دارالعلوم دیوبند کا ترجمان
ماہنامہ
دار العلوم
مدیر
حبیب الرحمٰن قاسمی

دارالعلوم دیوبند کا ترجمان

ماہنامہ

دارالعلوم

دیوبند

شمارہ نمبر ۱ ماہ جمادی الاول ۱۴۰۷ھ مطابق ماہ جنوری ۱۹۸۷ء جلد نمبر [illegible]

نگراں

حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند

مدیر

مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی

فی شمارہ 4/-

سالانہ 40/-

سالانہ بدل اشتراک بیرون ممالک سے

سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ کا سالانہ 160/-

پاکستان سے 70/- بنگلہ دیش سے 50/- ہندوستانی

سرخ نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ کا زرتعاون ختم ہوگیا ہے

فہرست مضامین

ہندوستانی و پاکستانی خریداروں سے ضروری گذارش

(۱) ہندوستانی خریداروں سے ضروری گذارش یہ ہیکہ ختم خریداری کی اطلاع پاکر اول فرصت میں اپنا چندہ نمبر خریداری کے حوالہ کے ساتھ منی آرڈر سے روانہ کریں۔

(۲) پاکستانی خریدار اپنا چندہ مبلغ ۷۰/- روپے مولانا عبدالستار صاحب کرم علی والا تحصیل شجاع آباد ملتان پاکستان کو بھیجدیں اور انھیں لکھیں کہ وہ اس چندہ کو رسالہ دارالعلوم کے حساب میں جمع کرلیں۔

(۳) خریدار حضرات پتہ پر درج شدہ نمبر محفوظ فرمالیں، خط و کتابت کے وقت خریداری نمبر ضرور لکھیں۔

والسلام - منیجر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرف آغاز

حبیب الرحمٰن قاسمی

حضرت خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے مقاصد یا بالفاظ دیگر آپ کے عہدۂ رسالت کے فرائض منصبی قرآن حکیم میں یہ بیان کئے گئے ہیں۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰہُ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ بَعَثَ فِیْھِمْ رَسُوْلًا مِّنْھُمْ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیْھِمْ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ الخ الآیة

اللہ تعالیٰ نے مومنین پر احسان فرمایا کہ ان میں بھیجا ایک رسول انہی میں سے، پڑھتا ہے ان پر اس کی آیتیں اور انھیں پاک کرتا ہے اور انھیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

یعنی آپ کے فرائض رسالت میں تین امور قرار دیے گئے (۱) تلاوتِ آیات (۲) تعلیمِ کتاب (قرآن) و حکمت (سنت) (۳) تزکیۂ اخلاق۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی اپنی بعثت کی غرض بیان کرتے ہوئے فرمایا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا اور ایک دوسرے موقع پر ارشاد ہوا بعثت لاتمم مکارم الاخلاق یعنی میں اللہ تعالیٰ کے احکام و فرمان کی تعلیم کیلئے بھیجا گیا ہوں، اور میرے دنیا میں آنے کا مقصد یہ بھی ہے کہ میں انسانوں کو تمام مراتب شرک و معصیت اور نفسانی آلائشوں سے پاک و صاف کرکے انھیں اخلاق و کردار کے اعلیٰ مقام پر پہنچا دوں۔

ان نصوص سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام تزکیۂ اخلاق اور تعلیم کتاب و سنت کی تاریخ ساتھ ساتھ چلتی ہے، اسلام کا آغاز ہی تعلیم و تزکیہ کی ابتدا ہے، اور ان میں باہم چولی دامن کا رشتہ ہے، اسلام بغیر علم و اخلاق کے ایک جسد بے روح کے ہے اور تزکیہ و تعلیم کا تصور بغیر اسلام کے ایک فریب و دھوکا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی تبلیغ و دعوت کے ساتھ تعلیم و تزکیہ کا سلسلہ بھی ابتدا ہی سے جاری رکھا، مکی زندگی جہاں مالک حقیقی کا نام لینا ہی سب سے بڑا گناہ اور فکر و رائے کی آزادی سنگین جرم تھا ظلم و جبر کی گھٹی ہوئی فضا، اور انتہائی غیر مساعد حالات میں جہاں ایک طرف چل پھر کر اسلام کی دعوت کا فریضہ انجام دیتے تھے وہیں دوسری طرف دار ارقم میں بیٹھ کر مسلمانوں کو کتاب و سنت کی تدریس اور اخلاق کے تزکیہ کا کام بھی انجام دیتے تھے۔

ہجرت مدینہ کے بعد جب گونہ سکون میسر آیا اور آزادی کی فضا میں سانس لینا نصیب ہوا تو مسجد نبوی کی تعمیر کے ساتھ مسجد سے باہر متصلاً جانب شمال مستقل طور پر ایک مدرسہ اور تربیت گاہ بھی تعمیر کرائی جو صفۃ المسجد اور بعد میں مختصر ہو کر صفہ کے نام سے موسوم و مشہور ہوا جس کی چھت مسجد ہی کی طرح کھجور کی ٹہنیوں سے بنائی گئی تھی یہ ایک اقامتی درسگاہ تھی جہاں طالبان علوم و تزکیہ کا ہمہ وقتی قیام رہتا تھا اور آنحضرت صلعم کی تعلیم و تربیت سے مستفیض ہوتے تھے، حضرت ابوعبیدہ بن الجراح حضرت عبداللہ ابن مسعود، حضرت ابوہریرہؓ حضرت عبداللہ بن عمر حضرت ابوذر غفاری حضرت سلمان فارسی حضرت ابدردا، حضرت حذیفہ بن یمان حضرت بلال مؤذن رسول اللہ صلعم وغیرہ افاضل صحابہ رضوان اللہ علیہم اسی درسگاہ نبوت کے فیض یافتہ تھے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرات خلفاء نے تعلیم و تربیت کے اس سلسلے کو نہ صرف باقی رکھا بلکہ اس میں مزید ترقی دی بالخصوص خلیفہ ثانی حضرت فاروق اعظمؓ نے اس جانب بطور خاص توجہ دی اور تمام ممالک محروسہ میں قرآن کریم کی جبری تعلیم کا نفاذ فرمایا، پھر اسی کے ساتھ اہم اور قابل ذکر مقامات میں معلمین و مربین روانہ کئے۔

حکومتی سطح پر اس کوشش کے ساتھ ساتھ حضرات صحابہ بطور خود بھی اپنی اپنی جگہوں پر تعلیم و تربیت کی خدمات انجام دیتے تھے گویا جو صحابی جہاں پہنچ جاتا تھا وہیں ایک مدرسہ قائم ہو جاتا تھا۔

یہ حضرات بھی اپنے تلامذہ کی تعلیم کے ساتھ ان کے تزکیہ و تربیت کی جانب بھی پوری توجہ فرماتے تھے

چنانچہ حضرات تابعین جہاں حدیث و تفسیر فقہ اور سیر و مغازی کے امام ہوتے تھے وہیں زہد تقویٰ اور مکارم اخلاق کے بھی پیکر ہوتے تھے، امام حسن بصری، امام محمد ابن سیرین، سعید بن المسیب امام زہری وغیرہ حضرات تابعین کے تراجم و تذکرے پڑھ جائیے، آپ کو ہر امام اعمال و اخلاق کا پیکر نظر آئے گا۔

الغرض چوتھی صدی ہجری تک کے علماء میں بالعموم یہی جامعیت نظر آتی ہے کہ وہ بیک وقت محدث، مفسر، فقیہ، متکلم، ادیب اور مورخ ہونے کیساتھ اعلیٰ درجے کے متقی، پارسا اور آج کی اصطلاح میں صوفی و شیخ ہوتے تھے — چوتھی صدی کے بعد سے اس جامعیت میں اضمحلال آنا شروع ہوگیا جو دھیرے دھیرے اس حد تک پہنچ گیا کہ علماء کے مختلف طبقات بن گئے اور ہر طبقہ کسی ایک فن کے ساتھ مخصوص ہوگیا لیکن علم و عمل میں توافق اور یکسانیت پہلے کی طرح قائم رہی اگر کہیں اس میں تضاد نظر آتا ہے وہ بالعموم انفرادی حد تک رہا ہے جسے معاشرہ علماء و طلباء نے برداشت نہیں کیا ہے حتیٰ کہ علماء حق بے عمل عالم کو زمرۂ علماء میں شمار کرنے کے بھی روادار نہیں ہوتے تھے۔

مثال کیلئے زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں اپنے ملک ہندوستان کے علماء کے تذکروں پر ایک طائرانہ نگاہ ڈال لیجئے آپ کو نظر آئیگا کہ وہ ایک طرف علوم و فنون کے بحر بے کنار ہیں تو دوسری جانب سلوک و تصوف کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر بھی ہیں

علم و عمل یا تعلیم و تزکیہ کا یہ باہمی ربط اسلامی ہند کے آخری دور تک قائم رہا چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ کا خانوادہ جو اسی دور کی یادگار ہے اس کا ایک ایک فرد علوم و فنون اور سلوک و تصوف کا جامع تھا مگر صحیح بات تو یہ ہے کہ اس متاعِ گرانمایہ کو اگلی نسلوں تک پہنچانے میں اس خانوادے نے اہم کردار ادا کیا ہے

۱۸۵۷ء (۱۲۷۴ھ) کے بعد سیاسی انقلاب اپنی جلو میں تباہی و بربادی کا ایک ایسا عظیم سیلاب لے کر نمودار ہوا جس کی طوفانی موجوں میں مسلمانوں کی قوت و شوکت کے مناروں کے ساتھ ان کے تعلیمی و تربیتی مراکز بھی تہہ و بالا ہوگئے — اور خطرہ پیدا ہو چلا تھا کہ ہندوستان میں اسلام اپنی انفرادیت تو دور کی بات ہے وجود برقرار نہیں رکھ پائیگا، اس ہرج مرج اور ابتلاء کے وقت اسی خانوادۂ ولی اللہ

چند متقبین نے اسلام اور اس کی لازمی خصوصیات کی حفاظت و صیانت کیلئے نہایت خاموشی کیساتھ دیوبند جیسے گمنام مقام میں ایک ایسے مدرسہ کی بنیاد رکھدی جو بیک وقت مدرسہ و خانقاہ دونوں کی ضرورت پوری کرے اور یہاں سے اسلام کے ایسے مبلغ تیار کئے جائیں جو اسلامی علوم و فنون کیساتھ دینی اعمال و اخلاق کے بھی محافظ و منادی ہیں۔ چونکہ مقصد انتہائی نیک اور بانیین کے اندر اخلاص تھا اس لئے تھوڑی ہی مدت میں یہ ایک قصباتی "مدرسہ اسلامیہ" دارالعلوم بن گیا اور اسکے علماء و فضلا کو ایسی مقبولیت و مرجعیت حاصل ہوئی کہ ان کے سامنے کسی کا چراغ روشن نہ رہ سکا حالانکہ علماء دیوبند کے علاوہ دیگر حلقوں میں بھی ایسے علماء فضلاء کی خاصی تعداد تھی جو تبحر علمی میں علماء دیوبند سے کسی طرح بھی فروتر نہیں تھے لیکن علم و عمل یا عالمیت و مشیخت کی وہ جامعیت جو علماء دیوبند کی خصوصیت تھی ان میں یہ حضرات مقابلہ نہ کرسکے اس لئے پیچھے رہ گئے۔ چنانچہ عصر حاضر کے مشہور مورخ و مبصر شیخ اکرام لکھتے ہیں

"دارالعلوم دیوبند نے بغیر کسی شور و غل کے تھوڑی ہی مدت میں جو اعتبار و مرتبہ حاصل کرلیا ہے وہ اسکے منتظمین کی قابلیت اور نیک نیتی کا واضح ثبوت ہے اور انھیں اس پر فخر کا جائز حق ہے لیکن ہمیں یہ نہ بھولنا چاہئے کہ دیوبند کی کامیابی علمی فتوحات کی وجہ سے کم اور روحانی پاکیزگی کی وجہ سے زیادہ ہوئی ہے۔" (موج کوثر ص ۲۱۰)

لیکن حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہ العزیز کے بعد سے ہماری یہ خصوصیت مدھم پڑتی جارہی ہے اور علم و عمل کی وہ جامعیت جو ہمارے اکابر رحمہم اللہ کا طرۂ امتیاز تھا اب کم نظر آرہی ہے ابھی اکابر کی نگاہوں کو دیکھے ہوئے اور ان کی روحانی مجلسوں میں بیٹھنے والے بہت سے بزرگ موجود ہیں جن کے دم سے کسی نہ کسی حد تک یہ سلسلہ جاری ہے لیکن یہ حضرات اب چراغ سحری ہیں اس لئے ضرورت ہے کہ دارالعلوم میں روحانیت کے اس ماحول کو پھر سے برپا کیا جائے یہ وقت کی اہم ترین ضرورت ہے، دارالعلوم چونکہ برصغیر میں ام المدارس کی حیثیت رکھتا ہے اس لئے اس کا اثر ان شاء اللہ پورے برصغیر میں محسوس کیا جائے گا۔

خطبۂ استقبالیہ

از: —— حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب دامت برکاتہم، مہتمم دارالعلوم دیوبند

بموقع اجلاس تحفظ حرمین شریفین

منعقدہ مورخہ ۸ صفر ۱۴۰۸ھ ۲ اکتوبر ۱۹۸۷ء دارالعلوم دیوبند

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ محمد و آلہ و صحبہ اجمعین

خداوند قدوس کا فضل و کرم ہے کہ خدام دارالعلوم کی دعوت پر مغربی اضلاع کے نمائندہ حضرات علماء تشریف فرما ہیں اور ہم ایک ایسے موضوع پر تبادلۂ خیال کر کے کسی نتیجہ تک پہنچنے کی کوشش میں ہیں جس نے پورے عالم اسلام کو اپنی جانب متوجہ کر لیا ہے۔

اس لئے سب سے پہلے ہم اپنے مہمان گرامی قدر کا صمیم قلب سے شکریہ ادا کرتے ہیں جنھوں نے اپنی گوناگوں مشغولیات کے باوجود دارالعلوم کی دعوت کو قبول فرماتے ہوئے سفر کی زحمت برداشت کی اور اس موضوع کو اہمیت دی جس نے تمام مسلمانوں کے دل و دماغ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔

مہمانان گرامی قدر! —— اہل تحقیق مؤرخین کا خیال ہے کہ دنیا میں کوئی اہم حادثہ اتفاقی طور پر پیش نہیں آتا اور سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی شہادت کا دلگداز سانحہ بھی اتفاقی طور پر وجود میں نہیں آیا تھا بلکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک سے جو اسلام دشمن گروہ طرح طرح کی سازشوں کی ترتیب میں مصروف کار تھا یہ حادثہ اس کی

ریشہ دوانیوں کی کامیابی کا پہلا اظہار اور اُمت محمدیہ کے درمیان افتراق وانتشار کی مہم کا آغاز تھا پھر اس نفاق پیشہ گروہ کے دسیسہ کاروں نے اپنی تنظیم کو عہد عثمانی کے اواخر تک مضبوط و مستحکم کرلیا تو حضرت عثمان ذوالنورین کے خلاف باقاعدہ مہم چلائی اور اپنے ناپاک عزائم میں کامیابی کا یقین کرلینے کے بعد امت مرحومہ کی تیسری سب سے اہم شخصیت مجسمہ صبر و رضا پیکر حلم وحیا اور مرقع جود وسخا حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو شہید کردیا اور اس کے بعد حضرت علی مرتضی کرم اللہ وجہہ کے عہد خلافت میں اس گروہ کے سربراہوں نے امت مسلمہ کو باقاعدہ دو حصوں میں تقسیم کرنے کی مہم سر کرلی

شیعیت کے اسی تاریخی پس منظر کی بنیاد پر یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ شیعوں کے اس اختلاف کا دین سے کوئی تعلق نہیں ہے کیونکہ یہ اختلاف اس وقت شروع کیا گیا جب دین و شریعت کا کامل اظہار ہوچکا تھا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دین کی مکمل تبلیغ فرمانے اور لاکھوں صحابہ کو تبلیغ دین پر گواہ بنانے کے بعد تشریف لے گئے تھے، اس کامل شریعت میں دینی ضروریات فرائض و واجبات اور آیات محکمات کی جو اہمیت بیان فرمائی گئی تھی وہ قیامت تک بدستور باقی رہے گی، پھر ان تمام دینی امور کی عملی تصویر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ میں پیش کردی گئی اور اب انھی چیزوں کے اتباع سے اُمت مسلمہ کی صداقت وحقانیت کا تسلسل قائم ہے

گویا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تکمیل دین کا اعلان فرمانے کے بعد جس گروہ نے سب سے پہلے دین میں تفرقہ اندازی اور فساد انگیزی کا کام شروع کیا وہ یہی شیعوں کا گروہ ہے جو اس وقت سے آج تک سینکڑوں بار دین صحیح کے خرمن کو نذر آتش کرنے کی جدوجہد کرچکا ہے تاریخ میں اس نفاق پیشہ گروہ کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کی تفصیلات محفوظ ہیں، ان کو جب بھی کوئی سیاسی اقتدار حاصل ہوا ہے انھوں نے مقامات مقدسہ کی حرمت کو پامال کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔

۲۷۸ھ میں سرزمین کوفہ میں حمدان عرف قرمط نامی ایک شخص نے شیعیت کے فتنہ کی خوب آبیاری کی، اس نے خلیفہ معتضد باللہ کے زمانہ سے سر ابھارنا شروع کیا، سلاطین اسلام کی بار بار سرکوبی کے باوجود قرمط کے معتقدین میں سے متعدد لوگوں نے مہدی ہونے کا دعویٰ کیا، بحرین کوفہ اور بصرہ ان کی سرگرمیوں کے مرکز رہے اور یہ فتنہ یہاں تک بڑھ گیا کہ وہ ایک زمانہ میں بحرین پر قابض و متصرف ہو گئے

۳۱۲ھ میں ابوطاہر قرمطی نے فوج کشی کرکے حجاج کرام کے قافلوں کو لوٹ لیا

۳۱۳ھ میں باہر کے حجاج کرام نے حج کے سفر کی ہمت نہیں کی۔

۳۱۸ھ میں پھر حجاج کا قتل عام انھی قرمطی شیعوں کے ہاتھوں سے ہوا ان شرانگیزوں نے خانہ کعبہ کے اندر بھی قتل و خونریزی کا شرمناک کام کیا مقتولین کی لاشیں زمزم میں ڈالدیں حجر اسود کو گرز مار کر دیوار سے الگ کر دیا اور گیارہ دن تک حجر اسود یونہی زمین پر پڑا رہا، خانہ کعبہ کے دروازے توڑ دیئے، میزاب رحمت کو اکھاڑ کر پھینک دیا، پھر یہ ظالم حجر اسود کو اٹھا کر اپنے دارالسلطنت بحرین لے گئے۔

پھر مطیع باللہ کے عہد میں بیس سال کے بعد یہ حجر اسود واپس ہوا، اور اصل جگہ پر نصب کیا گیا۔

یہ ایک واقعہ نہیں ہے بلکہ قرامطہ کا فتنہ تقریباً پچاس سال تک سلاطین اسلام کی توجہ کا مرکز بنا رہا، اور اسکے بعد ہر صدی میں کہیں نہ کہیں یہ فتنہ دین صحیح کو پامال کرنے کی جدوجہد میں مصروف نظر آتا ہے۔

سامعین عالیمقام!۔ آپ کو یاد ہوگا کہ ایرانی انقلاب کے فوراً بعد جو اعلانات آنا شروع ہوئے تھے ان میں خمینی صاحب کے اس اعلان نے تمام مسلمانوں کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کرا لیا تھا کہ

"دنیا کی اسلامی اور غیر اسلامی طاقتوں میں ہماری قوت اس وقت تک تسلیم نہیں

ہو سکتی جب تک کہ مکہ و مدینہ پر ہمارا قبضہ نہیں ہو جاتا ...... میں جب فاتح بن کر مکہ اور مدینہ میں داخل ہوں گا تو سب سے پہلے میرا یہ کام ہوگا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضے میں پڑے ہوئے دو بتوں (حضرت ابوبکرؓ وحضرت عمرؓ) کو نکال باہر کروں گا۔ (بحوالہ خمینی ازم اور اسلام)

چنانچہ اس ناپاک منصوبہ کو بروئے کار لانے کیلئے ہر سال ایرانی مفسدہ پرداز جدوجہد میں مصروف نظر آتے ہیں، ایرانی انقلاب پر ابھی پورا ایک سال بھی نہ گذرا تھا کہ یکم محرم سنہ ۱۴۰۰ھ کو ایک مسلح گروہ نے کعبۃ اللہ اور مسجد حرام پر قبضہ کرکے یہ اعلان کر دیا۔ کہ

"مہدی موعود ظاہر ہوگئے ہیں اور اب ان کی بیعت کے بغیر چارہ کار نہیں ہے اور چونکہ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں کسی کی آمد و رفت یا قیام پر پابندی عائد کرنا شرعاً حرام ہے اس لئے امام مہدی کے عہد میں ان پابندیوں کو ختم کر دیا جائیگا اور تمام مسلمانوں کو آزادی کے ساتھ بلا روک ٹوک ان مقامات مقدسہ میں آنے اور قیام کرنے کی سہولت مہیا کی جائے گی، اور تمام غیر اسلامی قوانین کو منسوخ کر دیا جائیگا"

مہدیٔ موعود کے نام پر رچائے جانے والے اس ناپاک ڈھونگ کا انجام یہ ہوا کہ دو ہفتہ سے زائد مدت تک بیت اللہ کا طواف بند رہا پھر ان شیاطین میں سے کچھ کو زندہ گرفتار کر لیا گیا اور اکثریت کی لاشیں مسجد حرام کے تہہ خانوں سے ان پر قابو پا لینے کے بعد برآمد کی گئیں جن میں نام نہاد مہدی موعود کی بھی لاش تھی۔

پھر اس کے بعد ہر سال موسم حج میں حج کے نام پر سفر کرنے والے ایرانیوں کی جانب سے جو صورت حال پیش آتی رہتی ہے وہ انتہائی تکلیف دہ اور شرمناک ہے ایران کے اس اسلام دشمن انقلاب سے پہلے ایرانی زائرین کی تعداد بہت کم رہتی تھی، لیکن انقلاب کے بعد ان کی تعداد میں زبردست اضافہ ہوا اور اب یہ تعداد بڑھ کر ڈیڑھ لاکھ سے بھی زائد

ہوگئی ہے، ان زائرین کا مقصد حدودِ حرم میں عام مسلمانوں کی ایذا رسانی کے علاوہ کچھ نہیں ہے، یہ طرح طرح کی شورشیں برپا کرتے ہیں، امن وامان کو تباہ کرنے کیلئے ہمیشہ جلوس کی شکل میں نکلتے ہیں، خمینی کی تصویروں کو اٹھائے احتجاجی مظاہرے اور جلوس کی کوشش کرتے ہیں، طواف کے دوران بھی اللہ واحد، خمینی قائد، اللہ اکبر، خمینی رہبر کے نعرے لگاتے ہیں، حدودِ حرم میں تکلیف دہ اور ضرر رساں چیزوں کو پھینکتے رہتے ہیں اور بسا اوقات غلاظت تک بکھیر دیتے ہیں، خلفاء ثلاثہ، اور امہات المومنین رضی اللہ عنہم اجمعین پر تبرے سے بھی باز نہیں آتے، کچھ بدبخت حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما سے کینہ کی آگ بجھانے کی غرض سے روضۂ اقدس کی بے حرمتی کا بھی ارتکاب کرڈالتے ہیں، اپنے قابلِ شرم مذہب کے مطابق جن عورتوں کو ساتھ لاتے ہیں ان کے ذریعہ ان مقدس مقامات پر بھی متعہ جیسی بدترین عیاشی کو رواج دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

ایرانی امیر الحجاج کو حکومتِ ایران کی جانب سے یہ ہدایت دی جاتی ہے کہ مختلف مقاصد کے تحت مکۂ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں جلوس نکالے اور سیاسی مظاہروں کا اہتمام کرے اس طرح یہ ایرانی جلسے جلوس اور ہنگامے کرکے لاکھوں حجاج کرام کی توجہ اصل عبادت سے ہٹا کر سیاسی نعرے بازی کی طرف مبذول کرتے رہتے ہیں اور اگر ان کو سلامت روی کے ساتھ ان حرکتوں سے باز رکھنے کی تلقین کی جائے تو آمادۂ پیکار ہوجاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اسلام دین وسیاست کے مجموعہ کا نام ہے وغیرہ۔

ان تمام نازیبا اور ناروا حرکتوں کا مقصد اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے کہ اس مقدس خطہ کے امن وسکون کی اس نعمت لازوال کو تباہ وبرباد کردیا جائے جو اسے ہمیشہ سے حاصل رہی ہے۔

مہمانانِ محترم! ان بدترین مقاصد کو بروئے کار لانے کیلئے ایران کی موجودہ

حکومت تسلسل کے ساتھ کام کررہی ہے اور انقلاب ایران کے بعد ہر سال ہی کچھ نہ کچھ واقعات پیش آتے رہتے ہیں۔

اکتوبر ۱۹۸۱ء میں مدینہ طیبہ میں مسجد نبوی کے اندر جب ایرانیوں نے مظاہرے کا آغاز کیا تو اس وقت بھی سعودی سیکورٹی فورس کو مداخلت کرنا پڑی تھی اور ایرانیوں کے جارحانہ کردار کی بنیاد پر تصادم کی نوبت آگئی تھی جس کے نتیجہ میں تمام ایرانیوں کو مکہ معظمہ میں مظاہرے سے روک دیا گیا تھا اور ایران کے حج کے ذمہ دار حجۃ الاسلام موسوی کو ۱۴ رفقاء سفر کے ساتھ ملک بدر کر دیا گیا تھا۔

اس کے بعد پھر ستمبر ۱۹۸۳ء میں ایرانیوں نے مکہ مکرمہ میں باقاعدہ مظاہرہ کا انتظام کیا، اس ہنگامہ کو فرو کرنے کیلئے حفاظتی فورس کو مداخلت کرنا پڑی جس کے نتیجہ میں ایرانی مظاہرین اور فورس کے ساتھ بعض حجاج کرام بھی مجروح ہوگئے۔ پھر ستمبر ۱۹۸۴ء میں ایرانی اور عراقی حاجیوں کے درمیان مدینہ منورہ میں تصادم کی نوبت آئی اور ایک ایرانی مارا گیا

پھر اگست ۱۹۸۵ء میں جب ایرانی زائرین کی تعداد ایک لاکھ پچاس ہزار کے قریب تھی، ایرانیوں نے اجتماعی طور پر ایک زبردست مظاہرے کا اہتمام کیا جس میں خمینی صاحب کا پیغام پڑھ کر سنایا گیا۔ اس موقع پر بھی سیکورٹی فورس کو مداخلت کرنا پڑی اور متعدد ایرانیوں کی گرفتاری عمل میں آئی

پھر اگست ۱۹۸۶ء میں متعدد ایرانی جدہ ایرپورٹ پر گرفتار کیے گئے کیونکہ ان کے بارے میں یہ مصدقہ اطلاعات تھیں کہ ان کے بکسوں میں دھماکہ خیز اور آتشگیر سازوسامان ہے چنانچہ تلاشی کے دوران یہ انتہائی خطرناک چیزیں برآمد ہوئیں، اور مسافروں کے صندوقوں کی خفیہ تہوں سے یہ آتشگیر مادے برآمد کرلئے گئے، ایک ایک اٹیچی کی تہہ سے جو مادہ برآمد ہوا وہ بڑی سی بڑی عمارت کو خاکستر کرنے کیلئے کافی تھا، ان مسافروں نے یہ بیان دیا کہ طہران ایرپورٹ پر انھیں یہ سازسامان کچھ بتلائے بغیر دیا گیا تھا۔

پھر اب سال رواں میں جو واقعہ پیش آیا اس کی تفصیلات سب کے سامنے ہیں کہ امسال بھی ایرانی زائرین کی تعداد ایک لاکھ پچاس ہزار سے متجاوز تھی، اور تحقیقاتی رپورٹ کے مطابق یہ چیز فکر انگیز ہے کہ ان میں تقریبًا پچھتر فیصد زائرین فوجی تربیت یافتہ اور فوجی تنظیموں کے رضاکار تھے، ان حضرات کے منظم منصوبہ کے تحت ۶ ذی الحجہ کو جمعہ کے دن جمعہ کے بعد ہی سے خطرے کی علامتیں ظاہر ہونے لگی تھیں کہ ایرانی زائرین ہزاروں کی تعداد میں جلوس کی شکل میں مسجد حرام میں پہنچنے شروع ہوگئے تھے یہ حضرات خمینی اور ان کے جانشین آیت اللہ منتظری کی تصویریں لئے ہوئے تھے جس سے حجاج کرام میں سراسیمگی پھیلنا شروع ہوگئی ان مظاہرین نے حرم شریف کے دروازے بند کرنا شروع کئے اور آمد و رفت کے راستوں پر رکاوٹیں کھڑی کرنا شروع کردیں اس دوران کعبۃ اللہ کا طواف بھی رک گیا، ایرانی بار بار اشتعال انگیز نعرے بھی لگاتے رہے، پھر نماز مغرب کے بعد ایرانی زائرین کا ایک زبردست ہجوم جلوس کی صورت میں نعرے لگاتا ہوا جنت المعلیٰ سے مسجد حرام کی طرف روانہ ہوا۔ پولیس نے جلوس کو روکنے کی کوشش کی تو اچانک ان ایرانی زائرین نے چھرے نکال کر سپاہیوں پر حملہ شروع کردیا اور ہجوم نے دوکانوں اور کاروں کو آگ لگانی شروع کردی، تشدد اور خوں ریزی کا یہ سلسلہ برابر بڑھتا رہا سعودی سیکورٹی فورس نے بار بار ان حرکتوں سے باز رہنے کی پُرامن تلقین کی مگر مظاہرین نے اس کی مطلق پرواہ نہیں کی پھر فورس کی ایک بڑی تعداد نے پہنچ کر سعودی فورس کے بیان کے مطابق گولیاں چلائے بغیر ہلکے درجے کی تدبیروں سے ان مفسدہ پردازوں اور دین دشمنوں کو قابو میں کیا، اس کارروائی میں سینکڑوں افراد جاں بحق ہوگئے

حاضرین کرام : ایران کی اسلام دشمن حکومت کی ان مسلسل جارحانہ کارروائیوں سے یہ بات بالکل عیاں ہوجاتی ہے کہ ان کا مقصد ان مقدس مقامات کے تقدس کو پامال کرنا ہے، وہ قرن اول سے لیکر آج تک کی معاندانہ روش کے مطابق دین صحیح کے علمبردار ــــ

اہل سنت والجماعت کو، اس مقدس خطہ کی خدمت سے محروم کرنے اور اپنے ناپاک عزائم کو بروئے کار لانے کی منصوبہ بند جدوجہد کر رہے ہیں۔

کیونکہ اثنا عشری عقائد کی رُو سے اس مذہب کے ماننے والوں پر یہ بات "مذہبی فریضہ" کے طور پر واجب ہے کہ وہ حرمین شریفین اور عراق پر قبضہ کی خفیہ تدبیریں عمل میں لاتے رہیں تاکہ اگر کسی وقت گردشِ ایام ان کا ساتھ دے تو وہ صدیوں پہلے کے غائب شدہ بارہویں امام کو "مکہ مکرمہ" میں ظاہر کر سکیں، ان حضرات کے عقیدے کے مطابق یہ بارہویں امام چار پانچ سال کی عمر میں تمام تبرکات ساتھ لے کر ایک غار میں غائب ہو گئے تھے، ان تبرکات میں قرآن کریم کا اصل نسخہ، تورات، زبور، انجیل، دیگر آسمانی صحیفے، مصحف فاطمی، عصائے موسیٰ، خاتم سلیمانی اور انبیاء سابقین کی بیش قیمت یادگاریں شامل ہیں، ان حضرات کا عقیدہ یہ ہے کہ یہ امام غائب، قرب قیامت میں عراق میں اپنے غار سے نکلیں گے اور مکہ مکرمہ میں ظاہر ہونگے اور کفار سے پہلے سنیوں کے قتل سے اپنی مہم کا آغاز کریں گے پھر مدینہ طیبہ پہنچ کر حضرات شیخین اور امہات المومنین کو زندہ کریں گے اور ان کو عبرت ناک سزا دیں گے وغیرہ (نعوذ باللہ من ہذہ الخرافات)

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایران کے موجودہ مذہبی قائدین، اپنے ان بدترین عقائد کو عملی صورت میں ظاہر کرنے کیلئے مسلسل منصوبہ بندی میں لگے ہوئے ہیں، اور سعودی عرب کی موجودہ حکومت کے خلاف طرح طرح کی سازشوں میں ہمہ تن منہمک ہیں، ان حضرات کی یہ تجویز بھی ان ہی سازشوں کا ایک حصہ ہے کہ ان مقدس مقامات کا انتظام بین الاقوامی شہر کے طور پر کیا جائے، اور حرمین شریفین کا نظم ونسق پوری دنیا کے مسلمان نمائندوں کے سپرد کیا جائے حالانکہ یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ اس وقت کے حرمین شریفین کے خدام بجا طور پر اس خدمت کے مستحق ہیں کہ ان حضرات نے اقتدار سنبھالنے کے بعد جو سہولتیں حجاج کرام کیلئے فراہم کی ہیں اس سے زیادہ کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔

دردمندانِ ملت:- آپ جانتے ہیں کہ ہر سال عالم اسلام سے فریضۂ حج کی ادائیگی کے لئے جانے والے حجاج کرام کی تعداد پچیس لاکھ سے متجاوز ہو چکی ہے، اتنی بڑی تعداد کیلئے ہر سال آمد و رفت، دیکھ بھال، قیام و رہائش اور خورد و نوش کا انتظام کرنا بڑا اہم کام ہے اور اس وقت کی سعودی حکومت بڑی محنت و جانفشانی اور خوبی کے ساتھ یہ تمام خدمتیں انجام دے رہی ہے اسی حسن انتظام کی بدولت مکہ مکرمہ، میدان عرفات اور منٰی کی وادی غیر ذی زرع میں نہ صرف پینے کے پانی کی فراوانی ہے بلکہ خورد و نوش کیلئے دنیا کی تمام نعمتیں وہاں مہیا ہیں۔

پچاس سال پہلے کے حجاج کرام سے وہاں کے قیام کے دوران کی مشکلات سننے میں آتی ہیں تو حیرت کی انتہا نہیں رہتی مگر اب تمام راستے پُرسکون اور مامون ہیں، ہر موقع پر زندگی کی ہر ضرورت مہیا ہے، حجاج کرام کے خیموں تک میں ہمہ وقت پانی کی سپلائی بحال رہتی ہے، حرمین شریفین کو کئی بار اتنی توسیع دی جا چکی ہے جتنی ممکن تھی، چھتوں پر جانے کیلئے چاروں کونوں میں لفٹ نصب کر دیئے گئے ہیں جن میں سے ہر یونٹ کی صلاحیت ایک گھنٹہ میں ۳۰ ہزار افراد کو لانے اور لیجانے کی ہے، مطاف میں حرارت کو جذب کرنے والے ٹائل لگا دیئے گئے ہیں جن کے سبب سخت گرمی کے باوجود طواف میں کوئی دشواری نہیں ہے پورے حرم شریف میں ٹھنڈے پانی کی سپلائی کیلئے ہزاروں کی تعداد میں کولروں کا انتظام کر دیا جاتا ہے، پورے حرم شریف میں روشنی اور ہوا کیلئے انتظام کر دیا گیا ہے کہ دنیا کے کسی بھی علاقہ میں اس کی نظیر نہیں ہے، ان سہولتوں کی فراہمی پر کروڑوں نہیں مجموعی طور پر اربوں کی دولت خرچ ہو چکی ہے اگر ان سہولتوں کی تفصیل کی جائے جو موجودہ سعودی حکومت حجاج کرام کیلئے عمل میں لاتی رہتی ہے تو اس کیلئے یہ وقت ناکافی ہے، دین صحیح کی ترویج و اشاعت اور بدعات کے قلع قمع کیلئے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے جا رہے ہیں وہ بھی اس حکومت کی قابل قدر خدمات کا وسیع باب ہیں۔

ہمدردان اسلام!

ان مختصر معروضات سے یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ اس وقت ملت اسلامیہ تاریخ کے نازک موڑ پر کھڑی ہوئی ہے کہ ایک طرف دین صحیح کے خدام ہیں جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح وراثت کے تحفظ کی جد وجہد میں مصروف ہیں اور دوسری طرف طاغوتی اور شیطانی طاقتیں ہیں جو ہر طرح سازشیں کر کے دین صحیح کو نقصان پہنچانے کی سازشیں مرتب کر رہی ہیں۔

اس نازک موقع پر دین صحیح کے وارث ہونے کی حیثیت سے عموماً اور دارالعلوم دیوبند سے نسبت فیض رکھنے کی بنیاد پر خصوصاً ہماری ذمہ داریاں بہت بڑھ جاتی ہیں کیونکہ دارالعلوم دیوبند کے قیام کا مقصد ہی دین صحیح کی ترویج واشاعت اور باطل قوتوں کے ساتھ نبرد آزمائی رہا ہے۔

اثنا عشری فرقہ کی ریشہ دوانیوں کی جو تفصیلات سامنے آئی ہیں ان کی بنیاد پر ضروری تھا کہ دارالعلوم دیوبند اپنے تمام ہی ابنائے قدیم اور ہمدردوں کا اجتماع طلب کر کے اس موقع پر اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی جد وجہد کرتا لیکن وقت کی کمی کے سبب اس وقت صرف مغربی اضلاع کے علماء کرام کو دعوت دی گئی ہے تاکہ ہم اس نازک موقع پر اپنی ذمہ داریوں کو سمجھیں اور حرمین شریفین اور فریضۂ حج کو ایرانی سازشوں سے بچانے کیلئے احتیاطی تدابیر پر غور کریں اور جو تدابیر طے پائیں ان سے سعودی حکومت کو فوری طور پر مطلع کریں تاکہ وہ اپنی حرمین شریفین کی حفاظت اور حجاج کرام کے امن وعافیت کیساتھ حج کرنے کی ذمہ داری کو باحسن وجوہ پورا کر سکے اور دشمنان اسلام کی سازشوں کا ہمیشہ کیلئے خاتمہ ہو جائے۔

دعا ہے کہ پروردگار عالم اپنے فضل وکرم سے دین مبین کی حفاظت فرمائے، اعدائے اسلام کی سازشوں کو ناکام ونامراد کرے اور دین صحیح کے حریم پاک کے تقدس اور اس کی عصمت وعظمت کے تحفظ کے سلسلے میں ہماری مساعی کو شرف قبول سے نوازے۔

(باقی بر ص ۴۲)

دینی مدارس میں سائنس کی تعلیم

از مولانا اسید ادروی - جامعہ اسلامیہ بنارس

"دینی مدارس اور سائنسی تعلیم" کے نام سے پچھلے دنوں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی تھی جس میں چالیس کے قریب مضامین اور مقالے پڑھے گئے تھے مقالہ نگاروں میں کچھ تو جدید تعلیم یافتہ طبقہ سے تعلق رکھتے تھے اور کچھ وہ لوگ تھے جو گاؤں اور قصبوں کے دینی مدارس میں درس و تدریس کا کام کرتے ہیں، ان سارے مضامین کو مسلم یونیورسٹی کے رسالہ "تہذیب الاخلاق" کے ماہ مئی کے شمارے میں یکجا کر کے شائع کر دیا گیا ہے۔

تقریباً ایک سال سے مسلمانوں میں سائنس کی تعلیم کو فروغ دینے کی تحریک چلائی جا رہی ہے اس کام کیلئے مسلم یونیورسٹی میں ایک شعبہ "مرکز فروغ سائنس" کے نام سے کھولا گیا ہے، یہ کانفرنس اسی مرکز کی طرف سے بلائی گئی تھی، اس مرکز نے اتر پردیش اور بہار میں دینی مدارس کا سروے بھی کیا ہے، وہ پرائمری درجات سے لے کر آخر تک ریاضی، سائنس اور انگریزی تینوں مضامین کو دینی مدارس کے نصاب میں شامل کرنا چاہتے ہیں، ان کا نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ دینی مدارس کے نصاب میں کتر بیونت کر کے ان مضامین کو اس میں شامل کیا جا سکتا ہے اور صرف ان مضامین کے اساتذہ کا اضافہ کر کے یہ تحریک اپنی منزل پر پہنچ سکتی ہے

کانفرنس میں پڑھے گئے مضامین، کنوینر کے خطبۂ استقبالیہ اور مہمان خصوصی کی تقریر میں ان علوم کی اہمیت وضرورت پر پوراز ورقلم اور زور بیان صرف کیا گیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ قرآن وحدیث میں ان علوم کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے، موجودہ دور میں مسلمانوں کی پستی اور بدحالی کا واحد سبب بھی ان علوم سے ناواقفیت کو بتایا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ جب تک مسلمان ان علوم سے بے بہرہ رہیگا وہ کبھی بھی ترقی کی منزلیں طے نہیں کرسکیگا بلکہ بتدریج پستی میں گرتا چلا جائیگا۔ "تہذیب الاخلاق" کے مدیر نے مسلمانوں کو سائنس کی تعلیم کی اہمیت وضرورت بتاتے ہوئے بعض غلط فہمیوں کو دور کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ

"آج بھی بعض حلقوں میں یہ خیال پایا جاتا ہے کہ سائنس سے مذہب بیزاری آتی ہے، ہم اس خیال کی پرزور الفاظ میں تردید کرتے ہیں اس غلط خیال کی بنیاد سائنس کی تاریخ سے لاعلمی، سائنس کی بابت غلط فہمی اور بے جا تعصب ہے، تاریخ گواہ ہے کہ عظیم سائنسدانوں اور سائنسی تحقیق کے شہسواروں کی بڑی اکثریت مذہب اور روحانیت کی قائل رہی ہے"

پھر اسی سانس میں اپنے مذکورہ بالا بیان کے بالکل برعکس وہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ۔

"غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ سائنس پر مذہب بیزاری کے الزام کی بنیادی وجہ مغرب میں سائنس اور مذہب کے نام پر ماضی میں ہونے والا ٹکراؤ ہے اس ٹکراؤ کو اس کے صحیح پس منظر میں دیکھے بغیر بعض مسلم دانشوروں نے یہ غلط نتیجہ نکالا کہ سائنس فطرتاً مذہب کے خلاف ہے، دراصل یہ ٹکراؤ سائنس اور روایتی عیسائیت کے مابین تھا نہ کہ سائنس اور اسلام کے۔ اس ٹکراؤ میں شدت اور سائنسی حلقے کے چند افراد کے مذہب کے معاملہ میں انتہا پسندی، اس دور کے کلیسا کے انتہائی آمرانہ اور ظالمانہ رویہ کا رد عمل تھا"۔

پہلے جو بات کہی تھی اور جس بات کی پرزور الفاظ میں تردید کی گئی تھی اسی کے برعکس ساری باتوں کا خود اعتراف کرلیا گیا اور اسکے ثبوت میں سائنس اور مذہب کے ٹکراؤ کی تاریخ بھی پیش کردی گئی اور یہ بات ثابت کردی کہ سائنس کا ابتدا ہی سے مذہب سے ٹکراؤ رہا ہے، بالکل ایسے ہی جیسے سمرقند و

بخارا میں کمیونزم اور اسلام کے درمیان ٹکراؤ رہا اور اسکے نتیجہ میں روس کو اسلام کا سب سے بڑا قبرستان بنا دیا گیا۔

پھر اپنے پہلے دعوی سے نیچے اتر کر دوسرا دعوی کیا گیا کہ سائنس کا ٹکراؤ اصلی عیسائیت سے نہیں تھا بلکہ روایتی عیسائیت سے تھا، اگر مدیر گرامی نے اصلی عیسائیت اور روایتی عیسائیت کے درمیان خط فاصل کھینچ کر بتا دیا ہوتا تو جواب زیادہ باوزن ہو جاتا، مدیر گرامی نے اپنے اس جواب سے مسلم دانشوروں کو پھر خود غلط فہمی میں مبتلا کر دیا اور ان کو یہ یقین کرنے پر مجبور کر دیا کہ جب دینی مدارس میں سائنس کے رواج کے بعد مسلمانوں میں ذہنی ارتداد اور الحاد پیدا ہوگا اور مسلم دانشور اسکے خلاف صدائے احتجاج بلند کریں گے تو حامیان سائنس یہی کہیں گے کہ سائنس کا ٹکراؤ اصلی اسلام سے نہیں بلکہ روایتی اسلام اور مسلم دانشوروں کے کٹر پن سے ہے، اصل اسلام تو وہ ہے جس کو جدید تعلیم یافتہ طبقہ سمجھتا ہے، آج ہندوستان میں جو تمام دینی مظاہر ہیں۔ شکل و صورت، وضع قطع، لباس و معاشرت، تہذیب و اخلاق، طور و طریق، نکاح و طلاق، رشتے ناطے، نماز و روزہ، زکوۃ و حج، توحید، کائنات کے خالق و مالک کے غیر محدود تصرفات اور قدرت و اختیار، حشر و نشر، حیات بعد الموت، یہ سب کچھ ترقی پسندوں کے نزدیک روایتی اسلام ہے اصلی اور حقیقی اسلام وہ ہے جس کو کریم چھاگلہ، نور الحسن، حمید دلوائی، عارف محمد خاں، ظفر علی نقوی اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ سمجھتا ہے، علماء اور مسلم دانشوروں کو معرفت کے اس بلند مقام تک پہنچنے میں ابھی صدیوں کی مدت درکار ہے۔

دینی مدارس وہ لوگ چلاتے ہیں جو اسلامی تعلیمات و روایات اور انکے عملی مظاہر کو حقیقی اور اصلی اسلام سمجھتے ہیں ان کا اسلام جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی طرح قلم کی نوک اور زبان کی لفاظیوں تک محدود نہیں ہے اسلئے دینی تعلیم کے ساتھ کسی ایسے علم کی تعلیم کو کس طرح گوارا کر سکتے ہیں جو ان کے دین کی نفی کرتا ہے اور عقیدہ کی جڑوں میں کھولتا ہوا پانی دیکر اس کے استیصال کی کوشش کرتا ہے۔

اس تحریک کا سرچشمہ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ ہے اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ اس کی رہنمائی کرتا ہے، پلاننگ اور منصوبہ بندی ان لوگوں کی ہے جو اس یونیورسٹی سے وابستہ ہیں یا وہ لوگ ہیں جو اپنے عہدوں سے ریٹائر ہوچکے ہیں، اب ان کو تلاش ان خیمہ برداروں کی ہے جو دُو دُو تین تین سو روپے ماہوار پر دینی مدارس میں اپنی زندگیاں کھپا رہے ہیں، ان کو مدارس اسلامیہ کے نصاب کے ناکارہ پن کی بھی شدید شکایت ہے، منطق فلسفہ اور علم کلام کی کتابوں کی لغویت اور ان کے مذہب دشمن ہونے کا بھی شدید احساس ہے، ان کا خیال ہے کہ دینی مدارس کے نصاب کو از سر نو مرتب کیا جائے اور ہر فن کی ایسی کتابیں مرتب کرائی جائیں یا منتخب کی جائیں کہ ایک ہی کتاب سے وہ فن حاصل ہوجائے، اس طرح "مرکز فروغ سائنس" ایک وسیع منصوبہ رکھتا ہے اور اپنے کام کا آغاز کرچکا ہے، مدارس دینیہ کے ارباب اہتمام اور اساتذہ سے رابطہ قائم کیا جارہا ہو اور ان کو اپنی کانفرنس اور اصلاح ومشورہ کی مجلسوں میں بلاکر سر اور آنکھوں پر بٹھایا جارہا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مرکز فروغ سائنس نے خصوصیت کے ساتھ دینی مدارس ہی کو کیوں نشانہ بنایا؟ جبکہ وہ جانتے ہیں کہ یہاں خالص دینی تعلیم دی جاتی ہے اور وہ بھی صرف عربی زبان میں، یہاں نہ انگریزی زبان پڑھائی جاتی ہے اور نہ عصری علوم کی تعلیم دی جاتی ہے، ان مدارس کی افادیت کا اعتراف اور ان کی کارگذاری پر اظہار اطمینان بھی کرتے ہیں اسکے باوجود خود ہی اس کی افادیت کو مجروح کرنے کیلئے اقدام بھی کرتے ہیں ان کیلئے سہل ترین صورت تو یہ تھی کہ وہ ان تمام انگریزی اسکولوں اور کالجوں میں فروغ سائنس کی مہم کو اور تیزی سے چلاتے جو مسلمانوں کے زیر انتظام چلائے جارہے ہیں ان کی تعداد بھی دینی مدارس سے کچھ کم نہیں ہے، اگر ان اسکولوں اور کالجوں سے اپنی مہم کا آغاز کرکے مسلمان قوم میں وہ انقلاب برپا کرنے کا معجزہ دکھاتے جس کا سبز باغ مسلمانوں کو دکھلایا جارہا ہے اور ایسے سائنسداں پیدا کرتے جو دینی و دنیاوی علوم کے جامع ہوتے ان اسکولوں اور کالجوں اور خود مسلم یونیورسٹی سے نکلنے والا سائنسداں ظاہر و باطن دونوں

لحاظ سے اسلام کا ترجمان بن جاتا تو دنیا دیکھ لیتی کہ آپ نے جو منصوبہ بندی کی ہے اس کا عملی نمونہ مسلم یونیورسٹی سے نکلنے والا سائنس اور ریاضی کا ماہر بھی ہے اور اسلام کا بہترین ترجمان بھی۔ ایک زمین اپنے اندر نشوونما کی پوری صلاحیت رکھتی ہے اس کے سارے وسائل و ذرائع بھی موجود ہیں اس میں تخم ریزی کرکے فصل پیدا کرنا کہیں آسان ہے اس بات سے کہ آپ ایک بنجر اور شور زمین کو منتخب کرکے اپنی محنت کو رائگاں کرنے کیلئے نکلے ہیں، اگر عمل سے اس تحریک کی افادیت ظاہر کردی جاتی تو زور بیان اور زور قلم دکھانے کی ضرورت نہیں ہوتی، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ عرصہ دراز سے اب تک اس سلسلہ میں جو کام ہوا ہے وہ صرف یہی کہ چند افراد ان علوم کی سندلے کر آئے اور کسی یونیورسٹی میں لکچرر بن کر چار پانچ ہزار تنخواہ پانے لگے اور بس، ان کی اپنی دنیا تو سنور گئی اب قوم و ملت کا افسانۂ درد بھی ان کو سننا منظور نہیں جب تک کہ وہ عہدے سے ریٹائر نہ ہوجائیں اگر اس تحریک سے ایسے ہی چند افراد کی پیداوار مقصود ہے اور اسی کو مسلمان قعر مذلت سے نکال کر بام ثریا پر پہنچانا سمجھتے ہیں اور یہی اس تحریک کی آخری منزل ہے تو خدا کیلئے آپ اس تحریک کو انھیں لوگوں تک محدود رکھئے جن کے طائر فکر کی پرواز حسن بن صباح کی اس فردوس بریں کی بلندیوں تک ہے عام مسلمانوں کے دینی تعلیم کے نظام کو درہم برہم کرکے اسلام کو اس سرزمین میں دفن کرنے سے احتراز فرمائیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔

ان کا خیال ہے کہ ایک عالم دین کو بہترین سائنسداں اور عصری علوم میں بھی ماہر ہونا چاہیئے تاکہ آج کی ترقی یافتہ دنیا میں اسلام کی ترجمانی کا فرض بہتر طور پر ادا کرسکے۔ چونکہ علماء اسلام عصری علوم سے ناآشنا ہیں اس لئے دور جدید میں وہ اسلام کی بہترین ترجمانی کرنے سے معذور ہیں اور اپنے فرض کو صحیح طور پر انجام نہیں دے پارہے ہیں، سوال یہ ہے کہ مسلم یونیورسٹی اور مسلمانوں کے زیر انتظام چلنے والے اسکولوں اور کالجوں نے جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں کتنے اسلام کے ترجمان پیدا کئے؟ جنھوں نے اسلام کی ترجمانی

حق پورے طور پر ادا کیا ہو، عالم دین کو سائنس پڑھنا تو فرض ہے لیکن سائنس پڑھنے
والے مسلمان کو دین کی ابجد سے بھی واقف ہونا کیوں دقیانوسیت ہے؟ ایسی صورت
حال میں پھر دین کی بات اسلام کی سربلندی اور مسلمانوں کی عظمت اور اسلام کی بہتر ترجمانی کی
بات درمیان میں کیوں لائی جاتی ہے؟ جدید تعلیم یافتہ طبقہ ایک بھی مثال پیش کرنے سے
عاجز ہے کہ اس نے کوئی ایسا شخص بھی ملت کو دیا ہو جس نے سائنس کی اعلیٰ تعلیم حاصل
کی ہو اور وہ دین کا بھی بہترین عالم ہو اور اس نے دین کے فروغ کیلئے کوئی قابل ذکر کام
کیا ہو، کیوں کہ اس کا مطمح نظر صرف دنیا ہے دین نہیں، اس کی پوری زندگی لیکچرر، ریڈر اور
پروفیسر کی مثلث تک محدود ہو کر رہ جاتی ہے، ذہن میں یہ کھٹک پیدا ہوتی ہے کہ جدید
تعلیم یافتہ طبقہ جو پابندی رسوم و قیود سے" اپنی پوری زندگی میں آزاد رہتا ہے ان کے
دلوں میں اسلام کو سربلند کرنے، نئے دور کے تقاضوں کے مطابق اسلام کا ترجمان پیدا
کرنے کا یہ جذبہ کیسے پیدا ہوا، ان کے دماغوں میں یہ سودا کیوں سما گیا کہ مسلمان قوم دنیا
کی ترقی یافتہ قوموں کی صف میں اپنی دینی و مذہبی خصوصیات کے ساتھ کھڑی ہو جائے
اسلام کا ترجمان ایک طرف علوم دین میں ماہر کامل ہو تو دوسری طرف سائنس اور عصری علوم
میں بھی اس کا مقام و مرتبہ اتنا بلند ہو جائے کہ وہ دور جدید کے چیلنجوں کا بھرپور مقابلہ کر سکے
اور پوری دنیا میں پرچم اسلام کی سربلندی کا فریضہ نہایت شاندار طریقے سے انجام دے
سکے جبکہ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ بہترین دماغ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں آتے ہیں، دینی
مدارس میں وہی طلبہ آتے ہیں جو معاشی اعتبار سے پسماندہ، ذہنی اعتبار سے کودمغز
اور ناکارہ اور سماج کے نچلے طبقہ سے ہوتے ہیں، پھر ایسے ہی ہ رہ ناقابل توجہ ذلیل و حقیر انسا
کو دو متضاد طرح کے علوم اور زبان کی تعلیم دیکر مقام ثریا پر پہنچانے کا منصوبہ بناتے ہیں اور
اس حیرتناک اور محیر العقول تجربہ کیلئے میدان میں اتر آتے ہیں، یہ بڑی حیرتناک بات ہے
کیا ایسا تو نہیں کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ جو عام طور پر علماء دین اور مشائخ کو حقارت کی

نگاہوں سے دیکھتا ہے وہ دینی مدارس پر شبخون مارنے کی تیاری کر رہا ہے، اور وہ یہ چاہتا ہے کہ مسلمان اس دقیانوسی فرسودہ اور از کار رفتہ تعلیم سے ترک تعلق کر کے تہذیب جدید کی راہوں پر گامزن ہو جائے اور ترقی یافتہ اقوام کے دوش بدوش کھڑا ہو جائے؟ اس کے امتیازات وخصوصیات اور اس کی انفرادیت اپنی موت آپ مرجائے شکل وصورت، وضع قطع، لباس، تہذیب ومعاشرت خیالات وجذبات ہر اعتبار سے اس منزل پر آجائے جہاں کئی کمیونسٹ ممالک پہنچ چکے ہیں! اور یہی جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی ہندوستان میں معراج کمال ہے۔

اس کھٹک کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ آج سے چالیس سال پہلے بھی قوم وملت کا یہ درد ایک بار اس کے سینے میں بڑی شدت سے اٹھا تھا اس نے ہندوستان کے مسلمانوں کو سبق پڑھایا کہ ہندوستان میں دو قومیں ہیں ہندو اور مسلمان دونوں کا یکجا رہ کر اپنی تہذیب وتمدن اور اپنا دین بچانا ناممکن ہے اس لئے مسلمانوں کا ایک علیحدہ ملک ہونا چاہیئے اس کا نام انھوں نے پاکستان رکھا لیکن یہ تحریک اس وقت عوامی تحریک بنی جب مولویوں کا ایک گروہ اپنے گرد اکھٹا کر لیا اور ان کو اسلامی حکومت کا سبز باغ دکھایا، دوسری طرف ہندوؤں اور مسلمانوں میں نفرت وعناد کا وہ زہریلا بیج بویا کہ ہندوستان کی پوری فضا زہر آلود ہو گئی اور ملک کو دو حصوں میں تقسیم ہونا پڑا، پھر اس کے بعد کیا ہوا؟ یہ ساری دنیا جانتی ہے۔ ۸ لاکھ مسلمان ادھر سے ادھر، مارے مارے پھرے لاکھوں مسلمانوں کو بوٹی بوٹی کاٹ کر پھینک دیا گیا، ۳۰ ہزار مسلمان عورتیں اغوا کی گئیں اور دوسروں کے قبضہ میں جا کر عزت وعصمت اور دین وایمان سب لٹانے پر مجبور ہوئیں ہزاروں مسجدوں میں جانور باندھے جانے لگے، مسلمانوں کی اربوں کی جائداد پر حکومت نے قبضہ کر لیا اور آج ستر کروڑ کی آبادی میں مسلمان کی حیثیت یرغمال کی ہو کر رہ گئی یہ سب نتیجہ ہے اس تحریک کا جو جدید تعلیم یافتہ طبقہ نے اسلام کے نام پر چلائی تھی، اور آج تک ہم اس تقسیم کا عذاب بھگت رہے ہیں۔

پاکستان بن جانے کے بعد اسمبلی میں شیخ الاسلام پاکستان مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے اسلامی دستور بنانے پر زور دیا اور کہا کہ حسب اعلان پاکستان میں اسلامی حکومت قائم ہونی چاہئے تو اس وقت کے وزیر خزانہ مسٹر شعیب نے کہا کہ مولانا! آج بھی تو اسلامی حکومت ہے، کیا آپ چاہتے ہیں کہ مسجد کے لوٹے اور کلوخ کے ڈھیلے جب حکومت کریں گے تبھی اسلامی حکومت ہوگی؟ پاکستان کی حمایت میں رعد و برق کی طرح کڑکنے اور گرجنے والے علماء مسجد کے لوٹے اور کلوخ کے ڈھیلے بنا دیئے گئے کیونکہ اب تیر کمان سے نکل چکا تھا، اسی طرح مسٹر جناح پر جب اسلامی دستور بنانے کیلئے زور دیا گیا تو انھوں نے دوٹوک جواب دیا۔

"پاکستان میں آج کے بعد کوئی مسلمان کوئی ہندو، کوئی سکھ کوئی عیسائی نہیں ہوگا، سب پاکستانی ہوں گے اور ایک پاکستانی قوم کی حیثیت سے ملک کی تعمیر میں حصہ لیں گے۔ بہت سے لوگوں کا دعویٰ ہے کہ پاکستان انھوں نے حاصل کیا ہے اس لئے صاف طور پر سن لیں کہ پاکستان تین چیزوں نے بنایا ہے، میں نے میرے سکریٹری نے، اور میرے ٹائپ رائیٹر نے، اس لئے اس کے مستقبل کی بہتری کیلئے میں جو چاہوں گا کروں گا۔"

یہ تھا اس طوفان بدوش تحریک کا انجام جو جدید تعلیم یافتہ طبقہ نے اسلام کی عظمت اور مسلمانوں کی سربلندی کے نام سے ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کی صبح تک پورے جوش و خروش کے ساتھ اسلامی حکومت کا سبز باغ دکھا کر چلائی تھی، تحریک کامیاب ہوگئی، پاکستان بن گیا تو اسلام اور مسلمان کا نام لینے والے بے عزتی کیساتھ اسٹیج سے اُتار دیئے گئے، یہ صرف اسلئے کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ پاکستان بنا کر صرف اپنا مستقبل محفوظ کرنا چاہتا تھا اور وہ محفوظ ہوگیا، نہ اسلام کی عظمت ان کے پیش نظر تھی اور نہ مسلمانوں کی سربلندی، اس تلخ تجربے کی بنا پر میں یہ سوچنے پر مجبور ہوں کہ کیا وہی تاریخ پھر دہرائی جارہی ہے؟۔

آج "مرکز فروغ سائنس" نے بھی وہی طریقہ اختیار کیا ہے جو آج سے چالیس سال

(باقی برص ۴۲)

ہندوستان کی عربی شاعری میں عجمیت

.... پر ایک نظر ....

مولانا عبدالجبار متوی

عرصہ ہوا جناب ڈاکٹر حامد علی صاحب لکچرار عربی ڈپارٹمنٹ مسلم یونیورسٹی کا ایک مضمون "ہندوستان کی عربی شاعری میں عجمیت" کے عنوان سے معارف اعظم گڑھ میں شائع ہوا تھا جس میں فاضل موصوف نے ہندوستان کی عربی شاعری میں دو قسم کی خامیوں کا ذکر کیا ہے، ایک یہ کہ ان کی شاعری فارسی محاورات سے متأثر ہے دوسرے ان کے کلام میں کچھ عربی قواعد کی غلطیاں ہیں "

پہلی قسم کی خامی پر مدیر معارف جناب مولانا شاہ معین الدین احمد صاحب نے اپنے ادارتی نوٹ میں مختصر الفاظ میں نہایت جامع تبصرہ کر دیا تھا جس کے بعد ضرورت نہیں ہے کہ مضمون کے اس پہلو پر کوئی بحث کی جائے۔

البتہ دوسری قسم کی خامی یعنی عربی قواعد کی غلطیوں اور عربی کلمات و محاورات کے بے موقع استعمال پر مدیر محترم نے تعرض نہیں کیا، اس سے انکار نہیں کہ اس قسم کی خامیاں بعض ہندوستانی شعراء کے کلام میں ہیں لیکن ڈاکٹر صاحب ان کے کلام پر اس پہلو سے بحث میں عربی قواعد کی ایسی خلاف ورزیاں بھی بیان کر گئے ہیں جن کی کتب لغت و نحو سے تائید نہیں ہوتی، اور چند خالص عربی محاورات کو جنھیں عرب شعراء نے اپنے اشعار میں استعمال کیا ہے یا عربی لغت میں مذکور ہیں فارسی محاورات میں داخل کر دیا ہے جسے یقیناً مبنی برانصاف

نہیں کہا جا سکتا، اس مختصر مقالہ میں ڈاکٹر صاحب موصوف کی انھیں فروگذاشتوں پر تبصرہ مقصود ہے۔

(۱) یدعوا الیہا یا مد ظل محمد ⁂ وعداہ تعدام مثل ظل محمل (امیرخسرو)

ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں اس شعر میں امیر خسرو نے اگرچہ ذومعنی لفظ محمد کا استعمال کرکے فن بدیع کی صنعت دکھائی ہے مگر "مد ظل محمد" فارسی محاورہ ہے، عربی میں سایہ کی درازی کے لئے اظل بمعنی صار ذا ظل رائج ہے، فارسی دانوں نے ہی مد الظل، مد ظلکم، دام الظل، دام ظلکم، دامت اظلالکم وغیرہ کو عربی مرکبات بنا کر استعمال کیا ہے

اس بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ الظل کے ساتھ مد یا دام کا استعمال فارسی محاورہ ہے یا خانہ ساز عربی ہے، شعر میں مد ظل محمد کے بجائے اگر اظل محمد ہوتا تو عربی محاورہ کے مطابق ہوتا، حالانکہ یہ دونوں محاورے قرآن کریم میں موجود ہیں، ایک آیت میں "کیف مد الظل"[1] اور دوسری میں ظل ممدود[2] ہے، تیسری میں اکلہا دائم وظلہا[3]۔ یہ سب مثالیں ان کے عربی ہونی کی شاہد ہیں،

(۲) حتی علا فوق السماء سریرہ ⁂ رؤسہم غابت بہ تحت الثری

ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں "پہلے مصرع میں فارسی خیال ہے دوسرے میں رؤس کیساتھ غابت کا استعمال عربی لغت کے مطابق نہیں ہے" مگر عرب شعراء بھی جب اپنے ممدوح کی رفعت شان اور ان کے رتبہ ومقام کی برتری بیان کرتے ہیں، تو آسمان سے کم کی بات نہیں کرتے، اور ممدوح کو اور اس سے نسبت رکھنے والی چیزوں کو سماء، بدر، نجوم، کواکب اور ثریا یا اس سے اوپر تک پہنچا دیتے ہیں، مثال کے طور پر چند اشعار عرب شعراء کے ملاحظہ ہوں۔

لنا جبل یحتلہ من نجیرہ ⁂ منیف یرد الطرف وھو کلیل

---

[1] سورہ فرقان۔ [2] سورہ واقعہ، [3] سورہ رعد۔

رسا اصله تحت الثرىٰ وسما به الى النجم فرع لاينال طويل

(سموٴل بن عادیا)

ہمارے قبضہ میں ایسا اونچا قلعہ ہے کہ آنکھیں اس کے دیکھنے سے پتھرا جاتی ہیں اس پر رسائی اس کی ہوگی جو ہمارے زیر پناہ ہو، قلعہ کی بنیاد تحت الثریٰ میں راسخ ہے اور اس کی چوٹی ثریا تک پہنچنے کی وجہ سے دسترس سے باہر ہے

(۲) وما سلمت فوقك للثريا ولا سلمت فوقك للسماء (متنبی)

(اے ممدوح) تیری بلندی نہ میں ثریا کیلئے مانتا ہوں نہ آسمان کیلئے۔

فبايما قدم سعيت الى العلىٰ ادم الهلال لاخمصيك حذاء (〃)

کیسا تیرا قدم تھا کہ اتنے اونچے رتبے پر پہنچ گیا، تیرے پاؤں کیلئے چاند کے چمڑے کا جوتا ہونا چاہئے۔

(۳) وقد كان يدنى مجلسى فى سمائه: احادث فيها بدرها والكواكبا (〃)

(ممدوح) کی مجلس آسمان تھی، مجھے اس میں قریب جگہ دیتے تھے میں اس آسمان کے چاند تاروں سے بات کرتا تھا۔

یہ فیصلہ بھی کہ رؤس کے ساتھ غابت کا استعمال عربی لغت کے مطابق نہیں ہے صحیح نہیں ہے، اقرب الموارد میں ہے غابت الشمس وغیرها من النجوم غیابا و غیلوبة غربت واستترت عن العین، وغیبوبة الشئ فی الشئ غیابة وغیابا بطن فیه واستتر۔ اگر بالفرض اس نے غابت الرؤس کا استعمال عربی لغت کے مطابق ثابت نہ بھی ہو تب بھی ڈاکٹر صاحب کا یہ ارشاد کہ عربی ایسے موقع پر باب مفاعلت واری یواری موارا ة کا استعمال کیا جاتا ہے، قطعاً عربی لغت ومحاورہ کے مطابق نہیں ہے، کیونکہ غابت لازم ہے جس کا ترجمہ "غائب ہوگئے" ہوگا، اور کیا گیا بھی ہے، اور واری یواری موارا ة باب مفاعلت سے عربی لغت میں متعدی مستعمل ہے جیسا کہ

قرآن کریم میں ہے اعجزت ان اکون مثل ھذا الغراب فاداری سوءۃ اخی — ماؤری عنھما۔ کسی فعل کا مجہول ہونا اسکے متعدی ہونے کی دلیل ہے، لہٰذا اگر اس موقع پر غابت کے بجائے وارث باب مفاعلت سے استعمال کیا جائے تو اس کا ترجمہ "غائب کردیا یا چھپا دیا" ہوگا جو اس موقع پر یقیناً صحیح نہیں ہے، صحیح محاورہ توارث باب تفاعل سے ہے جو لازم ہے اور اس باب سے قرآن کریم میں بھی لازم آیا ہے، یتوارى من القوم من سوء ما بشر به۔ حتی توارت بالحجاب۔ ان شواہد کے بعد غالباً ڈاکٹر صاحب کو اپنی تحقیق انیق پر اصرار نہ ہوگا کہ واری یواری مفاعلت کا لازم استعمال ہوتا ہے۔؟

(۳) ثم اغتنم فرصۃ من قبل ان ضعفت ٭ قواك من سطوۃ الامراض والعلل

ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں "من قبل ان ضعفت" میں ان مصدریہ کے بعد فعل مضارع کی جگہ فعل ماضی لایا گیا ہے جو عربی قواعد کی صریح خلاف ورزی ہے مگر اس کی کوئی سند انھوں نے نہیں پیش کی ہے کہ ان مصدریہ کے بعد فعل ماضی لانا عربی قواعد کے خلاف ہے، عربی قواعد کی مشہور اور مسلم کتاب کافیہ ہے۔ اس میں حروف مصدریہ تین بتائے گئے ہیں ما۔ ان۔ ان۔ ان میں سے کسی کی مثال خود متن کافیہ میں نہیں ہے البتہ شارح کافیہ ملا جامی نے اس کی مثالیں دی ہیں ان کی مثال نحو قولك اعجبني ان خرجت ای خروجك

مولانا عبدالحق خیرآبادی شرح کافیہ مسمیٰ بہ تسہیل الکافیہ میں فرماتے ہیں و ثانیها ان المصدریۃ نحو اعجبني ان ضربت زیداً ای ضربك زیداً۔ اسی طرح عربیت کے امام علامہ زمخشری ان مصدریہ کی نسبت اپنی کتاب مفصل میں "من اصناف حروف الاستقبال" کے تحت لکھتے ہیں وان تدخل علی المضارع والماضی فیکونا معہ فی تاویل المصدر وا ذا دخل علی المضارع لو یکن امہا

مستقبلاً۔ اور "من اصناف الحروف الحرفان المصدريان" کے تحت فرماتے ہیں
نقول بلغني ان جاء عمرو واريد ان تفعل وانه اهل ان يفعل اى اهل
الفعل - وقال الله تعالى فما كان جواب قومه الا ان قالوا،۔ اس سے ثابت
ہوتا ہے کہ ان مصدریہ کے بعد ماضی اور مضارع دونوں آتا ہے، عربی زبان کی مشہور و مستند
اور مبسوط لغت لسان العرب میں بھی اس کی تشریح ہے کہ ان مصدریہ کے بعد فعل
مضارع اور فعل ماضی دونوں عربی زبان میں مستعمل ہیں۔ وہ لکھتے ہیں: وان قد تكون
مع الفعل المستقبل في معنى مصدري فتنصبه تقول اريد ان تقوم والمعنى
اريد قيامك فان دخل على فعل ماض كانت معه بمعنى مصدر وقد وقع
الا انها لا تعمل تقول اعجبني ان قمت والمعنى اعجبني قيامك الذى
مضى وان قد تكون مخففة من المثقلة فلا تعمل۔

اس سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں: "اور تاویل کی کوئی گنجائش نہیں ہے کیونکہ
یہاں ان نہ مخفف ہو سکتا ہے نہ حرف تفسیر البتہ ان زائدہ قرار دیا جا سکتا ہے، اہل عرب
نے حروف زوائد میں ان کو بھی بتایا ہے"

بیشک اہل عرب نے حروف زوائد میں ان کو بھی بتایا ہے مگر علمائے عربیت نے
ان مقامات کو بھی بتایا ہے جہاں پر اَن زائدہ آتا ہے جس طرح انھوں نے ان مصدریہ
مخففہ اور ان حروف تفسیر کے مقامات کی نشاندہی بوضاحت کی ہے، چنانچہ ڈاکٹر صاحب
نے علمائے عربیت کے بیان کردہ قواعد کی روشنی میں فرمایا ہے کہ یہاں ان نہ مخفف ہو سکتا
ہے اور نہ حروف تفسیر، لہٰذا اس کو ان زائدہ قرار دینے کیلئے بھی ان قواعد کی طرف رجوع
کرنا ضروری ہوگا اور معلوم کرنا ہوگا کہ یہ مقام بھی ان مقامات میں سے ہے جہاں اہل عرب
نے اَن کو زائدہ قرار دیا ہے، ان مقامات کو معلوم کرنے کیلئے اقرب الموارد کی عبارت نقل
کرتا ہوں۔

الوجه الرابع ان تکون زائدة للتوکید وذلك بعد لما التوقيتية وهو الاکثر نحو ولما ان جاءت رسلنا لوطا سيئ بهم. وبين لو وفعل القسم مذکورا کقوله۔

فاقسم ان لو التقينا وانتم لكان لكم يوم من الشر مظلم

او متروکا کقوله :۔ اما والله ان لو کنت حيا ۔ وبين الكاف ومخفوضها کقوله کان ظبية تعطو الی وارق السلم وهو نادر وبعد اذا کقوله: فامهله حتی اذا کانه ۔

جب عربی قواعد کی رو سے اَنْ زائدہ ہونے کی یہی پانچ صورتیں ہیں اور شعر مذکور میں اَنْ نہ لما کے بعد واقع ہوا ہے نہ قسم اور لو کے درمیان، نہ کاف اور اس کے مجرور کے درمیان، نہ اذا کے بعد تو اس کو اَنْ زائدہ کیسے قرار دیا جاسکتا ہے، نیز اگر اَنْ کو یہاں زائدہ قرار دیا جائے تو قبل مضاف اور مضاف الیہ ضعفت فعل ماضی ہوگا، اور کوئی بھی فعل فعل ہوتے ہوئے مضاف الیہ نہیں ہوسکتا ہے کیونکہ اضافت اسم کے خواص سے ہے، ہاں فعل جب کسی حرف مصدری کے ذریعہ خواہ لفظاً ہو یا تقدیراً بتاویل مصدر اسم قرار دیا جائے گا تو مضاف الیہ واقع ہوگا۔

کلام عرب میں جس جگہ کوئی فعل مضارع واقع ہوا ہے وہ بتاویل مصدر ہے، چنانچہ ملا جامی فرماتے ہیں۔ المضاف اليه کل اسم حقيقة او حکما ليشمل الجمل التی يضاف اليها نحو يوم ينفع الصادقين صدقهم فانها فی حکم المصادر یعنی مضاف الیہ اسم ہی ہوگا خواہ حقیقت میں اسم ہو یا اسم کے حکم میں ہو، اس تعمیم سے وہ جملے بھی اسم قرار دیئے جائیں گے جو مضاف الیہ واقع ہوتے ہیں جیسے يوم ينفع الصادقين صدقهم اسلئے کہ اس طرح کے جملے مصدر کے حکم میں ہیں پس اگر ان ضعفت میں اَنْ کو مصدریہ قرار دیا جائے اور اَنْ ضعفت بتاویل مصدر ہو کر مضاف الیہ

ہو جائے تو قواعد عربی کی خلاف ورزی لازم نہیں آتی۔ اور اگر اَنْ کو زائدہ قرار دیا جائے جو ڈاکٹر صاحب کی تجویز ہے ضعفت فعل ماضی کو مضاف الیہ بنانا پڑے گا جو عربی قواعد کی مذکورہ بالا تصریحات کے بالکل خلاف ہے۔ یا کہئے کہ اَنْ موجودہ زائد ہے اور ضعفت ان مقدرہ سے بتاویل مصدر ہو کر مضاف الیہ قرار دیا جائیگا مگر یہ کلام کی کتنی بھونڈی توجیہ ہوگی۔

لا تغتر بزمان کان شیمته ان عزعزا بعز منه منتقل

اس شعر پر بحیثیت عربی یہ اعتراض ہے کہ دوسرے مصرعہ میں جن الفاظ و تراکیب سے مفہوم ادا کیا گیا ہے وہ محاورۂ عرب کے خلاف ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے خاص ذوق عربیت کی بنا پر مصرعہ ثانیہ کے الفاظ و تراکیب کو محاورۂ عرب کے خلاف قرار دیا ہے کاش وہ الفاظ و تراکیب پر تفصیلی بحث کر کے ان کا محاورۂ عرب کے خلاف ہونا بیان کرتے تو دوسروں کو بھی اس کو سمجھنے اور اس میں غور و فکر کی گنجائش نکلتی۔ اگر ڈاکٹر صاحب کی یہ مراد ہے کہ یہاں بھی اَنْ مصدریہ کے بعد فعل مضارع کی جگہ فعل ماضی لایا گیا ہے تو اس پر بحث گذر چکی ہے کہ اَنْ مصدریہ کے بعد فعل ماضی لانا عربی قواعد کے خلاف نہیں ہے

له المکارم ابهی من نجوم دجی ÷ له العز انهوا مضی من قنا البطل

اس شعر کی عربیت پر کلام کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں: "عربی میں رمح اور قناۃ کی صفت ذبول ہے اور ذابلہ کی جمع ذوابل۔ رماح (تیروں) کیلئے صفت غالبہ کی طرح مستعمل ہے اس لئے قنا کی اضافت بطل کی طرف عربی زبان کے خلاف ہے غالبًا بطل کا استعمال ضرورت قافیہ کے تحت کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب تو دعویٰ یہ کرتے ہیں کہ قنا کی اضافت بطل کی طرف عربی زبان کے خلاف ہے اور اس کی دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ عربی میں رمح اور قناۃ کی صفت ذبول آتی ہے ایسی بے ربط بات ڈاکٹر صاحب جیسے فاضل سے مستبعد معلوم ہوتی ہے وہ خود ہی غور فرمائیں

کہ اگر ذبول عربی میں رمح و قناۃ کی صفت آئی ہے تو یہ عربی زبان میں اضافت قنا الی الابطال کے ممنوع ہونے کی دلیل کیسے ہوگی۔

کسی مدعا کے اثبات کیلئے ضروری ہے کہ دلیل مدعا کی مثبت ہو، یہاں مدعا میں اضافت قنا الی ابطال کا مسئلہ ہے، اور دلیل میں صفت رمح و قنا کا اثبات ہے مضمون کے لحاظ سے بہادر کا نیزہ کہنے میں کوئی خرابی معلوم نہیں ہوتی۔ بلکہ مضاف اور مضاف الیہ میں غایت مناسبت ہے، جیسا کہ مصنف کا قلم کہتے ہیں ہے

لولا سہول جمالکو فی ذاتی ماکنت ارضیٰ ساعۃ بحیاتی

ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں "عربی میں "جمال" اور "ذات" کا استعمال ایک ساتھ نہیں ہوتا" یہ کلام محتاج تشریح ہے اگر اس سے مراد یہ ہے کہ عربی میں ذات کا جمال نہیں بولا جاتا تو شاعر نے ذات کا جمال نہیں کہا ہے بلکہ شعر میں جمال کی اضافت ضمیر مخاطب "کم" کی طرف ہے ذات اس کا ظرف اور مظہر و مرکز ہے، پھر فرماتے ہیں نیز ذات کے ساتھ جمال کا استعمال بمعنی خوبصورتی درست نہیں، عربی میں ایسے موقع پر "حسن" استعمال ہوتا ہے، مگر انھوں نے اس کی کوئی مثال نہیں پیش کی تاہم اس سے اتنا معلوم ہوگیا کہ ان کے نزدیک اگر شعر میں "جمالکم" کے بجائے "حسنکم" لایا گیا ہوتا تو عربی محاورہ کے مطابق ہوتا جمال کا استعمال جن مختلف قسم کی خوبصورتیوں پر عربی میں ہوا ہے اس کی مثالیں پیش کی جاتی ہیں (۱) شکل و صورت کی خوبصورتی کے لئے، حدیث شریف میں ہے تنکح المرأۃ لمالها وجمالها۔ عورت سے شادی اس کی مالداری کی وجہ سے کی جاتی ہے اور اس کی خوبصورتی کی وجہ سے۔

(۲) لباس و ہیئت کی خوبصورتی (۳) خاندانی شرافت (۴) اخلاق و کردار کی عمدگی، عمرو بن معدی کرب کا شعر ہے۔ سہ

لیس الجمال بمیزر فاعلموا ان ردیت بردا

ان الجمال معادن ومناقب اورثن مجداً

لباس کی خوبصورتی جمال نہیں ہے، گرچہ کتنا ہی عمدہ لباس زیب تن کرلو، یہ بات خوب سمجھ لو تمہارا خاندان خوب اچھا ہو اور تمہارے اندر شریفانہ اخلاق ہوں تو البتہ یہ جمال ہے

(۵) صبر کی خوبصورتی۔ فصبر جمیل" پس مجھے صبر کرنا ہے عمدہ قسم کا۔

(۶) معشوق کی وعدہ خلافی کی خوشنمائی۔ متنبی کہتا ہے ؎

تفرد فی الاحکام فی اھلہ الھویٰ فانت جمیل الخلف مستحسن الکذب

یعنی عشق کا حکم عاشقوں پر دنیا سے نرالا ہے، اسی وجہ سے عاشق کو تمہاری وعدہ خلافی اچھی لگتی ہے اور جھوٹ اچھا معلوم ہوتا ہے

(۷) دولت کی شان وشوکت، قرآن کریم میں مویشیوں کے منافع بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ولکم فیھا جمال حین تریحون وحین تسرحون۔ یعنی مویشیوں کو جب شام کو چرا کر واپس لاتے ہو اور جب چرانے لے جاتے ہو تو تمہاری دولت مندی کی شان و شوکت نمایاں ہوتی ہے۔

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں عربی لغت میں لفظ "ذات" کے معنی "والی" اور "صاحبہ" کے ہیں جیسا کہ قرآن میں ذات الجنب اور ذات الشمال مذکور ہے بیشک ذات الشمال کا استعمال قرآن مجید میں ہے مگر ذات الجنب باوجود تلاش کے مجھے قرآن مجید میں نہ ملا، رہا یہ مسئلہ کہ لفظ ذات بمعنی حقیقت فارسی ہے جیسا کہ ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے یہ حقیقت کے خلاف ہے عربی لغت کی کتابوں میں ذات کے معنی حقیقت بھی بیان کئے گئے ہیں، "لسان العرب" میں ہے۔

وقال ابو اسحاق، معنی ذات بینکم حقیقۃ وصلکم ...... قال ابن الانباری فی قولہ عزوجل انہ علیم بذات الصدور۔ معناہ بحقیقۃ القلوب من المضمرات "قاموس" میں ہے: ذومعناہ صاحب صیغت لیتوصل بھا الی الوصف

بالاجناس ج ذوون ، وهی ذات وهما ذاتان ـ ج ذوات وذات بينكو حقيقة وصلكوا وذات البين الحال التی بها يجتمع المسلمون۔

السراج المنیر میں جو اقرب الموارد کے آخذ میں سے ہے، تصریح ہے کہ وقد يجعل اسما مستقلا فيعبر بها عن الاجسام فيقال ذات الشئ بمعنی حقيقته وماهيته ، پھر اس قول کی پرزور تردید کی ہے کہ ذات بمعنی حقیقت عرب کے کلام قدیم میں استعمال نہیں ہوا ہے اور دلائل کے ساتھ صحیح قول پیش کرنے کے بعد لکھا ہے واذا نقل هذا فالكلمة عربية ولا التفات الی من انكر كونها من العربية فانها فی القرآن وهو افصح كلام العرب یعنی منقولہ دلائل سے ثابت ہو گیا کہ ذات بمعنی حقیقت عربی کلمہ ہے اور جو اس کے عربی ہونے کا انکار کرے اس کی بات قابل التفات نہیں ہے کیونکہ اس معنی میں قرآن کریم میں آیا ہے اور قرآن عرب کا سب سے فصیح کلام ہے۔

ندالك اكثر لا ينتهی ابدا ..... لكن ادناه اندی من ندی السيل

ڈاکٹر صاحب کی نگاہ میں اس شعر میں لفظی اور معنوی دونوں قسم کی خامی ہے لفظی یہ ہے کہ اس میں "ندی السیل" استعمال کیا گیا ہے، جو عرب کا محاورہ نہیں ہے اور معنوی خامی یہ ہے کہ اس مضمون میں کوئی بلند پردازی نہیں ہے

لفظی خامی کی نسبت عرض ہے کہ متنبی عربی شاعر ہے اور محاورات عرب پر اسکی وسعت نظر کی وجہ سے اسکے دیوان کو علمائے ہند نے مدارس عربیہ کے نصاب میں داخل کیا اور فن عربیت میں اس دیوان کو خاص اہمیت و مقبولیت حاصل ہوئی حتی کہ کم و بیش اس کی چالیس شرحیں لکھی گئیں، اسی عرب شاعر کا یہ شعر ہے، مساور بن محمد رومی کی مدح میں کہتا ہے

نفدِ يلك من سيل اذا سئل الندى ..... هول اذا اختلطا دم ومسيح

تم پر ہماری جانیں قربان یعنی تو وہ ہے کہ جب اس سے بخشش طلب کی جائے تو سیلاب

ثابت ہوتا ہے، یعنی اس کی بخشش سیلاب کی طرح ہوتی ہے، اور میدان جنگ میں جب خون و پسینہ ایک کیا جاتا ہے تو دشمنوں کیلئے ہول و دہشت ہے کیا اس مثال کے بعد بھی یہ کہنا صحیح ہوگا کہ "ندی السیل" عربی کے خلاف ہے، مدیر محترم نے سچ فرمایا کہ "انھوں نے ان کے کلام میں جس قسم کی خامیاں دکھائی ہیں ان سے عرب شعراء کلام بھی خالی نہیں ہے۔

اب معنوی خامی کا جائزہ لیجئے سیل کا مفہوم عربی زبان میں وہی ہے جس کو اردو میں سیلاب سے تعبیر کرتے ہیں، یعنی بارش کا رواں پانی بہت زیادہ مقدار میں اکٹھا ہو کر بہتا ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دریا سیلاب کے زمانے میں اپنے محدود دائرہ سے نکل کر دور دور تک پھیل جاتا ہے، عرب ممالک میں یہ سیلاب زمین کی کاشت اور اس کی پیداوار کی فراوانی کا واحد ذریعہ تھا، چنانچہ اسلام سے پہلے دریائے نیل کی طغیانی کیلئے مصر کی کوئی حسین و جمیل لڑکی آراستہ و پیراستہ کر کے بھینٹ چڑھائی جاتی تھی، کیونکہ مصر کی خوشحالی اور اقتصادی فلاح دریائے نیل کی طغیانی پر موقوف تھی، اور یہ حقیقت ہے کہ دریا کے پانی سے مخلوق فائدہ اٹھاتی ہے، مگر اس سے فائدہ اٹھانے کیلئے دور افتادہ وہاں حاضر ہوگا، جانوروں کو لائے گا، اگر کھیت کی سینچائی کرنی ہے تو بہزار کلفت کھیت تک پانی پہنچانا پڑے گا، دریا کی سخاوت کا تصور یہ ہے کہ حاجتمند اس کے دروازہ پر جائیگا، تب تو اس سے مستفید ہوگا، بخلاف سیلاب کے کہ اس میں پانی کی فراوانی کے علاوہ اس کی افادیت و سخاوت کا یہ تصور ہے کہ وہ اپنی بخشش ضرورت مندوں کے دروازوں پر خود لے جاتا ہے اور ان کے جانور، کھیت اور خود ان کو سیراب کرتا ہے، اور اس راہ میں ان کو خود کوئی کوشش نہیں کرنا پڑتی، سیلاب کے اسی قسم کی فیض رسانی اور سخاوت کی وجہ سے شعراء عرب اپنے ممدوحین کی سخاوت کو سیلاب سے تشبیہ دیتے ہیں، کہ ممدوح کی بخشش ان کے

گھروں تک خود پہنچ جاتی ہے لوگوں کو اسکے دروازہ پر حاضر ہونے کی ضرورت نہیں پڑتی، کیا اس انداز فکر سے "اندی من ندی السیل" میں مضمون کی بلند پروازی نہیں ہے۔

فلو یبق خلق لو یردن فناءہ   وھن لہ شرب ورود المشارب

یعنی ممدوح کی بخشش لوگوں کے دروازوں پر خود اس طرح پہنچ جاتی ہے جیسے لوگ پانی کے گھاٹ پر پہنچتے ہیں، حالانکہ بخشش بمنزلہ گھاٹ کے ہے، لہذا پیاسوں کو گھاٹ پر جانا چاہیئے، یہاں خود گھاٹ پیاسوں کے پاس آرہا ہے۔

لھا عارض تبریقہ غیر عارض   اسیل صیقل حسنہ کالسجنجل۔

اس شعر کا بے تکلف ترجمہ یہ ہے کہ محبوبہ کے رخسار کی چمک عارضی نہیں ہے، وہ چکنا چمکدار ہے۔ اس کی چمک دمک آئینہ کی چمک کی طرح ہے"

اس ترجمہ کی رُو سے شعر کی ترکیب یہ ہے کہ شعر میں محبوبہ کے عارض کی چار نحوی صفات لائی گئی ہیں (۱) تبریقہ غیر عارض (۲) اسیل (۳) صیقل (۴) حسنہ کالسجنجل شعر میں عارض کی دو صفت مفرد ہیں اور دو صفت جملہ ہیں، جملہ سے بھی نکرہ کی صفت نحوی قاعدہ سے درست ہے جبکہ جملہ میں کوئی ضمیر ہو جو موصوف کی طرف لوٹے اور شعر کے اندر دونوں جملوں میں یہ شرط موجود ہے، لہذا شعر میں عارض موصوف کی جو مسلسل چار صفتیں لائی گئی ہیں، عربی قاعدہ سے اس میں کوئی خامی نہیں ہے اور جو خامی ڈاکٹر صاحب نے شعر کی ترکیب میں بتائی ہے غلط فکر کی پیداوار ہے اگر خامی ہے تو ان کی فکر میں نہ کہ شعر میں۔

ڈاکٹر صاحب نے ان الفاظ میں اس شعر پر کلام کیا ہے۔

" اس شعر کا پہلا مصرعہ محتاج تشریح ہے، نیز عارض کی صفت مصرعہ دوم میں واقع ہے اس لئے صفت موصوف کے درمیان فاصلہ ہو جانے کے باعث تعقید لفظی کا عیب پیدا ہو گیا ہے صیقل کا فاعل حسنہ ہے اور اس ترکیب کے ماتحت یہ معنی ہو گئے کہ محبوبہ کے

رخسار کی خوبصورتی آئینہ کی طرح پالش کی ہوئی ہے۔

دیکھئے ڈاکٹر صاحب نے عارض کی صفت اول کو مہمل قرار دیا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ مصرعہ دوم میں اسیل اور عارض کے درمیان فاصلہ کا عیب شعر میں پیدا ہوا، اگر تر کیبہ میں عارض کو صفت اول قرار دیتے تو فاصلہ کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا، اسی طرح انھوں نے حسنہ کو صیقل کا فاعل ٹھہرایا، اسی ترکیب کے باعث شعر کے قابل اعتراض معنی پیدا ہوئے جو ڈاکٹر صاحب نے لکھا اگر حسنہ کو مبتدا اور کالسجنجل کو خبر قرار دیا جائے تو اس صحیح ترکیب سے شعر کا عیب بھی ختم ہو جائیگا۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ شعر کا سارا عیب ڈاکٹر صاحب نے اپنی ترکیب سازی سے پیدا کر دیا ورنہ صحیح ترکیب کے ماتحت جو اوپر لکھی گئی ہے شعر میں کوئی عیب ہی نہیں ہے

هناك رسول الله ينجو لربه　　　شفيعاً وفتاحاً لباب المواهب

یہ شعر شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا ہے، ڈاکٹر صاحب کا یہ ارشاد ہے کہ مصرعہ اول میں ینجو کا صلہ لغت عرب کے خلاف ہے، بالکل صحیح ہے، مگر شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے کلام کو صحیح بنانے کی جو توجیہ ڈاکٹر صاحب نے کی ہے کہ اصل کلام "یدعو لربہ" تھا مگر تصحیف کی وجہ سے اس کی جگہ "ینجو لربہ" تحریر ہو گیا، ہرگز صحیح نہیں ہے، ڈاکٹر صاحب نے دیکھا کہ ینجو کا صلہ عربی زبان میں نہیں اور یدعو کا صلہ لام آتا ہے اسلئے ینجو کی جگہ یدعو کر دیا جائے تو کلام صحیح ہو جائیگا، حالانکہ عربی زبان میں جب یدعو فعل دعا کرنے کے معنی میں آتا ہے تو جس ذات سے مانگا جائے اور دعا کی جائے گی وہ بے صلہ ہوگا اور جس شخص کیلئے دعا کی جائے گی اس کا صلہ لام آئیگا جیسا کہ "تعالوا ادع لنا ربك" سے ظاہر ہے، لغت عرب کی رو سے ڈاکٹر صاحب کی توجیہ کا یہ مطلب ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب کیلئے کسی تشفیع اور فتاح لابواب المواہب سے دعا کرتے ہیں، نعوذ باللہ من ذلک ایسی توجیہ ایک عالم ربانی کے کلام کی کیسے صحیح ہوگی۔

میرے نزدیک شعر میں کوئی تصحیف نہیں ہے اور شعر کی توجیہ یہ ہو سکتی ہے کہ "ینحو" چونکہ تخشع کے معنی کو متضمن ہے اور تخشع کا صلہ لام آتا ہے۔ اس وجہ سے یہاں لام آیا اس طرح کی توجیہ شراح کرتے رہتے ہیں۔

عندی علوم لا یکاد یحیطہا سماء فکلا بر و بحر و ساحل

یہ شعر بھی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ہے اس پر یہ اعتراض ہے کہ یحیط کے بعد "ب" نہ لانا محاورۂ عرب کے خلاف ہے، ڈاکٹر صاحب کا یہ ارشاد بالکل بجا ہے مگر متقدمین شعراء کے کلام میں بھی صلہ کی اسی طرح فروگذاشت ہوئی ہے، مگر ان کے شراح نے یہ نہیں فرمایا کہ شاعر نے عرب کے محاورہ کی خلاف ورزی کی ہے بلکہ یہ توجیہ کی ہے کہ منصوب بنزع الخافض ہے یعنی یہاں پر حرف جر تھا مگر ہٹا دیا گیا، اس لئے اسم کو منصوب رکھا گیا، اس توجیہ کے مطابق یحیطہا اصل میں یحیط بہا تھا مگر "ب" کو دور کر دینے کی وجہ سے یحیط کے بعد ہا منصوب ہو گیا۔

مروان بن الحکم کے عہد کا ایک شاعر ہے جسکو حبیب بن اوس طائی نے باب الحماسہ میں درج کیا ہے ؎

وسائلۃ بالغیب عنی وسائل ویسئل الصعلوک این مذاہب

کتنی عورتیں اور کتنے مرد مجھکو پس پشت پوچھتے ہیں آخر مجھ محتاج غریب کو کون پوچھتا ہے کہ اس کا راستہ کہاں ہے

عربی محاورہ یہ ہے کہ جن کو پوچھا جائیگا اس پر عن کا صلہ ضرور داخل ہوگا جیسا کہ پہلا مصرعہ اور یسئلونک عن الساعۃ میں عن مسئول عنہ پر داخل ہے، اسی قاعدہ سے دوسرے مصرعہ میں من یسئل عن الصعلوک تھا، عن نکال دینے سے الصعلوک منصوب بنزع الخافض ہو گیا۔

جاہلی شاعر عنترہ کے قول ؎ ولقد ابیت علی الطوی واظلہ کی توجیہ کرتے

ہوئے صاحب اقرب الموارد لکھتے ہیں آی اظل علیہ فحذف حرف الجر کما حذف من قولہ لولا الاسی لقضانی ای لقضی علی۔

جب عرب شعراء کے کلام میں اس قسم کی توجیہات کی گئی ہیں تو ہندوستانی شعراء کے کلام کو کیوں اس سے محروم رکھا جائے۔

لاح دار العمل وحال الحول دار کاس الصد ام راس الحول

ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں "دار" اور "کاس" مؤنث سماعی ہیں اس لئے ان فاعلوں کے فعل عربی قواعد کے مطابق لاحت اور دارت ہونا چاہئے"

اس اعتراض کو پڑھ کر اسلئے تعجب ہوا کہ فعل کے مذکر و مؤنث لانے کا قاعدہ نحو میر اور نحو کی ہر چھوٹی بڑی کتاب میں مثال کے ساتھ یہ بتایا گیا ہے کہ جب مونث سماعی مظہر فعل کا فاعل واقع ہو جیسا کہ اس شعر میں ہے تو فعل کو مذکر اور مؤنث لانا دونوں صحیح ہے نحو میر میں ہے۔ بدانکہ چوں فاعل مؤنث حقیقی باشد یا ضمیر مؤنث علامت تانیث در فعل لازم باشد چوں قامت ہند و ہند قامت، و در مظہر مونث غیر حقیقی و در مظہر جمع تکسیر دو وجہ روا باشد چوں طلع الشمس و طلعت الشمس و قال الرجال و قالت الرجال۔" پھر ڈاکٹر صاحب کا یہ فرمانا کہ عربی زبان میں دو ساکن حروف متصل نہیں ہوا کرتے علی الاطلاق صحیح نہیں ہے، کیا وقف کی حالت میں دو حرف ساکن متصل نہیں ہوتے جبکہ کلمہ کے آخری حرف سے پہلے حرف ساکن ہو جیسے غفور، شکور، حلیم، حساب، کتاب یعلمون، کافرون وغیرہ سیکڑوں ایسے کلمات ہیں جن میں وقف کی حالت میں دو حرف ساکن متصل ہوتے ہیں اور تلاوت قرآن کریم کے وقت تمام علماء و قراء اس جرم کا ارتکاب کرتے ہیں، غیر وقف میں بھی یہ بات پائی جاتی ہے جیسے وَلَا الضَّآلِّیْن میں ضاد کے بعد الف اور لام اول دونوں ساکن ہیں اور ایسے بہت سے کلمات قرآن کریم میں موجود ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے یہی اعتراض باقر آغا کے اس شعر پر کیا ہے۔

وسریت نحوی کالنسیم تلطفا فهفهت من طرب افاح ذکاء

کہ ذکا، عربی زبان میں مؤنث ہے اسلئے فاح ذکار کی جگہ فاحت ذکار ہونا چاہئے۔

ما زار طرفی غمض بعد بعدکو وکاخیال سرور دارنی خلدی

ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ دوسرے مصرعہ میں خیال سرور فارسی کا اثر ہے، عربی میں خیال محبوبہ کی اس تصویر کو کہتے ہیں جو خواب میں نظر آئے۔"

ڈاکٹر صاحب کا یہ خیال ہے کہ "خیال" عربی میں محبوبہ کی اس تصویر کو کہتے ہیں جو خواب میں نظر آئے لیکن شیخ احمد تھانیسری کے علاوہ غیر عجمی محقق علماء نے خیال کو اس معنی میں استعمال کیا ہے جس کو ڈاکٹر صاحب فارسی کا اثر کہتے ہیں، علامہ سید محمود آلوسی بغدادی اپنی کتاب تفسیر روح المعانی میں قرآن کریم کے حروف مقطعات پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں: والذی یغلب علی الظن ان تحقیق ذلك علم مستور وسر محجوب عجزت العلماء کما قال ابن عباسؓ ادراکہ وقصرت خیول الخیال عن لحاقه۔

علامہ ابن الہمام خط سترہ کی بحث میں لکھتے ہیں: والسنة اولی بالاتباع مع انه یظهر فی الجملة اذا المقصود جمع الخاطر بربط الخیال به کیلا ینتشر[1]

سترہ کی بحث میں علامہ ابن عابدین شامی ناقلاً عن الحلیة لکھتے ہیں: ویظهر ان الاولی اتخاذها فی هذا الحال وان لم یکره الترك لمقصود اخر وهو کف بصره عما وراءها وجمع خاطره دربط الخیال بها کذا فی رد المحتار[2]۔

لغت کی کتاب سے بھی اس استعمال کی تائید ہوتی ہے

الخیال ما تشبه لك فی الیقظة والحلم من صورة والظن والوهو وشخص الرجل وطیفه وطلعة

---

[1] فتح الملهم ج ۲ ص ۱۰۳ (۲) رد المحتار۔

ان محقق علماء اور کتب لغت کی شہادت کے بعد اس محاورہ کو فارسی کا اثر کہنا صحیح نہیں، آخر میں ایک جاہلی شاعر حارث ابن عباد کا شعر پیش کیا جاتا ہے جس نے لفظ خیال کو اپنے شعر میں استعمال کیا ہے لہ

قربا مربط النعامة منی لقحت حرب وائل عن خیال

کیا اس شعر میں خیال کے وہی معنی مراد ہیں جو ڈاکٹر صاحب نے بیان کئے ہیں!؟ یا وہم و خیال مراد ہے۔

جفتنی ذی بنی فغظت بغیظة فذبت بشجن بین جنبی یشقق

ڈاکٹر صاحب نے اس شعر کا یہ ترجمہ کیا ہے کہ "محبوبہ بدسلوکی کے ساتھ مجھ سے پیش آئی اور مجھے دھکے دیئے پھر سخت غیظ و غضب کا اظہار کیا، بعد ازاں ایسا غم و اندوہ دیکر نکال دیا جو میرے پہلوؤں کے درمیان کسک پیدا کرتا ہے۔ یہ ترجمہ بتاتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب غظت کو واحد مونث غائب کا صیغہ غاظ یغیظ سے قرار دیتے ہیں، حالانکہ فن صرف کا مبتدی بھی جانتا ہے کہ غاظ سے واحد مونث غاظت ہوگا جیسے باع سے باعت، لطف کی بات یہ ہے کہ غظت سے شعر کا وزن بھی درست نہیں ہوتا، شاعر کے نزدیک واحد مونث غائب کا صیغہ نہیں ہے ورنہ وہ غاظت کہتا اور شعر کا وزن بھی درست ہوجاتا

حقیقت یہ ہے کہ شاعر کے نزدیک غظتُ بعثُ کے وزن پر غاظ سے واحد متکلم کا صیغہ ہے، اسی طرح ڈاکٹر صاحب دوسرے مصرعہ میں ذبت کو ذبّ یذبّ سے واحد مونث غائب کا صیغہ سمجھتے ہیں حالانکہ وہ بھی واحد متکلم کا صیغہ ذبتُ ہے ذاب یذوب سے قلتُ کے وزن پر۔

ڈاکٹر صاحب کی تجویز سے شعر لفظاً تو درست ہوجاتا ہے اور اسکے وزن میں انکسار نہیں پیدا ہوتا مگر معناً بالکل بے معنی ہوجاتا ہے، فطری بات ہے کہ جو دھکہ کھاتا

لہ ملاحظہ ہو ربات من اغانی العرب فی قصیدة حارث بن العباد۔

ہے اس کو غم و غصہ ہوتا ہے، چنانچہ شاعر کہتا ہے کہ میرے ساتھ محبوبہ نے ناروا سلوک کیا اور مجھے دھکا دیا تو مجھے غصہ آیا اور گویا غم سے آگ لگ گئی اور میں پگھل گیا اور غم میرے پہلو میں موجزن رہا اس لئے یقیناً شعر میں غظت واحد متکلم کا صیغہ ہے عربی قواعد سے کسی طرح واحد مؤنث غائب کا نہیں ہو سکتا، لیکن غظتُ کا استعمال یہاں پر عربی زبان کے محاورہ کے خلاف معلوم ہوتا ہے کیونکہ غاظ یغیظ دوسرے کو غصہ دلانے کیلئے عربی زبان میں بولا جاتا ہے جیسا کہ قرآن کریم میں ہے" یغیظ بہم الکفار"، خود غصہ ہونے کیلئے اغتاظ باب افتعال سے مستعمل ہے اور تغیظ باب تفعل سے ۔

بقیہ خطبہ استقبالیہ

میں آخر میں دارالعلوم دیوبند کے ادنیٰ خادم کی حیثیت سے پھر مہمانان گرامی قدر کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ واجبات کی ادائیگی میں ہونے والی تقصیرات سے درگذر فرما کر ممنون فرمائیں گے ـــــ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

(حضرت مولانا) مرغوب الرحمٰن (صاحب) مہتمم دارالعلوم دیوبند

بقیہ دینی مدارس میں سائنس کی تعلیم

پہلے اسکے پیشرؤں نے اختیار کیا تھا، اسی ڈھنگ اور اسی لب و لہجہ میں بات کی جارہی ہے بار بار دین کا ذکر خیر ہو رہا ہے اور اسی طرح کا سبز باغ دکھایا جارہا ہے کیا اس کو اپنا مستقبل محفوظ کرنے کی پھر ضرورت پیش آگئی ہے؟ اگر اس تحریک کی تہہ میں یہی حقیقت کارفرما ہے تو ہندوستان کے مسلمانوں کو یہ سوچنا پڑیگا کہ پہلی تحریک سے تو اس نے مسلمانوں کے جان و مال اور عزت و آبرو کا سودا کر کے اپنا مقصد حاصل کیا تھا، اب کی بار اس کا دین و مذہب اور اسکا ایمان داؤ پر لگا رہا ہے اسلئے آنکھیں کھلی رکھنے کی ضرورت ہے کیونکہ نیا جال لایا پرانا شکاری!

لے مضمون طبع ہونے کے بعد سمجھ میں آیا کہ اگر غظتُ کو فعل ماضی مجہول کا صیغہ قرار دیا جائے تو یہ اعتراض وارد ہی نہیں ہوتا، اور یہی صحیح ہے کیونکہ اس صیغہ کی صورت معروف و مجہول یکساں ہے۔

عبادت! سیاست! یا شرارت

مولانا حافظ محمد اقبال رنگونی (مانچسٹر)

بلد اللہ الحرام مکۃ المکرمہ میں گذشتہ دنوں ایرانی عازمین حج کی طرف سے کئے گئے پرشور سیاسی مظاہرے، نعرے بازی اور اسکے بعد یکایک حجاج کرام پر قاتلانہ حملہ نے دنیا بھر کے مسلمانوں کے دل و دماغ کو سخت ٹھیس پہنچائی ہے، اور ہر سچا مسلمان ایرانیوں کی اس شرمناک حرکت کی شدید مذمت کر رہا ہے۔

حج بیت اللہ ایک اہم فریضہ اور عبادت ہے اور اس متبرک اور اہم فریضہ کی ادائیگی کے لئے لاکھوں مسلمان وہاں پہونچتے اور نہایت سکون و اطمینان کے ساتھ یہ اہم فریضہ سرانجام دیتے ہیں، مگر پچھلے چند سالوں سے (جب سے خمینی برسر اقتدار آئے ہیں) ایرانیوں نے اس اہم عبادت کے نام پر جو سیاست (بلکہ شرارت) برپا کر رکھی ہے وہ افسوسناک ہونے کے ساتھ شرمناک بھی ہے گذشتہ دو سال سے تو ان لوگوں نے شرارت کی انتہا ہی کردی ہے اور اس سال تو بہت سے حجاج کرام نہ صرف ان کی شرارت کا نشانہ بنے بلکہ جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔ !

مکۃ المکرمہ میں ہونے والے حادثۂ فاجعہ کی تفصیلات اخبارات میں پڑھ چکے ہونگے جس سے آپ نے بھی یہ اندازہ لگالیا ہوگا کہ شرارت کس نے کی؟ سعودی حکومت اور ایرانی حکومت نے ٹی، وی کے ذریعہ اس کی تفصیلات فراہم کیں ہیں، ایرانی ٹی وی نے اپنے ملک میں جو فلم دکھائی ہے اس میں بھی اس امر کا اقرار موجود ہے کہ ایرانیوں نے مکۃ المکرمہ کی گلی کوچوں میں خمینی کی تصویریں (بلکہ لبیک یا خمینی کی گھڑیاں

پہن کر، نعرے بازی شروع کی اور جب جمعہ ۳۱ر جولائی کی شام حاجی صاحبان نماز کے بعد اپنے اپنے مستقر کی طرف جا رہے تھے تو ان کا راستہ روک لیا گیا جس پر حاجی صاحبان نے انھیں سمجھایا کہ ان کا راستہ چھوڑ دیا جائے مگر اس کا کوئی اثر نہ ہوا، اسکے ساتھ ہی چھریوں لاٹھیوں، ڈنڈوں سے حملہ کرتے ہوئے وہاں پر موجود موٹر سائیکلوں اور گاڑیوں کو آگ لگادی ایرانیوں کی اس خرمناک شرارت کے نتیجہ میں ۴۰۲ جانیں خاک و خون میں تڑپ کر رہ گئیں۔

اس شرمناک واقعہ پر تقریبا دنیا بھر کے اسلامی سربراہوں نے نہایت ہی افسوس کا اظہار کرتے ہوئے ایرانیوں کی اس شرمناک کارروائی کی شدید مذمت کی، اور انھیں تلقین کی گئی کہ مکۃ المکرمۃ جیسے مقدس و متبرک مقام کو سیاست اور شرارت کا نشانہ نہ بنایا جائے۔

مگر! دوسری طرف ایرانی حکومت نے الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے! کے مصداق اس ساری کارروائی کو سعودی حکومت کے سر تھوپ دینے کی ناکام کوشش کر رکھی ہے اور اسے عرب ممالک خصوصا سعودی عرب سے انتقام لینے کی دھمکیاں بھی دی ہیں، اخبار جنگ لندن کی رپورٹ کے مطابق ایرانی پارلیمنٹ کے اسپیکر علی اکبر رفسنجانی نے تہران میں ہزاروں ایرانیوں کے جذبات سے کھیلتے ہوئے کہا!

ہم سعودی حکمرانوں کا خاتمہ کر کے ان شہیدوں کا انتقام لینے کا عہد کرتے ہیں،

ایرانی وزیر اعظم میر حسین موسوی کا اعلان یہ تھا۔

ایران اپنے عازمین حج کے قتل عام کا انتقام لینے کیلئے اپنے تمام تر وسائل کو بروئے کار لائے گا۔ ـــــ ایران کے پارلیمانی ڈپٹی منسٹر صادق خلخالی کا کہنا تھا کہ

وہ اپنے شہداء کے خون کا بدلہ لیں گے۔

ایرانی وزارت خارجہ کی طرف سے کہا گیا کہ ! یہ امت مسلمہ اور خاص طور پر ایرانی عوام کے خلاف امریکہ کے جرائم کے سلسلے کی ایک کڑی ہے، اس کا جواب دیا جائیگا۔

(جنگ ۱۰ - ۱۱ر اگست ۱۹۸۷ء)

ملاحظہ فرمائیے! شرارت کرنے کے باوجود سعودی عرب سے انتقام لینے کی دھمکیاں!
کیا سیاسی مظاہرے، نعرے بازی، خمینی کی تصاویر، اور لبیک یا خمینی کی تصاویر و
گھڑیاں پہن کر گلی کوچوں میں شور کرنا سعودی عرب کی کارروائی تھی یا ایرانیوں کی
شرمناک شرارت!

اس مبارک اور مقدس اجتماع کے موقع پر ہی اس قسم کی شرارت کا مقصد کیا تھا؟
ہم نے حالات کا اندازہ لگاتے ہوئے اس واقعہ سے تقریباً ۶ ماہ قبل لکھا تھا کہ
آثار و قرائن سے کچھ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ایران (عراق کے بعد) اب کسی
نئے ٹارگٹ کی تلاش میں ہے اور اشاروں کنایوں میں اس نئے ٹارگٹ کا تعین
بھی کر لیا گیا ہے اور وہ نیا ٹارگٹ سعودی عرب اور حرمین شریفین ہیں جس پر
حکومت کا خواب دیکھا جا رہا ہے۔ ایرانی رہنما آیت اللہ خمینی نے فرانس میں جلاوطنی
کے دوران اپنے اس خیال کا اظہار بھی کیا تھا اور اب سیاسی و مذہبی انداز میں بھی
یہ باتیں کھل کر سامنے آگئی ہیں تہران سے شائع ہونے والے اردو رسائل و جرائد
اسکے شاہد ہیں، اس وقت ہمارے سامنے ایران سے شائع ہونے والا اردو ماہنامہ
"ندائے اسلام" موجود ہے اسکے اداریہ میں "حرم عالم اسلام کا دل اور ایک آزاد
علاقہ" کی سرخی کے تحت یہ لکھا گیا کہ

اسلامی دنیا کے قلب "حرم" پر کسی خاص گروہ فرقے اور کسی خاص فقہی نظریے
کی حکم فرمائی اور مشکلات اور محدودیتوں کا وجود میں لانا جیسا کہ آج سعودی عرب میں حکم فرما
ہے ایک غیر اسلامی عمل ہے۔

ذرا آگے چل کر اپنا مقصد واضح کیا کہ
اس کو ایک گروہ کی حکم فرمائی سے آزاد کرانا اسلام کے ابتدائی دور میں لوٹانا
اور اسلامی بین الاقوامی بنانا ہے (یعنی کھلا شہر قرار دے دو)

پھر اس مقصد پر عمل کرنے کو جہاد مقدس کا نام دیتے ہوئے کہا گیا ہے کہ
اس جہاد مقدس کو عملی جامہ پہنانے کے طریقوں کا جائزہ لینے کیلئے ضرورت اس بات
کی ہے کہ تمام ممالک کے برگزیدہ اشخاص ارباب حل وعقد اور علماء و فقہاء اس اہم مسئلہ کا
تجزیہ کریں (ماہنامہ الہلال مانچسٹر)
ہم نے جو کچھ لکھا تھا ایرانی ذہنیت کو سامنے رکھ کر لکھا تھا اور آج مکۃ المکرمہ میں
ہونے والا یہ حادثہ اس امر کی کھلی شہادت دے رہا ہے کہ ایران کا موقف اور منصوبہ کیا ہے؟
اور اس منصوبہ (یعنی حرمین شریفین پر قبضہ) کی تکمیل کیلئے وہ ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں
ان ملحدین کا منصوبہ کیا ہے آپ پہلے اسے ملاحظہ فرمائیں ! خمینی فرماتے ہیں کہ
دنیا کی اسلامی وغیر اسلامی طاقتوں میں ہماری قوت اس وقت تک تسلیم نہیں ہو سکتی
جب تک کہ مکہ اور مدینہ پر ہمارا قبضہ نہیں ہو جاتا، چونکہ یہ علاقہ مہبط الوحی اور مرکز اسلام
ہے اس لئے اس پر ہمارا غلبہ اور تسلط ضروری ہے ...... میں جب فاتح بن کر مکہ
اور مدینہ میں داخل ہوں گا تو سب سے پہلے میرا یہ کام ہوگا کہ رسول اللہ کے روضہ میں پڑے
ہوئے دو بتوں کو نکال باہر کروں (خطاب بہ نوجوانان بحوالہ خمینی ازم اور اسلام ص)
خمینی نے اس بیان میں اپنے منصوبہ کا نہایت واضح انداز میں اعلان فرما دیا ہے، اور
ساتھ ہی حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کی جس انداز میں گستاخی و بدتمیزی کی ہے وہ محتاج بیان نہیں -
کچھ بھولے بھالے مسلمان یہ گمان کرتے ہیں کہ خمینی شیخین کے بارے میں یہ انداز
اختیار نہیں کر سکتے، ان پر صرف الزام ہے، ان حضرات کی خدمت میں مؤدبانہ گذارش یہ ہے
کہ زیادہ نہیں صرف خمینی کی کتاب "الحکومۃ الاسلامیہ" اٹھا کر دیکھئے آپ کو اس سے شدید
الفاظ نظر آئیں گے - جہاں تک حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کی ذات گرامی کو بت (معاذ اللہ) کہنے کا
تعلق ہے یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے خمینی کے مرشد و مقتدیٰ علامہ مجلسی اس سے بھی
بہت پہلے شیعہ حضرات کو یہ سبق پڑھا چکے ہیں - کہ

وہ دو شخص (یعنی ابوبکرؓ و عمرؓ) جو قریش کے بت تھے۔

(حیات القلوب ج۲ ص۳۷۵ بحوالہ تحفہ امامیہ ص۸۶)

ایک اور جگہ لکھتا ہے :- "واعتقاد ما دریں برأت آنست کہ باید بیزاری جو بند از بت ہائے چہار گونہ یعنی ابوبکر و عمر و عثمان و معاویہ۔ حق الیقین ص۲۱۲ مطبوعہ لکھنو۔

اس لئے خمینی کے اس بیان پر تعجب کا اظہار نہیں بلکہ تاسف کا اظہار کرنا چاہئے اور اپنے زاویۂ فکر کو صحیح سمت پر لانا چاہیئے۔

عرض یہ کر رہا تھا کہ خمینی کا خطرناک منصوبہ آپ نے ملاحظہ کیا اس منصوبہ کی تکمیل کچھ اس طرح ہو سکتی ہے۔

(۱) آیت اللہ خمینی کو پوری دنیا کا امام تسلیم کیا جائے

(۲) امام کو مسلمانوں کا مرکزی مقام سپرد کر دیا جائے

(۳) امام اپنے اختیار سے ہر کام کر سکے۔

اب اسے تفصیل کی روشنی میں ملاحظہ کیجئے۔

(۱) سب سے پہلا کام یہ طے کرنا ہوگا کہ خمینی کو پوری اسلامی دنیا کا لیڈر اور امام تسلیم کر لیا جائے۔ ظاہر ہے کہ حج بیت اللہ کے مبارک موقع کے سوا اور کون سا وقت موزوں ہو سکتا ہے اسلئے کہ اس وقت ساری دنیا کے مسلمان خانہ کعبہ میں موجود ہوتے ہیں اس لئے ان سے جبراً یہ کام نہایت آسانی کے ساتھ لیا جا سکتا ہے اور یوں پوری دنیا کو باور کرایا جا سکتا ہے کہ لاکھوں اور دنیا بھر کے مسلمانوں نے خمینی کو امیر المومنین تسلیم کر لیا ہے

(۲) جہاں تک امام کی رہائش کا تعلق ہے تو پھر یہ مرحلہ اور بھی آسان ہو جائیگا اور کہا جائیگا کہ امام کی رہائش اس جگہ ضروری ہے جو اسلامی دنیا کا قلب اور مرکز ہو، ظاہر ہے کہ وہ مرکزی مقام ایران نہیں بلکہ مکہ مکرمہ ہے اسلئے عوام سے اس بات کو بھی جبراً منوایا جائے کہ اب خمینی تہران چھوڑ کر مکۃ المکرمہ آجانا چاہئے اور مسلمانوں کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں سنبھال لیں

اور یوں خانہ کعبہ خمینی صاحب کے ہاتھوں میں سپرد کر دیا جائے۔

(۳) جب خمینی پوری اسلامی دنیا کے لیڈر اور امام مانے جا چکے اور مسلمانوں کے مرکزی مقام پر بھی قابض ہو چکے تو اب امیرالمومنین کی حیثیت سے ان کو اختیار دیا جائے کہ وہ اسلام کے نام اور جہاد کے عنوان پر جو کچھ چاہیں کر سکتے ہیں یعنی جس حکومت کا تختہ الٹنا چاہیں الٹ دیں، جس سربراہ کو چاہیں پھانسی پر چڑھا دیں جس سنی عالم کو چاہیں تہہ تیغ کر دیں۔

یہ صرف الزام ہی نہیں بلکہ شیعہ مجتہدین کی تحریرات اس امر کی شاہد عدل ہیں، جگر پر ہاتھ رکھئے اور علامہ مجلسی کا یہ بیان پڑھئے۔

"جب قائم (یعنی مہدی) ظاہر ہوں گے تو کفار سے پہلے سنیوں کے علماء سے ابتدا کرینگے اور (ایشاں را خواہد کشت) ان کو قتل کرینگے (حق الیقین ص۱۴۲ سطر۲ مطبوعہ لکھنو)

خمینی چونکہ بطور نائب مہدی ہیں اس لئے اس فریضہ کی انجام دہی ان کی ذمہ داریوں میں سے ہے اسکے بعد پھر خمینی کی خواہش (جواد پر گندی) کے پورا ہونے میں کوئی چیز مانع نہ ہوگی اور خمینی مکۃ المکرمہ اور مدینۃ المنورہ میں مدفون حضرات خلفاء راشدین، امہات المومنین، اور صحابہ کرام رض کی قبور مبارکہ کی بے حرمتی و گستاخی کرتے رہیں گے (اللہ تعالیٰ ان کے ناپاک ارادوں کو خاک میں ملائے آمین)

مکۃ المکرمہ میں ہونے والا یہ حادثہ فاجعہ اسی سلسلے کی ابتدا تھی، روزنامہ جنگ لندن اپنے نمائندہ کے حوالے سے اس بات کا انکشاف کرتا ہے کہ۔

گذشتہ جمعہ کو مکہ معظمہ میں مظاہرہ کرنے والے ایرانی مظاہرین کے منصوبہ میں کعبۃ اللہ کے امام شیخ صالح بن حمید کو قتل کرنا اور کعبۃ اللہ کو جلانا بھی شامل تھا، رپورٹ کے مطابق ایرانی مظاہرین نے ایک منصوبہ بنایا تھا اس میں عصر کی نماز کے دوران ایرانیوں نے کعبۃ اللہ کے اندر داخل ہونے والے تمام دروازوں پر قبضہ کر کے انھیں بند کر دینا تھا اور پھر ان کی طرف سے یہ اعلان کیا جانا تھا کہ جناب آیت اللہ خمینی کو تمام مسلمانوں کا مقدس امام تسلیم کیا جائے بعد ازاں حاضرین حج کو موقع پر موجود ایرانی مظاہرین کے لیڈروں کی اطاعت اور وفاداری اور جناب آیت اللہ خمینی کو امام مانے جانے کا حلف اٹھانے کے بعد انھیں کعبۃ اللہ میں داخلے کی اجازت دی جاتی تھی (جنگ لندن ۸ اگست ۸۷ء)

ہم ایرانی اور خمینی کے اس ناپاک منصوبہ پر اسکے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں یریدون لیطفئوا نور اللہ بافواھھم واللہ متم نورہ ولو کرہ الکافرون۔ نور خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن۔ پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائیگا۔

دارالعلوم دیوبند کا ترجمان
ماہنامہ
دارالعلوم
دیوبند
شمارہ نمبر ۲
ماہ جمادی الثانی ۱۴۰۸ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۸۸ء
جلد نمبر ۷۲
نگراں :- حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب
مہتمم دارالعلوم دیوبند
مدیر :- مولانا حبیب الرحمن قاسمی
فی شمارہ 4/-
سالانہ 40/-
سالانہ بدل اشتراک
بیرون ممالک سے
سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ کا سالانہ 160/-
پاکستان سے 70/-
بنگلہ دیش سے 50/- (ہندوستانی)
سرخ نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ کا زر تعاون ختم ہو گیا ہے۔

فہرست مضامین

ہندوستانی وپاکستانی خریداروں سے ضروری گذارش

(۱) ہندوستانی خریداروں سے ضروری گذارش یہ ہیکہ ختم خریداری کی اطلاع پاکر اول فرصت میں اپنا چندہ نمبر خریداری کے حوالہ کے ساتھ منی آرڈر سے روانہ کریں

(۲) پاکستانی خریدار اپنا چندہ مبلغ /۷۰ مولانا عبدالستار صاحب مہتمم جامعہ عربیہ محمودیہ داؤد والا براہ شجاع آباد ملتان، پاکستان کو بھیجدیں۔

(۳) خریدار حضرات پتہ پر درج شدہ نمبر محفوظ فرمالیں، خط وکتابت کے وقت خریداری نمبر ضرور لکھیں۔

والسلام۔ منیجر۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ آغاز

کیا اثنا عشری شیعہ مسلمان ہیں؟

حبیب الرحمٰن قاسمی

ایمان و کفر دو جدا جدا مستقل حقیقتیں ہیں، جو اپنے معنی و مفہوم اثرات و عوامل اور نتائج و ثمرات کے اعتبار سے ایک دوسرے کی ضد اور متباین ہیں، انبیائے کرام اور کتب سماویہ کے نزول کی ایک اہم ترین غرض ایمان و کفر کے حدود کی تعیین و تشخیص اور ان کے درمیان امتیاز کرنا بھی ہے تاکہ ایمان کو کفر، اور کفر کو ایمان سمجھنے کی خطرناک اور تباہ کن غلطی سے نوعِ انسانی کو بچایا جائے اس لیے جو شخص اسلامی تعلیمات کے مطابق عقیدۃً مومن ہے اسے کافر سمجھنا یا جو اسلامی عقائد کی رو سے کافر ہے اسے مومن باور کرنا شریعت اسلامیہ میں عظیم جرم ہے "ادخال الکافر فی الملۃ و اخراج مسلم عنھا عظیم فی الدین" (اکفار الملحدین ص ۲۰ و شرح شفاء ج ۲ ص ۵۰۰) کیونکہ یہ غیر محتاط رویہ بعثت رسولؐ انزال کتب کے مقصد و غرض کی نفی کرتا ہے

مسلمانوں کو کافر کہنے کے متعلق باری تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَتَبَیَّنُوْا وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰٓى اِلَیْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا (نساء)

اے ایمان والو جب تم اللہ کی راہ میں سفر میں نکلو تو ہر کام تحقیق کرکے کیا کرو اور ایسے شخص کو جو تمہارے سامنے اسلام پیش کرے یہ مت کہو کہ تو کافر ہے

اس آیت پاک سے ثابت ہوتا ہے کہ جو شخص اپنا اسلام ظاہر کرے تو جب تک اسکے کفر پر مکمل اور یقینی ثبوت فراہم نہ ہو جائے اسے کافر سمجھنا ناجائز ہے۔

اسی کے بالمقابل کافر کو مسلمان قرار دینے پر ان الفاظ نکیر فرمائی گئی ہے

اَتُرِیْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ وَمَنْ یُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِیْلًا ۔ (نساء)	کیا تم لوگ اس کا ارادہ رکھتے ہو کہ ایسے لوگوں کو راہ پر لاؤ جن کو اللہ تعالیٰ نے گمراہی میں ڈال رکھا ہے اور جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ گمراہی میں ڈالدے اسکے (مومن ہونے کے) لئے کوئی راہ نہیں پاؤ گے۔

مطلب یہ ہے کہ گمراہ غیر مؤمن کو راہ یاب مؤمن قرار دینا درست نہیں ہے لہذا اس غلطی سے مسلمانوں کو دور رہنا چاہیئے۔

مگر آج کی بے قید آزادی کا یہ کرشمہ ہے کہ اس انتہائی نازک مسئلہ میں بھی بیباکانہ افراط و تفریط کی جارہی ہے، ایک طرف وہ لوگ ہیں جنھوں نے تکفیر بازی کو اپنا مشغلہ بنالیا ہے اور معمولی معمولی خلاف شرع بلکہ خلاف طبع باتوں پر فتویٰ تکفیر جاری کر دیتے ہیں، ان کے بالکل برعکس کچھ دوسرے لوگ ہیں جن کے نزدیک اسلام و ایمان کی کوئی حقیقت و ماہیت ہی نہیں ہے محض دنیاوی مفاد اور مردم شماری کی فہرست میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ دکھلانے کی غرض سے یہ لوگ ہر مدعیٔ اسلام کو (خواہ اسکے سارے عقائد اسلام کے خلاف کیوں نہ ہوں) نہ صرف مسلمان کہنے پر مصر ہیں بلکہ جو اہل علم ایسے بد عقیدوں کو شرعی دلائل کی بنیاد پر خارج از اسلام سمجھتے ہیں انھیں یہ لوگ لعن وطعن اور سب وشتم بھی کرتے ہیں حالانکہ جس طرح صحیح العقیدہ مسلمان کو مسلمان سمجھنا ضروری ہے اسی طرح ضروریات دین وقطعیات اسلام کے منکرین بد عقیدوں کو خارج از اسلام سمجھنا بھی شرعاً لازم ہے۔ اور جاننے والوں کی یہ شرعی ذمہ داری ہے کہ ملت اسلامیہ کو ان کے فساد عقیدہ سے باخبر کر دیں تاکہ یہ بدباطن مار آستین بن کر اپنے مسموم عقائد

کا زہر مسلمانوں میں نہ پھیلا سکیں۔

عقل و انصاف کا تقاضا تو یہ ہے کہ امت کو ان علمائے دین کا احسان مند و شکر گذار ہونا چاہئے جو اس طرح کے نقاب پوش بدعقیدہ دشمنانِ اسلام کا پردہ چاک کرکے ان کا اصل چہرہ نمایاں کر دیتے ہیں تاکہ مسلمان بغیر کسی اشتباہ کے ان کی حقیقتِ اصلیہ سے واقف ہوجائیں اور ان کے ضرر سے محفوظ رہیں نہ کہ الٹے انھیں تنگ نظر، مفاد پرست اور تفریق بین المسلمین کا مجرم گردانا جائے۔ بریں عقل و دانش بباید گریست۔

اپنے ذاتی اور دہ بھی موہوم مفاد کے تحت جو لوگ دشمنان اسلام کو مسلمانوں کی صف میں گھسانے کیلئے اس طرح کی غیر معقول اور نا روا حرکتیں کر رہے ہیں ان کا حال اس نا سمجھ بچے جیسا ہے جو کسی چور کے ہاتھ پڑ گیا تھا اور چور اسے چند چاکلیٹ دیکر گھر کے سیف کی تالیوں کو معلوم کر رہا تھا کہ ایسا شخص وہاں آگیا جو چور کو اور اس کی اس تکنک کو اچھی طرح جانتا تھا اس نے چور کو بچے کے پاس اکیلا بیٹھا دیکھ کر چور، چور چلانا شروع کر دیا جس کی وجہ سے چور وہاں سے بھاگ گیا جس پر نا سمجھ بچہ منھ بسور کر اس شور مچانے والے کو برا بھلا کہنے لگا کہ اس نے ناحق ایک مخلص پر چوری کا الزام لگا کر میرے پاس سے اسے بھاگ جانے پر مجبور کر دیا وہ تو از راہ محبت مجھے چاکلیٹ کھلا رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ بچے کے اس واویلا پر کون ذی ہوش کان دھرے گا۔ بعینہ یہی حال اس نا روا توسیع پسند گردہ کا ہے جو اپنے چند روزہ مفاد کے پیش نظر فرقۂ اثناعشریہ کو زبردستی مسلمانوں کے زمرہ میں گھسیٹ لانے پر مصر ہیں بالخصوص دہلی کے ایک معاصر ہفت روزہ نے تو اسے ایک مہم بنا لیا ہے اور دلائل و شواہد کے بجائے دشنام بازی، الزام تراشی، افترا پردازی اور صحافتی پھبتیوں کے سہارے وہ ان تقیہ باز منکرین اسلام کو مخلص اور سچا پکا مسلمان ٹھہرا دینے کی ناکام کوشش میں لگا ہے چنانچہ اس نے اپنی جنوری کی ایک اشاعت میں "علامہ خمینی اور ان کے ماننے والے کافر؟" کا سوالیہ عنوان قائم کرکے خمینی اور ان کے ہم مذہب شیعوں کو کافر کہنے والوں

کو دل کھول کر گالیاں دی ہیں اور انھیں کے ساتھ مملکت سعودیہ کے سربراہوں پر بھی بغیر کسی معقول شہادت کے شراب نوشی، قمار بازی اور شہوت پرستی کا الزام لگایا ہے لیکن سعودی حکمرانوں کے بالفرض شراب نوش قمار باز ہونے سے خمینی اور ان کے متبعین کا اسلام کس طرح ثابت ہو گیا؟ کیا ایک فریق کی بدعملی دوسرے فریق کے اسلام کو مستلزم ہے؟ آخر استدلال و استنباط کی یہ کون سی قسم ہے جسے یہ پیش کر کے خمینی کے اسلام پر ثبوت فراہم کر رہا ہے؟ کم از کم مجھ جیسے طالب علم کیلئے تو یہ عقدہ لاینحل ہے

ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہئے
خامہ انگشت بدنداں ہے اسے کیا لکھئے

اسی تحریر میں جسے بقلم خود فکر انگیز بتایا گیا ہے قارئین کو متاثر کرنے کی غرض سے ایک جگہ بڑے پُر اعتماد لہجے میں یوں خامہ فرسائی کی گئی ہے۔

"میں عالم دین تو نہیں البتہ یہ بات بڑے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اب تک شیعہ مسلمانوں کو کبھی کافر قرار نہیں دیا گیا"

سوال یہ ہے کہ اس وثوق کی بنیاد کیا ہے؟ پردۂ زنگاری میں چھپے معشوق کے چشم و ابرو کا اشارہ ہے؟ یا علم و استدلال کی وہ روشنی ہے جس کے ذریعہ کسی اختلافی و نزاعی مسئلہ میں دو ٹوک فیصلہ کی قوت حاصل ہوتی ہے۔ بقول خود اس فکر انگیز تحریر کے لکھنے والے مفکر گرامی دینی علوم کی دولت سے محروم ہیں تو اس انتہائی نازک اور خالص علمی و دینی مسئلہ میں ان کا ایک پہلو پر اظہار وثوق معشوق زر نگلوہی کا مرہون منت ہو گا۔

صحیح بات تو یہ ہے کہ کفر و ایمان کا مدار خالص اعتقادیات و نظریات پر ہے اگر کوئی شخص صدق دل سے اللہ کی وحدانیت، رسول کی رسالت اور تمام ضروریات دین و قطعیات اسلام کو مانتا ہے تو وہ مسلمان ہے اور قطعی مسلمان ہے چاہے ساری دنیا ایک زبان ہو کر اسے شرابی جواری اور شہوت پرست کیوں نہ کہے دنیا کا یہ مخالف پروپیگنڈا اسے دائرہ اسلام سے باہر نہیں کر سکتا اس کے برعکس اگر کوئی شخص ضروریات دین میں سے کسی ایک چیز کا بھی منکر ہے تو وہ خارج از

اسلام ہے، فقیہ عادل، رہبر اعظم، امام زماں کے دعوے اور نعرے اسے اسلام میں داخل نہیں کر سکتے۔

محدث عصر علامہ انور شاہ کشمیری اپنی معرکۃ الآرا تصنیف "اکفار الملحدین" میں بحوالہ ایثار الحق علی الخلق از حافظ محمد بن ابراہیم یمانی لکھتے ہیں۔

اجماع الامۃ علی تکفیر من خالف الدین المعلوم بالضرورۃ (ص ۲۳)

ضروریات دین کے مخالف کی تکفیر پر امت کا اجماع ہے

اسلئے بلند بانگ دعووں اور اخبارات کی شاہ سرخیوں سے کسی منکر ضروریات دین کے اسلام کو ثابت نہیں کیا جاسکتا اس کیلئے تو ضروریات دین پر یقین واذعان کے ٹھوس اور مستحکم دلائل درکار ہیں اور بدقسمتی سے خمینی اور ان کے ہم نواؤں کی زنبیل اسی گنج گراں مایہ سے خالی ہے جیسا کہ آئندہ سطور سے معلوم ہو جائیگا۔ اس لئے خمینی اور دیگر اثنا عشری شیعوں کی تکفیر کے سلسلے دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ اسباب کفر میں سے کوئی سبب ان کے اندر پایا جاتا ہے یا نہیں اگر ان اسباب میں سے کوئی سبب ان میں محقق ہو جاتا ہے تو وہ یقیناً کافر ہوں گے، اس تلاش وجستجو کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں کہ اب تک کے علماء نے اس فرقہ کی تکفیر کی ہے یا نہیں، کیونکہ اوپر کی تفصیلات سے معلوم ہو چکا ہے کہ کفر کا مدار کسی کے کہنے یا فتویٰ پر نہیں ہے بلکہ وہ اسباب کفر ہیں جن کو اختیار کرنے سے آدمی کافر بن جاتا ہے، لہذا معاصر کا یہ دعویٰ کہ "البتہ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اب تک شیعہ مسلمانوں کو کافر قرار نہیں دیا گیا" بالفرض اگر درست بھی مان لیا جائے پھر بھی اس نرے دعویٰ سے کفر کے طوق لعنت سے اثنا عشری شیعوں کی گلو خلاصی نہ ہو سکے گی، کیوں کہ ..... ان کے اندر ایک نہیں بلکہ متعدد اسباب کفر جمع ہو گئے ہیں مثلاً (۱) عصمت ائمہ۔ (۲) حضرات انبیاء پر ائمہ کی برتری (۳) تحریف قرآن (۴) ارتداد صحابہ (۵) انکار خلافت شیخین (ابوبکر وعمرؓ) (۶) بداء (۷) قذف عائشہ صدیقہ (۸) رجعت، وغیرہ یہ سارے عقائد ضروریات دین کے بالکل مخالف ہیں اور اثنا عشری فرقہ سے تعلق رکھنے والے تمام شیعہ ان مذکورہ عقائد کے پابند

ہیں جیسا کہ ان کی کتابوں سے ظاہر ہے، اس موقع پر چند کتابوں کا نام درج کیا جا رہا ہے تاکہ انھیں دیکھ کر اطمینان کر لیا جائے (۱) الکافی از محمد بن یعقوب الکلینی متوفی ۳۲۹ھ (۲) من لایحضرہ الفقیہ از ابن بابویہ محمد بن علی الصدوق القمی متوفی ۳۸۱ھ (۳) تہذیب الاحکام (۴) الاستبصار (اثنا عشریوں میں یہ چاروں کتابیں امہات کتب میں شمار ہوتی ہیں اور ان میں اول الذکر کا مرتبہ تمام کتابوں سے بلند ہے) ان کے علاوہ شیعوں کے رئیس المحدثین علامہ باقر مجلسی کی کتابیں مثلاً حیات[۵] القلوب، حق[۶] الیقین، جلاء[۷] العیون جو شیعوں کے نزدیک نہایت معتبر و مستند مانی جاتی ہیں، ان متقدمین علمائے شیعہ کے علاوہ اس دور کے علمائے شیعہ میں سے مولانا حسین بخش جاڑاکی،[۸] تفسیر انوار النجف محمد حسین ڈھکو مجتہد کی احسن[۹] الفوائد و تجلیات[۱۰] صداقت اور مترجم الکافی مولانا ظفر حسن امروہوی کی عقائد[۱۱] الشیعہ اور تحفۃ[۱۲] العوام وغیرہ ہندوپاک کے شیعوں میں متداول ہیں اور ہر شیعہ ان کے مندرجات کو صحیح و درست سمجھتا ہے اور موقع استدلال میں ان کی عبارتوں کو پیش کرتا ہے، ان مذکورہ تمام کتابوں میں اوپر ذکر کئے ہوئے شیعوں کے عقائد کی تفصیلات موجود ہیں اگر طوالت کا خوف نہ ہوتا تو ہر ایک کتاب سے کم از کم ایک حوالہ ضرور پیش کر دیا جاتا۔

اور یہ سارے کے سارے عقائد ضروریات دین کی نفی کرتے ہیں کیونکہ علمائے متکلمین کی اصطلاح میں ضروریات دین میں ہر ایسے امور داخل ہیں جن کا دین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہونا قطعی دلائل سے ثابت ہو اور مسلمانوں کے ہر طبقہ میں وہ اس طرح سے مشہور ہوں کہ ان کی تحصیل کسی خاص اہتمام پر موقوف نہ ہو بلکہ عام طور پر مسلمانوں کو وراثۃً وہ امور معلوم ہوتے رہتے ہیں جیسے نماز روزہ وغیرہ کی فرضیت، نبی علیہ السلام کا خاتم الانبیاء ہونا وغیرہ ایسے امور ہیں جو بغیر تعلیم و تعلم کے مسلمانوں کو معلوم ہو جاتے ہیں، اور علمائے کلام کی حسب تصریح (۱) حضرات انبیاء کا عصمت کے ساتھ مخصوص ہونا (۲) غیر نبی کا نبی سے کم تر درجہ کا ہونا (۳) قرآن کریم کا تحریف و تبدیلی سے محفوظ ہونا (۴) تمام صحابہ کرام کا مومن ہونا (۵) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابوبکر و

عمر رضی اللہ عنہما کا کے بعد دیگرے خلیفہ ہونا (۶) علم خداوندی کا ہر موجود و غیر موجود پر محیط ہونا (۷) منافقین کے عائد کردہ الزام سے حضرت عائشہ صدیقہؓ کا بری ہونا (۸) مرنے کے بعد اس دنیا میں جزا و سزا کیلئے دوبارہ پیدا نہ ہونا یہ سب امور ضروریات دین اور قطعیات اسلام میں داخل ہیں ان میں سے کسی ایک کا انکار بھی موجب کفر ہے، اور اوپر کی تفصیل سے معلوم ہو چکا ہے کہ اثنا عشری شیعوں کا عقیدہ ان سب کے خلاف ہے اس لئے علمائے امت نے ہر دور میں اس طرح کے عقائد رکھنے والے شیعوں کی تکفیر کی ہے، چنانچہ علامہ ابن کثیر آیت پاک اِنَّ الَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ الخ کے ذیل میں لکھتے ہیں قد اجمع العلماء رحمهم الله قاطبة على ان من سبها (عائشہ) بعد هذا فانه كافر معاند للقرآن (تفسیر ابن کثیر) تمام کے تمام علماء نے اس بات پر اتفاق کیا ہے کہ جو لوگ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو آیت مذکورہ کے بعد قذف کرتے ہیں وہ کافر اور قرآن مجید کے مخالف ہیں اور اصول فقہ کی مشہور کتاب نورالانوار میں ملا جیونؒ اجماع کی بحث میں لکھتے ہیں ؎ ثم هو على مراتب فالاقوى اجماع الصحابة نصا مثل ان يقولوا جميعا اجمعنا على كذا فانه مثل الآية والخبر المتواتر حتى يكفر جاحده ومنه الاجماع على خلافة ابى بكر پھر اسکے چند مراتب ہیں جن میں سب سے قوی حضرات صحابہ کا صراحتاً کسی بات پر اجماع ہے مثلاً تمام صحابہ کسی مسئلے کے متعلق صراحتاً یہ کہیں کہ ہم نے اس پر اتفاق کر لیا ہے تو یہ آیت اور خبر متواتر کے مثل ہوگا حتیٰ کہ اس اجماع کے منکر کی تکفیر کی جائیگی اور اسی قبیل سے حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کی خلافت پر اجماع ہے، اور فرقہ اثنا عشری اتفاقی طور پر نہ صرف خلافت شیخین کے منکر ہیں بلکہ سرے سے انہیں مؤمن مخلص ہی نہیں مانتے شیعوں کے مجتہد مولوی حسین بخش جاڑا لکھتے ہیں۔ بیشک شیعوں کا یہ عقیدہ ہے کہ یہ لوگ (خلفاء ثلاثہ) دل و جان سے مؤمن نہیں تھے البتہ ظاہراً زبانی طور پر وہ اسلام کا اظہار کرتے تھے (مناظرہ بغداد ص ۸۵) شیعوں کے ایک دوسرے مجتہد مولوی محمد حسین ڈھکو لکھتے ہیں "ہمارے اور ہمارے برادر اسلامی میں اس سلسلہ میں جو کچھ نزاع ہے وہ صرف اصحاب ثلثہ کے بارے میں ہے اہل سنت ان کو بعد از نبی تمام اصحاب امت سے افضل جانتے ہیں اور ہم ان کو دولت ایمان و ایقان اور اخلاص

سے تہی دامن سمجھتے ہیں (تجلیات صداقت ص ۲۰۱) دورِ حاضر کے شیعوں کے رہبرِ اعظم دنائبِ امام غائب خمینی بھی خلفائے ثلثہ کے ایمان کے منکر ہیں ان کی مشہور کتاب کشف الاسرار کے صفحات ۱۰۷، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۹، ۱۵۳، وغیرہ کو دیکھ کر فیصلہ کر لیا جائے۔

کیا ان تصریحات کے بعد بھی کسی کیلئے اس کی گنجائش ہے کہ وہ دعویٰ کرے کہ: اب تک شیعہ مسلمانوں کو کافر قرار نہیں دیا گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ اوپر مذکور انھیں ضروریات دین وقطعیات شریعہ کی مخالفت اور انکار کی بنا پر ہر دور کے علماء وفقہاء نے شیعوں کی تکفیر کی ہے اور انھیں گمراہ اور گمراہ کنندہ قرار دیا ہے اس موقع پر بغرض اختصار چند ان کتابوں کے نام مصنف کی تصریح کے ساتھ درج کیے جاتے ہیں جن میں شیعوں کی تکفیر کی گئی ہے۔

(۱) الفصل فی الملل والاہواء والنحل ج ۲ ص ۸۷ مؤلفہ امام ابن حزم اندلسی متوفی ۴۵۶ھ

(۲) خلاصۃ الفتاویٰ قلمی مرتبہ شیخ طاہر بن احمد البخاری المتوفی ۵۴۲ھ

(۳) الشفا ج ۲، ص ۲۸۶ و ۲۸۹ مصنفہ قاضی عیاض مالکی متوفی ۵۴۴ھ

(۴) بدائع الصنائع از شیخ ابوبکر ابن مسعود کاسانی متوفی ۵۸۷ھ

(۵) فتح القدیر ج ۱ ص ۳۴۴۔ از علامہ کمال الدین المعروف بہ ابن ہمام حنفی۔

(۶) الصارم المسلول ص ۵۷۵ پر علامہ ابن تیمیہ متوفی ۷۲۸ھ نے قاضی ابویعلی، محمد بن یوسف فریابی، امام ابوبکر ہانی سے فتویٰ تکفیر شیعہ درج کیا ہے

(۷) خزانۃ المفتیین قلمی میں بھی تکفیر شیعہ کا فتویٰ موجود ہے، امام حسین بن محمد سمعانی مؤلف کتاب اس کی تالیف سے ۷۴۰ھ میں فارغ ہوئے ہیں۔

(۸) تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق ج ۱ ص ۱۳۴ مطبوعہ مصر از امام فخر الدین ابو محمد عثمان بن علی زیلعی متوفی ۷۴۳ھ۔

(۹) بحر الرائق مؤلفہ شیخ زین العابدین ابن نجیم مصری متوفی ۹۶۹ھ

(۱۰) مجمع الانہر از شیخ زادہ، یہ کتاب ۱۰۷۷ھ میں لکھی گئی ہے۔

(۱۱) فتاوی عالمگیریہ جسے اورنگ زیب عالمگیرؒ کے حکم سے پچاس علماء پر مشتمل ایک مجلس نے مرتب کیا ہے
(۱۲) تنقیح حامدیہ از علامہ ابن عابدین شامی ۔
(۱۳) شرح فقہ اکبر ص ۵۳ از ملا علی قاری حنفی متوفی ۱۰۱۴ھ
(۱۴) اور ہندوستان کے مشاہیر علماء میں مجدد الف ثانیؒ نے اپنی مشہور تصنیف رد الروافض میں اثنا عشریوں کو کافر لکھا ہے (۱۵) حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے مسوی شرح موطا امام مالک ج ۲ ص ۱۱۰ پر انھیں زندیق کہا ہے (۱۶) حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے اپنے فتاویٰ میں ان کی تکفیر کی ہے (۱۷) اور مولانا عبدالحئی فرنگی لکھتے ہیں منقح اور قولِ مفتی بہا درج یہ ہے کہ جو شیعہ منکر ضروریات دین ہوں وہ کافر ہیں، ان کا ذبیحہ حلال نہیں، مناکحہ ان کے ساتھ درست نہیں، شرکت ان کے ساتھ مثل شرکت اہل اسلام کے جائز نہیں" (فتاوی مولانا عبدالحئی ج ۲ ص ۱۱، طبع قدیم)
(۱۸) مولانا احمد رضا خاں بریلوی نے اپنے رسالہ " رد الرفضہ " میں پچاس سے زائد کتب فقہ کلام و تفسیر کے حوالوں سے اثنا عشریوں کے کفر کو ثابت کیا ہے ۔

آج سے تقریباً ساٹھ سال پہلے امام اہل سنت حضرت مولانا عبدالشکور فاروقی لکھنوی نے ایک استفتاء کے جواب میں تحریر فرمایا تھا: "شیعہ اثنا عشریہ رافضیہ قطعاً خارج از اسلام ہیں ہاں علماء سابقین کو چونکہ ان کے مذہب کی حقیقت کما ینبغی معلوم نہ تھی بوجہ اس کے کہ یہ لوگ اپنے مذہب کو چھپاتے ہیں اور کتابیں بھی ان کی نایاب تھیں لہذا بعض محققین نے بربنائے احتیاط ان کی تکفیر نہیں کی تھی مگر آج ان کی کتابیں نایاب نہیں رہیں اور ان کے مذہب کی حقیقت منکشف ہوگئی اس لئے تمام محققین ان کی تکفیر پر متفق ہو گئے ہیں، ضروریات دین کا انکار قطعاً کفر ہے اور قرآن شریف ضروریات دین میں سب سے اعلیٰ وارفع چیز ہے اور شیعہ بلا اختلاف ان کے متقدمین و متاخرین سب کے سب تحریف قرآن کے قائل ہیں" الخ ــــــ امام اہل سنت کے اس فتوی پر اس وقت کے ۳۰ علمائے ہند کے تصدیقی و تائیدی دستخط ثبت ہیں جن میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی، مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ شاہجہاں پوری ثم دہلوی، مولانا مفتی ریاض الدین مفتی

دار العلوم دیوبند، مولانا اعزاز علی شیخ الادب والفقہ دار العلوم دیوبند، مولانا مرتضیٰ حسن چاند پوری ناظم تعلیمات دار العلوم دیوبند، مولانا مفتی محمد شفیع مفتی اعظم پاکستان، محدث کبیر حضرت مولانا خلیل احمد صاحب شیخ الحدیث وصدر مدرس مظاہر علوم سہارنپور، حضرت مولانا سید انور شاہ کشمیری شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند، حضرت مولانا مفتی مہدی حسن شاہجہاں پوری صدر مفتی دار العلوم دیوبند، حضرت مولانا محمد عبدالعزیز گوجرانوالہ مصنف نبراس الساری حضرت مولانا عبدالرحمٰن نصرامروہوی وغیرہ جیسے اساطین علم بھی ہیں "شیعہ اثنا عشریہ کے کفر وارتداد کے متعلق علمائے کرام کا متفقہ فتویٰ" کے نام سے یہ فتویٰ متعدد بار طبع ہو چکا ہے اور دستیاب ہے، ابھی حال ہی میں ماہنامہ الفرقان لکھنؤ میں بھی یہ پورا فتویٰ شائع کیا گیا ہے۔ اسکے علاوہ ۱۳۴۶ھ میں "فیصلہ شرعی" کے نام سے حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم اور ان کے برادر خورد مولانا محمد طاہر صاحب کے اہتمام میں مطبع قاسمی سے ۲۰ صفحات پر مشتمل ایک فتویٰ شائع ہوا تھا، اس رسالہ میں بھی ایک استفتاء کے جواب میں مولانا حکیم محمد قطب الدین پیرکوٹی نے لکھا ہے: "اکثر فقہاء اور متکلمین مطلق رافضیوں کو کافر لکھتے ہیں خواہ وہ رافضی محض سبّ وگالی بکنے والے ہوں یا سبّ صحابہ کے ساتھ دیگر بکواس بھی بکتے ہوں اور خواہ وہ رافضی صحابہ کرام کو ایماندار سمجھ کر گالیاں دیتے ہوں یا والعیاذ باللہ غیر مومن جان کر سب بکتے اور گالیاں دیتے ہوں اور خواہ وہ رافضی سبّ صحابہ کو حرام اعتقاد کرتے ہوں یا حلال چنانچہ صاحب فتاویٰ ظہیریہ اور خلاصہ اور رقنیہ اور عالمگیریہ اور جامع الرموز اور درمختار اور ردالمحتار شامی اور فتح القدیر وغیرہ وغیرہ سب کے سب شیعہ رافضیوں کو علی الاطلاق کفر کا فتویٰ دیتے ہیں الخ (ص ۶) ۔ اس فتویٰ پر بھی صوبہ سرحد، ملتان، سندھ وغیرہ کے ۲۶ علماء ومفتیوں کے تائیدی دستخط ہیں، اور ابھی چند ماہ پہلے ماہنامہ الفرقان لکھنؤ نے "خمینی اور اثنا عشریہ کے بارے میں علماء کرام کا متفقہ فیصلہ" کے نام سے ۲۸۴ صفحات کا ایک نمبر شائع کیا ہے جس میں ہندوستان و پاکستان کے علمائے دیوبند، علمائے اہل حدیث اور علمائے بریلی کے تقریباً ۲۰۰ سے زائد فتاوے اور تصدیقات ہیں جن میں متفقہ طور پر تینوں مکتبہ فکر کے علماء نے خمینی اور اثنا عشری کو کافر

لکھا ہے۔

حیرت ہے کہ ایک ایسا مسئلہ جس پر علمائے متقدمین و متاخرین اور پھر ہندوستان کے تینوں مکتبۂ فکر کے علماء متفق ہوں اس کے بارے میں آنکھ بند کر کے یہ لکھ دیا جائے کہ بڑے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اب تک شیعہ مسلمانوں کو کافر قرار نہیں دیا گیا۔

چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد

یہ تو سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ کوئی شخص ایسے نازک، حساس اور جذباتی موضوع پر فکر انگیز تحریر سپرد قلم کرنے بیٹھے اور وہ اس موضوع سے متعلق لکھے گئے لٹریچر سے اس درجہ غافل ہو کہ اسے اپنے ہی ملک اور اپنے گرد و پیش کے علماء کی رائے معلوم نہ ہو، اس لئے یہی کہا جا سکتا ہے کہ سب کچھ جاننے کے باوجود کسی خاص مقصد کے تحت تجاہل عارفانہ سے کام لیا گیا ہے اور جان بوجھ کر محض اپنے نقاب پوش محسنوں کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے ایک ایسا دعویٰ کیا گیا ہے جس کا غلط ہونا نصف النہار کی طرح روشن ہے

اللهم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعه و
ارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابه۔

انوار الباری شرح اردو صحیح البخاری

مجموعۂ افادات اکابر امت و تحقیقات علمیہ علماء دیوبند و سہارنپور وغیرہ

شرح مذکور کی ۱۹ جلدیں شائع ہو چکی ہیں اور آخری دو جلدیں زیر تالیف ہیں اس عظیم القدر تالیف میں ۱۴ سو سال کے ۶ سو سے زائد اکابر محدثین کے حالات وخدمات، شروح بخاری کے گرانقدر ارشادات اور عالمی شہرت یافتہ علامہ محدث مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ کے آخری دو سالہ امالی درس بخاری شریف کے علاوہ برسہا برس سے جو امور زاویہ خمول میں پڑے تھے ان سے بھی پردہ ہٹا دیا گیا ہے۔

اختلافی مسائل میں موافق و مخالف دلائل کو نہایت احتیاط و اعتدال کے ساتھ پیش کیا گیا ہے اور اہم ترین فروعی و اصولی مباحث میں سیر حاصل ابحاث درج ہوئی ہیں۔

شروع کی دو جلدیں بہت قیمتی و بیش بہا معلومات پر مشتمل اور مقدمہ فتح الباری کی طرح بے نظیر ہیں، اردو زبان میں ۲۰×۳۰ سائز کی ۱۲ جلدوں کے تقریباً ساڑھے چار ہزار صفحات میں علمی حدیثی مضامین عالیہ کا مفصل شدہ یکجائی خزانہ ہے جو عربی زبان میں بھی ایک جگہ اور آسانی سے میسر نہ ہوگا۔ کتابوں کے حوالے بھی مکمل دیئے گئے ہیں مضامین شرح مذکور کا اجمالی تعارف تقاریظ اکابر امت اور رسائل و اخبارات کے تبصرے الگ سے شائع شدہ ہیں۔ ایک کارڈ لکھ کر طلب کریں

پاکستان میں:۔ مکتبہ حفیظیہ، مینا بازار، گوجرانوالہ سے رابطہ قائم کریں

مکتبہ ناشر العلوم، بخارہ روڈ۔ بجنور (یو، پی)

سفر حج کے آداب

از:- ڈاکٹر ماجد علی خاں جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

حج ایک اجتماعی عبادت ہے اور اسلام کا ایک عظیم رکن ہے. جو مسلمان صاحب استطاعت ہو، مکہ مکرمہ تک سفر کا خرچہ اور سفر برداشت کرسکتا ہو اور اس کی شرائط پوری کرسکے اسکے اوپر حج کرنا فرض ہے، اللہ جل شانہ قرآن کریم میں ارشاد فرماتا ہے

وَلِلّٰہِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْہِ سَبِیْلًا وَمَنْ کَفَرَ فَاِنَّ اللّٰہَ غَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ ۝
(سورۂ آل عمران: ۹۷)

"اور یہ لوگوں کے ذمہ ہے کہ بیتُ (اللہ) کا حج کریں، اس شخص کے ذمہ جو وہاں تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو، اور جو کوئی کفر کرے تو اللہ تعالیٰ تمام جہانوں سے بے نیاز ہے" (سورۂ آل عمران)

ایک حدیث میں حضرت علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا "جس (مسلمان) کے پاس اس قدر زاد راہ اور سواری (کا انتظام) ہو کہ وہ بیت اللہ تک پہنچ سکے پھر بھی وہ حج نہ کرے تو وہ چاہے یہودی ہو کر مرے یا نصرانی" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دوسری حدیث میں فرمایا کہ "اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے اس بات کی شہادت دینا کہ اللہ (تعالیٰ) کے علاوہ کوئی معبود نہیں اور (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں، نماز قائم کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا، رمضان کے (مہینہ میں) روزے رکھنا اور جو اس کی استطاعت رکھتا ہو اسکو حج کرنا" حج کرنے کی تاکید اور اسکے فضائل میں بہت

سی احادیث وارد ہوئی ہیں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ حج مبرور کا جنت سے کم کوئی بدلہ نہیں"! ایک دوسری حدیث میں مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جس نے اللہ کیلئے حج کیا اور بدکلامی و بدگوئی اور فسق و فجور سے اپنے کو محفوظ رکھا تو وہ ایسا ہوجائیگا جیسا اُس دن تھا جس دن ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا" حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا۔ حج اور عمرہ کے درمیان متابعت کرو اسلئے کہ یہ دونوں گناہوں کو اس طرح دور کرتے ہیں جس طرح بھٹی لوہے یا سونے چاندی کے میل کو صاف کرتی ہے اور حج مبرور کا بدلہ جنت سے کم کوئی چیز نہیں، اور جب مومن احرام میں ہوتا ہے تو آفتاب کے غروب ہونے کے ساتھ اس کے تمام گناہ بھی زائل ہوجاتے ہیں" کچھ صحابہؓ نے ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ کون سا عمل افضل ہے، آپؐ نے فرمایا:۔ اللہ اور اسکے رسولؐ پر ایمان" پھر عرض کیا گیا کہ اسکے بعد کیا، تو آپ نے فرمایا۔ اللہ کے راستہ میں جہاد" پھر دریافت کیا گیا کہ اسکے بعد کون سا عمل، تو آپ نے فرمایا۔ "حج مبرور"

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

جو کام جتنا اہم ہوتا ہے اسکے آداب کی رعایت رکھنا بھی اتنا ہی اہم اور ضروری ہوتا ہے، حج جیسی عبادت کے آداب دوسری تمام عبادات سے مختلف اور الگ ہیں اس سلسلہ میں مستقل تصانیف ہیں اور علماء نے حج کے آداب اور اسکے مختلف ارکان کی حکمتوں کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، کچھ علماء نے تحریر کیا ہے کہ جب سفر حج کا ارادہ ہو تو پہلے مسنون طریقہ کے مطابق استخارہ کرنا چاہیئے[1]۔ استخارہ کا مسنون طریقہ اور دعا کتابوں میں درج ہے جب حج کا قوی عزم ہوجائے تو اللہ کی طرف رجوع کرے اور اپنے پچھلے تمام گناہوں سے

---

[1] ملاحظہ ہو۔ جامع المناسک الثلاثہ" از علامہ شیخ احمد بن محمد سنقور التمیمی (م ۱۳۲۵ھ) بیروت ۱۳۹۲ھ ص ۳۔

توبہ کرے۔[1] اور پھر اخلاص اور خَالِصَۃً لِوَجْہِ اللّٰہِ سفر شروع کرے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے: "انما الاعمال بالنیات ۔ وانما لکل امرئٍ مانوی"[2] یعنی اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے اور جو شخص جس طرح کی نیت کرتا ہے (اللہ کی طرف سے) اسکے ساتھ (اسی کے مطابق) معاملہ کیا جاتا ہے، حج کا سفر شروع کرنے سے پہلے ان لوگوں کا نان نفقہ جن کا اسکے ذمہ واجب ہے اتنے عرصہ تک کیلئے فراہم کرکے جانا ضروری ہے جتنا عرصہ سفر میں گذرے، اسکے بعد اگر ہوسکے تو غرباء و مساکین کو کچھ صدقہ خیرات ادا کرنا بھی بعض اہل اللہ کا دستور رہا ہے۔

سفر کے دوران حُسن خلق کا مظاہرہ کرنا، تکالیف پر صبر کرنا، غیبت، دوسری برائیوں اور گناہوں سے بچنا نہایت ضروری ہے نیز دوران سفر اللہ کے ذکر کا اہتمام، تلاوت قرآن اور نوافل کا اہتمام بھی حتی الوسع کرنا چاہئے، علماء نے لکھا ہے کہ جمعرات کے دن یا پیر (دوشنبہ) کے دن سفر شروع کرنا مستحب ہے[3] سفر شروع کرنے سے قبل گھر میں دو رکعت نماز نفل ادا کرے اور دعائے سفر پڑھے، سفر کی مسنون دعائیں احادیث کی کتابوں میں وارد ہوئی ہیں، ایک مشہور دعا یہ ہے۔

اَللّٰھُمَّ ھٰذَا دِیْنِیْ وَاَھْلِیْ وَوَلَدِیْ وَمَالِیْ وَدِیْعَۃٌ عِنْدَكَ، اَللّٰھُمَّ اَنْتَ الصَّاحِبُ فِی السَّفَرِ وَالْخَلِیْفَۃُ فِی الْاَھْلِ وَالْمَالِ وَالْوَلَدِ اَسْتَوْدِعُ اللّٰہَ نَفْسِیْ وَمَالِیْ وَاَھْلِیْ وَخَوَاتِیْمَ عَمَلِیْ، اَللّٰھُمَّ اَنْتَ تَعْلَمُ اِنِّیْ لَمْ اَخْرُجْ اَشَرًا وَّلَا بَطَرًا وَّلَا رِیَاءً وَّلَا سُمْعَۃً وَّلٰکِنْ خَرَجْتُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِكَ۔ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ اَنْ اَضِلَّ اَوْ اُضَلَّ اَوْ اَذِلَّ اَوْ اُذَلَّ اَوْ اَظْلِمَ اَوْ اُظْلَمَ اَوْ اَجْھَلَ اَوْ یُجْھَلَ عَلَیَّ۔

[1] ملاحظہ ہو جامع المناسک الثلاثۃ از علامہ شیخ احمد بن محمد منقور التمیمی (م ۱۱۲۵ھ) بیروت ۱۳۹۲ھ ص ۳

[2] صحیح بخاری، صحیح مسلم [3] خروجہ یوم الخمیس لحدیث کعب بن مالک رضی اللہ عنہ

(باقی حاشیہ برصفحہ آئندہ)

گھر کے اہل وعیال و دوسرے اقارب و دوست و احباب سے سفر سے قبل یہ دعائیہ الفاظ کہنا بھی مسنون ہے "نَسْتَوْدِعُ اللّٰہَ دِیْنَكَ وَاَمَانَتَكَ وَخَوَاتِیْمَ عَمَلِكَ"

مکہ مکرمہ وہ شہر ہے جس میں اللہ کا پاک گھر واقع ہے اس کی حیثیت خالق کائنات، ربُّ السموات والارض نے دنیا کے اندر ایک پاک اور متبرک شہر کی بنائی ہے اور اس کو قرآن نے "بلد الامین" جیسے لقب سے پکارا ہے چنانچہ اس مبارک شہر میں داخلے کے شرائط میں سے ایک شرط یہ ہے کہ احرام باندھ کر اس میں حاضری دی جائے۔ احرام باندھنے کیلئے مکہ مکرمہ کے چاروں طرف کچھ فاصلے پر مختلف مقامات مقرر کر دیئے گئے ہیں جن کو مواقیت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، مواقیت (جس کا واحد میقات ہے) کے تعین سے حاجی میں ایک ولولہ، جذبہ شوق و ذوق اور فکری و روحانی بیداری پیدا کرانا مقصود ہے تاکہ ہر اس شخص کو جو کہ مکرمہ حاضری دینے جارہا ہو اسکا احساس ہوجائے کہ وہ تمام عالموں کے پروردگار کے حضور میں سجدہ ریز ہونے اور اسکے احکامات کی تعمیل کیلئے حاضر ہونے جارہا ہے، مواقیت کے مقرر کئے جانے کی حکمت پر روشنی ڈالتے ہوئے حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی اپنی شہرۂ آفاق تصنیف حجۃ اللہ البالغہ میں تحریر کرتے ہیں

"مواقیت کے اندر اصل یہ ہے کہ جبکہ مکہ میں ایسی حالت میں آنا مطلوب تھا کہ پراگندہ بال ہو اور آشفتہ حال ہو اور نفس ذلت کی حالت میں ہو اور لوگوں کو اس بات کا حکم کرنے میں کہ وہ اپنے اپنے شہروں سے احرام باندھ کر آیا کریں بڑی دقت کی بات تھی جو کہ ظاہر ہے کیونکہ ان میں سے بعض شہر مکہ سے ایک ماہ کی مسافت پر اور بعض دو ماہ کی مسافت پر واقع ہیں تو ضروری ہوا کہ مکہ کے چاروں طرف چند معلوم مقامات خاص کئے جائیں جہاں سے لوگ احرام باندھا کریں اور ان مقامات

(بقیہ حاشیہ ۹) وکان یحب ان یخرج یوم الخمیس، حدیث ، لقلما کان یخرج الا فی یوم الخمیس، فی الصحیحین۔ وقال السخاوی؛ ویقال انہ صلی اللہ علیہ وسلم ھاجر الی المدینۃ یوم الاثنین۔

کے بعد احرام کو موخر نہ کریں، اور ضروری ہے کہ یہ مقامات ظاہر اور مشہور ہوں
اور ان کو ہر شخص جانتا ہو اور اہل آفاق وہاں سے گذرتے ہوں، پس نبی کریم
صلی اللہ علیہ وسلم نے تحقیق فرماکر ان مقامات کا حکم فرمایا۔" [۱]

حاجی کیلئے یہ ضروری ہے کہ وہ میقات سے بغیر احرام باندھے نہ گذرے یعنی میقات آنے سے قبل احرام باندھنا ضروری ہے، جو لوگ ہوائی جہاز سے سفرِ حج کرتے ہیں اور جن کو یہ قوی اندیشہ ہوتا ہے کہ مقام میقات کے آنے کی اطلاع ان کو نہ مل پائیگی ان کو چاہئے کہ وہ ہوائی جہاز پر احرام باندھ کر ہی سوار ہوں، بہر حال ہر حاجی کیلئے ضروری ہے کہ وہ میقات سے گذرنے سے قبل ہی احرام باندھ لے۔ چونکہ اس تقریر کا موضوع مسائل حج بیان کرنا نہیں لہذا احرام کے مسائل سے اعراض کرتے ہوئے اس کی حکمت حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے الفاظ میں تحریر کی جاتی ہے، حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں

"واضح ہو کہ حج وعمرہ میں احرام باندھنا ایسا ہے جیسا کہ نماز میں تکبیر کہنا، احرام کے اندر اخلاص وتعظیم کی صورت اور ایک ظاہری فعل کے ساتھ حج کے ارادہ کا انضباط پایا جاتا ہے اور اس میں لذت کی چیزوں کے ترک کرنے کے سبب سے اور عادات مالوفہ اور ہر قسم کی زینت کی باتیں ترک کرنے کے سبب سے نفس خدا تعالیٰ کے سامنے ذلیل اور متواضع بن جاتا ہے" [۲]

احرام کے ساتھ ساتھ تلبیہ کہنے کا مقصد بھی حاجی کے اندر ذوق وشوق، ولولہ اور ایمان و محبت کی کیفیات پیدا کرانا ہے تلبیہ کے الفاظ یہ ہیں۔

لبيك اللهم لبيك، لبيك لا شريك لك لبيك، ان الحمد والنعمة لك والملك، لا شريك لك۔

"میں حاضر ہوں، اے اللہ میں حاضر ہوں، اے وہ ذات جس کا کوئی شریک نہیں میں حاضر ہوں میں حاضر ہوں، بیشک تمام تعریفیں اور ہر قسم کی نعمتیں اور تمام مملکت صرف تیرے لئے ہے تیرا کوئی شریک نہیں"

مسئلہ کفاءت

احادیث اور اساطین امت کے اقوال کی روشنی میں

مولوی نسیم احمد مظفر پوری، متعلم شعبۂ افتاء دارالعلوم دیوبند

۱۔۔۔۔ شرعی نقطۂ نظر سے کفاءت کی کیا حیثیت ہے

۲۔۔۔۔ محدثین امت اور مسئلہ کفاءت

۳۔۔۔۔ فقہاء، ومجتہدین اور مسئلہ کفاءت

۴۔۔۔۔ کن کن چیزوں میں کفاءت کی رعایت ضروری ہے

۵۔۔۔۔ کیا پیشہ میں بھی کفاءت کا لحاظ ضروری ہے۔

یہ چند امور ہیں جن پر زیر نظر مقالہ میں گفتگو کی جائے گی، ہمارے زمانے میں کچھ حضرات تو مسئلہ کفاءت میں افراط سے کام لیتے ہیں اور کچھ تفریط سے، مگر حق افراط وتفریط کے درمیان ہے، مسئلہ کفاءت کو اگر ہم اس اعتبار سے دیکھیں کہ اس میں کلمہ گو کے درمیان تفریق ہوتی ہے اور ایک مسلمان کو دوسرے کا ہمسر قرار نہیں دیا گیا ہے تو بظاہر مسئلہ کفاءت کا شریعت اسلامیہ سے ٹکراؤ معلوم ہوگا کیونکہ اسلام میں اونچ نیچ اور قبائلی ونسبی فخر ومباہات کوئی چیز نہیں ہے بلکہ ہر کلمہ پڑھنے والا مسلمان ہونے کی حیثیت سے برابر اور مساوی ہے کسی کو کسی پر فوقیت نہیں، قومی اور نسبی اعتبار سے ان میں کوئی اعلیٰ اور کوئی ادنیٰ نہیں، کیونکہ صرف نسب وحسب کے اعتبار سے کوئی عنداللہ مقبول نہیں ہوسکتا اگر نسب ہی مدار فضیلت اور برتری ہوتا تو سرداران مکہ ابولہب، ابوجہل عتبہ دنیا وآخرت میں خاسر ونا کام کیوں ہوتے، اگر

ہاشمی ہے مگر فاسق وفاجر ہے تو اس کا ہاشمی اور سید ہونا سودمند نہیں ہے، عابد وزاہد سید پر اسے فوقیت نہیں، جیسا کہ آپؐ نے اپنے حجۃ الوداع کے آخری خطبہ میں ارشاد فرمایا تھا یا ایھا الناس الا ان ربکم واحد لا فضل لعربی علی عجمی، ولا علی عربی ولا لاسود علی احمر ولا لاحمر علی اسود الا بالتقوی اکرمکم عند اللہ اتقاکم[1]

اے لوگو! تمہارا خدا ایک ہے، کسی عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر اور کالے کو سرخ اور سرخ رنگ والے کو کالے پر کوئی فضیلت نہیں، فضیلت کا مدار تقویٰ اور خوف الٰہی ہے تم میں خدا کے نزدیک مکرم وہ ہے جو متقی ہے ـــ ایک دوسری حدیث میں ارشاد ان اللہ لا ینظر الی صورکم و اموالکم ولکن ینظر الی قلوبکم و اعمالکم[2]

خداوند قدوس تمہاری صورتوں اور تمہارے اموال کو نہیں دیکھتا ہے البتہ تمہارے قلوب اعمال کو دیکھتا ہے کہ کس کا قلب خدا کی طرف زیادہ متوجہ رہتا ہے، ایک دفعہ آپؐ نے حضرت ابوذر غفاریؓ سے فرمایا کہ ابوذر تم کسی احمر واسود سے افضل نہیں ہو الا یہ کہ تقویٰ اور بزرگی فضیلت حاصل کرو۔

اسی طرح طبرانی کی ایک روایت میں ہے کہ عن ابی ھریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال یقول اللہ یوم القیامۃ ایھا الناس انی جعلت نسبا وجعلتم نسبا فجعلت اکرمکم عند اللہ اتقاکم فابیتم الا ان تقولوا فلان بن فلان وفلان اکرم وانی الیوم ارفع نسبی واضع نسبکم این اولیائی المتقون[3]

---

[1] روح المعانی ج ۸ ص ۱۹۴، الترغیب والترہیب ج ۳ ص ۳۱۲ - [2] ابن کثیر وتفسیر بغوی ج ۴ ص ۳۹ - [3] روح المعانی ج ۸ ص ۱۹۴ -

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن خداوند قدوس فرمائیگا، اے لوگو! میں نے ایک نسب بنایا تھا اور تم لوگوں نے بھی ایک نسب بنالیا تھا، پھر میں نے اپنے نزدیک مکرم و پسندیدہ صاحب تقویٰ کو کیا تھا مگر تم لوگوں نے اس کا انکار کردیا اور کہنے لگے کہ فلاں ابن فلاں اور فلاں (دولت و ثروت کے اعتبار سے) زیادہ باعزت ہے، سن لو! آج میں اپنے نسب کو اونچا کردوں گا اور تمہارے نسب کو پست، بیشک میرے اولیاء متقین ہیں۔

صرف یہی نہیں کہ آپ نے مدار فضیلت تقویٰ کو بتایا بلکہ اس پر صحابۂ کرام سے عمل بھی کرا کر امت مسلمہ کیلئے اسوۂ حسنہ چھوڑ گئے، آپ کی پھوپھی زاد بہن حضرت ام المؤمنین زینب بنت جحش جو قریشیہ تھیں مگر آپ نے زید بن حارثہ جو آزاد کردہ غلام تھے اُن سے نکاح کردیا، اسی طرح بنی بیاضہ سے فرمایا کہ اپنی بیٹی کا عقد ابوہند سے کردو حالانکہ ابوہند حجام تھے[1]

مسند احمد کی ایک روایت میں ہے ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم فمن ترضون اتاکم دینہ و امانتہ فزوجوہ "اللہ کے نزدیک تمہارا سب سے زیادہ متقی سب سے زیادہ باعزت ہے لہذا تمہارے پاس جو پیغام لیکر آئے اور تم اسکے دین و دیانت کو پسند کرتے ہو تو اسی سے نکاح کردو

ان احادیث کا تقاضا بظاہر یہ ہے کہ مسئلہ کفارت کی رعایت نہیں ہونی چاہئے اور ایک مسلمان کی شادی دوسرے مسلم گھرانے میں بغیر نسب و حسب اور برادری و پیشے کی رعایت کے ہونی چاہیئے مگر اس کے خلاف اکابر امت دنیاوی مصلحتوں اور گھریلو نظام کے پیش نظر کفاءت اور مساوات کو زن و شوہر کے درمیان ضروری قرار دیتے ہیں، چنانچہ صاحب ہدایہ فرماتے ہیں لان انتظام المصالح بین المتکافئین عادۃ لان الشریفۃ تابی ان تکون مستفرشۃ للخسیس فلابد من اعتبارھا[2] یعنی نکاح کی مصلحتیں چونکہ عام طور پر دو مکافی اور برابر

[1] ترمذی بحوالہ بذل المجہود ص ۲۹ - ج ۳ - روح المعانی ص ۱۹۴ - ج ۸
[2] ہدایہ ج ۲ ص ۳۱۹، ۳۲۰

شخصوں کے درمیان ہی ہو سکتی ہیں اسلئے کہ شریف عورت کسی رذیل کی فراش بننے پر آمادہ نہیں ہوتی اس لئے کفارت کا اعتبار ضروری ہوا صاحب فتح القدیر لان انتظام المصالح کے تحت فرماتے ہیں

یعنی ان المقصود من شرعیة النکاح انتظام مصالح کل من الزوجین بالاخر فی مدة العمر لانه وضع لتاسیس القرابات الصهریة لیصیر البعید قریبًا عضدًا وساعدًا یسره مایسرك ویسوءه مایسوءك وذلك لایکون الا بالموافقة والتقارب ولا مقاربة للنفوس عند مباعدة الانساب والاتصاف بالرق والحریة ونحو ذلك[1]

یعنی مشروعیت نکاح کا مقصود یہ ہے کہ زندگی بھر زوجین میں سے ہر ایک کی مصلحت دوسرے سے پوری ہوتی ہے، اس لئے کہ نکاح کی وضع ہی سسرالی تعلقات کو پیدا کرنے کیلئے ہوتی ہے تاکہ وہ شخص جو قبل از نکاح دور تھا بالکل قریب ہو جائے اور ایک دوسرے کے لئے دست و بازو بن جائے اور جو چیز تمھارے لئے باعث فرحت و مسرت ہو وہ اس کیلئے بھی خوشی کا سبب ہو اور جو چیز تمھارے لئے باعث رنج و الم ہو وہ اس کیلئے باعث رنج ہو اور یہ تعلقات دو خاندانوں کے درمیان موافقت اور مساوات ہی کی صورت میں پیدا ہو سکتے ہیں اور نفوس ایک دوسرے کے قریب نہیں ہو سکتے اگر نسبوں میں دوری ہو یا رقیت و حریت کے ساتھ متصف ہو۔

کفاءت کا اعتبار زوجین کے درمیان کیوں ہونا چاہئے، اس سلسلے میں صاحب فتح القدیر نے بہت ہی لطیف نکتہ بیان کیا جس کی تہہ تک اگر پہنچا جائے تو پھر کفاءت کا مزاج شریعت کے خلاف ہونے کا تصور نہیں پیدا ہو سکتا۔ شریعت نے زندگی کے ہر موڑ پر انسانوں کے فطری

[1] فتح القدیر ج ۲ ص ۴۱۸۔

تقاضوں کی رعایت کی ہے اسلام اور دوسرے مذاہب میں یہی بنیادی فرق ہے مثلاً شریعت محمدیہ سے قبل ہر مذہب و ملت میں تعدد ازدواج کی رسم رائج تھی مگر انسانیت تفریط کی شکار تھی اسلام جب آیا تو اس نے تعدد ازدواج کو کالعدم قرار نہیں دیا کیونکہ ایسا کرنا فطرت انسانی کے خلاف تھا بلکہ اس میں ترمیم کرکے تعدد کو چار میں محدود کر دیا، اسی طرح بیاہ شادی میں حسب ونسب مال وثروت، حرفت وغیرہ میں مساوات ضروری سمجھی جاتی ہے اور دو متناکحین کی مصلحتیں عام طور پر اسکے بغیر پوری بھی نہیں ہوتی تو اگر کفائت کا اعتبار نہ کیا جاتا تو نکاح کی غرض وغایت حاصل نہ ہوتی کیونکہ نکاح کے ذریعہ دو خاندان والے جو قبل از نکاح ایک دوسرے سے بالکل دور تھے اور ان میں باہمی تعلق نہیں تھا ایک دوسرے کے مونس وغمخوار بن جاتے ہیں اور یہ تعلقات اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتے جب تک کہ ان خاندان کے مابین نسب وغیرہ میں برابری نہ ہو اگر کفارت کا اعتبار نہ کیا جاتا تو کتنے گھرانے آباد ہونے اور ایک دوسرے کے قریب ہونے کے بجائے ویران و برباد ہو جاتے، شریف ونیک گھرانے کی لڑکیاں فاسق وبددین گھرانے میں بیاہی جائیں تو ان کی زندگی دوبھر ہو جاتی، عطر فروش گھرانے کی لڑکیاں دباغ وحجام کے گھرانے میں جانے کو آمادہ نہیں ہوتیں، انھیں امور کے پیش نظر متناکحین کے درمیان کفارت کا اعتبار کیا گیا مگر اسے رکن اور شرط کا درجہ نہیں دیا گیا، لہٰذا اگر کوئی عورت اپنا نکاح غیر کفوء میں کرلے تو نکاح ہو جائیگا مگر اولیاء جنھیں دنیا اس موقع پر شرم وعار دلاتی ہے شریعت نے انھیں یہ حق دیا کہ اگر وہ چاہیں تو قاضی کا سہارا لے کر اس نکاح کو فسخ کروا دیں ولہ ای

للولی اذا کان عصبۃ ولو غیر محرم کابن عم فی الاصح خانیۃ الاعتراض فی غیر الکفو فیفسخہ القاضی[۱]

کفارت کس کا حق ہے کفارت خالص اولیاء کا حق ہے اس لئے اگر کسی عورت کا کوئی ولی نہ ہو یا ولی اس کا راضی ہو تو غیر کفو میں بھی اس کے لئے

---

[۱] الدر المختار ج ۲ ص ۱۹۱-

نکاح کرنا درست ہوگا۔ شامی میں ہے الکفاءۃ ھی حق الولی لا حقھا فلو نکحت رجلا ولم تعلم فاذا ھو عبد لا خیار لھا بل للاولیاء ولو زوجوھا برضاءھا ولم یعلموا بعدم الکفاءۃ ثم علموا لا خیار لاحد۔[1]

یعنی کفاءت خالص ولی کا حق ہے عورت کا حق نہیں لہٰذا اگر کسی عورت نے اپنا نکاح کسی آدمی سے کرلیا اور اسے اس کا حال معلوم نہیں تھا مگر بعد میں اس کا غلام ہونا ظاہر ہوا تو اب عورت کو کوئی حق نہیں ہوگا کیونکہ اس نے برضا و رغبت اس سے نکاح کیا تھا اور کفاءت اس کا حق بھی نہیں البتہ اسکے اولیاء کو خیار حاصل ہوگا، اور اگر اولیاء نے عورت کی اجازت سے اس کا نکاح کر دیا اور اولیاء کو اس کا حال معلوم نہیں تھا تو اس صورت میں کسی کو بھی خیار حاصل نہیں ہوگا۔

مسئلہ کفاءت اور محدثین کفاءت کے سلسلے میں بہت سی احادیث وارد ہوئی ہیں جن میں سے بعض احادیث محدثین کے نزدیک ضعیف ہیں اور بعض درجہ حسن کو پہنچتی ہیں اور ان میں سے بعض صحیح ہیں، انھیں احادیث کی وجہ سے محدثین و فقہاء کی اکثریت کفاءت کی قائل ہے اس موقع پر چند حدیثیں نقل کی جارہی ہیں

عن عائشۃ قالت، قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تخیروا لنطفکم وانکحوا الاکفاء وانکحوا الیھم رواہ ابن ماجۃ (۱۴۲) وفی فتح الباری (ص ۱۰۲ ج ۹) اخرجہ ابن ماجۃ وصححہ الحاکم واخرجہ ابونعیم	حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا کہ اپنے نطفے کیلئے اچھا گھرانہ پسند کرو اور کفوؤں میں رشتہ مناکحت قائم کرو اور انھیں سے نکاح کرو، ابن ماجہ نے اس کی تخریج کی ہے اور فتح الباری میں ہے کہ امام ابن ماجہ نے اس روایت کی تخریج کی اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور ابونعیم نے بھی مذکورہ

[1] شامی ج ۲، ص ۸۵

من حدیث عمر ایضا وفی اسناده مقال ویقوی احد الاسنادین بالاخر[1]

حدیث کی تخریج حضرت عمرؓ سے کی ہے مگر اس کی سند میں کلام ہے اور ایک سند دوسری سند کو قوی کرتی ہے

(۲) عن علیؓ رفعه ثلاث لا توخر الصلوة اذا اتت والجنازة اذا حضرت والایم اذا وجدت لها کفوا اخرجه الترمذی والحاکم باسناد ضعیف۔ قلت حسنه السیوطی بالجامع الصغیر وصححه الحاکم والذهبی کلاهما فی المستدرک والاختلاف غیر مضر[2] (اعلاء السنن ص ۶۷، ج ۱۱)

حضرت علیؓ کی مرفوع روایت میں ہے کہ تین چیزوں میں تاخیر نہیں کرنی چاہئے، نماز جب اس کا وقت آجائے، جنازہ جب تیار ہو جائے اور بے شادی شدہ عورت جب اس کا کفو مل جائے، امام حاکم اور ترمذی نے اس حدیث کی تخریج کی ہے سند ضعیف کے ساتھ صاحب اعلاء السنن فرماتے ہیں کہ علامہ سیوطی نے جامع صغیر میں اس روایت کو حسن قرار دیا ہے اور امام حاکم اور علامہ ذہبی نے اس کی تصحیح فرمائی ہے جیسا کہ مستدرک میں مذکور ہے اور یہ اختلاف مضر نہیں ہے[2]

مذکورہ بالا دونوں روایتوں سے مسئلہ کفاءت ثابت ہوتا ہے، حضرت عائشہؓ کی حدیث میں نبی کریمؐ نے صراحتہً کفو میں نکاح کرنے کا امر فرمایا ہے، اب رہا یہ اشکال کہ مذکورہ روایت کس درجے کی ہے تو قاضی القضاۃ حافظ حدیث علامہ ابن حجر العسقلانی الشافعی نے فتح الباری شرح بخاری میں ذکر کیا کہ امام حاکم نے اس روایت کو صحیح قرار دیا ہے البتہ یہی روایت ابونعیم نے حضرت عمرؓ کے طریق سے ذکر کی ہے مگر اس کی سند میں کلام کیا گیا ہے مگر سند اول حاکم کے نزدیک صحیح ہے لہذا اس سند کی وجہ سے یہ سند بھی قوی ہو جائے گی۔

دوسری روایت حضرت علیؓ سے مروی ہے، نبی کریمؐ نے فرمایا کہ تین چیزوں میں تاخیر نہیں

[1] اعلاء السنن ج ۱۱ ص ۶۱، ۷۷۔ [2] ایضاً۔

چاہیئے (۱) نماز کا جب وقت آجائے تو اسے فوراً ادا کر لیا جائے (۲) جنازہ جب تیار
ہو جائے تو اس پر فوراً نماز جنازہ پڑھلی جائے (۳) غیر شادی شدہ عورت کا جب کفو
مل جائے تو اس کی شادی کر دی جائے اور اس میں لیت و لعل نہ کی جائے۔

اس روایت کو امام ترمذی اور امام حاکم نے سند ضعیف کے ساتھ ذکر کیا ہے مگر سیوطیؒ
نے جامع صغیر میں اسے حسن کہا ہے اور امام حاکم اور علامہ ذہبی نے اسے صحیح قرار دیا۔ لیکن محدثین
کے خلاف اثبات مدعا میں مضر نہیں۔ کیونکہ ضعیف روایت بھی تعدد طرق سے درجہ حسن کو
پہنچ جاتی ہے ——— حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے

قال قال رسول اللہ صلی اللہ	نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عرب
...وسلم العرب بعضهم اکفاء	بعض کے بعض کفو ہیں اور اہل عجم ایک
...ض والموالی بعضهم اکفاء	دوسرے کے کفو اور برابر ہیں مگر حائک اور
...ض الاحائك او حجام	حجام، صاحب تنقیح نے کہا کہ یہ روایت منقطع
...صاحب التنقیح هذا منقطع	ہے اس وجہ سے کہ شجاع ابن الولید نے اپنے
...ویسو شجاع ابن الولید	بعض اصحاب کا نام ذکر نہیں کیا صاحب
...ی اصحابه کذا فی نصب	اعلاء السنن فرماتے ہیں کہ قرون فاضلہ میں
...یة ص ۱۸، ج ۲ قلت والانقطاع	روایت کا منقطع ہونا مضر نہیں بالخصوص
المقرون الفاضلة لایضرنا	جبکہ اس روایت کے شواہد موجود ہیں جنھیں
...سیما وله شواهد ذکرها	زیلعی نے پوری تفصیل سے ذکر کیا ہے حافظ
...لعی بالبسط. وقال ابن تیمیة	ابن تیمیہ نے اقتضاء الصراط المستقیم میں لکھا
...اقتضاء الصراط المستقیم	ہے کہ ابوبکر بزاز نے روایت کیا اور اپنی سند
...ابوبکر البزار وذکر سندا عن اوس	اوس بن ضمعج سے ذکر کی ہے اس روایت میں
...ضمعج قال قال سلمان نفضلکم	ہے کہ حضرت سلمان فارسیؓ نے فرمایا کہ اے

یا معشر العرب لتفضیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایاکم لا ننکح نساءکم ولا نؤمکم فی الصلوٰۃ ثم قال وھذا اسناد جید[1]	اہل عرب میں تمہیں فضیلت دیتا ہوں اس وجہ سے کہ رسول اکرمؐ نے تم لوگوں کو فضیلت دی ہے ہم تمہاری عورتوں سے نکاح نہیں کرتے اور نہ تمہاری امامت کرتے، پھر حافظ ابن تیمیہ نے کہا کہ اس روایت کی اسناد جید ہے۔

حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کی مذکورہ بالا روایت سے معلوم ہوا کہ اہل عرب باہم ایک دوسرے کے کفو ہیں اسی طرح اہل عجم بھی ایک دوسرے کے برابر اور کفو ہیں الا یہ کہ کوئی شخص حجام یا حائک ہو تو پھر وہ دوسرے پیشے والے کا کفو نہیں ہوگا، مگر اس روایت کو صاحب تنقیح نے منقطع قرار دیا ہے اور انقطاع کی وجہ انھوں نے یہ ذکر کی کہ اس روایت میں ایک راوی شجاع بن ولید ہیں انھوں نے اسے اپنے بعض اصحاب سے روایت کیا اور ان بعض اصحاب کا نام نہیں ذکر کیا، مگر یہ انقطاع قرن اولیٰ میں ہوا ہے اس لئے یہ قابل احتجاج رہے گی، پھر یہ کہ اس روایت کے کئی شاہد علامہ زیلعی نے بیان کئے ہیں، ان شواہد کی وجہ سے روایت مذکورہ کا انقطاع مضر نہیں۔ حافظ ابن تیمیہؒ نے اپنی کتاب اقتضاء الصراط المستقیم میں حضرت سلمانؓ کا قول ذکر کیا ہے سے بھی مذکورہ روایت کو تقویت ملتی ہے اور اس کی سند کو حافظ ابن تیمیہ نے جید قرار دیا ہے حضرت سلمان کے قول سے بھی صراحۃً ثابت ہوتا ہے کہ اسلام نے متناکحین کے مابین برابری اور کفاءت کا اعتبار کیا ہے، اور حضرت سلمانؓ چونکہ عجمی تھے اس لئے فرمایا کہ تمہاری عورتوں سے نکاح نہیں کرتے اور تمہاری امامت نہیں کرتے۔ قدرت نے بیت اللہ کی وجہ سے مکہ کو تمام عالم پر فوقیت و فضیلت دی تو اگر سید الاولین والآخرین سرتاج انبیا

[1] اعلاء السنن ج ۱۱ ص ۷۷

ر بی صلعم کے وجود با مسعود کی وجہ سے اہل عرب کو تمام دنیا پر فضیلت دیدی جائے تو قابل حیرت
ر بیجابات نہیں ہے، محب و مشتاق کو اپنے محبوب کے در و دیوار اور اہل شہر سے محبت ہوتی ہے
صاحب نصب الرایہ احادیث کفارت کی تخریج کرتے ہوئے فرماتے ہیں قال الشافعی و
صل الکفاءۃ مستنبط من حدیث بریرۃ لانہ علیہ السلام انما خیرھا لان
زوجھا لم یکن کفوا او استدل ابن الجوزی فی التحقیق علی اشتراطھا بحدیث
عائشۃ انہ علیہ السلام قال تخیروا لنطفکم وانکحوا الاکفاء[1]
حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ کفاءت کی اصل حدیث بریرہ سے نکلتی ہے اسلئے کہ نبی کریمؐ نے
انہیں اس وجہ سے اختیار دیا تھا کہ ان کے شوہر ان کے کفو نہیں تھے، ابن جوزی نے کفارت
کے شرط ہونے پر حدیث عائشہ تخیروا لنطفکم سے احتجاج کیا ہے
اگر حدیث بریرہ سے مسئلہ کفارت پر استدلال کیا جائے جیسا کہ امام شافعی نے استدلال کیا
زیادہ بہتر ہوگا اس لئے کہ حدیث بریرہ اپنی سند کے اعتبار سے صحیح ہے اس کی سند پر کوئی کلام نہیں
حافظ ابن حجر تلخیص الحبیر میں احادیث کفارت کو نقل کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

روی انہ صلی اللہ علیہ وسلم قال	نبی کریمؐ سے مروی ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا
ان اللہ اصطفی کنانۃ من بنی	اللہ تعالیٰ نے کنانہ کو بنی اسمٰعیل میں سے منتخب
اسمٰعیل واصطفی من بنی کنانۃ	کیا اور بنو کنانہ میں سے قریش کو منتخب کیا اور
قریشا واصطفی من قریش بنی ھاشم	پھر قریش میں سے بنو ہاشم کو منتخب کیا ترمذی
مسلم والبخاری فی التاریخ والترمذی	کی روایت میں ہے، اللہ تعالیٰ نے اولاد ابراہیمؑ میں
من حدیث واثلۃ وفی روایۃ	سے حضرت اسمٰعیل کو چنا اور اولاد اسمٰعیل
الترمذی وھی الاحد ان اللہ اصطفی	میں سے بنو کنانہ کو، حافظ فرماتے ہیں کہ اس
من ولد ابراھیم اسمٰعیل ومن ولد	روایت کے متعدد طرق ہیں جیسے ہمارے شیخ

[1] نصب الرایہ ج ۳ ص ۱۹۷-

اسمٰعیل کنانۃ الحدیث قلت ولہ طرق جمعہا شیخنا العراقی فی محجۃ القرب فی محبۃ العرب۔ تنبیہ۔ لایعارض ھذا ما رواہ الترمذی عن ابی ھریرۃ مرفوعاً لینتھن اقوام یفتخرون بآبائھم الذین ماتوا فی الجاھلیۃ الحدیث لانہ محمول علی المفاخرۃ المفضیۃ الی احتقار المسلم وعلی البطر وغمص الناس وحدیث واثلۃ تستفاد منہ الکفاءۃ[1]

التلخیص الحبیر ص ۲۹۸ ج ۲

عراقی نے اپنی تصنیف "محجۃ القرب فی محبۃ العرب" میں جمع فرمادیا ہے۔ تنبیہ۔ روایت مذکورہ ترمذی کی اس روایت کے معارض نہیں ہے جس میں آپ نے ارشاد فرمایا کہ وہ لوگ باز آجائیں جو اپنے ان آباء پر فخر ومباہات کرتے ہیں جن کا ایام جاہلیت میں انتقال ہوگیا اس لئے یہ حدیث محمول ہے اس مفاخرت پر جس میں کسی مسلمان کی توہین ہوتی ہو اور جن کا انکار کیا جائے، اور لوگوں کو طعنہ دیا جائے اور حدیث واثلہ سے کفاءت ثابت ہوتی ہے۔

حدیث واثلہ سے نسب وحسب میں کفاءت کا ثبوت ملتا ہے اس لئے کہ حدیث مذکور میں قریش کو دیگر عرب پر اور اہل عرب کو تمام دنیا پر فضیلت دی گئی ہے

امام دارقطنی نے بھی بہت سی روایات ذکر کی ہیں جن سے مسئلہ کفاءت کا ثبوت ملتا ہے

عن سماک بن حرب قال جاء رجل الی علی علیہ السلام فقال امرأۃ انا ولیھا تزوجت بغیر اذنی فقال علیؓ تنظر فیما صنعت ان کانت تزوجت کفوا اجزنا ذلک لھا وان کانت تزوجت من لیس لھا بکفو جعلنا ذلک الیک[2]

سماک بن حرب کہتے ہیں کہ ایک شخص حضرت علیؓ کے پاس آیا اور کہا کہ ایک عورت جس کا میں ولی تھا اس نے بغیر میری اجازت کے اپنا نکاح کرلیا حضرت علیؓ نے فرمایا کہ اگر عورت نے کفو میں نکاح کیا ہوگا تو میں اسے نافذ کردوں گا، اور اگر اس نے غیر کفو میں کیا ہوگا تو پھر اس کا معاملہ تیرے سپرد کردوں گا۔

---

[1] تلخیص الحبیر ج ۲ ص ۲۹۸ – [2] دارقطنی ص ۳۸۹ –

اس سے معلوم ہوا کہ صحابۂ کرامؓ بھی کفارت کا اعتبار کرتے تھے اسی وجہ سے حضرت علیؓ نے اس شخص کی شکایت سن کر فرمایا کہ اگر کفو میں اس عورت نے اپنا نکاح کیا ہوگا تو تجھے کوئی خیار نہیں ملیگا کیونکہ کفو میں نکاح کرنے کی صورت میں اولیار کو خیار فسخ حاصل نہیں ہوتا، ہاں اگر اس نے غیر کفو میں نکاح کیا ہوگا تو اس کا معاملہ تیرے ہاتھ میں کر دوں گا۔

دار قطنی ہی کی ایک دوسری روایت میں ہے۔

عن عبد اللہ بن بریدۃ قال جاءت فتاۃ الی عائشۃ فقالت ان ابی زوجنی ابن اخیہ لیرفع بی خسیستہ وانی کرھت ذلک قالت اقعدی حتی یجئ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاذکری لہ ذلک فجاء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فذکرت ذلک لہ فارسل الی ابیھا فجاء ابوھا وجعل الامر الیھا فلما رأت ان الامر جعل الیھا قالت انی اخترت ماصنع ابی انی انما اردت ان اعلم ھل للنساء من الامر من شئ ام لا قال ابن الجنید فقالت

حضرت عبداللہ بن بریدہ سے روایت ہے کہ ایک عورت حضرت عائشہؓ کے پاس آئی اور کہا کہ میرے والد نے میرا نکاح اپنے بھائی کے لڑکے سے کر دیا تا کہ میرے ذریعہ اس کی دناءت کو دور کرے اور میں اسے ناپسند کرتی ہوں، حضرت عائشہؓ نے کہ بیٹھی رہو جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائیں گے تو ان سے اپنا واقعہ بیان کرنا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو اس عورت نے اپنا واقعہ حضورؐ سے بیان کر دیا آپ نے اسکے والد کے پاس آدمی بھیجا جب وہ آگئے تو آپ نے اس عورت کا معاملہ اسکے سپرد کر دیا جب اس نے دیکھا کہ میرا معاملہ میرے سپرد ہو گیا ہے تو اس نے کہا کہ میرے والد نے جو کچھ کیا میں اسے اختیار کرتی ہوں اور یہ سب میں نے صرف اس لئے کیا تھا تا کہ جان لوں کہ عورتوں کو کچھ اختیار ہے یا نہیں۔

یارسول اللہ قد اجزت ماصنع
ابی ولکن اردت ان اعلم للنساء
من الامر شیٔ ام لا۔

"قولہ فجاءت فتاۃ" قال الدارقطنی
.... الحدیث اخرجہ النسائی
واحمد عن عبد اللہ قال المؤلف
والبیھقی ھذا مرسل ابن بریدۃ
لم یسمع من عائشۃ وان صح
فاجعل الامر الیھا لوضعھا
فی غیر کفو۔

وفی روایۃ ابن ماجۃ عن عبد اللہ
بن بریدۃ عن ابیہ قال الشوکانی
رجالہ رجال الصحیح وکذا اخرجہ
النسائی قال ابن الجوزی وجمہور
الاحادیث محمول علی انہ زوج من
غیر کفو وقولھا زوجنی ابن اخیہ
یدل علی انہ زوجھا من ابن
عمھا، قال الشوکانی قولھا الحدیث
لیرفع بی خسیستہ مشعر بانہ
غیر کفوء لھا

التعلیق المغنی علی دارقطنی ص ۳۸۶ و ۳۸۷

فجاءت فتاۃ "کے تحت تعلیق مغنی میں ہے کہ
اس حدیث کی امام نسائی اور احمد نے
عبداللہ بن بریدہ کے طریق سے تخریج کی
ہے مؤلف اور بیہقی کہتے ہیں کہ یہ روایت
مرسل ہے کیونکہ عبداللہ کا سماع حضرت عائشہ
سے ثابت نہیں ہے اور اگر روایت صحیح ہو تو حضور
نے اس عورت کا معاملہ اسکے سپرد اس وجہ سے
کردیا کہ اس کا نکاح غیر کفو میں کیا گیا تھا اور
ابن ماجہ کی ایک روایت میں عبداللہ بن بریدہ
عن ابیہ مذکور ہے، شوکانی نے کہا کہ اس
روایت کے رواۃ صحیح کے رواۃ ہیں ایسے ہی
نسائی نے بھی اس کی تخریج کی ہے ابن الجوزی
کہتے ہیں کہ تمام روایات اس پر محمول ہیں کہ ان
کے والد نے غیر کفو میں ان کا نکاح کیا تھا اور
اس کا قول "زوجنی ابن اخیہ" دلالت کرتا ہے کہ
چچازاد بھائی سے اس کا نکاح ہوا تھا شوکانی
نے کہا کہ اس کا قول لیرفع بی خسیستہ اس بات
کو بتاتا ہے کہ اس کا نکاح غیر کفو میں ہوا تھا

اس روایت سے بھی معلوم ہوا کہ شریعت نے کفارت اور مساوات کا لحاظ کیا ہے اسی وجہ سے جب اس عورت نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت عالیہ میں اپنا مقدمہ پیش کیا اور عرض کیا کہ حضورؐ میرے باپ نے میرا نکاح بغیر میری اجازت و رضامندی کے اپنے بھتیجے سے کر دیا تاکہ وہ میرے ذریعہ اس کی خساست کو ختم کریں اور مجھے یہ ناپسند ہے تو اگر کفارت کا شریعت میں کوئی لحاظ نہ ہوتا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صاف فرما دیتے کہ جاؤ چاہے تمہارا نکاح کفو میں ہوا یا غیر کفو میں دونوں صورتوں میں نافذ ہو گیا، اب تمہیں کوئی اختیار نہیں مگر امام شوکانی اور ابن جوزی کے بقول چونکہ یہ نکاح غیر کفو میں ہوا تھا اس لئے حضورؐ نے اولاً ان کے والد کو بلوایا اور پھر ان کے سامنے اس عورت کا معاملہ اسکے سپرد کر دیا کہ اگر وہ چاہے تو اس نکاح کو رد کر کے دوسرا نکاح کفو میں اپنی مرضی سے کرلے اور اگر چاہے تو اسی پر راضی ہو جائے، شوکانی اور ابن جوزی کی تصریح اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ عدم کفاءت ہی کی وجہ سے اس عورت کا معاملہ اسکے سپرد ہوا اور حدیث کا لفظ یرفع بی خسیسته اس کا بیّن ثبوت ہے

اب رہا امام دارقطنی اور بیہقی کا اس روایت کو مرسل قرار دینا تو وہ اس وجہ سے درست نہیں کہ اسی روایت کو ابن ماجہ نے ذکر کیا ہے اور اس میں عن عبداللہ بن بریدۃ عن ابیہ عن عائشہؓ موجود ہے اور حضرت بریدہ کے والد کا سماع حضرت عائشہؓ سے ثابت ہے لہذا اس کا مرسل ہونا بھی ختم ہو گیا، اور شوکانی نے کہا کہ اس روایت کے رجال صحیح کے رجال ہیں، پس اس روایت سے بھی احتجاج و استدلال درست ہوگا علاوہ ازیں جمہور فقہاء و محدثین کے نزدیک روایت مرسل بھی قابل حجت ہوتی ہے، اور یہی حضرت امام ابو حنیفہ کا بھی مذہب ہے۔

(باقی آئندہ)

مولانا محمد باقی باللہ قاسمی

اتحاد اسلامی کی راہ میں حائل رکاوٹیں

اتحاد و اتفاق کسی قوم کی وہ عظیم طاقت ہے جس پر قومی زندگی کی پوری عمارت قائم رہتی ہے اور اگر مخالف ہوا کے تند و تیز جھونکے اور سرکش موجوں کے تھپیڑے اس کو ہلانا اور کمزور کرنا چاہیں تو اتحاد و یک جہتی کی قوت اپنی آغوش میں لے کر اس کی حفاظت کرتی ہے، اسلام میں اتحاد اور اجتماعیت کی جو تعلیم دی گئی ہے اس کی تصویر مسلمانوں کے پورے نظام حیات میں نمایاں طور پر نظر آتی ہے، خواہ وہ تہذیب و تمدن ہو یا اخلاق و معاملات، معاشرت و معیشت ہو یا سیاست و قانون، مذہبی امور ہوں یا دنیوی کاروبار غرض کہ ابتدائے آفرینش سے انتہائے موت تک شعبۂ زندگی کا کوئی جزو ایسا نہیں ہے جو وحدت کے جوہر سے خالی اور یک جہتی کی دولت سے محروم ہو۔

لیکن آج کل اتحاد اسلامی کی راہ میں بڑھتی ہوئی مشکلات سے مسلمانوں کا شیرازہ بکھرنے لگا ہے اور ان کی اجتماعیت منتشر ہونے لگی ہے، اگر ان بنیادی عوامل و محرکات کی بیخ کنی کردی جائے جو عملی و نظریاتی طور پر اتحاد اسلامی کے قیام و استحکام کیلئے سد راہ بنے ہوئے ہیں تو پھر مسلمان عہد صحابہ کی یاد تازہ کرسکتے ہیں، اور تقویٰ و طہارت، سیرت صالحہ شجاعت و بہادری، آہنی عزم و ارادہ اور بحیثیت مجموعی کتاب و سنت کے عناصر ترکیبی سے بنی ہوئی جماعت کے سامنے کسی شیطانی طاقت اور سرکش قوت کو سر اٹھانے کی ہمت نہ ہوگی اور ۳۱۳ کی قلیل تعداد ایک ہزار کی کثیر تعداد کے مقابلہ میں غالب ہوسکتی ہے

اور ماضی کی تاریخ پھر دہرائی جاسکتی ہے۔

اختلافات

اتحاد بین المسلمین کو ختم کرنے والے اسباب میں پہلا نمبر اختلاف کا ہے، اس کی دو قسمیں ہیں (۱) فکری (۲) عملی نظری اختلاف کا مصداق جزئیات و فروعات میں فقہائے کرام اور ائمہ مجتہدین کے وہ مسلک و مشرب ہیں جو اپنے اپنے زاویۂ فکر و نظر سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں، اختلاف کی اس نوعیت سے اتحاد اسلامی متأثر نہیں ہوتا بلکہ یہ امتداد زمانہ اور تمدن کی ترقی کی بنیاد پر حالات کی ہر گردش اور واقعات کی ہر کروٹ میں پیش آمدہ مسائل اور ضروریات زندگی کے حل کیلئے راستہ ہموار کرتا ہے اور اس طرح اسلامی زندگی کا ہر گوشہ فقہائے کرام کے مختلف اقوال کے ذخیرہ سے حیاتی کش مکش اور تمدنی تصادم کے شگافوں سے اپنی راہ نکال لیتا ہے، اسی لئے کہا گیا اختلاف الائمۃ رحمۃ -

البتہ وہ اختلاف جو اساسات شریعت اور ضروریات دین میں ہو (جن میں توحید رسالت، قرآن کا منزل من اللہ ہونا اور بدرلیعۂ تواتر بغیر کسی تحریف کے ہم تک پہنچنا، ارکان خمسہ، اسی طرح خمر و خنزیر کی حرمت وغیرہ امور آتے ہیں) وہ کفر کے ہم معنی ہے اور اس میں اختلاف کرنے والے زمرۂ مسلین سے خارج ہیں، رہا وہ اختلاف جو عقائد اسلامی اور نازک کلامی مسائل کو فلسفۂ یونان کی آمیزش کے ساتھ عوام کے سامنے پیش کرنے کی صورت میں رونما ہوا تھا جس میں صفات باری تعالیٰ کے اثبات و نفی اور بندہ کی قدرت خداوند قدوس کی قدرت کے مقابلہ اور اسی نوع کے دیگر مسائل میں حد سے زیادہ غلو کی بنا پر علماء و عوام کی شیرازہ بندی اور جمعیت میں خلل نفع ہوا تھا، تو یہ بحث ہمارے موضوع سے خارج ہے کیونکہ اس وقت فلسفہ و حکمت کا غلبہ تھا، ہر چیز کو عقل کی کسوٹی پر پرکھا جاتا تھا اس لئے اسلامی معتقدات اور ما وراء الطبیعی تخیلات میں تزلزل و انتشار پیدا ہونے کے اندیشے سے فلسفۂ یونان

کی کتابوں کا عربی زبان میں ترجمہ کیا گیا اور رفتار زمانہ کے مطابق فلسفیانہ انداز بیان میں عقائد وایمانیات کے حصہ کو عوام کے سامنے پیش کیا گیا، اس سے اگرچہ آپس میں اختلاف بھی پیدا ہوا لیکن لوگ گمراہی اور ضلالت کے گڑھے میں گرنے سے بچ گئے، نیز ان علماء کی یہ سرگرمی سراسر نیک نیتی اور خلوص پر مبنی تھی۔

اعتقادی اختلافات — ۱

فکری اختلاف کا ایک اور پہلو ہے جو مادی و ایمانی نقطۂ نظر کے اختلاف سے نکلتا ہے اس نے ملحدوں اور مسلمانوں دونوں کی زندگی کے راستے الگ الگ کردیئے ہیں، الحاد و دہریت پسند لوگوں کا نظام اخلاق وضابطۂ حیات چونکہ عقلیات، مشاہدات اور تجربات کے ذریعہ مرتب ہوتا ہے اس لئے اس کے پیچھے کوئی خدائی قانون اور بعث بعدالموت کا تصور نہیں ہوتا کہ آپ سے آپ انسان ضوابط کی تعمیل پر کاربند ہو، پھر خود ساختہ قوانین میں جو خرابیاں اور مہلکات ہوتے ہیں وہ اپنی جگہ پر الگ رہے

جب کہ مسلمانوں کے قوانین حیات کی پشت پر الٰہی سند اور اتھارٹی ہوتی ہے جو اندر سے ان کو احکام کی پابندی پر مجبور کرتی ہے، پھر جبکہ وہ بجائے خود فطرت سلیمہ کے مطابق اور ہر طرح کی غلطی ونقص سے پاک ہیں اس لحاظ سے ملحدین اپنے امور کی عمل پیرا ہونے میں جلوت میں بھی آزاد اور مسلمان اپنے ضابطہ کی پابندی میں خلوت میں بھی پابند ہوتے ہیں، اس طرح یہ اختلاف عالمی پیمانے پر اتحاد اسلامی کے لئے سدّراہ بنتا ہے اس کو خارجی اختلاف سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

اسی طرح اسلامی مکتب خیال کے جزیاتی اختلاف کے نتیجہ میں جو متعدد گروہ اور مختلف فرقے مسلمانوں میں پیدا ہو گئے ہیں (جن میں دیوبندی، بریلوی، غیر مقلدین، جماعت اسلامی وغیرہ کے نام زور وشور سے لئے جارہے ہیں) جسے داخلی اختلاف سے تعبیر کیا جا سکتا

ہے، اس نے بھی اسلامی جمعیت کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔

خارجی اختلاف کو مٹانے کی صورت یہ ہے کہ ملحدین کے سامنے اسلام کی غیر متزلزل حقیقت ابدی صداقت اور لازوال اخلاقی قدروں کو قومیت کے بجائے انسانیت کی بنیاد پر عقلی اور سائنٹفک اندازِ بیان میں پیش کرکے انھیں اپنا بنایا جائے، اور داخلی اختلاف کو ختم کرنے کا طریقہ یہ ہوسکتا ہے کہ ہر مکتبِ خیال کے مسلمان جن کی شاخیں ایک ہی درخت سے پھوٹی ہیں ایک جگہ بیٹھ کر سمجھوتہ کریں اور اپنے اپنے مسلک پر باقی رہتے ہوئے اسلامی پیغام کو عام کرنے اور اتحاد واستحکام کی دیوار کو مضبوط بنانے کیلئے متحد ہوکر کام کریں اور ان تمام مناظروں بلکہ مجادلوں اور مباحثوں سے دستکش ہوجائیں جو آپس کی طاقت کو نقصان پہنچاتے ہیں۔

عملی اختلاف :- ۲

دوسری قسم کا اختلاف باعتبار فعل وعمل افتراق وانتشار کا دوسرا سبب ہے اس نے اپنا میدان سیاست وقیادت اور حکومت کو بنایا ان امور کی اساس پر فکر ونظر کے زاویے بدلے، مذہب ودین کا سہارا لے کر سیاسی مفادات حاصل کرنے کی کوشش کی گئی اور کبھی کبھی افکار وخیالات بالکل لامذہبیت ولادینیت کے رنگ میں رنگ گئے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مختلف پارٹیاں اور جماعتیں معرض ظہور میں آئیں اور اقتدار اور تخت شاہی کے حصول کیلئے آپس میں ایک دوسرے کے خلاف برسرجنگ رہیں۔

ایسی کش مکش صرف ان ہی لوگوں تک محدود نہیں رہتی جو سیاست وحکومت کی لڑائی لڑتے ہیں بلکہ اس کا اثر ان تمام باشندگان ملک تک پہنچتا ہے جو سیاسی پارٹیوں سے نقطۂ نظر میں کسی طرح کا اتفاق رکھتے ہیں، اور ان میں بھی وہی کشیدگی اور تناؤ پیدا ہوتا ہے جو اربابِ سلطنت وسیاست میں ہوتا ہے، ان نظامہائے حکومت وتدبیرہائے سلطنت میں جو روح

کام کرتی ہے، وہ عشرت پسندی، لذت کوشی اور جاہ طلبی کے جذبات ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ خلفائے راشدین کے بعد خلافت ملوکیت میں تبدیل ہوگئی، اور حکومت کی تشکیل و تنفیذ ان خطوط پر بند ہوگئی جو قرآن نے عدالت، شوریٰ اور اطاعت امیر کی بنیاد پر کھینچے تھے، پھر قیام حکومت کے بعد اس کی تنفیذ جادۂ شریعت سے ہٹ گئی اس لئے امراء و عوام کے عقائد و اعمال میں طرح طرح کی خرابیاں پیدا ہونی شروع ہوگئیں، یا اگر آج کل جہاں کہیں بھی اسلامی جمہوری حکومت قائم ہے وہاں بھی کسی نوعیت سے شخصیت پرستی ہے اور جہاں غیر اسلامی جمہوری حکومت ہے وہاں لادینی و غیر فطری قوانین کے نفاذ سے وہی انتشار و افتراق پایا جاتا ہے جو وحدت امت سے میل نہیں کھاتا اور تعلیمات اسلامی سے متصادم ہے۔

اس طرح اسلام جس وسیع پیمانے پر معاشرہ کے اتحاد اور امت کی برابری اور مساوات کی داغ بیل ڈالنا چاہتا ہے اور ضروریات زندگی اور مقتضیات حیات کی کثرت میں رنگ نسل، قومیت اور زبان و تہذیب کے بجائے تقویٰ، اخلاقی بلندی اور فوق البشری ہدایت مگر فطرت و طبیعت سے ہم آہنگ طریقہ پر سماج کی وحدت کو جس شاہراہ پر چلانا اور پھیلانا چاہتا ہے، سیاست و حکومت کی غیر اسلامی تشکیل و تنفیذ اس کی راہ میں زبردست رکاوٹ ہے اس سے نہ صرف اتحاد اسلامی کی رفتار سست پڑتی ہے بلکہ ملی وجود اور اسلامی تشخص کو بھی خطرہ درپیش ہے۔

سرمایہ داری اور اشتراکیت — ۳

سرمایہ دارانہ نظام معیشت میں ہر شخص اپنے مال اور وسائل ثروت کا تنہا مالک ہوتا ہے وہ جس طرح چاہے دولت کمائے اور جس چیز میں چاہے تصرف کرے، کوئی اسکے مال میں ذرہ برابر حقدار نہیں ہوتا، پھر حاصل شدہ منافع کو اپنے ذاتی مفاد میں خرچ کئے بغیر صرف آور پیداوار کے استعمال کیلئے لگایا جائے، اور سماج اور دوسروں

کی خیر خواہی وخبر گیری کو نظر انداز کر کے ازدیاد مال کا یہ سلسلہ برابر چلتا رہے پھر اخلاقی راہ سے نہ کوئی آئین اس سے باز پرس کر سکے اور نہ کسی اسٹیٹ اور جماعت کو یہ حق ہو کہ اس پر دارو گیر کرے، دوسری طرف وہ لوگ جو وسائل و ذرائع کی کمی یا ذہنی وقوائے عمل کے عدم استطاعت کے باعث مستقل کاروبار کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں وہ سرمایہ داروں کے غلام بن کر یا ان کی خدمت کر کے زندگی بسر کریں۔

ظاہر ہے اس طرز معیشت سے جو نقشۂ حیات تیار ہوگا وہ یہ ہے کہ معاشرہ سے ہمدردی، اخوت اور امداد باہمی کی روح مفقود ہو جائے گی اور ایک، لکھ پتی و کروڑ پتی آدمی ہزاروں ابنائے آدم کے افلاس و درماندگی کا نتیجہ ہوگا، اس طرح ایک طرف ساہوکاروں، سرمایہ داروں، زمینداروں اور کارخانہ داروں کا طبقہ وجود میں آئے گا، تو دوسری طرف قرضداروں، مزدوروں، کسانوں اور کمزوروں کا گروہ پیدا ہوگا، اس نظام سے تقسیم دولت کا توازن بگڑنے اور ایک ابنائے آدم کے درمیان معیشت کا صحیح تناسب قائم نہ ہونے کی بنا پر طرز زندگی اور اخلاقیات میں جو تفاوت پیدا ہوگا وہ اتحاد امت اور وحدت قوم کی روح ومزاج دونوں سے متعارض ہوگا

اب اشتراکیت کو لیجئے اس نظریہ کی بنیاد پر افراد کے لئے شخصی ملکیت کا کوئی سوال ہی نہیں، جو وسائل ثروت ہوں وہ مخصوص سوسائٹی کے درمیان مشترک رہیں وہی ان پر مالکانہ قبضہ رکھے اور ان میں تصرف کرے اور افراد جماعتی مفاد کیلئے جو کچھ خدمات انجام دیں اسی کے بقدر سوسائٹی ان کو معاوضہ دیکر تقسیم دولت کرے، یہاں سرمایہ دار کے بالکل برعکس عام لوگوں کو نہ انشورنس یا ورکر فنڈ کے ذریعہ روپیہ جمع کرنے کا حق ہے نہ اس میں تصرف کرنے کی گنجائش بلکہ ان کی حیثیت ایک مزدور کی سی ہوتی ہے جس کو صرف مزدوری اور معاوضہ تک اختیار رہتا ہے

معاشی ظلم وستم کی یہ داستان یہیں تک ختم نہیں ہوتی بلکہ جماعتوں اور سوسائٹیوں

سے نکل کر اس نقطۂ انتہا پر پہنچتی ہے جس کا نام اشتراکی حکومت ہے، وہ پورے جبر واستبداد کے ساتھ شعبۂ حیات میں دولت تقسیم کرتی ہے، اور پورے اشتراکی سسٹم کی باگیں اپنے ہاتھ میں رکھتی ہے اور بالآخر بے بس افراد اور خود مختار جماعتوں کے غیر معمولی تفاوت سے ایک منطقی لزوم کے ساتھ بالکل اسی طرح چھوٹے اور بڑے دو طبقے وجود میں آتے اور امتیازات کے درجے قائم ہوتے ہیں، جس طرح سرمایہ دارانہ نظام میں اشتراکی نظام کا مقصد سرمایہ داری کے برخلاف اگرچہ تمام لوگوں کے درمیان حقوق کا صحیح تناسب قائم کرنا ہے، اور یہ نظریہ بجائے خود صحیح ہے لیکن معاشی توازن کے لئے جس طریقۂ کار کو اختیار کیا گیا ہے وہ غلط ہے کیونکہ کوئی فرد اسی وقت دلچسپی اور لگن کے ساتھ کاروبار میں سرگرم عمل ہو سکتا ہے جب کہ وسائل پر اس کو شخصی ملکیت اور تصرف میں خود مختاری حاصل ہو، اگر اسکے تمام اختیارات چھین لئے جائیں تو اسکے کام میں وہ اسپرٹ اور تیز رفتاری نہیں پیدا ہو سکتی جو بصورت دیگر ہوتی ہے یہ ہر فطرت انسانی کا خاصہ ہے جسے کوئی منطق دل و دماغ کے ریشوں سے نہیں نکال سکتی، چہ جائیکہ اموال کی تقسیم مقررہ حد سے تجاوز کر کے قوت لایموت سے بھی کم تک پہنچ جائے

آج روس کی سویت گورنمنٹ نے رعایا کو جبر واستبداد کے جس آہنی شکنجے میں جکڑ دیا ہے، دنیا کی کوئی شخصی حکومت اس کی مثال پیش کرنے سے عاجز ہے، یہی وجہ ہے کہ اشتراکی شاخسانہ سے افراد میں اتحاد و مساوات تو کجا خود جماعت و حکومت کے خلاف بغاوت کا جذبہ ابھرتا ہے اور بدامنی پھیلتی ہے، گویا سرمایہ داری جس طرح چمک دمک میں ایک خوشنا لیبل معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ہر آدمی کو لکھ پتی و کروڑ پتی بننے کے مواقع مہیا ہوتے ہیں مگر مآل کار میں دولت کی پس اندازی سے دوسرے ہزاروں انسانوں کے حق میں نتیجہ افلاس اور غربت نکلتا ہے، اسی طرح اشتراکی نظام میں ظاہری خوبصورتی کے بالکل برعکس باطن میں اس کا ماحصل خراب ظاہر ہوتا ہے۔

ان دونوں انتہاؤں کے بین بین اسلام ایک معتدل نظام قائم کرتا ہے، جس کا اصل الاصول یہ ہے کہ تمام نوع انسانی کے حقوق یکساں ہیں ہر ایک کو شخصی و فطری ملکیت حاصل ہے وہ اپنی قوت و قابلیت کے مطابق اکتساب مال بھی کرسکتا ہے اور جمع و خرچ بھی مگر اس طرح کہ اجتماعی راحت رسانی کے خلاف نہ ہو، اسی طرح جماعت کے مفاد کیلئے فرد کے فوائد کو قربان نہیں کیا جاسکتا، ایک طرف اسلام نے دولت کے توازن کو قائم کرنے کیلئے اخلاقی راہ سے کچھ پابندیاں عائد کیں تو دوسری طرف قانونی راہ سے چند ضوابط کا پابند بنایا، چنانچہ زکوٰۃ، صدقات، عشر، میراث وغیرہ کے نظام کو پوری انسانی برادری میں اموال کی گردش اور دولت کے پھیلاؤ کا ذریعہ بنایا، تاکہ مال سمٹ کر ایک جگہ جمع نہ ہوجائے بلکہ ہر فرد کو اس کا متناسب حصہ ملے، اور افراد میں باہمی موافقت و معاونت اور پڑوسیوں کی خیر خواہی کو ایمان و دین کا لازمہ قرار دیا تاکہ آپس میں ہمواری و مساوات، اخوت اور محبت کی فضا قائم ہو، اور بحیثیت مجموعی اس نے فرد و جماعت کے انفرادی و اجتماعی مفادات کو پوری یکسانیت کے ساتھ ایک دوسرے سے مربوط کردیا تاکہ پوری امت وحدت کے جوہری خطوط پر چل کر سفر زندگی طے کرے۔

سائنس و فلسفہ ــــ ۴

موجودہ دور میں سائنس و فلسفہ نے تہذیب و تمدن اور معاشرت و معیشت میں جو انقلاب برپا کیا ہے اس کے جراثیم عقائد اور ایمانیات تک میں سرایت کرگئے ہیں اس لئے کہ اس کی بنیاد سائنس و فلسفہ کی وہ تھیوری ہے جو نری عقل مجرد مشاہدہ اور محض تجربہ کی سرحد تک محدود ہے، وہ دنیا میں پائی جانے والی ہر چھوٹی بڑی چیز کو انھی تین ذرائع کی کسوٹی پر کستی ہے اور انھی کی عینک سے دیکھتی ہے چنانچہ زمین اور

اس میں پائے جانے والے ذرات، آسمان اور اس میں چمکتے ہوئے چاند ستارے کائنات اور اس میں پھیلے ہوئے نظارات، یہ سب سائنس وفلسفہ کی طبع آزمائی کی جولان گاہ ہیں ان میں سے کوئی چیز اگر اپنے معیار پر اُترے تو اس کا وجود ہے ورنہ نہیں لیکن وہ فوق البشری تخیلات اور مذہبی معتقدات جن کا علم انسان کو بذریعہ وحی انبیاء ورسل کی وساطت سے ہوا ان کے ہر جزو کا عقل، تجربہ اور مشاہدہ کی گرفت میں آنا ضروری نہیں ہے، یہ اور بات ہے کہ اکثر عقائد اسلامی میں عقل کی موافقت حاصل ہے لیکن اگر محض عقل کو سررشتہ دین میں بنی آدم کی رہنمائی کے لئے کافی مان لیا جائے تو انبیاء ورسل کی بعثت بے معنی ہو جائے گی، عقلیات نے غیبی خیالات اور خدائی ہدایات میں ایسی دخل اندازی کی اور اس میں ایسا رسوخ حاصل کر لیا کہ جن لوگوں پر اس کا جادو چل گیا وہ اسی کے ہو کے رہ گئے اور ان کے نزدیک دین ومذہب کوئی چیز نہیں رہی، اس طرح اس نے عقائد میں تزلزل وانتشار پیدا کر کے قوموں کو شریعت مطہرہ کے جادۂ حق سے ہٹا کر مختلف راہوں پر چلا دیا، دوسری طرف ٹکنالوجی اور تمدن کے فروغ کے ذریعہ عیش وعشرت اور رزم وبزم کی داستان چھیڑی، اور نتیجہ کے طور پر اسلام سے مختلف ایک دوسرا نظام زندگی کا ڈھانچہ تیار ہو گیا، اور بحیثیت مجموعی قوائے فکر وعمل اسلام کے بجائے ایک دوسرے نقشۂ حیات پر کام کرنے لگے۔ گویا سائنس وفلسفہ نے عقل کی راہ سے فکر وعمل کے دونوں شعبوں میں اسلامی اتحاد کو مٹانے کا کام انجام دیا، اس لئے اس کو اتحاد اسلامی کی راہ میں بڑھتی ہوئی مشکلات میں سے کہا جانا عین حقیقت کے مطابق ہے

۵ــــ تعصب اور غیر اخلاقی امتیاز

رنگ، نسل، قومیت، زبان اور تہذیب کی اساس پر امتیاز کا جاہلی تصور انسانیت کیلئے وہ لعنت ہے جو اتحاد واستحکام کی دیوار کو گھن کی طرح کھا جاتی ہے، طلوع اسلام

کے وقت عربوں کی کیا حالت تھی، تفصیل کے ساتھ تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہے، مختصر الفاظ میں یہ کہ عرب کی زندگی میں مختلف بدعات و خرافات اور جاہلانہ رسومات ومیلانات کے علاوہ نسلی وقومی تعصب سے پیدا ہونے والی چھوٹی سی چھوٹی بات بجائے خود ایک اہم اور گمبھیر مسئلہ بن گئی تھی جس کے نتیجے میں جھگڑا و تکرار سے تجاوز کرکے کشت وخون تک کی نوبت آتی تھی، مگر آفتاب اسلام کی شعاعیں ہر چہار جانب پھیلیں اور آپس میں محبت والفت کی فضا قائم ہوگئی. اسلام نے ذات پات، کالے گورے اور اونچ نیچ کے سارے غیر اخلاقی امتیازات ختم کر دئے اور برتری وسربلندی کا معیار تقوی وطہارت کے ان اصول پر قائم کیا جو صراط مستقیم پر گامزن کرکے بندہ کا رشتہ خدائے وحدہ لاشریک سے جوڑ دیں، چنانچہ ارشاد ہوا. یا ایھا الناس انا خلقنا کم من ذکر و انثی وجعلنا کم شعوبا وقبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم، پھر شمع رسالت کے ارد گرد پروانہ وار صحابہ کرام کی جو عظیم اجتماعیت اور طاقت تیار ہوئی اور نصرت خداوندی اور فتوحات غیبی کے جو دروازے کھلے اس کے واقعات آپ کو معلوم ہیں۔

دنیا کی تاریخ شاہد ہے کہ جب بھی کسی زمانہ میں اسطرح کے فتنہ تعصب نے سر نکالا تو طبقاتی کش مکش سے آدمے کا آدا تباہ ہوگیا اور شکست وپسپائی قوم کیلئے لازمی چیز بن گئی آج افریقہ میں سیاہ فام اور سفید فام کا جو تعصب تباہی وبربادی کا رنگ دکھارہا ہے اس سے کون واقف نہیں ہے، مسلم قومیت کو چھوڑ کر تعصب کسی بھی قوم کے اپنے دائرہ کیلئے بھی باعث ہلاکت ہوتا ہے اور وحدت ویگانگت وسیلۂ فتمندی ہوتی ہے یہ جائیکہ اسلام ہر رنگ ونسل اور زبان وتہذیب کی حد بندیوں اور جغرافی سرحدوں کو توڑ کر معاشرہ کو شرعی خطوط کے مطابق روئے زمین کے تمام خطوں پر پھیلانا چاہتا ہے اور انسانوں کی ایک عالمگیر برادری قائم کرنا چاہتا ہے۔

کتاب وسنت سے انحراف — ۶

آپس میں تفرقہ ڈالنے والے مذکورہ بالا عوامل یا دوہ اسباب جو حالات و زمانہ کے اختلاف سے بدلتے رہتے ہیں اور ہر دور کے سیاسی وثقافتی معیار کے مطابق رونما ہوتے رہتے ہیں بحیثیت مجموعی سب ایک بنیادی عامل میں آکر سمٹ جاتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ جب بھی کبھی لوگوں میں کتاب وسنت سے یک سرمو انحراف پیدا ہوتاہے یا شریعت اسلامیہ سے بے اعتنائی برتی جاتی ہے تو آپس کا اتحاد و اتفاق ختم ہوجاتا ہے اور وحدت ویگانگت کا ماحول افتراق وانتشار کی فضا میں تبدیل ہوجاتاہے کیونکہ اسلام انسانی فطرت کی موافقت کے ساتھ ایک مکمل اور جاوداں ضابطۂ حیات ہے جس کی ہر کڑی اور ہر جزد دوسری کڑی اور دوسرے جزد سے باہم مربوط ہے، اگرچہ ظاہر میں اس کی تمام اکائیاں ایک دوسرے سے مختلف نظر آتی ہیں یہی نہیں بلکہ کائنات میں پائے جانے والے تمام نظامات ہم رنگ وہم آہنگ ہیں اور ایک قادر مطلق کے قانون وفرمان کے مطابق گردش کر رہے ہیں اس لئے کسی بھی زاویۂ حیات میں کتاب وسنت سے انحراف عین اس کا تقاضا کرتاہے کہ اس کی یک رنگی دو رنگی وسہ رنگی میں تبدیل ہوجائے۔

اتحاد اسلامی کی راہ میں ان بڑھتی ہوئی مشکلات کو ختم کرکے اگر کوئی صورت اتفاق ویکجہتی کی فضا قائم کرنے کی ہے تو وہ یہ ہے کہ گروہ بندی اور تمام غیر اخلاقی امتیانات کو چھوڑ کر پوری انسانیت ایک پرچم توحید کے سایۂ رحمت میں آجائے اور اتحاد اسلامی بلکہ مجموعی حیثیت سے قرآن وحدیث کے تمام دستور کی تنفیذ کو مخالفین کی موجوں کی دستبرد سے بچایا جائے کیونکہ قرآن اختلافی عقائد کو نظرانداز کرکے مشترک بنیادوں پر اتحاد کی دعوت دیتاہے۔ قل یا اھل الکتاب تعالوا الی کلمة سواء بیننا وبینکم ان لا نعبد الا اللہ ولا نشرك به شیئا ولا یتخذ بعضنا بعضا اربابا من دون اللہ (آل عمران) ۔

علمِ طب اور مسلمان

از قلم :- محمد بیر قدار۔ ترجمہ و تلخیص :- مولوی ابوالکلام قاسمی

اسلامی تہذیب میں سب سے زیادہ شہرت یافتہ شعبہ دنیوی علوم میں علم طب ہے مسلمانوں نے علم طب میں ایسی بے مثال خدمات انجام دی ہیں کہ رہتی دنیا تک لوگ اس سلسلہ میں ان کے شکرگذار رہیں گے۔ مسلمانوں میں علم طب کا آغاز اسلام کے شروع ہی سے ہوگیا تھا، اسلام ہمہ گیر دین ہے جس نے زندگی کا کوئی شعبہ نہیں چھوڑا وہ کیونکر پاکی اور طب کے موضوع کو چھوڑ سکتا تھا، قرآن کریم کی بہت سی آیتیں ہیں جن میں طب اور صحت اور طہارت کے موضوع شامل ہیں، اور احادیث تو بہت زیادہ ہیں، اس موضوع پر بہت سے لوگوں نے "طب نبوی" کے نام سے مستقل تالیفات کی ہیں، اور یہ حدیثیں صحیحین، ابوداؤد، ترمذی اور دوسری حدیث کی کتابوں میں بکثرت پائی جاتی ہیں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے طہارت، صحت، بیماری وغیرہ کے متعلق بیان فرمایا ہے، آپؐ نے بعض بیماریوں کی تعیین بھی فرمائی ہے مثلاً جذام، اعضاء کا شل ہوجانا، آنکھ کی بیماری وغیرہ، نیز رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یونانیوں کے داغ دیکر کئے جانے والے علاج سے منع فرمایا ہے۔

مسلمانوں میں سب سے اول حکیم اور ڈاکٹر حارث بن کلدہ رضی اللہ عنہ گذرے ہیں۔ (م ۱۳ھ) یہ پہلے مسلمان ڈاکٹر ہیں جنھوں نے طب کو پڑھا اور پہلی صدی ہجری میں اس کو پیشہ بنایا، حارث بن کلدہ رضی اللہ عنہ نے جو بیش قیمت خدمت اسلامی معاملہ میں انجام دی ہیں وہ آگے چل کر اسلامی سوسائٹی کے لئے ایک نمونہ بن کر ابھری آپ کے بعد آپ کے صاحبزادے نضر بن حارث بن کلدہ نے یہ خدمت انجام دی۔

مسلمانوں نے طب پر کافی زور دیا، حتی کہ یونان کے بادشاہ ایک ایک کتاب دیکر بھی مسلمان بادشاہوں کا تقرب حاصل کرتے تھے، چنانچہ تیسری صدی ہجری میں بڑے بڑے ماہرین حکیم پیدا ہوئے۔ مثلاً ابویوسف یعقوب الکندی جو فیلسوف العرب کے نام سے بھی مشہور ہیں، مامون کے زمانہ میں سائنسی دنیا کے روشن ستارے بنے۔ ان کو اسکے علاوہ علم طب اور فن ریاضی اور موسیقی اور فن منطق اور علم الافلاک سے بھی کافی دلچسپی رہی ہے۔ ۷۹۶ء ۸۶۳ء۔ ان کے علاوہ علی بن سہل بن ربّن ہیں ۸۵۰ء ۸۶۱ء میں جو علم طب کے مشہور لوگوں میں ان کا شمار ہے، انکی کتاب فردوس الحکمت بڑی مشہور رہی ہے، پہلے یہ نصرانی تھے بعد میں ۸۵۵ء میں انھوں نے اسلام قبول کیا اور عیسائیوں کے رد میں ایک کتاب "الرد علی النصاری" تالیف کی، ان کی تالیف "فردوس الحکمت" ایک طبی انسائیکلوپیڈیا سے کم نہیں ہے، اس میں ۳۲۰ فصلیں ہیں، علم طب کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے اور یہ کتاب علم طب کا اہم ترین مرجع سمجھی جاتی رہی ہے، مرض کی تشخیص اور دوا کی ترتیب میں اپنی مثال آپ ہے۔ ——— اس صدی کے نصف ثانی میں جس حکیم کا نام صف اول میں شمار کیا جاتا ہے وہ بھی طبری کے شاگرد ہیں اور ان میں سب سے زیادہ ماہر ابوبکر محمد بن زکریا رازی ۸۶۴ء ۹۳۲ء ہیں، آپ عرب کے مشہور ترین حکیموں میں سے ہیں، "رَیّ" میں پیدا ہوئے عرب کا جالینوس آپ کا لقب تھا ری۔ اور بغداد میں شفاخانہ بنایا، طب کے علاوہ دیگر موضوعات پر بھی آپ کی بہت سی کتابیں ہیں مثلاً "الحاوی" اور (الطب المنصوری) حاوی پر مغرب میں گیارہویں صدی سے اٹھارہویں صدی تک بحث ہو چکی ہے، آپ قرون وسطی کے سب سے بڑے طبیب شمار ہوتے ہیں پانچویں صدی ہجری میں قدم رکھنے سے قبل ہم ایک قابل ذکر کتاب کا تذکرہ کئے دیتے ہیں جس کے مصنف کو "ابن قرہ" کے نام سے تاریخ یاد کرتی ہے (۸۲۶ء سنہ ۹۰۱ء) ان کی کتاب (الناظرة فی علم الطب) مشہور ہے چھٹی صدی ہجری کے نصف اول میں کوئی بڑا حکیم اور ڈاکٹر نہیں گذرا ہے پھر بھی ہم حکیم سنان بن ثابت کا نام ذکر کرتے چلتے ہیں جو خلیفہ المقتدر باللہ القاہر الراضی" کا

معالج اور حکیم رہا ہے، البتہ اس صدی کے نصف ثانی میں چوٹی کے حکیم اور ماہرین طب پیدا ہوئے مثلاً علی بن عباس المجوسی المتوفی ۹۹۴ء آپ مشرق اور مغرب میں برابر کی شہرت رکھتے ہیں، آپ کی کتاب "کامل الصناعۃ" ہے اس زمانہ کے مشہور اطباء میں "ابن الجزر" ہیں جو جڑی بوٹیوں میں ماہر اور کامل تھے، آپ نے مصر میں وفات پائی ۱۰۰۹ء میں، حضرت ابوالقاسم الزہراوی جن کا چارسو ہجری کے بعد انتقال ہوا آپ اندلس کے سب سے بڑے حکیم اور سرجن تھے، یورپ میں جدید بیداری تک انھیں کی علمی وطبی سرگرمیاں اور دلچسپیاں کارفرما ہیں، بہت سے آپریشن کے آلات کو انھوں نے ایجاد کیا فن جراحت میں آپ کا ایک مشہور مقالہ ہے "المقالۃ فی عمل الید" اور موصوف اپنی مشہور تصنیف "التصریف لمن عجز عن التصنیف" کی وجہ سے بڑے مقبول ہوئے نیز اس صدی کے نصف ثانی کے اہم اطباء میں ابوالقاسم زہراوی ہیں، پانچویں صدی میں جو سب سے بڑا حکیم اور طبیب پیدا ہوا وہ "ابن سینا" ہے، ابن سینا بچپن سے علم وریسرچ کا مشتاق تھا ابھی سترہ ہی سال کا ہوا تھا کہ بخاریٰ کے بادشاہ کا علاج کیا جبکہ بڑے بڑے حکیم اسکے علاج سے عاجز ہو چکے تھے، بادشاہ نے شفا پانے کے بعد وہ قیمتی کتب خانہ جو بعد میں جلکر راکھ ہو گیا تھا دیا، ابن سینا نے اس سے پورا استفادہ کیا، کہا جاتا ہے کہ ابن سینا نے ہی اس کتب خانہ میں حکمت سے آگ لگادی - بوعلی سینا کی اب تک ۲۳۱ تصنیفات کا انکشاف کیا جا چکا ہے، اور ۱۱۰ دوسری کتابوں کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ اس کی لکھی ہوئی ہیں، فلسفہ کے موضوع پر ان کی مشہور تصنیف "الشفا" "النجاۃ" ہے جبکہ طب کے موضوع پر "القانون فی الطب" اور نفسیات کے موضوع پر "احوال النفسیات" اس کی معرکۃ الآرار تصنیف ہیں — القانون فی الطب سے ان کی مہارت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس کتاب کے منظر عام پر آنے کے بعد تقریباً پانچ سو برسوں تک یعنی سترہویں صدی کے اختتام تک اپنے موضوع پر سب سے مستند کتاب سمجھی جاتی رہی، ابن سینا نے اس کتاب میں دوسرے مسلم حکیموں کے تجربات کے ساتھ اپنے ذاتی تجربات بھی جمع کر دیئے ہیں۔

اس صدی کے حکیموں میں کرمانی متوفی ۱۰۶۶ء بھی قابل ذکر ہیں، آپ اسپین میں سرجن سے مشہور تھے نیز آپ کے ساتھی ابن الواقد ۹۹۷ء ۱۰۷۴ء کی بھی مختلف تصانیف طب کے موضوع پر ہیں لیکن ان کا سب سے بڑا مشغلہ معمولی چیزوں سے علاج کرنا تھا اور آپ کی تالیف "الادویۃ المفردۃ" اس سلسلہ کا بڑا مرجع ہے، اور آپنے جڑی بوٹیوں اور پھولوں سے علاج کے سلسلہ میں کئی رسالے لکھے جو کا لاطینی زبان میں ترجمہ کیا جا چکا ہے، اور "بندقیہ" میں ۱۵۵۰ء میں طبع بھی کی گئیں،

اور اس عہد کے علم طب کے ماہرین میں۔ ابوالقاسم عمار مؤلف "المنتخب فی علاج العین" علی بن عیسیٰ اور علی بن رضوان بھی ہیں جن کی کئی تصنیفات اس فن پر ہیں جن میں سب سے زیادہ شہرت یافتہ "کتاب الفنون الصغری" ہے۔

پانچویں صدی کو ہم ابن غزالہ متوفی ۱۱۰۰ء اور زار بن دست مصنف "نور العین" پر ختم کرتے ہیں،

اسلامی طب کی تمام تر سرگرمیاں اور کاوشیں بوعلی سینا کی تحقیقات اور انکشافات کے محور پر گردش کرتی رہیں تا آنکہ رازی اور دوسرے حکماء نے کچھ پیش قدمی دکھائی

چھٹی صدی کے نصف اول میں اطباء کی ایک جدید جماعت منظر عام پر آئی مثلاً ابن زہر ۱۰۹۱ء-۱۱۶۲ء جو خصوصاً اسپین میں بہت زیادہ مشہور ہوئے، بہت سی کتابیں اور بحثیں بطور یادگار کے اپنے پیچھے چھوڑ گئے، اسمٰعیل جرجانی نے بھی اس صدی میں کچھ کم شہرت نہیں پائی — وہ بھی اپنی بولتی تصویر "کتاب الذخیرہ" چھوڑ گئے لیکن اس چھٹی صدی کا نصف ثانی حکیموں سے خالی نظر آتا ہے اور قابل ذکر حکیم عبدالرحمن شیرازی کے علاوہ اور کوئی نہیں ملتا ہے

اس کے بعد اگرچہ طب اسلامی روبا نحطاط ہو گیا تھا پھر بھی اس دور زوال میں مسلمان حکیموں نے بہت سے قابل ذکر کارنامے انجام دیئے اور جدید انکشافات و تحقیقات سے طب کے دامن کو گرانبار کیا اس میں سب سے زیادہ مشہور ابن نفیس ہیں (متوفی ۱۲۸۸ء)

جنھوں نے خون کے دوران کا پتہ لگایا اور اپنی اس تحقیق کو شرح القانون میں درج کرکے اسے بقائے دوام بخشا، صلاح الدین بن یوسف کا نام جب تک اس صدی کے حکیموں کے ساتھ لکھا جائے تو اس صدی کی تاریخ کامل نہ ہوگی، آنکھوں کی بیماریاں اور روشنی پر ان کی تحقیقات مسلم ہیں، اس سلسلہ میں انھوں نے "نورالعین" اور "جامع الفنون" جیسی اہم کتابیں لکھیں۔

آٹھویں صدی ہجری:۔ اس صدی میں بھی پھر سے طب کے موضوع پر مزید ریسرچ اور تحقیق ہونے لگی، دواؤں کو ملانے اور بنانے کی ترکیبیں منظر عام پر آئیں اور بہت سی بحثیں لکھی گئیں جس میں دوائیں بنانے اور آنکھ وغیرہ کی بحثیں قابل ذکر ہیں۔

اس صدی کے سرخیل محمد بن الیاس شیرازی متوفی ۱۳۳۱ء ہیں جنھوں نے کئی طبی کتابوں کی تالیف کی جن میں سب سے زیادہ اہم "الحاوی فی علم التداوی" ہے۔ لیکن اس صدی پر جس بڑے حکیم اور طبیب کی چھاپ ہے وہ محمد بن ابراہیم ہیں جو ابن الاکفانی کے نام سے مشہور ہیں سنجار میں پیدا ہوئے قاہرہ میں قیام کیا اور وہیں وفات پائی، علم طب اور سائنس میں پانچ طبی اور طویل بحثیں کیں۔

آٹھویں صدی دنیا والوں کو الوداع کہنے ہی والی تھی کہ محمد بن محمد ۱۳۶۳ء نے طاعون پر ایک کتاب تصنیف کی جس کا نام "اصلاح السنیۃ" رکھا اور ان کی یہ تصنیف تاریخ میں پہلی تحقیق شمار کی جاتی ہے جو طاعون پر کی گئی ہو، اور شاذلی مصری نے اپنی تصنیف "العمدۃ الکحلیہ فی الامراض البصریہ" لکھی جو اس میدان میں سب سے آخری کتاب شمار کی گئی ہے ترکی طبیبوں میں الاقسرائی متوفی ۱۳۶۸ء ہیں جنھوں نے ابن نفیس کی کتاب "موجز القانون" کی شرح کی اور حاج بادشاہ متوفی ۱۴۱۷ء ہیں جنھوں نے بعض اہم بحثیں طب کے موضوع پر قلمبند کیں، اس زمانہ میں ایران میں بھی بعض اہم شخصیات پیدا ہوئیں مثلاً کلیم منصور بن الیاس جنھوں نے ایک کتاب "التشریح بالتصویر" لکھی۔

(باقی ص ۵۵ پر)

مولانا مودودی کی تحقیق حدیث دجال پر ایک نظر

مولانا عبدالمنان اعظمی

ذخیرۂ احادیث سے بے اعتمادی

مولانا کی تحقیق میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دوحیثیت کا مطالعہ کرنے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جملہ ارشادات کو دو اجزا پر مشتمل مان لینے کے بعد ذخیرۂ احادیث سے ایک طرح کی بے اعتمادی پیدا ہوجاتی ہے اور حدیثوں سے امان اٹھ جاتا ہے، کیونکہ جب مولانا کے بیان کے مطابق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کبھی تو رسول کی حیثیت سے وحی الٰہی کی روشنی میں کلام فرماتے تھے اور کبھی انسان کی حیثیت سے بربنائے قیاس، چنانچہ ان کی تحقیق میں دجال کی صفات اور خصوصیات کی خبریں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بذریعہ وحی دیں اور اس کے زمانہ خروج و مقام خروج کی خبریں بذریعۂ قیاس جیسا کہ موصوف لکھتے ہیں... وہ دراصل آپ کے قیاسات ہیں" تو اس سے خود بخود یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مسلمانوں کے پاس جو ذخیرۂ احادیث ہے وہ وحی و قیاس اور صحیح و غلط کا گڈمڈ مرکب ہے جس کی کوئی حدیث بھروسے کے لائق نہیں، کسی حدیث کی بابت یقین کے ساتھ یہ کہنا دشوار ہے کہ واقعی وہ صحیح اور بربنائے وحی اور قابل سند حجت ہے، کیونکہ جب ساڑھے تیرہ سو برس بعد یہ انکشاف ہوتا ہے اور خود مولانا ہی کی تحقیق سے ہوتا ہے کہ خلاف حدیث جس کو سلف صالحین صحیح و بربنائے وحی سمجھتے چلے آرہے تھے وہ آج بربنائے وحی نہیں بلکہ بربنائے قیاس و ناقابل نقل روایت ثابت ہوگئی تو پھر اب کسی اور حدیث پر کیا اعتماد کہ وہ واقعی مبنی بر وحی ہی ہے اور آئندہ قیاسی اور ناقابل

نقل و روایت ثابت نہیں ہوگی۔

یہ بے اعتمادی جو مولانا کی تحقیق سے پیدا ہو رہی ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی پر سے ہمارا ایمان رخصت کر دے رہا ہے، اور ہم پورے یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ حضورؐ کی ۲۳ سالہ پیغمبرانہ زندگی کا پورا کارنامہ خطا اور لغزش سے پاک ہے، یہاں مولانا کا وہ جواب مجروح ہو جاتا ہے جو انھوں نے محمد شفیع صاحب فاضل جج یا ڈاکٹر عبدالودود صاحب کو دیا ہے (دیکھئے)۔

مولانا کا جواب مجروح

فاضل جج جناب محمد شفیع صاحب نے جو یہ بات فرمائی کہ: یہ صحیح ہے کہ محمد رسول اللہؐ نے کوئی گناہ نہیں کیا مگر وہ غلطیاں تو کر سکتے تھے اور یہ حقیقت خود قرآن میں تسلیم کی گئی ہے (منصب رسالت ص۲۶۳) اس کا جواب مولانا نے منصب رسالت ص۱۳۱ پر حضورؐ کی سنت غلطیوں سے پاک ہے کہ نہیں؟" اس عنوان کے تحت مولانا فرماتے ہیں کہ

> "فاضل جج فرماتے ہیں" یہ صحیح ہے کہ محمد رسول اللہؐ نے کوئی گناہ نہیں کیا، مگر وہ غلطیاں کر سکتے تھے اور یہ حقیقت خود قرآن میں تسلیم کی گئی ہے" اسکے متعلق اگر قرآن کا تتبع کیا جائے تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صرف پانچ مواقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو غلطی پر تنبیہ فرمائی ہے ایک سورۂ انفال آیت ۶۷ و ۶۸ میں دوسرے سورۂ توبہ آیت ۹ میں تیسرے سورہ احزاب آیت ۳۷ میں چوتھے سورۂ تحریم آیت ۱ میں پانچویں سورہ عبس آیت ۱۔۱۰ میں، چھٹا مقام جہاں گمان کیا جا سکتا ہے کہ شاید یہاں کسی غلطی پر تنبیہ کی گئی ہے وہ سورہ توبہ آیت ۸۴ ہے، پورے ۲۳ سال کے زمانۂ نبوت میں ان پانچ یا چھ مواقع کے سوا قرآن مجید میں نہ حضورؐ کی کسی غلطی کا ذکر آیا ہے نہ اس کی اصلاح کا، اس سے جو بات ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اس پورے زمانہ میں حضورؐ براہ راست اللہ تعالیٰ کی

کی نگرانی میں فرائض نبوت انجام دیتے رہے ہیں، اللہ تعالیٰ اس بات پر نگاہ رکھتا رہا ہے کہ اس کا نمائندہ مجاز کہیں اس کی غلط نمائندگی اور لوگوں کی غلط رہنمائی نہ کرنے پائے[۱]۔ اور ان پانچ یا چھ مواقع پر حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) سے جو ذرا سی چوک ہوگئی ہے اس پر فوراً ٹوک کر اس کی اصلاح کر دی گئی ہے اگر ان چند مواقع کے سوا کوئی اور غلطی آپ سے ہو جاتی تو اس کی بھی اسی طرح اصلاح کر دی جاتی جس طرح ان غلطیوں کی کر دی گئی ہے[۲]، لہٰذا یہ چیز حضورؐ کی رہنمائی پر سے ہمارا اطمینان رخصت

---

[۱] یہاں مولانا یہ فرما رہے ہیں کہ "اللہ تعالیٰ اس بات پر نگاہ رکھتا رہا ہے کہ اس کا نمائندہ مجاز کہیں اس کی غلط نمائندگی اور لوگوں کی غلط رہنمائی نہ کرنے پائے"۔ مگر تفہیمات جلد ثانی ص۴۳ پر اسکے خلاف یہ فرماتے ہیں کہ "اللہ تعالیٰ نے بالارادہ ہر نبی سے کسی نہ کسی وقت اپنی حفاظت اٹھا کر ایک دو لغزشیں ہو جانے دی ہیں تاکہ لوگ انبیاء کو خدا نہ سمجھیں اور جان لیں کہ یہ بھی بشر ہیں"۔ ع بہ بیں تفاوتِ رہ از کجا است تا بکجا

[۲] مولانا کے اس بیان سے جو چیز ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ :-

(الف) حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جو بھی خطا یا لغزش ہوئی اس کی فوراً اصلاح کر دی گئی کوئی لغزش بغیر اصلاح کے نہیں چھوڑی گئی ورنہ امت کی غلط رہنمائی ہو جاتی

(ب) اصلاح بھی قرآن میں وحی جلی سے کی گئی، کسی اور جگہ اور کسی اور ڈھنگ سے نہیں وحی جلی سے ہی اصلاح کئے جانے کا اقرار مولانا ایک جگہ اور فرما رہے ہیں، لکھتے ہیں کہ —— اسی لئے جہاں آپ کا اجتہاد ذرا بھی اللہ کی پسند سے ہٹا ہے وہاں فوراً وحی جلی سے اس کی اصلاح کر دی گئی ہے (تفہیم القرآن النجم)

(ج) قرآن میں زیادہ سے زیادہ صرف پانچ یا چھ لغزشوں اور ان کی اصلاح کا ذکر ہے بس

(د) ان پانچ یا چھ کے علاوہ کوئی اور لغزش اگر واقعی آپ سے ہوئی ہوتی تو اس کی بھی اصلاح

کر دینے کے بجائے اس کو اور زیادہ مضبوط کر دینے والی ہے، اب ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ حضورؐ کی ۲۳ سالہ پیغمبرانہ زندگی کا پورا کارنامہ خطا اور لغزش سے بالکل پاک ہے اور اس کو خدا کی رضا (APPROVAL) حاصل ہے" منصب رسالت ۳۱۱ و ۳۱۲)

بالکل یہی جواب ڈاکٹر عبدالودود صاحب کو بھی دے رہے ہیں اور وہ یہ ہے

" دوسری آیات جو آپ نے پیش فرمائی ہیں، ان سے آپ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے فیصلوں میں بہت سی غلطیاں کی تھیں جن میں سے اللہ میاں نے بطور نمونہ یہ دو چار غلطیاں پکڑ کر بتا دیں تاکہ لوگ ہوشیار ہو جائیں حالانکہ دراصل اس سے نتیجہ بالکل برعکس نکلتا ہے۔ ان سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی پوری پیغمبرانہ زندگی میں بس وہی چند لغزشیں ہوئی ہیں جن کی اللہ تعالیٰ نے فوراً اصلاح فرما دی اور اب ہم پورے اطمینان کے ساتھ اس پوری سنت کی پیروی کر سکتے ہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کیونکہ اگر اس میں کوئی اور لغزش ہوئی ہوتی تو اللہ تعالیٰ اس کو بھی برقرار نہ رہنے دیتا جس طرح ان لغزشوں کو اس نے برقرار نہیں رہنے دیا (منصب رسالت ص۸۷)

قرآن میں وحی جلی سے آجاتی۔

(۷) ان پانچ یا چھ کے علاوہ کسی اور لغزش کا قرآن میں ذکر نہ ہونا بجائے خود اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے علاوہ کوئی اور لغزش آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں ہوئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا باقی سارا کارنامہ لغزشوں سے پاک ہے۔

ان مذکورہ بالا باتوں سے یہ بات خود بخود صاف ہو جاتی ہے کہ دجّال کے زمانۂ خروج و مقامِ خروج وغیرہ سے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات جو امور دین و اخبار غیب

مولانا کے ان بیانات کی رو سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ان پانچ یا چھ غلطیوں[۱] کے بعد سنت کا بقیہ تمام ذخیرہ لغزشوں سے بالکل پاک اور پیروی کے لئے قابل اطمینان تھا، مگر پھر ساڑھے تیرہ سو برس بعد خود مولانا ہی نے ان پانچ چھ غلطیوں کے علاوہ دجال سے متعلق جو یہ مزید غلطی نکال دی تو اب اطمینان کہاں رہ گیا، اب مولانا کسی کو کیسے یقین دلا سکتے ہیں کہ حضور کا بقیہ کارنامہ خطا و لغزش سے بالکل پاک ہے منکرین حدیث کے اعتراض کے جواب میں مولانا کی تقریر میں اگر کچھ جان تھی تو وہ بس غلطیوں کی چھ اعداد تک کی تعیین و تحدید ہی سے تھی، اب جبکہ مولانا نے خود ہی اس حد کو توڑ دیا اور ساڑھے تیرہ سو برس بعد ایک اور غلطی ساتویں نمبر کی دجال کی بابت نکال دی تو مولانا کے جواب میں کیا جان باقی رہ گئی؟ اور مولانا کے پاس منکرین حدیث کے اس اعراض کا کیا جواب ہوگا کہ حضرت محترم آپ پانچ چھ غلطیوں کو چھوڑ کر بقیہ سنت پر مطمئن ہو کر بیٹھ گئے تھے کہ اب اس کے اندر غلطیاں نہیں رہیں پھر بالآخر آپ ہی نے ساڑھے تیرہ سو برس بعد ایک اور غلطی نکال کر رکھ دی، جس کا ذکر قرآن میں نہیں ہے، تو اب تبلائیے اس بقیہ سنت پر کیا اطمینان کہ یہ غلطیوں سے پاک ہی ہے اور آئندہ صدیوں میں کوئی غلطی نہیں نکلے گی اب تو آپ ہی کی تحقیق سے ثابت ہو گیا کہ ذخیرۂ احادیث غلطیوں سے پاک نہیں اللہ میاں نے قرآن میں بطور نمونہ دو چار غلطیاں پکڑ کر بتا دیں تاکہ لوگ ہشیار ہو جائیں۔

اب دیکھئے مولانا اپنی تحقیق کی روشنی میں اس اعتراض کا کیا جواب دیتے ہیں

پر مبنی ہیں مولانا کی تحقیق کے مطابق اگر قیاسی اور غلط ہوتے تو انکی اصلاح قرآن میں آچکی ہوتی، قرآن میں ان کی اصلاح کا نہ ہونا خود ہی دلیل ہے کہ وہ صحیح اور برمنی الٰہی ہیں مولانا کا ان کو قیاسی کہنا اور غلط ہونے کا تاثر دینا باطل ہے۔۔ [۱] مولانا نے جو پانچ غلطیاں شمار کی ہیں ان کو بحسب بیان القرآن تفسیر آیت ۱۹ اسورہ محمد غلطی نہیں کہتا میرے نزدیک ان میں اولیٰ اور غیر اولیٰ یا افضل و مفضول کی نسبت ہے، بس

بقیہ:- علم طب اور مسلمان ۱۱ سے آگے۔

دسویں اور گیارہویں صدی میں اس طرح کی ترقی نظر نہیں آتی جس طرح گذشتہ صدیوں میں ہوئی بہرکیف یہ طب اپنی حالت پر برقرار تھا اوراب طب ترکی، ایران، افریقہ، مصر، برصغیر ہندوستان میں پھلنے پھولنے لگا، ایران میں محمد حسین نور نجاشی متوفی ۱۵۰۷ء نے ایک ضخیم کتاب تالیف کی مصر میں داؤد متوفی ۱۵۹۹ء اپنی خدمات سے لوگوں کو فائدہ پہنچا رہے تھے سولہویں صدی کا مشہور طبیب مصر میں پیدا ہوا وہ علی حلبی تھے جو اس فن میں متعدد اہم بحثیں اپنی یادگار چھوڑ گئے

برصغیر ہندوستان میں سولہویں اور سترہویں صدی عیسوی میں یہ فن خوب پھلا پھولا، اسی عہد میں عین الملک شیرازی نے "اسماء الادویہ" لکھ کر شاہجہاں کو ہدیہ میں دی نیز دارا شکوہ کی طبی انسائیکلوپیڈیا کے تیار کرنے میں بھی ان کا حصہ رہا ہے، یہ وہ آخری اسلامی طبی انسائیکلو پیڈیا ہے جس کو اسلامی تہذیب نے چھوڑا ہے بارہویں صدی ہجری میں بڑے ماہر حکیم پیدا ہوئے جو ایک مشہور و عظیم طبی کتاب "موازین الطب" ہم کو دے کر چل بسے۔

خمینی ازم کا جادو حرم میں چل نہیں سکتا

قاری محمد اسحاق حافظ سہارنپوری

درج ذیل اشعار ۸ نومبر ۱۹۸۷ء کو جمعیۃ علماء ہند کے زیر اہتمام بسروا دس نئی دہلی میں منعقد ہونے والی عظیم الشان "تحفظ حرم کانفرنس" میں پُرزور نعرہ ہائے تکبیر کے درمیان پیش کئے گئے

خدا کے فضل سے بیدار ہیں ہشیار ہیں ہم سب
ہماری آستیں میں سانپ کوئی پل نہیں سکتا
یہاں ہر سامریت آتے ہی دم توڑ دیتی ہے
خمینی ازم کا جادو حرم میں چل نہیں سکتا

حرم کے پاسباں کے ساتھ ہے اسلام کا لشکر
خمینی کی حمایت پر ہیں فوجیں آج شیطاں کی
حرم والوں کی میدانِ وفا میں لاج رکھ لینا
حضورِ قلب سے ہے یہ دعا ہر اک مسلماں کی

حرم والو تمہارے ساتھ ہم سارے مسلماں ہیں
تمہارا ساتھ دیں گے ہر طرح تم یہ یقیں رکھو
مگر یہ شرط ہے پیمانۂ قلبِ مجلّی میں
محمدؐ کی محبت کی شراب انگبیں رکھو

محمدؐ کی محبت کا ذرا بھی پاس گر رکھا
تمہارا ہر مخالف خوار ہوگا، سرنگوں ہوگا
شرارت پر جو آمادہ ہیں وہ سب منہ کی کھائیں گے
قلمرو میں تمہاری ہر جگہ امن و سکوں ہوگا

وفاداری محمدؐ سے مگر شرط مسلّم ہے
بقا کا ضامنِ اعظم یہی پہچان محکم ہے

دار العلوم دیوبند کا ترجمان

دار العلوم دیوبند

ماہ رجب المرجب سنہ ۱۴۰۸ھ مطابق ماہ مارچ سنہ ۱۹۸۸ء

جلد نمبر ۷۳ — شمارہ نمبر ۳ — فی شمارہ 4/= — سالانہ 40/=

نگران

حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب

مہتمم دار العلوم دیوبند

مدیر

مولانا حبیب الرحمن قاسمی

سالانہ بدل اشتراک بیرون ممالک سے

سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ کا سالانہ 150/= ہندوستانی

پاکستان سے 70/= بنگلہ دیش سے 50/= (ہندوستانی)

◯ سرخ نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ کا زر تعاون ختم ہو گیا ہے۔

فہرست مضامین

ہندوستانی وپاکستانی خریداروں سے ضروری گذارش

(۱) ہندوستانی خریداروں سے ضروری گذارش یہ ہے کہ ختم خریداری کی اطلاع پاکر اول فرصت میں اپنا چندہ نمبر خریداری کے حوالہ کے ساتھ منی آرڈر سے روانہ کریں۔

(۲) پاکستانی خریدار اپنا چندہ مبلغ ۷۰/- مولانا عبد الستار صاحب مہتمم جامعہ عربیہ محمودیہ داؤد والا براہ شجاع آباد ملتان پاکستان کو بھیجدیں۔

(۳) خریدار حضرات پتہ پر درج شدہ نمبر محفوظ فرمائیں۔ خط وکتابت کے وقت خریداری نمبر ضرور لکھیں۔

والسلام

منیجر

اداریہ　　　مولانا حبیب الرحمن صاحب قاسمی

یاد رفتگاں

ادھر تین چار ماہ کے اندر فرزندان دارالعلوم دیوبند میں سے یکے بعد دیگرے پانچ قابل ذکر فضلاء بزم ہستی سے روٹھ کر خلد آشیاں ہو گئے، مگر ہماری محرومیٔ قسمت دیکھئے کہ ہم ان کی تعزیت میں چند سطریں بھی نہ لکھ سکے، اس کوتاہی میں اگرچہ سب سے بڑا دخل اس حقیر کی درسی مصروفیتوں کا ہے، لیکن اسی کے ساتھ رسالہ کی تنگ دامانی بھی سدّ راہ بنی، بعض ضروری مضامین عرصہ سے اشاعت کے منتظر تھے جنھیں مزید مؤخر کرنا مضمون نگار حضرات کے لئے سوہان روح تھا، اس لئے مجبوراً یاد رفتگان اور جدید مطبوعات کے تعارف کو روک کر انھیں شائع کرنا پڑا، اب بھی بہت سے مضامین باقی رہ گئے ہیں لیکن تقاضوں کے دباؤ میں کسی حد تک کمی آگئی ہے۔ اس لئے یاد رفتگان کے سلسلے میں یہ چند سطریں تاخیر پر ندامت کے ساتھ قارئین دارالعلوم کی خدمت میں پیش کی جارہی ہیں اور اس توقع پر کہ ان مرحومین مخلصین کے لئے ان سطروں کے پڑھنے والے دعائے مغفرت اور ترقیٔ درجات کی دعا فرمائیں گے۔

(۱) ـــــ دارالعلوم دیوبند کے مہتمم حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب مدظلہ العالی کے برادر بزرگ جناب مولانا حکیم مطلوب الرحمن بن مولانا مشیت اللہ بجنوری رحمۃ اللہ علیہ رحمۃً واسعۃً طویل علالت کے بعد ۱۰ ربیع الثانی ۱۴۰۰ھ کو اپنے پیچھے سوگواروں کا ایک انبوہ کثیر چھوڑ کر راہیٔ ملک جاودانی ہو گئے، مرحوم حافظ قرآن، مسیحا نفس طبیب اور دارالعلوم دیوبند کے گرامی قدر فرزند تھے، دورۂ حدیث کی تکمیل حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی

قدس سرہٗ سے کی تھی، اور زندگی بھر اپنے شیخ کے دلدادہ رہے، حضرت مولانا مدنیؒ جب کبھی ان کے یہاں تشریف لے جاتے تو وہ دن ان کے لئے عید سے کم نہ ہوتا، وفات سے چند دن پہلے خواب دیکھا کہ حضرت مدنیؒ تشریف لائے ہیں اور ان کے ہمراہ دو بزرگ اور ہیں جن کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ ان میں سے ایک حضرت مولانا انور شاہ کشمیری اور دوسرے حضرت حجۃ الاسلام مولانا نانوتوی قدس سرہما ہیں، اس خواب سے انھیں یقین ہوگیا تھا کہ اب زندگی کے ایام ختم ہوچکے ہیں اور جلد ہی ان اکابر کی مجلس میں باریابی ہوگی، مرحوم ایک عرصہ سے صاحب فراش تھے مگر اس حالت میں بھی پنج وقتہ نماز وقت پر ادا کرتے رہے، نہایت خوش خلق، ملنسار، متواضع اور مہمان نواز تھے، مہمان نوازی اور تواضع تو اس خاندان کو وراثت میں ملی ہے جس کی زندہ مثال حضرت مہتمم صاحب کی ذات والا صفات ہے متعنا اللہ بطول حیاتہ

(۲) ضلع اعظم گڈھ یوپی کی مشہور دینی درسگاہ جامعہ احیاء العلوم مبارکپور کے ناظم جناب مولانا عبدالباری صاحبؒ ۱۳ ربیع الآخر ۱۴۰۸ھ مطابق ۵ دسمبر ۱۹۸۷ء کو طویل و جانگسل علالت کے بعد انتقال کر گئے، مرحوم دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل اور حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنیؒ کے تلمیذ تھے، مولانا مرحوم کو اللہ تعالیٰ نے بڑی صلاحیتوں سے نوازا تھا، وہ بیک وقت عالم دین، دینی رہنما اور سیاسی لیڈر تھے، مرحوم نے ایک طرف احیاء العلوم کے ذریعہ اسلامی علوم و فنون اور دینی عقائد و اعمال کی ترویج و اشاعت کی خدمت کی تو دوسری طرف جمعیۃ علماء اور کانگریس کے پلیٹ فارم سے قومی و سیاسی جدوجہد کا فریضہ بھی انجام دیا، ضلع اعظم گڈھ بالخصوص مبارکپور کے مضافات میں مولانا مرحوم ایک بلند پایہ عالم دین اور قومی لیڈر کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے تھے علماء دیوبند سے آپ کے خصوصی روابط تھے بالخصوص حضرت مدنی، مولانا ابوالوفا شاہجہانپوری، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی وغیرہ سے آپ کے تعلقات بہت گہرے تھے اور بعض حضرات کی رہنمائی میں مولانا اپنے دیار کے قافلۂ

علم وسیاست کی رہنمائی انجام دیتے تھے

(۳) ـــــ مولانا لقمان الحق صاحب استاذ دارالعلوم دیوبند ۸ رجمادی الثانی ۱۴۰۸ھ کو مختصر سی علالت کے بعد جوارِ حق سے پیوست ہوگئے، مرحوم سابق ناظم کتب خانہ مولانا سلطان الحق رحمۃ اللہ علیہ کے خلف اکبر تھے، ابھی ان کی وفات کو پورا سال بھی نہیں گذرا تھا کہ صاحبزادے بھی ان کے ہم آغوش ہوگئے. مولانا لقمان الحق مرحوم دارالعلوم کے فاضل اور جید استعداد کے مالک تھے، دارالعلوم کے استاذ مقرر ہونے سے پہلے دارالعلوم میرٹھ کے شیخ الحدیث رہ چکے تھے، کچھ دنوں تک مدراس میں بھی تدریسی خدمت انجام دی تھی، درس وتدریس کے ساتھ تصنیفی ذوق بھی رکھتے تھے، فتاویٰ عالمگیری کا ترجمہ شروع کیا تھا جس کے کچھ اجزاء شائع بھی ہوگئے تھے، ایضاح البخاری کے ابتدائی اجزاء کی ترتیب وتدوین میں مولانا ریاست علی صاحب کے شریک کار تھے، افسوس کہ گلشن ہستی کی صرف ۴۹ بہاریں ہی دیکھ پائے تھے کہ مالک دوجہاں کا بلاوا آگیا۔

(۴) ـــــ مولانا قاری فخرالدین گیاوی ۲۰ رجمادی الآخر ۱۴۰۸ھ مطابق ۹ فروری ۱۹۸۸ء کو چند دن کی علالت کے بعد اس دار فانی سے رحلت کر گئے، مرحوم قاری صاحب حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی نوراللہ مرقدہ کے تلمیذ وخلیفہ اور صاحب نسبت بزرگ تھے مرحوم کو اپنے مرشد وشیخ سے عشق کی حد تک محبت تھی، ان کا نام سنتے ہی بے قابو ہو جاتے تھے، بہار کی مشہور مدرسہ جامعہ قاسمیہ گیا کے بانی ومہتمم تھے اس کے علاوہ مرحوم نے بہار میں پچاسوں مکاتب بھی قائم کئے تھے اور پیرانہ سالی اور ضعف کے باوجود ان تمام مکتبوں کی نگرانی وسرپرستی کی خدمت بھی انجام دیتے تھے، مرحوم کا یہ ایسا کارنامہ ہے جو ہمیشہ یاد رکھا جائیگا اور اس کا اجر وثواب انھیں قیامت تک ملتا رہے گا۔ مرحوم ایک کہنہ مشق قادر الکلام شاعر بھی تھے اور فی البدیہہ اشعار کہتے تھے، آپ کے کلام کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں دارالعلوم دیوبند کے فضلاء بہار میں مرحوم ایک امتیازی شان کے مالک تھے، جذب وسلوک

تواضع و مسکنت آپ کے خصوصی اوصاف تھے

(۵) ـــــ پاکستان کے ممتاز دینی ادارہ جامعہ مدنیہ لاہور کے بانی و مہتمم حضرت مولانا سید حامد میاں صاحب رجب کے آخری عشرہ میں اللہ کو پیارے ہو گئے، مرحوم دارالعلوم دیوبند کے ہونہار فاضل اور حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی قدس سرہ کے تلمیذ و خلیفہ تھے، ہندوستان کے مشہور عالم دین اور مصنف و مؤرخ حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندیؒ سابق ناظم جمعیۃ علماء ہند کے خلف اکبر تھے، تقسیم ملک کے بعد پاکستان منتقل ہو گئے تھے اور وہیں اپنے شیخ و مرشد حضرت مدنی قدس سرہٗ کی طرف نسبت کرتے ہوئے جامعہ مدنیہ کی بنیاد رکھی جو تھوڑے ہی عرصہ میں پاکستان کے اہم اور بڑے مدارس کی فہرست میں شمار ہونے لگا، مرحوم نہایت جید الاستعداد عالم تھے، اردو، فارسی، عربی تینوں زبانوں میں شعر کہہ لیتے تھے، درس و تدریس اور ارشاد و سلوک کے ساتھ تصنیف و تالیف کا بھی ستھرہ ذوق رکھتے تھے، تسہیل النحو والصرف، ذکر جمیل، متحدہ قومیت وغیرہ آپ کے مشہور مطبوع رسائل ہیں، مرحوم علوم عصری میں بھی اچھی دستگاہ رکھتے تھے پاکستان میں آپ کی رائے اور موقف کو اہمیت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ مرحوم پاکستان میں دارالعلوم دیوبند کے ایک ثقہ اور قابل اعتماد ترجمان اور نمائندہ تھے۔

مولانا محمد جنید بابونگری بنگلا دیش

قسط اوّل

سات آسمانوں کا وجود

قرآن و حدیث اور سائنس کی روشنی میں

بعض جدید ہیئت والے وجود آسمان کا انکار کرتے ہیں، اور قرآن میں جہاں جہاں "سمار" کا لفظ آیا ہے وہاں "سمار" سے "ہر بلند چیز" مراد لیتے ہیں، اور جو نیلگوں چیز ہم کو نظر آتی ہے اس کو "حد نگاہ" قرار دیتے ہیں

(دیکھو معارف القرآن ص ۱۹۱/۲ و عصر حاضر میں اسلام کیسے نافذ ہو ص ۵۴۶، و ماہنامہ "الحق" جمادی الثانیہ ۱۳۸۸ھ)

درحقیقت ان کا "انکار آسمان" سرتاپا غلط اور بے بنیاد ہے، عقل صحیح اور نقل صریح کی روشنی میں اس کا کوئی اعتبار اور وزن نہیں ہے، قرآن و سنت آسمانوں کے وجود کو ایک حقیقت ثابتہ کے طور پر ذکر کرتا ہے، ان کا وجود، ان کا تعدد، ان کا ذی جرم ہونا، ان میں دروازوں اور گذرگاہوں کا پایا جانا، ان دروازوں پر فرشتوں کا پہرہ مسلط ہونا اور ان دروازوں کا خاص خاص حالات و اوقات میں کھولا جانا، یہ سب کچھ قرآن و حدیث کے اندر صاف اور صریح الفاظ میں موجود ہے، اگرچہ قرآن میں بعض جگہ "سمار" سے "بلند چیز" یا "سحاب" مراد لیا جاسکتا ہے، لیکن ہر جگہ یہ معنی مراد لینا صحیح نہ ہوگا، کیونکہ بہت سی آیات میں "سمار" سے جرم اور دروازوں والا معروف و مشہور آسمان ہی مراد ہے، جس کی تفصیل آگے آرہی ہے، نیز بہت

سے فلاسفہ بھی جیساکہ آگے آرہا ہے، وجودِ آسمان اور تعددِ آسمان کا صاف اور کھلے طور پر اعتراف کیا ہے، یہاں آسمانوں کے وجود اور ان کے تعدد پر دلائل پیش کئے جانے کے ساتھ منکرین کے بعض شبہات کا جواب بھی دیا جائیگا۔ ومن اللہ التوفیق۔

آسمانوں کا وجود آیاتِ قرآنی کی روشنی میں

آسمانوں کے وجود ان کے ذی جرم ہونے اور ان کے سات ہونے پر بہت سی آیاتِ قرآنی وضاحت کے ساتھ دلالت کرتی ہیں اختصار کے پیشِ نظر ذیل میں صرف چند آیات ذکر کی جارہی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ان آیات کے تحت حضرات مفسرین کے قیمتی اقوال بھی درج ہیں۔

پہلی آیت

ثم استویٰ الی السماء فسوّاھن سبع سمٰوات (بقرہ-۲۹)

پھر (اللہ نے) توجہ فرمائی آسمان کی طرف (یعنی اس کی تخلیق اور تکمیل کی طرف) تو درست کرکے بنادیئے ان کو سات آسمان،

اس آیت کے تحت عظیم اسلامی فلاسفر حضرت امام رازی (متوفی ۶۰۶ھ) "تفسیر کبیر" میں رقم طراز ہیں

اعلم ان القرآن ھھنا قد دل علی وجود سبع سمٰوات" (تفسیر کبیر ۲/۱۶۵)

جان لو کہ بلاشبہ یہاں قرآن سات آسمانوں کے وجود پر دلالت کرتا ہے

پھر امام موصوف نے اصحاب ہیئت کا قول نقل کرکے ان "سبع سمٰوات" کے نام بھی شمار کئے ہیں (حوالہ بالا)

اور جلیل القدر تابعی حضرت قتادہؒ نے اسی "فسوّاھن سبع سمٰوات" کی تفسیر میں فرمایا کہ

بعضھن فوق بعضٍ بین کل سماءین مسیرۃ خمس مائۃ عام"

(تفسیر ابن جریر طبری ۱/۱۵۳ ودر منثور ۱/۴۳)

یہ (سات آسمان) بعض بعض کے اوپر ہیں اور ہر دو آسمان کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت ہے۔

پھر یہاں قتادہ کے قول میں، اسی طرح بعض احادیث میں ایک ایک آسمان اور سات زمینوں میں ایک ایک زمین کی درمیانی مسافت جو پانچ پانچ سو سال بیان کی گئی ہے اس کی متعدد توجیہات واحتمالات ہو سکتے ہیں، ایک توجیہ یہ ہے کہ پانچ سو سال والی مسافت کا ذکر "من باب التقریب للافہام" ہے، یعنی اس سے مراد ٹھیک ٹھیک مسافت کی پیمائش بیان کرنا نہیں ہے، بلکہ مقصود بات کو اس طرح بیان کرنا ہے کہ وہ لوگوں کی سمجھ سے قریب تر ہو لہذا کوئی اعتراض نہیں ہے (دیکھو روح المعانی ج ۲، ص۱۴۵)

دوسری آیت فقضٰھن سبع سمٰوٰت فی یومین واوحٰی فی کل سماء امرھا وزینا السماء الدنیا بمصابیح" (فصلت-۱۲)

سو دو روز میں اسکے سات آسمان بنا دیئے اور ہر آسمان میں اسکے مناسب اپنا حکم (فرشتوں کو) بھیجدیا اور ہم نے قریب والے آسمان کو ستاروں سے زینت دی۔

اس آیت کے تحت امام رازی سُدی کا قول نقل کرتے ہیں کہ "اللہ تعالیٰ نے ہر آسمان میں اس کی مخلوق یعنی فرشتے، پہاڑ اور سمندر پیدا کئے اور ہر آسمان میں ایک ایسا گھر ہے جس کا فرشتے طواف کرتے ہیں اور جو کعبہ شریف کے برابر میں واقع ہے" (تفسیر کبیر ج ۷، ص۲۴۴)

تیسری آیت ولقد خلقنا فوقکم سبع طرائق (المؤمنون - ۱۷)

اور ہم نے تمہارے اوپر سات آسمان بنائے (جن میں ملائکہ کی آمد و رفت کیلئے راستے ہیں)

مفسر جلیل امام عبداللہ قرطبی (متوفی ۶۷۱ھ) اس آیت کے تحت لکھتے ہیں کہ امام لغت ابو عبیدہ نے کہا کہ "سبع طرائق" سے سات آسمان مراد ہیں اور آسمانوں کو طرائق اس لئے کہا گیا ہے کہ بعض آسمان بعض کے اوپر ہے اور عرب ہر ایسی چیز کو طریقہ (جس کی جمع طرائق ہے) کہتے ہیں جو دوسری چیز کے اوپر ہو، اور بقول بعض اس لئے طرائق کہا گیا کہ یہ آسمان فرشتوں کی آمد و رفت کے طرائق یعنی راستے ہیں" (تفسیر قرطبی ج ۱۲، ص۱۱۱)

ترجمہ میں اسی آخرالذکر کو لیا گیا ہے۔

چوتھی آیت الذی خلق سبع سموٰت طباقاً ما ترٰی فی خلق الرحمٰن من تفٰوت" (ملک ۔ ۳)

اس نے سات آسمان اوپر تلے پیدا کئے (آگے آسمان کا استحکام بیان کرتے ہیں کہ اے دیکھنے والے) تو خدا کی اس صنعت میں کوئی خلل نہیں دیکھے گا۔

مفسر جلیل حضرت حکیم الامت تھانوی (متوفی ۱۳۶۲ھ) اس آیت کی تفسیر میں ارقام فرماتے ہیں کہ "حدیث صحیح میں ہے کہ ایک آسمان سے اوپر بفاصلۂ دراز دوسرا آسمان ہے، پھر اسی طرح اس سے اوپر تیسرا، وعلیٰ ہذا (بیان القرآن پ ۲۵ ج ۱۲)

پانچویں آیت الم تروا کیف خلق اللہ سبع سموٰت طباقاً (نوح ۔ ۱۵)

کیا تم کو معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح سات آسمان اوپر تلے پیدا کئے۔

اس آیت کی تفسیر میں علامہ صاوی (متوفی ۱۲۴۱ھ / ۱۸۲۵ء) لکھتے ہیں کہ "ایک آسمان دوسرے سے لگا ہوا نہیں ہے بلکہ ہر دو آسمان کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت ہے (حاشیہ صاوی علی الجلالین ص ۲۵ ج ۴)

چھٹی آیت وبنینا فوقکم سبعاً شداداً (نبأ ۔ ۱۲)

اور ہم ہی نے تمہارے اوپر سات مضبوط آسمان بنائے۔

اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے قاضی بیضاوی (متوفی ۶۹۲ھ) علامہ قرطبی اور علامہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی (متوفی ۱۲۱۲ھ) رقمطراز ہیں کہ "سبعا شدادا" سے مراد سات مضبوط آسمان ہیں جن کی صنعت بہت ہی قوی ہے اور مرور زمانہ سے جن پر کوئی اثر نہیں پڑا ہے (تفسیر البیضاوی ص ۲۵ ج ۲ وتفسیر قرطبی پ ۱۲ ج ۱۹ وتفسیر مظہری ص ۱۲ ج ۱۰)

ساتویں آیت

اللہ الذی خلق سبع سمٰوات ومن الارض مثلھن۔ (طلاق - ۱۲)

اللہ تعالیٰ ایسا ہے کہ جس نے سات آسمان پیدا کئے اور انھی کی طرح زمین بھی (سات پیدا کی)

اس آیت کے تحت قرطبی لکھتے ہیں کہ "آسمان کے سات ہونے میں کوئی اختلاف نہیں ہے جیسا کہ حدیث معراج اس پر دلالت کرتی ہے" (قرطبی $\frac{۱۷۴}{۱۸ج}$)

اور حدیث معراج آگے آرہی ہے

آٹھویں آیت

وسارعوا الی مغفرة من ربکم وجنة عرضھا السمٰوات والارض (آل عمران - ۱۲۳)

اور دوڑو طرف مغفرت کے جو تمھارے پروردگار کی طرف سے ہو اور طرف جنت کے جس کا عرض ایسا ہے جیسے سب آسمان وزمین۔

قدیم وجدید کے ماہر اسلامی فلاسفر اور عظیم مفسر علامہ آلوسی بغدادی (متوفی ۱۲۷۰ھ) یہاں لکھتے ہیں کہ "اس جگہ سمٰوات سے سات آسمان اور ارض سے سات زمینیں مراد ہیں" (روح المعانی $\frac{۵۶}{ج۴}$)

نویں آیت

ان اللہ یمسک السمٰوات والارض ان تزولا ولئن زالتا ان امسکھما من احد من بعدہ۔ (فاطر - ۴۱)

بیشک اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کو (اپنی قدرت سے) تھامے ہوئے ہے کہ موجودہ حالات کو چھوڑ نہ دیں، اور اگر (بالفرض) وہ موجودہ حالت کو چھوڑ بھی دیں تو پھر خدا کے سوا اور کوئی ان کو تھام بھی نہیں سکتا۔

اس آیت کے تحت "تفسیر قرطبی" میں ہے کہ

والسمٰوات سبع والارض سبع　　　اور آسمان سات ہیں اور اسی طرح زمینیں بھی سات ہیں۔

(قرطبی ص ۳۵۶ ج ۱۴)

پھر یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ آسمانوں کو روکنے کا مطلب یہ نہیں کہ ان کی حرکت بند کر دی، بلکہ مراد اپنی جگہ سے ہٹ جانا اور ٹل جانا ہے، لہٰذا اس آیت میں آسمان کے متحرک یا ساکن ہونے میں سے کسی جانب پر کوئی دلیل نہیں (معارف القرآن ص ۳۵۵ ج ۷)

دسویں آیت

اَللّٰہُ الَّذِی رفع السمٰوات بغیر عمد ترونہا (رعد ـ ۲)

اللہ ایسا (قادر) ہے کہ اس نے آسمانوں کو بدون ستون کے اونچا کھڑا کر دیا، چنانچہ تم ان (آسمانوں) کو (اسی طرح) دیکھ رہے ہو۔

ایاس بن معاویہؒ اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

السماء مقبیۃ علی الارض مثل القبۃ (تفسیر طبری ص ۹۴ ج ۸، در منثور ص ۶۰ ج ۴)

آسمان زمین پر قبہ کی طرح بلند ہے

اور امام رازی لکھتے ہیں کہ "یہ عظیم اجسام (آسمان) کھڑے ہیں بلند فضا میں"

(تفسیر کبیر ص ۱۶۲ ج ۵)

یہاں بلحاظ "تلك عشرة كاملة" ان دس آیات کریمہ پر اکتفا کیا گیا ہے جو آسمان کے وجود اور تعدد پر وضاحت کے ساتھ دلالت کرتی ہیں۔

وجہ استدلال اور ایک شبہ کا جواب

یہاں کسی کو یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ لغت میں اور اسی طرح خود قرآن کی اصطلاح میں سماء (جس کی جمع سمٰوات ہے) کے دو معنی آتے ہیں ایک جرم والی عظیم مخلوق یعنی آسمان، دوسرا ہر بلند چیز، پس اس صورت میں مذکورہ آیات قرآنی سے آسمان کا وجود کس طرح ثابت ہوگا؟ کیونکہ ان آیات میں سماء بمعنی "ہر بلند چیز" ہونے کا بھی تو احتمال ہے، جو منکرین آسمان کا خیال ہے۔

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ قرآن میں اگرچہ بعض آیات قرآنی (مثلاً سورۂ فرقان کی آیات "تبارک الذی جعل فی السماء بروجاً" اور "وانزلنا من السماء ماءً طہوراً") وغیرہ کے اندر سماء کے معنی میں مذکورہ دونوں احتمالات ہیں لیکن یہاں وجود آسمان کی بحث میں جن آیات کریمہ کا انتخاب کیا گیا ہے ان میں صرف اول معنی (یعنی جرم اور دروازوں والا آسمان جس کی تعداد سات ہے) ہی مراد ہے، اگر ان میں سے کسی آیت کے اندر کوئی اور احتمال نکالنے کی کوشش کی جائے تو وہ بہت بعید اور بالکل خلاف ظاہر ہوگا خود ان آیات میں اور اسی طرح ان کے تحت نقل کئے گئے اجلہ مفسرین کے اقوال میں اگر غور و تدبر کیا جائے تو یہ بات اظہر من الشمس ہے۔ واللہ اعلم۔

آسمانوں کا وجود اور تعدد، حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں

بہت سی معتبر حدیثوں سے آسمانوں کا وجود ثابت ہوتا ہے، یہاں اختصار کیساتھ صرف "حدیث معراج" بیان کی جاتی ہے جس سے دروازوں اور جرم والے سات آسمانوں کا وجود پوری وضاحت وصراحت اور تیقن کے ساتھ ثابت ہوتا ہے، نیز اس حدیث پاک سے معلوم ہوتا ہے کہ آسمانوں کے دروازوں پر فرشتوں کے مضبوط پہرے مسلط ہیں وہ خاص خاص حالات میں کھولے جاتے ہیں جو شخص جس وقت چاہے آسمان میں داخل نہیں ہوسکتا، آگے حدیث معراج پڑھئے۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے سامنے براق لایا گیا، اور وہ ایک جانور ہے سفید رنگ کا، لمبا اور گدھے سے اونچا، اور خچر سے چھوٹا، اپنے سم وہاں رکھتا ہے جہاں تک اس کی نگاہ پہنچتی ہے، میں اس پر سوار ہوا، اور بیت المقدس تک آیا، پھر میں مسجد کے اندر گیا اور دو رکعت نماز پڑھی، پھر باہر نکلا تو حضرت جبرئیل علیہ الصلوۃ والسلام دو برتن لے کر آئے، ایک میں شراب تھی اور دوسرے میں دودھ، میں نے دودھ پسند کیا، حضرت جبرئیل علیہ السلام ہمارے ساتھ (پہلے) آسمان

پر چڑھے (جب وہاں پہنچے) تو فرشتوں سے دروازہ کھولنے کے لئے کہا، انھوں نے پوچھا کون ہے، جبرئیل نے کہا جبرئیل ہے۔ انھوں نے کہا تمھارے ساتھ دوسرا کون ہے؟ جبرئیل نے کہا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ فرشتوں نے پوچھا کیا وہ بلائے گئے ہیں؟ جبرئیلؑ نے کہا ہاں بلائے گئے ہیں، پھر (پہلے آسمان کا) دروازہ کھولا گیا، تو ہم نے حضرت آدم علیہ السلام کو دیکھا، انھوں نے مرحبا کہا اور میرے لئے بہتری کی دعا کی، پھر حضرت جبرئیل علیہ السلام ہمارے ساتھ دوسرے آسمان پر چڑھے اور فرشتوں سے دروازہ کھولنے کو طلب کیا فرشتوں نے پوچھا کون ہے؟ انھوں نے کہا جبرئیل، فرشتوں نے پوچھا تمھارے ساتھ دوسرا کون ہے؟ انھوں نے کہا محمدؐ ہیں، فرشتوں نے کہا کیا وہ بلائے گئے ہیں؟ جبرئیلؑ نے کہا ہاں وہ بلائے گئے ہیں، پھر دروازہ کھلا تو میں نے دونوں خالہ زاد بھائیوں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت یحییٰ علیہ السلام کو دیکھا، دونوں نے مرحبا کہا اور میرے لئے بہتری کی دعا کی پھر جبرئیلؑ ہمارے ساتھ تیسرے آسمان پر چڑھے، اور دروازہ کھولنے کو طلب کیا، فرشتوں نے کہا کون ہے؟ جبرئیلؑ نے کہا، جبرئیل، فرشتوں نے کہا، تمھارے ساتھ دوسرا کون ہے؟ جبرئیلؑ نے کہا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، فرشتوں نے کہا کیا وہ بلائے گئے ہیں؟ جبرئیل نے کہا ہاں، پھر دروازہ کھولا گیا تو میں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھا اللہ تعالیٰ نے خوبصورتی کا آدھا حصہ ان کو دیا تھا، انھوں نے مجھ کو مرحبا کہا، اور نیک دعا کی۔ پھر حضرت جبرئیل علیہ السلام ہم کو لے کر چوتھے آسمان پر چڑھے اور دروازہ کھولنے کو طلب کیا، حسب سابق سوال وجواب کے بعد فرشتوں نے چوتھے آسمان کا دروازہ کھولا تو وہاں میں نے (حضور صلعم نے) حضرت ادریس علیہ السلام کو دیکھا، انھوں نے مرحبا کہہ کر اچھی دعا دی۔ پھر حضرت جبرئیل ہمارے ساتھ پانچویں آسمان پر چڑھے اور دروازہ کھولنے کو طلب کیا، سابق کی طرح سوال وجواب کے بعد پانچویں آسمان کا دروازہ کھولا گیا تو وہاں حضرت ہارون علیہ السلام کو دیکھا، انھوں نے مرحبا کہا اور میرے لئے

نیک دُعا کی۔ پھر حضرت جبرئیلؑ ہمارے ساتھ چھٹے آسمان پر چڑھے اور دروازہ کھولنے کو طلب کیا، سوال وجواب کے بعد فرشتوں نے چھٹے آسمان کا دروازہ کھولا تو وہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دیکھا۔ انھوں نے مرحبا کہا اور اچھی دُعا دی، پھر حضرت جبرئیل ہم کو لے کر ساتویں آسمان پر پہنچے اور دروازہ کھولنے کو طلب کیا جب سابق سوال وجواب کے بعد ساتویں آسمان کا دروازہ کھولا گیا تو وہاں میں نے حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کو پایا، وہ تکیہ لگائے ہوئے بیت المعمور کی طرف نظریں جمائے بیٹھے تھے، بیت المعمور میں ہر روز ستّر ہزار فرشتے جاتے ہیں جو پھر کبھی نہیں لوٹتے، پھر جبرئیل علیہ السلام مجھ کو (حضورؐ کو) سدرۃ المنتہیٰ کے پاس لے گئے، اس کے پتے اتنے بڑے تھے جیسے ہاتھی کے کان اور اسکے بیر قلہ کی طرح ہیں، اور قلّہ ایک بڑا گھڑا ہے جس میں دو مشک یا زیادہ پانی آتا ہے۔

یہاں تک اختصار کے ساتھ "حدیث معراج" کا بیان ہوا، صحیحین کے علاوہ "مسند احمدؒ (ص ۲۵۲ / ج ۳) "سنن نسائی" (ص ۷۶ / ج ۱) "ترمذی" (ص ۱۴۱ / ج ۲) اور "مستدرک حاکم" (ص ۳۶۰ / ج ۲) وغیرہ میں بھی یہ حدیث مروی ہے، حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ "حدیث معراج" متواتر ہے، چنانچہ یہ حدیث حضرت عمرؓ، علیؓ، ابن مسعودؓ، ابوہریرہؓ، عائشہؓ وغیرہم بیس سے زائد صحابہ سے مروی ہے اور حدیث معراج پر جملہ مسلمانان عالم کا اتفاق واجماع ہے، صرف زندیقوں اور ملحدوں نے اس کا انکار کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو تفسیر ابن کثیر ص ۲۴۰ / ج ۳)

وجود آسمان اور حضرات صحابہؓ

اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک آسمانوں کا وجود ایک مسلّمہ حقیقت ہے، چنانچہ علامہ قرطبیؒ محدث ابن ابی شیبہ (متوفی ۲۳۵ھ) سے روایت کرتے ہیں کہ "حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ اکابر صحابہؓ کے مجمع سے سوال کیا کہ شب قدر رمضان کی کون سی تاریخ میں ہے! سب نے جواب میں صرف اتنا

کہا کہ اللہ اعلم، کوئی تعیین بیان نہیں کی، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ ان سب میں چھوٹے تھے، ان سے خطاب فرمایا کہ آپ کیا کہتے ہیں؟ تو ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اے امیر المؤمنین اللہ تعالیٰ نے آسمان سات پیدا کئے، زمینیں بھی سات پیدا کیں، انسان کی تخلیق سات درجات میں فرمائی، انسان کی غذا سات چیزیں بنائیں اس لئے میری سمجھ میں تو یہ آتا ہے کہ شب قدر ستائیسویں شب میں ہوگی، فاروق اعظمؓ نے یہ عجیب استدلال سن کر اکابر صحابہ سے فرمایا کہ آپ سے وہ بات نہ ہو سکی جو اس لڑکے نے کی جس کے سر کے بال بھی ابھی مکمل نہیں ہوئے (قرطبی ص ۱۱۱ و ۱۱۱ ج ۱۲)

دیکھئے یہاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سمیت اکابر صحابہ کے اتنے بڑے مجمع میں ابن عباس رضی اللہ عنہ نے جب سات آسمانوں کی تخلیق کا ذکر کیا تو کسی نے اس پر نکیر نہیں کی۔ لہذا معلوم ہوا کہ ان تمام صحابہ کرام کو آسمانوں کا وجود اور ان کا سات ہونا مسلّم تھا۔

سات آسمان اور توریت و انجیل

توریت و انجیل کو بھی آسمانوں کی تعداد میں سات ہونا مسلّم ہے چنانچہ "ڈکشنری آف دی بائیبل" (ص ۳۲۲ ج ۲) میں ہے کہ عہد عتیق اور عہد جدید دونوں میں آسمانوں کا جو تخیل ہے وہ سات آسمانوں کا ہے۔"

(تفسیر ماجدی ص ۱۵ ج ۱۲)　　(باقی آئندہ)

مولانا محمد نسیم صاحب
شعبۂ دارالافتاء، دارالعلوم دیوبند

قسط ۲

مسئلہ کفائت احادیث و ساطین امت کے اقوال کی روشنی میں

فقہار اور مسئلہ کفائت

ائمہ اربعہ میں سے تنہا حضرت امام مالکؒ کفائت کا صرف دین میں اعتبار کرتے ہیں، ان کے علاوہ ائمہ ثلثہ اور دیگر فقہار مجتہدین نے نسب، حرفت، مال، حریت وغیرہ میں کفائت کا اعتبار کیا ہے، متقدمین و متاخرین فقہار کی اکثریت کفائت کی قائل ہے مشہور حنفی عالم علامہ ابن الہمام صاحب فتح القدیر میں فرماتے ہیں:۔

قوله ای صاحب الهدایة معتبرة قالوا معناه معتبرة فی اللزوم علی الاولیاء حتی ان عدمها جاز للولی الفسخ ثم استدل بقوله صلی الله علیه وسلم لا یزوج النساء الا الاولیاء و لا یزوجن ا من الاکفاء فههنا نظران فی اثباته حجیته ثم وجه دلالته علی الوجه المذکور من معناها اما الاول فهو حدیث ضعیف لان فی سنده مبشر بن عبید والحجاج بن أرطاة والحجاج مختلف فیه

صاحب ہدایہ کا قول معتبرہ فقہار نے کہا کہ اسکے معنی یہ ہیکہ کفائت معتبر ہے اولیاء پر لازم ہونے میں یہاں تک کہ اگر کفائت نہ ہو تو ولی کیلئے نکاح فسخ کرانا جائز ہوگا، پھر اثبات کفائت کیلئے صاحب ہدایہ نے حدیث رسول "عورتوں کا نکاح اولیاء ہی کریں اور وہ خود نکاح نہ کریں مگر کفوؔ میں" سے احتجاج کیا ہے مگر اس جگہ اس حدیث کے اثبات حجیت کی وجہ دو نظر ہے، اس حدیث کے حجت ہونے کے اثبات میں اور دعوی کفائت پر اپنے معنی کے اعتبار سے دلالت کرنے میں، نظر اول یہ ہیکہ یہ حدیث ضعیف ہے اس لئے کہ اسکی سند میں مبشر بن عبید اور حجاج

ومبشر ضعیف متروک ونسبه احمد الی الوضع وسیاتی تخریجه لکنه حجة بالنظائر والشواهد فمن ذلک ما رواه محمد فی کتاب الآثار عن ابی حنیفة عن رجل عن عمر بن الخطاب قال لامنعن فروج ذوات الاحساب الامن الاکفاء و من ذلک ما رواه الحاکم وصححه من حدیث علی انه علیه السلام قال له یا علی ثلاث لا تؤخرها الصلوٰة اذا اتت، والجنازة اذا حضرت، و الأیم اذا وجدت لها کفوًا وقول الترمذی فیه لا اری اسناده متصلا منتف بما ذکرناه من تصحیح الحاکم وما عن عائشة عن النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم ... والنطفکم وانکحوا الاکفاء روی ذلک من حدیث عائشة وانس و عمر من طرق عدیدة فوجب ارتفاعه الی الحجیة بالحسن لحصول الظن بصحة المعنی وثبوته عنه صلی اللّٰہ علیه وسلم وفی هذا کفایة۔ (فتح القدیر لابن الهمام ص ۱۸۷ ج ۲ فصل فی الکفاءة)۔

بن ارطاۃ ہیں، اور حجاج مختلف فیہ راوی ہے اور مبشر ضعیف اور متروک ہے، امام احمد نے اس کی نسبت وضع کی طرف کی ہے، اور عنقریب اس حدیث کی تخریج آئے گی لیکن یہ حدیث حجت ہے باعتبار اپنے نظائر و شواہد کے۔ ان شواہد میں سے ایک وہ ہے جسے امام محمد نے کتاب الآثار میں حضرت امام ابوحنیفہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر رضؓ نے ارشاد فرمایا کہ حسب و نسب والی عورتیں نکاح کرنے سے نہ روکی جائیں مگر کفؤ میں، ان میں سے ایک وہ ہے جسے امام حاکم نے حضرت علی رضؓ سے روایت کیا ہے اور اس کی تصحیح بھی فرمائی ہے اور وہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضؓ سے فرمایا کہ علی تین امور میں تاخیر نہیں ہونی چاہیئے (۱) نماز جب اس کا وقت آجائے (۲) جنازہ جب تیار ہوکر آجائے (۳) بے شوہر والی عورت جب اس کا کفؤ مل جائے، اور امام ترمذی کا قول اس حدیث کے بارے میں کہ میں اس کی سند کو متصل نہیں سمجھتا ہوں، منتفی ہے اس وجہ سے جو میں نے ذکر کیا حاکم کی تصحیح کو، اور انہی میں سے حدیث عائشہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اپنے نطفے کیلئے اچھے خاندان کا انتخاب کرو اور کفؤ ہی میں رشتہ مناکحت قائم کرو۔

علامہ ابن الہمام کی اس بحث کا خلاصہ یہ ہیکہ مسئلہ کفاءت کے سلسلے میں صاحب ہدایہ وغیرہ نے حدیث رسول الا لایزوج النساء الا الاولیاء سے استدلال کیا ہے مگر یہ حدیث اپنی سند کے اعتبار سے ضعیف ہے اسلئے کہ اسمیں ایک راوی حجاج بن ارطاۃ ہے جو محدثین کے نزدیک مختلف فیہ ہے، دوسرا راوی مبشر بن عبید ہے اور یہ محدثین کے نزدیک ضعیف اور متروک ہے بلکہ امام احمد نے تو اس کے بارے میں یہ کہا کہ یہ شخص حدیث وضع کرتا ہے۔ لہذا اس حدیث سے مسئلہ کفاءت پر استدلال کرنا درست نہیں۔ البتہ یہ روایت اپنے معنی کے اعتبار سے صحیح ہے اور اس روایت کے شواہد ونظائر ہیں جن سے اس روایت کو قوت ملتی ہے۔ تین شاہد خود علامہ ابن الہمام نے ذکر کئے ہیں۔

(۱) "حدیث عمرؓ بن الخطاب" لامنعن فروج ذوات الاحساب الامن الاکفاء۔

(۲) "حضرت علیؓ کی حدیث" ثلاث لاتوخر الصلوۃ اذا اتت، والجنازۃ اذاحضرت، والایم اذا وجدت لها کفواً۔

(۳) "حدیث عائشہؓ" تخیروا لنطفکم وانکحوا الاکفاء۔

ان کے علاوہ ماقبل میں بھی چند روایات گذر چکی ہیں جن سے حدیث مذکور کو تقویت ملتی ہے مثلاً حضرت سلمان کا قول نفضلکم یا معشر العرب لتفضیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایاکم لاتنکح نساءکم ولاتومکم فی الصلوٰۃ۔ حافظ ابن تیمیہ نے اس کی سند کو جید قرار دیا ہے۔

پس اگرچہ حدیث مذکور الالایزوج النساء الخ اپنی سند کے اعتبار سے ضعیف ہونے کی وجہ سے قابل احتجاج نہیں مگر شواہد کی وجہ سے یہ روایت درجہ حسن کو تو پہونچ ہی جائے گی لہذا اس سے استدلال باعتبار معنی درست ہوگا۔

قاضی خان اپنے فتاوی میں کفاءت کی بحث کرتے ہوئے رقم طراز ہیں۔

الکفاءۃ معتبرۃ فی النکاح خلافاً — کفاءت نکاح میں معتبر ہے، امام مالکؒ، سفیانؒ

لمالك وسفيان وجماعة من الصحابة وعن الكرخي انه اخذ بقولهم ثم الكفاءة تتعلق بخمسة منها لاخلاف فيها بيننا وهي النسب فقريش بعضهم اكفاء لبعض كيف كانوا حتى ان القرشي الذي ليس بهاشمي يكون كفا للهاشمي وغير القرشي من العرب لايكون كفأً للقرشي والعرب بعضهم اكفاء لبعض الانصاري والمهاجري فيه سواء والموالي لايكونون اكفاء للعرب" (قاضی خان علی هامش العالمگیری صہ۳۵۰ ج ۱)

اور صحابہ رض کی ایک جماعت کا اس میں اختلاف ہے امام کرخی نے بھی انھیں حضرات کے مسلک کو اختیار کیا ہے پھر کفارت متعلق ہوتی ہے پانچ چیزوں کے جنمیں علمائے حنفیہ کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ان اور خمسہ میں سے نسب ہے، پس تمام قریش ایک دوسرے کے کفو ہیں جیسے بھی ہوں یہانتک کہ قریش جو ہاشمی نہ ہو کفو ہوگا ہاشمی کا اور عرب میں سے غیر قریشی قریشی کا کفو نہیں، اور قریشی کے علاوہ عرب ایک دوسرے کے کفو ہیں اور اس میں انصاری اور مہاجری سب برابر ہیں اور اہلِ عجم عرب کے کفو نہیں ہیں۔

صاحب بدائع الصنائع علامہ کاشانی نے قائلین کفارت اور منکرین کفارت کے دلائل اور براہین پوری شرح وبسط کے ساتھ بیان فرماکر قائلین کفارت کے دلائل کو متعدد وجہ سے راجح قرار دیاہے پھر منکرین کفارت کے دلائل کا جائزہ لیکر ان کے مسکت جوابات دیئے ہیں چنانچہ علامہ فرماتے ہیں:۔

اما الاول اي الكفاءة في باب النكاح فقد قال عامة العلماء انها شرط وقال الكرخي ليس بشرط اصلاً وهو قول مالك وسفيان الثوري والحسن

اکثر مشائخ نے کہا ہے کہ کفارت نکاح میں شرط ہے اور امام کرخی ؒ نے کہا کہ شرط نہیں اور یہی حضرت امام مالکؒ، سفیان ثوری، حسن بصری وغیرہم کا قول ہے، ان حضرات نے اس حدیث سے استدلال

البصری واحتجوا بما روی ان ابا
طیبة خطب الی بنی بیاضة فابوا
ان یزوجوه فقال رسول اللّٰہ صلی
اللّٰہ علیه وسلم انکحوا اباطیبة
ان لاتفعلوا تکن فتنة فی الارض
وفساد کبیر، وروی ان بلالاً
خطب الی قوم من الانصار فابوا
ان یزوجوه فقال له رسول اللّٰہ
صلی اللّٰہ علیه وسلم قل لهم ان
رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم
یأمرکم ان تزوجونی، امرهم رسول
اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم بالتزویج
عند عدم الکفاءة ولوکانت معتبرة
لما امر لان التزویج من غیر کفء
غیر مامور به وقال صلی اللّٰہ علیه
وسلم لیس لعربی علی عجمی الا
بالتقوی وهذا نص ولان الکفاءة
لوکانت معتبرة فی الشرع لکان
اولی الابواب بالاعتبار بها باب
للدماء لانه یحتاط فیه ما لا
یحتاط فی سائر الابواب ومع

کیا ہے جسمیں ذکر کیا گیا ہے کہ ابوالطیبہ نے بنی بیاضہ
کے پاس اپنے نکاح کا پیغام بھیجا، تو ان لوگوں نے
ان سے نکاح کرنے سے انکار کر دیا تو اس پر رسول
اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ابوطیبہ سے
اپنی لڑکی کا نکاح کردو، اور اگر نہیں کروگے تو
زمین میں فتنہ اور زبردست فساد پیدا ہوگا اور
روایت میں ہے کہ حضرت بلال رضؓ نے قبیلہ انصار
کے کسی آدمی کے پاس اپنے نکاح کا پیغام بھیجا تو
یہ لوگ حضرت بلال رضؓ سے نکاح کرنے پر
آمادہ نہیں ہوئے تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم
نے حضرت بلال رضؓ سے فرمایا کہ تم ان سے جاکر کہدو
کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم تمہیں حکم دے
رہے ہیں کہ مجھ سے اپنی لڑکی کا نکاح کردو، تو
رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عدم کفارت کے
باوجود نکاح کردینے کا حکم فرمایا اور اگر کفارت
معتبر ہوتی تو آپ اس کا امر کیوں فرماتے اسلئے کہ
غیر کفؤ میں نکاح کردینا مامور بہ نہیں ہوسکتا، اور
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کسی
عربی کو کسی عجمی پر فضیلت نہیں مگر تقویٰ کے ذریعے
اور یہ حدیث کفارت کے غیر معتبر ہونے میں بالکل
صریح ہے، اور اگر کفارت شریعت میں معتبر ہوتی

هذا لم يعتبر حتى يقتل الشريف بالوضيع فههنا اولى والدليل عليه انها لم تعتبر فى جانب المرأة فكذا فى جانب الزوج ، ولنا ما روى انه عليه السلام قال لا يزوج النساء الا الاولياء فلا يزوجن الا من الأكفاء ولا مهر اقل من عشرة دراهم ولان مصالح النكاح تختل عند عدم الكفاءة لانها لا تحصل الا بالاستفراش والمرأة تستنكف عن استفراش غير الكفء وتعير بذلك فتختل المصالح ولان الزوجين يجرى بينهما باسطات فى النكاح لا يبقى النكاح بدون تحملها عادة و التحمل من غير الكفء امر صعب ثقيل على الطباع السليمة فلا يدوم النكاح مع عدم الكفاءة فلزم اعتبارها ولا حجة لهم فى الحديث لان الامر بالتزويج يحتمل انه كان ندبا بالهم الى الافضل واختيار الدين وترك الكفاءة فيما سواه والاقتصار عليه

تو خون کا باب اس کے اعتبار کا زیادہ حقدار ہوتا اسلئے کہ اس میں جتنی احتیاط کی جاتی ہے وہ دوسرے ابواب میں نہیں کی جاتی، اور اس کے باوجود خون کے باب میں کفارت کا اعتبار نہیں کیا گیا یہانتک کہ شریف آدمی رذیل کے قصاص میں قتل کیا جاتا ہے، پس نکاح کے باب میں بدرجۂ اولٰی اس کا اعتبار نہ ہوگا اور دلیل اس کی یہ ہے کہ کفارت عورت کی جانب معتبر نہیں پس ایسے ہی شوہر کی جانب بھی معتبر نہیں ہونی چاہیئے۔ اور ہماری دلیل وہ حدیث ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ عورتوں کا نکاح نہ کریں مگر انکے اولیاء اور وہ خود اپنا نکاح نہ کریں مگر کفؤ میں اور مہر دس درہم سے کم نہیں۔ اور اس لئے بھی کہ نکاح کی مصلحتیں عدم کفارت کی صورت میں پوری نہیں ہوسکتیں کیونکہ نکاح کے مصالح نہیں حاصل ہوتے مگر فراش بنانے کے ذریعے اور عورت حیا محسوس کرتی ہے غیر کفؤ کا فراش بننے سے اور عار دلائی جاتی ہے پس مصلحتیں مختل ہو کر رہ جائیں گی اور اسلئے کہ اس کا بھی احتمال ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عدم کفارت کے باوجود نکاح کر دینے کا حکم دیا یہ ان حضرات کی

وهذا لا يمنع جواز الامتناع و عندنا الافضل اعتبار الدين و للاقتصاد عليه، ويحتمل انه كان هو ايجاب امرهم بالتزويج مع عدم الكفاءة تخصصاً لهم بذلك كما خص اباطيبة بالتمكين من شرب دمه صلى الله عليه وخص خزيمة بقبول شهادته وحده ونحو ذلك ولا شركة فى موضع الخصوصية حملنا الحديثين على ما قلنا توفيقا بين الدلائل واما الحديث الثالث فالمراد به احكام الآخرة اذ لا يمكن حمله على احكام الدنيا لظهور فضل العربى على العجمى فى كثير من احكام الدنيا فيحمل على احكام الآخرة وبه نقول و القياس على القصاص غير سديد لان القصاص شرع لمصلحة الحياة واعتبار الكفاءة فيه يؤدى الى تفويت هذه المصلحة لان كل

خصوصیت ہو، جیساکہ ابوطیبہ کی خصوصیت ہیکہ انھیں نبی کریم ﷺ کے خون پینے کی اجازت دی گئی، اور حضرت خزیمہ کی تنہا شہادت قبول کی گئی ۔ اور اسکے مثل دیگر خصوصیات، اور موضع خصوصیت میں اشتراک نہیں ہوتا ہے، ہم نے ماقبل کی دونوں حدیثوں کو مذکورہ بالا خصوصیت پر محمول کیا دلائل کے درمیان تطبیق پیدا کرنے کیلئے، بہرحال حدیث سوم تو اس سے مراد آخرت کے احکام ہیں اس لئے انہیں احکامِ دنیا پر محمول کرنا ممکن نہیں بوجہ عربی کی فضیلت عجمی پر ظاہر ہوتے دنیاوی بہت سے معاملات اور احکام میں ۔ پس اسے آخرت پر محمول کیا جائے گا ۔ اور یہی ہمارا مسلک ہے اور قصاص پر قیاس کرنا درست نہیں اسلئے کہ قصاص زندگی کی مصلحت کیلئے مشروع ہوا ہے اور کفاءت کا اسمیں اعتبار کرنا مذکورہ مصلحت کے فوت کردینے کا سبب بنے گا، اسلئے کہ کفاءت کے معتبر ہونے کی صورت میں ہر آدمی اپنے غیر کفو کے قتل کا قصد کرے گا پس قصاص کی مصلحت فوت ہوکر رہ جائے گی ، اور کفاءت کا نکاح کے باب میں اعتبار کرنا نکاح سے مطلوب مصلحت کے اثبات کا سبب ہوگا لہٰذا خون کے باب میں اس کا

احد یقصد قتل عدوہ الذی لا یکافئہ نتفوت المصلحۃ المطلوبۃ من القصاص وفی اعتبار الکفاءۃ فی باب النکاح تحقیق المصلحۃ المطلوبۃ من النکاح من الوجہ الذی بینا فبطل الاعتبار ولذا الاعتبار بجانب المرأۃ لایصح ایضا للرجل لا یستنکف عن استفراش المرأۃ الآتیۃ لان الاستنکاف عن التفرش لاعن المستفرش والزوج مستفرش فیستفرش للوطی والحسن

اعتبار باطل ہوگا اور ایسے ہی کفاءت کا عورت کی جانب اعتبار کرنا صحیح نہیں ہے اسلئے کہ مرد نہیں عار محسوس کرتا ہے اپنے سے کمتر عورت کو فراش بنانے میں، کیونکہ عار و شرمندگی فراش بننے والی کی طرف سے ہوتا ہے نہ کہ فراش بنانے والے کی طرف سے اور شوہر فراش بنانے والا ہے پس ہر اچھی بری عورت کو فراش بنالے گا۔

(بدائع الصنائع ص ۳۱۷ ج ۲)

منکرین کفاءت کے جتنے بھی دلائل دیئے گئے ہیں وہ سب یا تو امور آخرت سے متعلق ہیں یا پھر وہ قیاسات ہیں جو صحیح نہیں، ابوطیبہ، اور حضرت بلال کی روایت میں کئی احتمالات نکل گئے اوّلاً یہ ہیکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف استحبابی حکم دیا تھا جس کا اولیاء کیلئے تسلیم کرنا از روئے شریعت ضروری نہیں تھا جیساکہ حضرت بریرہؓ سے آپؐ نے فرمایا تھاکہ مغیث کے نکاح میں رہ جاؤ۔ احتمال ثانی یہ کہ غیر کفو میں نکاح کیا جانا ان حضرات کی خصوصیت ہو، احتمال ثالث یہ کہ اولیاء کو ان کی دینداری کی وجہ سے ان سے نکاح کر دینے کا حکم دیا گیا اور صرف دینداری میں کفاءت کا اعتبار کیا گیا اور اولیاء کو اس کا حق ہے، اس کے علاوہ آیت کریمہ ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم اور اس طرح کی احادیث کے بارے میں گذر چکا کہ ان سب کا تعلق امورِ آخرت سے ہے نہ کہ دنیاوی معاملات سے۔

کفاءت کے معتبر ہونیکی وجہ عقلی یہ ہیکہ عام طور پر عورتیں غیر کفؤ افراد و اشخاص

کے فراش بننے سے عار محسوس کرتی ہیں اور ظاہر ہے کہ نکاح کی مصلحتیں اسی وقت پوری ہوسکتی ہیں جب وہ فراش بنیں۔ لہٰذا کفارت کے اعتبار نہ کرنے میں نکاح کی مصلحتیں فوت ہوجائیں گی۔ پھر مشروعیت نکاح سے کیا فائدہ۔

پھر عدم کفارت کی صورت میں زوجین کی زندگی خوشی ومسرت، فرحت وانبساط کیساتھ گذرنے کے بجائے تلخ اور نہایت خراب گذرے گی۔ کیونکہ جب دونوں کی معاشرت اور مزاج و طبیعت اور رہن سہن میں موافقت اور یکسانیت نہ ہوگی تو پھر ان کے آپس کے تعلقات و روابط جن کے سہارے رشتہ نکاح برقرار رہتا ہے استوار نہ رہ سکیں گے پھر چند دنوں کے بعد تفریق یا کم سے کم باہمی اختلافات ونزاعات سے دونوں کا چین وسکون خاک آلود ہوجائے گا۔ اسی طرح جب تک دو خاندانوں کے درمیان مساوات ویکسانیت اور معاشرت کا توازن نہیں رہے گا۔ وہ دونوں آپس میں ایک دوسرے سے مربوط نہیں ہوسکتے۔

انہیں اسباب ووجوہات کی بنا پر ائمہ ثلثہ اور ان کے متبعین نے نکاح میں کفارت کو شرط کا درجہ دیا۔ البتہ ان نصوص کے تحت جن میں صاحب دین وتقویٰ کے انتخاب کا حکم دیا گیا ہے۔ کفارت میں دینداری کا سب سے زیادہ خیال رکھا ہے۔ حتیٰ کہ اگر کوئی شخص صرف دینداری کی وجہ سے نکاح کرلے اور دوسری تمام چیزوں میں کفاءت کا لحاظ نہ کرے تو اس پر نکیر نہیں کی گئی اور صاحب بدائع کے حوالے سے یہ بات گذر چکی ہے کہ احناف کے نزدیک دینداری میں کفارت کا لحاظ واعتبار بنسبت دیگر امور کے افضل وبہتر ہے۔ اس سے وہ تمام اشکالات و اعتراضات کی خودساختہ عمارت خود بخود منہدم ومسمار ہوکر رہ جاتی ہے اور مسئلہ کفارت بغیر گرد و غبار کے منشاء شرع کے موافق نظر آتا ہے، مسئلہ کفارت کو پیٹ پرست اور متعصب ذہنیت رکھنے والے مولویوں نے گھناؤنا لباس پہنا کر لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ اور اس کی غلط تعبیر و تشریح کرکے عوام کالانعام کی ذہنیت کو خراب کیا،

اگر مسئلہ کفارت مزاج شرع وشارع علیہ السلام کے بالکل مخالف ومعارض ہوتا تو فقہاء

مجتہدین اسے عصر اُبعد عصر اپنی تصنیفات میں جگہ نہ دیتے اور نہ احادیث سے اس کا ثبوت فراہم کرتے۔ اسلاف سے لیکر اخلاف تک سبھوں نے کفاءت کو صحیح و معتبر تسلیم کیا ہے۔ البتہ فقہاء متقدمین میں سے بعض حضرات نے صرف دین میں کفاءت کا اعتبار کیا ہے مگر ان کے دلائل کے کے جوابات بھی دیئے گئے

صنعت و حرفت میں کفاءت کا اعتبار

فقہاء کرام نے چند چیزوں میں کفاءت کا اعتبار کیا ہے۔

(۱) نسب۔ (۲) دینداری (۳) مال (۴) صنعت و حرفت (۵) حریت ہدایہ۔ ص ۳۲۰ و ۳۲۱ ج ۲۔ درمختار ص ۱۹۴، ۱۹۵ ج ۱۔ باب الکفاءۃ۔

صنعت و حرفت میں یہ بات قابل لحاظ ہے کہ پیشے کے حسن و قبح اور اس کے اچھے برے ہونیکا دار و مدار عرف پر ہے۔ فی نفسہٖ کسی پیشہ کو معیوب اور غلط نہیں کہا جا سکتا، اور نہ کسی پیشہ کی وجہ سے کسی کو ہدف ملامت بنانا درست ہوگا۔ جہاں جو پیشہ گھٹیا شمار ہوتا ہوگا اس پیشہ والا وہاں کے پیشے والے کا کفوء اور ہمسر شمار نہیں ہوگا۔ چنانچہ علامہ ابن عابدین شامی حنفی رد المحتار علی الدر المختار میں فرماتے ہیں:۔

وفی الفتح ان الموجب هو استنقاص اهل الحرف فيدور معه وعلى هذا ينبغي ان يكون الحائك كفوًا للعطار بالاسكندرية لما هناك من حسن اعتبارها وعدم عدها نقصًا البتة الا ان يقترن بها خساسة غيرها فاذا دان الحرف

یعنی موجب اہل پیشہ کا گھٹیا سمجھا جانا ہے پس مسئلہ کفاءت اس پر دائر ہوگا اور اس اصول پر مناسب ہے کہ اسکندریہ میں بجز عطار کا کفوء ہو اس وجہ سے کہ اسے وہاں اچھا سمجھا جاتا ہے اور اسے گھٹیا نہیں گردانا جاتا۔ الا یہ کہ اس پیشے کے ساتھ اور کوئی دوسری رذیل چیز مل جائے، پس حاصل یہ ہوا کہ پیشے جب آپس میں متقارب و متحد ہوں تو دوسری جہتوں میں بھی کفاءت کا لحاظ ضروری ہوگا۔ پس عجمی عطار، عربی عطار اور بزاز کا کفوء نہیں ہوگا

اذا تقاربت وما خلا ذلك يجب
لاعتبار التكافؤ من بقية الجهات فالعالم
العجمي غير كفوء لعطار او بزاز عربي
والمعنى يلحق به اشرف النسب
والعلم يجبر نقص الحرفة بل
يفوق سائر الحرف فلا يكون نحو العطار
العجمي كفوءًا للنحو حلاق عربي او عالم ۔
(شامی ص ۹ ج ۱۳ پاکستان)

اور وہ چیز جو میرے سنے ظاہر ہوتی ہے
یہ ہے کہ نسب اور علم کا شرف پیشے کی
تلافی کر دیتا ہے ۔ بلکہ تمام پیشوں سے
فوقیت بھی لے جاتا ہے ۔ پس عجمی عطار
عربی نائی، یا عالم کا کفوء شمار نہ
ہوگا

⁂ ⁂
⁂

احناف و دیگر ائمہ نے صنعت و حرفت میں بھی کفاءت کا لحاظ اس وجہ سے کیا کہ لوگ اس کے ذریعہ بھی فخر ومباہات کرتے ہیں اور اچھے پیشوں کی وجہ سے فخر محسوس کرتے ہیں اور خراب وگھٹیا پیشوں کی بناء پر عار وشرمندگی محسوس کرتے ہیں ۔

ہدایہ ص ۳۲۱ ج ۲ ۔

صاحب بدائع الصنائع علامہ کاسانی حرفت وصنعت کا ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں

الحرفة فقد ذكر الكرخي
ان الكفاءة في الحرف والصناعات
معتبرة عند ابي يوسف فلا
يكون الحائك كفئًا للجوهري
والصيرفي وذكر ان ابا حنيفة
بنى الامر فيها على عادة العرب
ان مواليهم يعملون ۔ هذه
الاعمال لا يقصدون بها الحرف

بہرحال پیشہ تو امام کرخی رح نے ذکر کیا کہ امام ابی یوسف کے نزدیک صنعت وحرفت میں بھی کفاءت معتبر ہے پس حجام جوہری اور صیرفی کا کفوء نہیں ہوگا ۔ اور ذکر کیا کہ امام ابو حنیفہ رح نے اس میں مدار اہل عرب کی عادت پر رکھا ہے، ان کے موالی ان اعمال کو کرتے ہیں اور وہ لوگ اس سے پیشوں کا ارادہ نہیں کرتے جس کی بناء پر وہ لوگ پیشوں کی وجہ سے عار

فلا يعيرون بها واجاب ابو
يوسف على عادة اهل البلاد
انهم يتخذون ذلك حرفة
فيعيرون بالدنى من
الصنائع فلا يكون بينهم خلاف
في الحقيقة وكذا ذكر القاضي
في شرحه مختصر الطحاوي
اعتبار الكفاءة في الحرفة
ولم يذكر الخلاف فيثبت
الكفاءة بين الحرفتين في
جنس واحد كالبزاز مع
البزاز والحائك مع الحائك
وتثبت عند اختلاف جنس
الحرف اذا كان يقارب بعضها
بعضا كالبزاز مع الصائغ
والصائغ مع العطار والحائك
مع الحجام والحجام مع
الدباغ ولا تثبت فيما لا مقاربة
بينهما كالعطار مع البيطار
والبزاز مع الخراز وذكر في
بعض نسخ الجامع الصغير

نہیں دلائے جاتے ہیں، اور امام ابو یوسفؒ نے
اپنے بلاد کے لوگوں کی عادت کے مطابق جواب
دیا کہ وہ لوگ اسے پیشہ بناتے ہیں اور خراب
دگھٹیا پیشے کی وجہ سے انہیں عار دیا جاتا ہے،
لہٰذا حقیقت کے اعتبار سے ان میں کوئی فرق
اور اختلاف نہیں ہے۔ اور اسی طرح قاضی نے
مختصر طحاوی کی شرح میں پیشہ کی کفاءت کے معتبر
ہونے کو ذکر کیا ہے اور امام ابو یوسف اور حضرت
امام ابوحنیفہؒ کا اختلاف ذکر نہیں کیا، پس ثابت
ہوگی کفاءت ایک ہی جنس کے دو پیشوں کے درمیان
جیسے بزاز، بزاز کے ساتھ، اور بنکر، بنکر کے ساتھ
اور ثابت ہوگی کفاءت پیشوں کی جنسیت کے مختلف
ہونے کی صورت میں جبکہ وہ ایک دوسرے سے
ملتے جلتے ہوں جیسے بزاز، بزاز کے ساتھ اور بنکر،
بنکر کے ساتھ، اور ثابت ہوگی، کفاءت پیشوں
کی جنسیت کے مختلف ہونے کی صورت میں جبکہ وہ
ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہوں۔ جیسے بزاز زرگر
کے ساتھ، اور زرگر عطار کے ساتھ، اور بنکر
حجام کے ساتھ، اور حجام دباغت دینے والے کیساتھ،
اور نہیں ثابت ہوگی کفاءت ان پیشوں کے درمیان جو
ایک دوسرے کے متقارب نہیں۔ جیسے عطار، بیطار

(باقی صفحہ پر)

از:- محمد عبداللہ الاسعدی جامعہ عربیہ ہتورا ضلع باندہ

امام ابوحنیفہؒ کی مرویات اور ان کے مجموعے

امام صاحب کا اصل مستقر کوفہ تھا جس میں ۱۵۰۰ صحابہ نے قیام فرمایا جن میں حضرت علیؓ و ابن مسعودرضؓ بھی تھے جن کو تمام صحابہ کے علوم کا جامع قرار دیا گیا ہے اور امام صاحب کے متعلق خود انھیں سے ان دونوں حضرات کے اصحاب کے واسطے سے ان کے علوم کے جمع کرنے کی تصریح آئی ہے[1]۔ اور امام صاحب کے متعلق یہ بھی تصریح ہے کہ کوفہ کی تمام مرویات کو آپ نے جمع کر لیا تھا[2]۔ جیسے کہ محمد ابن سماعہ سے منقول ہے کہ امام صاحب نے اپنے تلامذہ کو ستر ہزار سے زائد احادیث کا املا کرایا[3] اور یحییٰ ابن نصر محدثؒ سے نقل کیا گیا ہے کہ وہ ایک مرتبہ امام صاحب سے ملنے گئے تو جس کمرہ میں ملاقات کی نوبت آئی وہ کتابوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے امام صاحب سے عرض کیا کہ یہ کتابیں کیسی ہیں؟ فرمایا کہ یہ احادیث ہیں۔ میں نے اس کا بس تھوڑا سا حصہ نقل کیا ہے جو کہ لائق انتفاع ہے[4]۔ ان تصریحات سے امام صاحب کی حفظ کردہ و محفوظ کردہ احادیث کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

امام صاحب سے منقول روایات کی کمی

البتہ یہ ضرور ہے کہ مذکورہ بالا قرائن اجتمۂ یا وقتی تعداد کے مقتضی ہیں لیکن

---

[1] السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی ص ۴۱۵　[2] ابوحنیفہ و اصحابہ المحدثین ص ۱۲

[3] قواعد فی علوم الحدیث　[4] السنۃ ومکانتہا ص ۴۱۱۔

اس کے برعکس دیگر حفاظ محدثین مثلاً امام احمد ابن حنبل وغیرہ سے جس مقدار میں روایات منقول ہیں۔ امام صاحب کی محفوظ مرویات اس کی نسبت کم ہیں۔ اس سے بہت سے لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے اور اس کو انہوں نے امام صاحب کی تنقیص کا ذریعہ بنا لیا ہے مگر اولاً تو محض مرویات کی کمی کو علمی نقص کی دلیل نہیں بنایا جا سکتا ہے۔ امام شافعی رح اور امام مالک کی محفوظ مرویات بھی تو بہت زیادہ نہیں ہیں۔ حتیٰ کہ امام احمد کے بقدر بھی نہیں اور صحابہ میں حضرت ابوبکر رض و حضرت عمر رض کا مقام معلوم ہے مگر پھر بھی ان کی مرویات کو دوسرے اصاغر صحابہ سے کیا نسبت ہے۔ معروف ہے۔ ثانیاً یہ کہ امام صاحب کی مرویات کی قلت کے سلسلے میں اکابر اہلِ تحقیق نے مختلف اسباب تحریر کئے ہیں۔ مثلاً :۔
استنباط مسائل کے ساتھ اشتغال ! صاحب عقود الجمان نے ذکر کیا ہے کہ وسعتِ حفظ کے باوجود اس کا سبب مسائل کے استنباط کے لئے غور وخوض جیسے کہ امام مالک و امام شافعی حتیٰ کہ حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کی مرویات بھی اسی انداز کی مشغولیات کی وجہ سے ان کے وفورِ علم کی نسبت بہت کم ہیں[۱]۔ (۲) قبول روایات میں تشدد :۔ بعض حضرات نے ذکر کیا ہے چونکہ امام صاحب کے عہد میں فرقِ ضالہ[۲] زور پر تھا اور اس کی وجہ سے وضع احادیث کا سلسلہ بڑھتا جا رہا تھا بالخصوص کوفہ کے مخصوص ماحول کی وجہ سے وہاں کی فضا کچھ زیادہ ہی متاثر تھی اس لئے امام صاحب نے روایات کے قبول ورد کا جو معیار اپنایا تھا وہ احتیاط اور تشدد میں دوسرے محدثین کے معیار سے بڑھا ہوا تھا حتیٰ کہ دوسرے معتمد محدثین کے نزدیک مقبول احادیث کو بھی وہ بسا اوقات مستحق قبول نہیں قرار دیتے تھے[۲]۔ فقہ حنفی کی کتب اصول میں خبر واحد کے قبول اور اس پر عمل کی جو شرطیں ذکر کی گئی ہیں ان سے ظاہر ہے۔
(۳) نقل روایات بصورت افتاء و مسائل : یعنی ایسا نہیں ہے کہ امام صاحب سے روایات

---

[۱] السنۃ ومکانتہا ص ۴۱۴ عن عقود الجمان [۲] ایضاً ص ۴۰۳-۴۰۴ و ۴۰۹ و ابوحنیفہ واصحابہ المحدثون ص ۱۲ نقلاً عن مقدمہ ابن خلدون۔

احادیث کم منقول ہیں بلکہ بات یہ ہے کہ روایات کی نقل کا جو طریقہ ہے کہ پوری سند کے ساتھ یا جو کچھ حذف یا صرف صحابی کے ذکر کے ساتھ یا کسی بھی راوی کی صراحت کے بغیر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف یا جس صحابی و تابعی کا اثر ہو اس کی طرف نسبت کرکے حدیث نقل کی جائے اس کے بجائے امام صاحب نے یہ کیا ہے کہ احادیث و آثار کو حسب موقع بصورت افتاء و مسائل نقل کیا ہے جس سے بظاہر یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ کہنے والے کا خود اپنا قول ہے حالانکہ وہ دراصل کسی روایت سے حاصل شدہ حکم ہوتا ہے حتیٰ کہ بسا اوقات بعینہ روایت کے الفاظ کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔ امام صاحب کا یہ طریقہ جو دراصل ان کا خود ایجاد کردہ نہیں تھا بلکہ یہ بعض اکابر صحابہ کی اتباع میں تھا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف صریح نسبت سے بڑی حد تک گریز کرتے تھے محض اسی احتیاط کی بناء پر کہ کہیں ہم سے نسبت میں کسی لفظ کی زیادتی یا کمی ہو جائے یا غلطی ہو جائے تو اس سلسلہ کی وعید کا مصداق نہیں۔ ان میں سر فہرست حضرت عمرؓ ابن مسعودؓ ہیں۔ اور حضرت ابن مسعودؓ سے یہ طریقہ کوفہ کے علماء نے حاصل کیا۔ اور اسی[۱] بنیاد پر شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے حضرت عمرؓ و حضرت ابن مسعودؓ کو ان صحابہ میں شمار کیا ہے۔ جو کثرت کے ساتھ احادیث کے ناقل سمجھے جاتے ہیں جن سے ہزار سے زائد احادیث مروی ہیں جو کہ دونوں حضرات کی طرف منسوب اقوال جو بظاہر موقوف ہیں۔ احادیث کے جائزہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حقیقت میں مرفوع ہیں[۲]۔ حضرت شاہ صاحب نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں نقل احادیث و روایات کے ان دونوں طریق پر تفصیل سے کلام فرمایا[۳]۔ اور امام صاحب اور ان کے تلامذہ کے متعلق تحریر فرمایا ہے کہ وہ سارے کے سارے ابراہیم نخعی وغیرہ کے آثار ہیں۔ اور ابراہیم نخعی کے آثار جو اگرچہ کسی کی طرف منسوب کرکے منقول نہ ہوں خود ان کی ذاتی آراء نہیں بلکہ ان کے اسلاف کوفہ میں مقیم صحابہ اور ان کے اصحاب کے آثار ہیں۔ مزید

---

[۱] ابوحنیفہ و اصحابہ المحدثون ص ۱۸، حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۵۱ و ۱۵۳ – ۱۵۴، ابوحنیفہ و اصحابہ المحدثون ص ۱۷ و ۱۸ بحوالہ ازالۃ الخفا مقصد دوم۔ [۳] حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۳۱ و ۱۳۲۔

[۴] ایضاً ص ۱۴۴ و ۱۴۶، ابوحنیفہ و اصحابہ المحدثون ص ۱۶ و ۱۷، قواعد فی علوم الحدیث ص ۹۲ و ۹۳۔

یہ کہ ہر حافظ و محدث کو جو روایات محفوظ ہوتی ہیں ان کی کثرت اور عظمت تعداد سے عموماً اس کی مرویات کم ہوتی ہیں۔ امام بخاری و مسلم دونوں کو تین تین لاکھ احادیث محفوظ تھیں مگر ان کی کتابوں میں غیر مکرر روایات بمشکل چار ہزار ہیں اس لحاظ سے دیکھا جائے تو امام صاحب سے محفوظ کردہ روایات بھی کوئی خاص قلت نہیں رکھتیں۔ جامع المسانید میں جو روایات محفوظ کی گئی ہیں۔ وہ تقریباً دو ہزار ہیں جن میں سے ۲۱۵ ابراہیم نخعی کے آثار ہیں[۱]۔ امام صاحب کے مسانید جو جمع کئے گئے ہیں ان میں سے صرف حافظ ابن عقدہ ۳۳۲ھ کے مسند میں ایک ہزار روایات جمع کی گئی ہیں اور امام صاحب کے متعدد مسانید ایسے بھی ہیں جو کہ جامع المسانید میں شامل ہیں جیسا کہ تفصیل آگے آئیگی۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ امام صاحب سے محفوظ روایات مکررات کے حذف کے ساتھ لگ بھگ چار ہزار ہیں جیسا کہ امام صاحب کے ایک تلمیذ حسن بن زیاد لؤلؤی سے منقول ہے کہ امام صاحب کی مرویات چار ہزار ہیں۔ دو ہزار ان کے استاذ خاص حماد سے محفوظ کردہ اور دو ہزار باقی مشائخ سے سنی ہوئی[۲] اسی لئے ائمہ ثقات سے متعلق جو نوع قائم کی ہے اس میں امام صاحب کا بھی تذکرہ کیا ہے[۳]۔

امام ابوحنیفہ کی مرویات کے مجموعے

امام صاحب اور ان کی فقہ کو بہت سے لوگ احادیث ہی سے تہی دامن سمجھتے ہیں مگر اس غلط گمان کی حقیقت اوپر کی تفصیلات سے ظاہر ہوگئی ہیں اور مزید آگے واضح ہوجائیگی شیخ محمد امین کی تحقیق کے مطابق جنھوں نے امام صاحب کی مرویات کے جمع و تدوین کو تقریباً دو سو صفحات پر مشتمل ایک کتاب "مسانید الامام ابی حنیفہ" کے نام سے لکھی ہے۔ ایسے مجموعے چار قسم کے ہیں (الف) کتاب الآثار۔ (ب) مسند امام ابوحنیفہ رح (ج) اربعیات امام ابوحنیفہ رح (د) وحدانیات امام ابوحنیفہ رح۔ ان میں سے صرف کتاب الآثار امام صاحب کی تالیف کردہ ہے اگرچہ بہت سے لوگ اس کو ان لوگوں کی تالیف سمجھتے رہے ہیں جنھوں نے اسس کو روایت کیا ہے[۴] باقی تینوں کتابیں امام صاحب کی تالیف کردہ و مرتب کردہ نہیں ہیں۔ بلکہ بعد

---

[۱] مسانید الامام ص ۱۶۰ [۲] مقدمہ مسند امام اعظم ص ۲۲ و ۲۳۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے فقہائے عراق کے طریق و مزاج کی وضاحت کرتے ہوئے اہمیت کے ساتھ اس کا تذکرہ کیا ہے کہ ان کے پاس آثار و روایات کا وسیع ذخیرہ نہیں تھا

(باقی بر صہ ۹)

لوگوں نے ان میں امام صاحب کی مرویات کو حسب موضوع جمع کیا ہے اور صاحب مسانید کی تفصیل کے مطابق امام صاحب کی مرویات پر مشتمل چھوٹی بڑی کتابوں کی مجموعی تعداد پچاس تک ہوتی ہے[1]۔ جن میں سے بیس چند رسائل ہیں باقی ضخیم کتابیں ہیں اور متعلقات اس کے ماسوا ہیں۔

(الف) کتاب الآثار جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے یہ امام صاحب کی خود اپنی تالیف ہے اور اس اعتبار سے اسلام کی اولین مؤلفات میں سے ہے۔ اسلئے کہ امام صاحب کا زمانہ ۱۵۰ھ تک ہے۔ کتاب الآثار کو فقہی ابواب کے مطابق مرتب کیا گیا ہے اور اس سلسلہ میں عموماً اولیت امام مالک اور ان کی کتاب مؤطا کی بتائی جاتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس انداز کے اولین مؤلف امام صاحب اور اولین مؤلف (کتاب) "کتاب الآثار" ہے۔

امام مالک و دیگر ائمہ جنھوں نے اس انداز کی کتابیں لکھی ہیں وہ ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کتاب کی ترتیب کتاب وار اور باب وار ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ امام صاحبؒ ابواب کے عناوین خود تجویز فرمائے ہیں اور کتب کے عناوین نہیں تجویز فرمائے ہیں بلکہ بایں معنی کتاب کی رعایت کی ہے کہ اصل سے متعلق ابواب ترتیب وار ذکر کئے ہیں صرف "کتاب المناسک" کا عنوان استعمال کرنے کے بعد پھر ابواب کو لائے ہیں۔ امام محمدؒ کے نسخے میں کل ۳۰۵ ابواب ہیں[2] بعض حضرات کی تصریح کے مطابق امام صاحب نے اپنے مقرر کردہ اصول و شرائط کے مطابق چالیس ہزار احادیث کے ذخیرہ سے اس مجموعہ کا انتخاب کر کے اپنے تلامذہ کو اس کا املا کرایا ہے[3]۔ اور انتخاب کے بعد اس میں جو مرویات لی ہیں وہ مرفوع بھی ہیں اور موقوف و مقطوع بھی۔ زیادہ تر حصہ غیر مرفوع کا ہے۔ مرویات کی مجموعی تعداد نسخوں کے اختلاف کی وجہ سے مختلف ذکر کی گئی ہے۔ امام ابو یوسفؒ کے نسخے میں ایک ہزار ستر کے قریب ہیں۔ امام محمدؒ کے نسخے میں صرف

(حاشیہ گذشتہ صفحہ کا بقیہ) ڈاکٹر مصطفےٰ سباعی نے اپنی کتاب السنۃ ومکانتہا میں بڑی قوت کے ساتھ اس کا رد کیا ہے ملاحظہ ہو ص ۴۱۵ تا ۴۳۷ نیز مولانا عبدالرشید نعمانی نے بھی اس نظریہ کو قبول نہیں کیا ہے۔ امام صاحبؒ کے ذخیرۂ احادیث کی وسعت پر مولانا ظفر احمد تھانویؒ نے قواعد فی علوم الحدیث اور ابو حنیفہ و اصحابہ المحدثون میں، اور مناظر احسن گیلانی نے اپنی کتاب میں تفصیل کے ساتھ کلام کیا ہے۔ (حاشیہ صفحہ ھذا) [1] مسانید الامام ص ۱۰۱ تا ۱۰۹ [2] قلائد الازہار باقی تفسیر

مرفوعات کل ایکسو بائیس ہیں[۵]۔ کتاب الآثار کو امام صاحب سے ان کے مختلف تلامذہ نے روایت کیا ہے جو نسخے معلوم ہوسکے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:-

(۱) کتاب الآثار بروایت امام ابویوسف م ۱۸۲ھ (۲) کتاب الآثار بروایت امام محمدؒ (۳) کتاب الآثار بروایت امام حسن بن زیاد لولوئی م ۲۰۴ھ (۴) کتاب الآثار بروایت حماد بن امام ابوحنیفہؒ ۱۷۶ھ (۵) کتاب الآثار بروایت حفص بن غیاث ۱۹۴ھ یہ نسخہ زیادہ معروف نہیں ہے (۶) کتاب الآثار بروایت محمد بن خالد داہبی قبل ۱۹۰ھ جو کہ مسند احمد بن محمد کلاعی کے نام سے معروف ہے۔ (۷) کتاب الآثار بروایت امام زفر م ۱۵۸ھ جو کہ سنن زفر کے ساتھ بھی معروف ہے[۶] ان میں مشہور دو نسخے ہیں ایک امام محمدؒ کا اور دوسرا امام ابویوسف کا اور عموماً ان کی شہرت ان دونوں کی تالیف کی حیثیت سے ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے اور یہی دونوں نسخے شائع بھی ہوئے ہیں۔ ان میں بھی امام محمد کا نسخہ زیادہ معروف و متداول ہے[۷] اور علماء نے اسی پر زیادہ کلام بھی کیا ہے۔ مثلاً امام طحاویؒ م ۳۲۱ھ شیخ جمال الدین قونوی م ۷۷۰ھ ابوالفضل علی بن مراد موصلی م ۱۱۴۷ھ اور ماضی قریب میں مفتی مہدی حسن صاحب شاہ جہانپوری سابق صدر مفتی دارالعلوم دیوبند نے "قلائد الازہار" کے نام سے اسی کی نہایت ضخیم شرح لکھی ہے جس کے غالباً دو حصے شائع ہوچکے ہیں۔ نیز مولانا عبدالباری فرنگی محلی م ھ اور مولانا ابوالوفاء افغانی صاحب کا اس پر حاشیہ بھی ہے۔ عبدالعزیز بن عبدالرشید اور شیخ محمد فخرالدین نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا ہے اور موخر الذکر نے ترجمہ کے ساتھ اضافے بھی کئے ہیں[۸]۔ اردو ترجمہ کے ساتھ مولانا عبدالرشید نعمانی (حال مقیم کراچی) کا کتاب الآثار کے تعارف سے متعلق ایک

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ: ۔ شرح کتاب الآثار ص ۲ [۳] مسانید الامام ص ۱۵۱ و ۱۵۲ [۴] قلائد الازہار ص ۵ و ص ۱۱ - حاشیہ صفحہ ہذا: [۱] ابوحنیفہ و اصحابہ المحدثون ص ۱۵ [۲] قلائد الازہار ص ۱۵ و ۱۶ و مسانید الامام ص ۷۹ [۳] قلائد الازہار ص ۲، مسانید الامام ص ۹۶ تا ۱۰۱ [۴] الرسالۃ المستطرفہ میں کتانی نے اور تعجیل المنفعۃ میں حافظ نے اسی کو ذکر کیا ہے [۵] مسانید الامام ص ۱۵۴ تا ۱۵۶۔

مبسوط مقدمہ بھی ہے۔ امام ابو یوسف کے نسخوں پر عربی میں مولانا ابوالوفا صاحب کے مقدمے ہیں۔ امام ابو یوسف کے نسخے پر مولانا افغانی صاحب کی تعلیقات بھی ہیں۔ اور ابن حجر عسقلانی اور ان کے شاگرد قاسم بن قطلوبغا حنفی ۸۷۰ھ ۹۴ دونوں نے کتاب الآثار کے رجال پر "الایثار بمختصر رجال کتاب الآثار" کے نام سے کتابیں لکھیں جس میں شراح و محشین نے اپنے مقدمات میں ذکر کیا ہے[۵]۔ کتاب الآثار کے متعدد نسخے یا ان کے کافی اجزاء مسانید امام اعظم کے مجموعے "جامع المسانید" میں بھی شامل ہیں۔ مثلاً امام زفر و حفص بن غیاث کے علاوہ باقی حضرات کے نسخے[۲]

(ب) مسند امام ابی حنیفہ رح گذر چکا ہے کہ امام صاحب کی طرف اس نام سے جو کتاب منسوب ہے وہ خود ان کی تالیف نہیں[۳]۔ بلکہ اس کی نوعیت یہ ہے کہ امام صاحبؒ اپنے مرتب کردہ مجموعہ احادیث کے علاوہ اپنے تلامذہ کو جن مسائل کا املا کرایا ہے اور جو مسائل ان کے سامنے بیان فرمائے ان کے ساتھ بطور دلائل بہت سی روایات بھی ذکر فرمائیں۔ انھیں مرویات کو امام صاحب کے تلامذہ نے مدون کیا اور مجموعہ کو مسند کا نام و عنوان دیا[۴]۔ اگرچہ کتاب الآثار کی مرفوع روایت کے مجموعے جن کو امام ابو یوسف و امام محمد اور امام زفر وغیرہ نے کتاب الآثار سے الگ کرکے مرتب و مدون کیا تھا وہ بھی مسند امام ابی حنیفہ کے عنوان سے ذکر کئے جاتے ہیں اور وہ سب کے سب جامع المسانید میں شامل ہیں۔ مگر اصلاً یہ عنوان امام صاحب کی ان مرویات کے مجموعے کے لئے تجویز کیا گیا ہے جن کو واسطہ در واسطہ سننے والوں نے خود مرتب کیا ہے۔ ان کی کل تعداد کتنی ہے تو اس سلسلے میں سترہ کا عدد مشہور ہے جن میں سے پندرہ جامع المسانید میں شامل ہونا معروف ہے مگر جیسا کہ ذکر کیا گیا۔ جامع المسانید میں کتاب الآثار

---

[۱] مسانید الامام ص ۱۵۶، ۱۵۷ [۲] مسانید الامام ملاحظہ ہوں تفصیلات بابت نسخ کتاب الآثار [۳] الرسالۃ المستطرفہ ص ۱۵۔ [۴] مسانید الامام ص ۷۵۔

کے نسخے بھی شامل ہیں خواہ مکمل خواہ صرف مرفوع روایات اس لئے کہنا پڑے گا کہ جامع المسانید میں جن پندرہ اشخاص مؤلفات کو لیا گیا ہے وہ ساری کی ساری اصلاً مسانید کے نام سے موسوم نہیں ہیں۔ البتہ اکثر ضرور ہیں اور ان کے علاوہ بھی متعدد مسانید معروف ہیں جیسے کہ بعض مسانید کا دوسرے بعض مسانید میں شامل و مدغم ہونا سمجھ میں آتا ہے۔ مثلاً ابن عقدہ کے سند میں دوسرے چار حضرات کی مرتب کردہ مؤلفات و مسانید کا شامل ہونا قرین قیاس ہے۔ اس لئے کہ ابن عقدہ کے واسطے صاحب جامع المسانید نے ان چار دوسرے حضرات کی کتابوں کا ذکر دسیوں مرتبہ کیا ہے۔ یہ چار حضرات ہیں۔ حمزہ بن حبیب تیمی کوفی م ۱۵۶ھ، محمد بن مسروق کندری کوفی، اسمٰعیل ابن حماد بن امام ابو حنیفہ م ۲۱۲ھ، حسین بن علی صاحب مسانید الامام کی تحقیق و تفصیل کے مطابق مستقل مسانید کی تعداد مذکورہ چار حضرات کی کتب کے علاوہ بیس ہے اور وہ حسب ذیل ہیں ——— (۱) مسند حارثی، مرتب حافظ ابو عبداللہ محمد بن حارثی بخاری حنفی ملقب بہ استاذ۔ م ۳۴۰ھ (۲) مسند طلحۃ العدل، مرتب حافظ ابو القاسم طلحہ ابن محمد جعفر عدل بغدادی حنفی م ۳۸۰ھ (۳) مسند ابن مظفر، مرتب حافظ ابو الحسین محمد بن مظفر بن موسیٰ بزار بغدادی حنفی م ۳۰۹ھ (۴) مسند ابن عدی۔ مرتب حافظ ابو محمد عبداللہ بن عدی جرجانی (صاحب الکامل فی الضعفاء) م ۳۶۵ھ (۵) مسند ابی نعیم، مرتب حافظ ابو نعیم بن عبداللہ اصبہانی شافعی م ۴۳۰ھ (۶) مسند عبدالباقی مرتب قاضی ابوبکر محمد بن عبدالباقی انصاری حنبلی معروف بقاضی مارستان م ۵۲۵ھ (۷) مسند قاضی اشنانی مرتب حافظ ابو الحسن عمر بن حسن اشنانی م ۳۳۹ھ۔ (۸) مسند ابن خسرو۔ مرتب حافظ حسین بن محمد بن خسرو بلخی حنفی م ۵۲۲ھ (۹) مسند ابن ابی العوام مرتب۔ حافظ ابو القاسم عبداللہ بن محمد بن العوام سعدی حنفی م ۳۳۵ھ (۱۰) مسند ابن عقدہ مرتب حافظ ابو العباس احمد ابن محمد بن سعید ہمدانی معروف با بن عقدہ م ۳۳۲ھ (۱۱) مسند ابن المقری، مرتب حافظ ابوبکر محمد بن ابراہیم بن علی اصبہانی یا بن المقری م ۳۸۰ھ (۱۲) مسند ابی اسماعیل انصاری۔ مرتب حافظ ابو اسمٰعیل عبداللہ بن محمد انصاری حنفی م ۴۸۱ھ ———

(۱۳) مسند دوری - مرتب حافظ ابن عبد اللہ محمد بن مخلد بن حفص دوری بغدادی م ۳۳۱
(۱۴) مسند دارقطنی - مرتب حافظ ابو الحسن علی بن عمر بن احمد دارقطنی بغدادی شافعی م ۳۸۵ (۱۵) مسند ابن شاہین - مرتب حافظ ابن حفص عمر ابن احمد عثمانی بغدادی معروف با بن شاہین م ۳۸۵ - (۱۶) مسند ابی علی بکری - مرتب ابو علی - (۱۷) مسند ابن عساکر - مرتب - حافظ ابو القاسم علی حسن بن عبد اللہ دمشقی، شافعی معروف با بن عساکر - م ۵۷۱ھ (۱۸) مسند سخاوی - مرتبہ حافظ ابو الخیر شمس الدین محمد بن عبد الرحمن بن سخاوی شافعی م ۹۰۲ھ (۱۹) مسند مغربی شیخ شائخ الحرمین عیسیٰ مغربی جعفری مالکی م ۱۰۸۳ھ (۲۰) مسند ابن القیسرانی - مرتب - حافظ ابو الفضل محمد بن طاہر م ۵۰۷ھ -

یہ کل بیس مستقل مسانید ہیں ——— جو ان مسانید کے علاوہ ہیں .... جن کو سامعین وامام زفر نے کتاب الآثار سے مرفوع روایت کو الگ کر کے مرتب کیا تھا اور ان چار کتابوں کے ماسوا ہیں جو کہ مسند ابن عقدہ میں شامل ہیں اور خود مسند ابن عقدہ جو کہ مسانید امام ابی حنیفہ میں وسیع ترین مسند ہے اس لئے کہ وہ ایک ہزار سے زائد احادیث کا جامع ہے اور جامع المسانید میں بکثرت ان کے واسطے کا تذکرہ ہے یہ مسند بھی بعد کے مرتب ہونے والے مسانید ہیں مدغم ہو کر باقی رہا ہے[1]۔ ان اٹھارہ مسانید میں نو وہ ہیں جو کہ جامع المسانید میں شامل ہیں[2] اور وہ مسانید ابن عقدہ کے بعد میں ترتیب دیئے گئے ہیں - وہ بھی ابن عقدہ کے مسند کو حاوی ہیں اور خود ابن عقدہ کا مسند ان کے پیش رو چار حضرات کے مسندوں کا جامع ہے، جامع المسانید میں ان نو کے علاوہ مزید چھ کتابیں لی گئی ہیں - وہ جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے - امام صاحب کے پانچ تلامذہ سے مروی کتاب الآثار کے نسخے ہیں حسن بن زیاد حماد محمد ابن خالد دہبی کے پورے نسخے ایسے ہی امام کے نسخے کی مرفوع وموقوف دونوں روایتوں کے مجموعے الگ الگ، نیز امام ابو یوسف کے نسخے کی مرفوع

---

[1] ملاحظہ ہو مقدمہ مسند اعظم اردو، ابن القیسرانی کے مسند کا تذکرہ اسی میں ہے۔ [2] مسانید الامام ص ۱۲۴ و ۱۲۵ -

روایات کا مجموعہ امام ابی یوسفؒ و امام محمد نے کتاب الآثار کی مرفوع روایات کا جو الگ سے مجموعہ تیار کیا تھا اس کو مسند کے نام سے ذکر کیا گیا ہے جیسے کہ امام زفر سے بھی اس عنوان سے کتاب الآثار کی مرفوع روایات کو الگ کر کے جمع کرنا منقول ہے۔ اس تفصیل کے اعتبار سے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ مسانید کل بیس نہیں بلکہ ابن عقدہ بیں مدغم چار کو ملایا جائے تو چوبیس اور کتاب الآثار کے مرفوع روایات کے مجموعوں کو شامل کیا جائے تو کل ستائیس ہو جاتی ہے۔ مرتبین کے سلسلے میں اختصار کے ساتھ جو کچھ ذکر کیا گیا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ امام ابوحنیفہ کے مسانید کو مرتب کرنے والے ابعبدالرحمٰن انصاری و شیخ مغربی کے علاوہ سب کے سب حفاظ حدیث میں سے ہیں (۲) اور ان کا زمانہ امام صاحب کے تلامذہ سے لے کر گیارھویں صدی تک پھیلا ہوا ہے (۳) یہ سارے کے سارے احناف ہی نہیں ہیں بلکہ شوافع ہیں اور بعض حنابلہ و مالکیہ میں ہیں (۴) ان میں سے متعدد محدثین اور سائر فن کی اولین صفوں سے تعلق رکھتے ہیں مثلاً ابن عدی، ابونعیم، دارقطنی، ابن عساکر، سخاوی و ابن شاہین[1]

امام صاحب کے مذکورہ مسانید میں سے زیادہ معروف بقول شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی دو مسانید رہے ہیں ایک مسند حارثی جس کا تذکرہ نمبر ایک پر کیا گیا ہے۔ اور مسند سے متعلق کام کرنے والوں نے زیادہ تر اسی کو سامنے رکھا ہے جیسا کہ آگے آ رہا ہے۔ دوسرے مسند ابن خسرو جس کو آٹھویں نمبر پر ذکر کیا گیا ہے۔ چنانچہ یمنی اور ابن حجر نے اسی کے رجال کے تراجم کا ذکر کیا ہے[2]

---

[1] مؤلفین مسانید کے احوال کے لئے مسانید الامام و مقدمہ مسند امام اعظم وغیرہ کا مطالعہ کیا جائے

[2] مقدمہ مسند امام اعظم ص ۱۸۔

★ :- از مولانا عبدالدیان اعظمی

مولانا مودودی کی تحقیق حدیث دجال پر ایک نظر

ایک چبھتا ہوا اعتراض

مولانا نے اپنی اس تحقیق میں یہ فرماکر کہ "ان امور کے متعلق جو مختلف باتیں حضورؐ سے احادیث میں منقول ہیں وہ دراصل آپ کے قیاسات ہیں .... "یہ باتیں آپ نے علم وحی کی بناء پر نہیں فرمائی تھیں".... بہت سی حدیثوں کو قیاسی اور غیر مربوط بالوحی بنادیا۔ احادیث کے بارے میں منکرین حدیث کا بھی یہی دعویٰ ہے۔ لیکن جب منصب رسالت میں مولانا مودودی صاحب اور ڈاکٹر عبدالودود صاحب منکر حدیث سے احادیث رسول کے مربوط بالوحی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قول وفعل کے سنت ہونے پر گفتگو ہوئی تو مولانا نے بڑے زوردار الفاظ میں فرمایا تھا :-

" جو بات آپ سے بار بار کہی جارہی ہے وہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیغمبر کی حیثیت سے جو کچھ بھی کیا اور کہا ہے وہ بربنائے وحی ہے ....
آپ نے جتنا بھی کام کیا وہ سب دراصل خدا کے رسول ہونے کی حیثیت میں آپ کا کام تھا اس میں خدا کی وحی، آپ کی رہنمائی اور نگرانی کرتی تھی ـــــ (منصب رسالت ص۱۲۰-۱۲۱)

مولانا کا یہ بیان کتنا ہی مبنی برحقیقت کیوں نہ ہو مگر خود ان کی تحقیق کے خلاف ہے تحقیق میں

وہ بہتری حدیثوں کو بربنائے وحی ہونے سے انکار اور ان کو قیاس گردان چکے ہیں۔ اس لئے ڈاکٹر عبدالودود صاحب نے اس مباحثہ میں مولانا کو مجوج اور ان کے اس بیان کی تردید کے لئے خود انہی کی تحقیق ان کے سامنے پیش کردی کہ یوخذ المرء یا قرار ہ اور مولانا پر تضاد بیانی کا ایسا چبھتا ہوا اعتراض کیا جس کی مولانا بجز اعتراف کے تاب نہ لاسکے۔[۱]
ڈاکٹر عبدالودود صاحب نے مولانا کو لکھا کہ

"آپ فرماتے ہیں کہ۔ حضورؐ نے اپنی نبوت کی پوری زندگی میں جو کچھ کیا یا فرمایا وہ وحی کی بنا پر تھا۔ لیکن دجال سے متعلق احادیث کے سلسلے میں آپ کا ارشاد یہ ہے کہ " ان امور کے متعلق جو مختلف باتیں حضورؐ سے احادیث میں منقول ہیں وہ دراصل آپ کے قیاسات ہیں۔ جن کے بارے میں آپؐ خود شک میں تھے۔ (رسائل و مسائل ص۵۵)
اور اس کے بعد آپ خود ہی اس کا اعتراف کرلیتے ہیں کہ" حضورؐ کا یہ تردد خود ظاہر کرتا ہے کہ یہ باتیں آپ نے علم وحی کی بناء پر نہیں فرمائی تھیں بلکہ اپنے گمان کی بناء پر فرمائی تھیں (ایضاً ص۵۶)
(منصب رسالت نمبر ۱۸۰)

ڈاکٹر صاحب کے اس چبھتے ہوئے اعتراض کا مولانا کے پاس کوئی جواب نہیں تھا

---

[۱] ڈاکٹر صاحب نے اپنے دوسرے ہی خط میں مولانا کے اس طرح کے متضاد بیانات کی طرف ان الفاظ میں اشارہ فرمادیا تھا کہ" آپ نے اپنے جن مضامین نشان دہی فرمائی ہے میں نے انھیں دیکھا ہے لیکن مجھے بڑے افسوس سے یہ عرض کرنے دیجئے کہ...... ان سے میری الجھن بڑھ گئی ہے اس لئے کہ ان میں کئی باتیں ایسی ہیں جو آپ کی دوسری تحریروں سے مختلف ہیں۔"
(منصب رسالت ص۲۲)

بجز اس کے کہ حذف و اضافہ اور قطع و برید کا لایعنی الزام لگائیں۔ چنانچہ جواب میں لکھتے ہیں کہ:-

"میری جن عبارات کا ڈاکٹر صاحب نے یہاں سہارا لیا ہے ان کی نقل کرنے میں پھر وہی کرتب دکھایا گیا ہے کہ سیاق و سباق سے الگ کرکے فقرہ کہیں سے اور ایک کہیں سے نکالکر اپنا مطلب برآمد کر لیا گیا ہے۔ دراصل جو بات اس مقام پر میں نے کہی ہے وہ یہ ہے کہ دجال کے متعلق حضورؐ کو وحی کے ذریعے جو علم دیا گیا تھا وہ صرف اس حد تک تھا کہ وہ آئے گا اور ان ان صفات کا حامل ہوگا۔ انہی باتوں کو حضورؐ کے خبر کے طور پر بیان فرمایا ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ وہ کب اور کہاں آئے گا تو اس کے متعلق حضورؐ کو وحی کے ذریعے کوئی علم نہیں دیا گیا تھا۔ اسی لئے ان امور کے متعلق جو کچھ آپ نے بیان فرمایا ہے وہ خبر کے انداز میں نہیں بلکہ قیاس و گمان کے انداز میں فرمایا ہے۔ مثال کے طور پر ابن صیاد کے متعلق آپ نے شبہ ظاہر فرمایا کہ شاید دجال ہو لیکن حضرت عمرؓ نے اسے قتل کرنا چاہا تو حضورؐ نے فرمایا کہ اگر یہ دجال ہے تو اس کے قتل کرنے والے تم نہیں ہو اور اگر یہ دجال نہیں ہے تو تمہیں ایک ذمی کو قتل کرنے کا حق نہیں پہنچتا۔ ایک اور حدیث میں ہے اگر دجال میری زندگی میں آگیا تو میں حجت سے اس کا مقابلہ کروں گا۔ ورنہ میرے بعد میرا رب تو ہر مومن کا حامی و ناصر ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ وحی کے ذریعہ سے ملے ہوئے علم کو ایک انداز میں بیان فرماتے تھے۔ اور جن باتوں کا علم آپ کو وحی کے ذریعہ سے نہیں دیا جاتا تھا ان کا ذکر بالکل مختلف انداز میں کرتے تھے۔ آپ کا طرز بیان ہی اس فرق کو واضح کر دیتا تھا۔ لیکن جہاں صحابہ کو اس فرق کے سمجھنے میں کوئی مشکل پیش آتی تھی وہاں وہ خود آپ سے پوچھ لیتے تھے کہ یہ بات اپنی رائے سے فرما رہے ہیں یا اللہ کے حکم سے[1]۔ اس کی متعدد مثالیں میں نے تفہیمات حصہ اول کے مضمون

---

[1] یہاں مولانا فرما رہے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم وحی کی بات کو ایک الگ انداز میں اور اپنی رائے (باقی بر صفحہ ۱۴۲)

"آزادی کا اسلامی تصور" میں پیش کی ہیں۔ (منصب رسالت ص ۱۸۱ تا ۱۸۴ حاشیہ)

مولانا کا یہ جواب خواہ کسی کو کتنا ہی اچھا لگے مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ جواب نہیں بلکہ اپنے لاجواب ہونے کا اعتراف ہے ورنہ پورے جواب میں سوائے سیاق وسباق سے عبارت کی قطع وبرید کے ایک لایعنی الزام کے اور پھر بعد میں تسلیم خم کرکے اسی بات کو مان لینے کے جو ڈاکٹر صاحب نے اپنے اعتراض میں کہی ہیں اور ہے کیا؟ ڈاکٹر صاحب مولانا کے اس دعوے کو کہ حضورؐ نے اپنی نبوت کی پوری زندگی میں جو کچھ کیا یا فرمایا وہ وحی کی بنا پر تھا، رد کرنے کے لئے جو یہ اعتراض وارد کر رہے ہیں کہ آپ خود ہی اس دعوے کے خلاف اپنی تحقیق میں دجال سے متعلق احادیث کو قیاس اور علم وحی سے غیر مربوط ٹھہرا چکے ہیں، تو کیا ان کا یہ اعتراض غلط ہے؟ کیا مولانا نے اپنی تحقیق میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کو دو اجزاء میں تقسیم نہیں کیا ہے۔ جہاں سے دو حیثیت کے باطل عقیدے کی بو آتی ہے؟ اور پھر جن حدیثوں کو جزء دوم کے ذیل میں لائے ہیں ان کی

(بقیہ صفحہ گذشتہ:- یا اپنے ذاتی قیاس کو ایک دوسرے انداز میں بیان فرماتے تھے۔ ان دونوں اندازوں کا فرق صحابہ سمجھتے تھے۔ جہاں نہ سمجھ سکتے وہاں پوچھ لیتے تھے۔ اب غور کرنے کی بات یہ ہے کہ جن احادیث کو مولانا قیاسی ٹھہرا رہے ہیں مثلاً یہی حدیث کہ "..... دجال مشرق میں ملک خراسان سے خروج کریگا اس کے تابع ایسے لوگ ہوں گے جن کے چہرے ٹوٹی ہوئی ڈھالوں کی طرح ہوں گے" (مشکوٰۃ وترمذی) ـــــ یا یہ حدیث انہ خارج خلۃ بین الشام والعراق (مشکوٰۃ فی حدیث نواس بن سمعان رضؓ) وغیرہ کیا ان کی بابت صحابہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان کا انداز سمجھ کر یا ان سے پوچھ کر کہیں بھی یہ فیصلہ دیا ہے کہ یہ قیاسی اور بغیر وحی الٰہی کے ہیں؟ اگر صحابہ نے ان کو قیاس ہونے کا فیصلہ نہیں دیا بلکہ وحی سے مربوط سمجھا اور بلغوا عنی ولو آیۃ کے حکم کے تحت ہم تک پہنچانے کے لئے ان کو نقل درروایت کیا اور یہ نقل درروایت کرنا اسلام کی صحیح منشاء کی سمجھا تو آج ساڑھے تیرہ سو برس بعد کوئی ان کو قیاسی کہنے کا کونسا حق رکھتا ہے؟۔

بابت قیاسی اور غیر مربوط بالوحی ہونے کے قائل نہیں ہیں؟ پھر خود اس جواب میں بھی یہ بات نہیں کہہ رہے ہیں کہ وہ کب اور کہاں آئے گا اس کے متعلق حضورؐ کو وحی کے ذریعہ سے کوئی علم نہیں دیا گیا تھا اس لئے ان .. امور کے متعلق جو کچھ آپ نے بیان فرمایا ہے وہ خبر کے انداز میں نہیں بلکہ قیاس وگمان کے انداز میں فرمایا ہے؟ کیا یہ اعتراف نہیں ہے؟ جب اعتراف ہے اور مولانا اپنی تحقیق میں حدیثوں کے قیام ہونے کے قائل ہیں تو اس قائل ہونے کے ثبوت کے لئے خواہ پوری تحقیق ہی اٹھاکر پیش کردی جائے خواہ اس کے چند فقرے۔ اس میں کیا فرق پڑتا ہے۔ جو عبارت میں قطع برید کا الزام لگایا جارہا ہے۔ حقیقت اس الزام کی اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ ڈاکٹر صاحب کے اس چبھتے ہوئے اعتراض کا مولانا سے کوئی جواب نہیں بن پڑا۔ خود کردہ را علاجے نیست۔

مولانا کے اس جملے سے کہ "میری جن عبارات کا ڈاکٹر صاحب نے یہاں سہارا لیا ہے" اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ مولانا کی یہ تحقیق منکرین حدیث کے نظریات کی توفیق کے لئے بڑی حد تک سہارا بنی ہوئی ہے اور ان کی بہت سی باتوں کی تائید کرتی ہے۔ مثلاً:-

(الف) منکرین حدیث کا نظریہ ہے کہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) انسان ہونے کی حیثیت سے ماسوا اس وحی کے جو ان کے پاس خدا کی طرف سے آئی تھی۔ وہ خود اپنے بھی کچھ خیالات رکھتے تھے اور اپنے ان خیالات کے زیر اثر کام کرتے تھے (منصب رسالت ص ۲۶۲-۲۶۳)

ان کے اس نظریئے کی تائید مولانا کی تحقیق اس طور پر کررہی ہے کہ دجال کی صفات وخصوصیات کی بابت حدیثوں کو تو مبنی بر وحی قرار دیتی ہے اور باقی زمان ومکان وغیرہ سے متعلق حدیثوں کو قیاس وخیال کی طرف منسوب کرتی ہے کہ وہ دراصل آپ کے قیاسات تھے۔

(ب) منکرین حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کو ان میں غلطی کا امکان مان کر حجت قرار نہیں دیتے۔ مولانا کی تحقیق بھی دجال کے متعلق حدیثوں کو غلط ہونے کا تاثر دے کر ان کے عقیدے کی توثیق کررہی ہے۔

ج :- منکرین حدیث اپنے مقصد کے لئے حدیث تابیر نخل کو مستدل بناتے ہیں۔
مولانا بھی اپنی تحقیق میں اپنے مقصد کے لئے یعنی احادیث رسول کو قیاسی اور ناقابل اعتقاد ٹھہرانے کے لئے حدیث تابیر نخل کو ثبوت میں پیش کر رہے ہیں جبکہ وہ خود جانتے ہیں کہ حدیث تابیر نخل دنیاوی امور سے متعلق ہے اور احادیث دجال دینی اور غیبی امور سے متعلق جن کو اس پر قیاس نہیں کیا جاسکتا ہے۔

(د) منکرین حدیث کہتے ہیں کہ حدیث کی کتابیں شرمناک اور مضحکہ خیز مواد سے لبریز ہیں (منصب رسالت ص۱۵)
مولانا کی تحقیق بھی ان کے اس قول کی تائید ان الفاظ میں کر رہی ہے کہ :-
"کانا دجال وغیرہ تو افسانے ہیں......"

(ھ) منکرین حدیث حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دو حیثیت قرار دیتے ہیں۔ تحقیق میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کو دو اجزاء میں تقسیم کر کے اسی دو حیثیت کے عقیدے کی توثیق کی گئی ہے۔

(و) منکرین حدیث، ذخیرۂ احادیث کو ناقابل اعتماد قرار دیتے ہیں۔ مولانا کی تحقیق بھی ذخیرۂ احادیث کو وحی و قیاس کا ایک گڈمڈ مرکب مان کر پھر اس میں ساڑھے تیرہ سو برس کے بعد غلطیاں نکال کر اس کو مشکوک اور ناقابل اعتبار قرار دینے میں حصہ لے رہی ہے۔
غرض مولانا کی تحقیق منکرین حدیث کے نظریات کی توثیق میں بڑی حد تک سہارا بنی ہوئی ہے۔

بقیہ صفحہ ۴۲ کا :- مسئلہ کفاءت احادیث واساطین امت کے اقوال کی روشنی میں

ان الکفاءۃ فی الحرف معتبرۃ فی قول ابی حنیفہ وعند ابی یوسف غیر معتبرۃ الا ان یکون فاحشۃ کالحیاکۃ والحجامۃ ونحو ذلک لانہا لیست بامر لازم واجب الوجود الا تری انہ یقدر علی ترکہا وھذا ابشکل بالحیاکۃ واخواتہا فانہ قادر علی ترکہا ومع ھذا یقدح فی الکفاءۃ ۔ (بدائع ص ۳۲۰ / ج ۲)

کے ساتھ ۔ اور بزازموچی کے ساتھ ، جامع صغیر کے بعض نسخوں میں مذکور ہے ، کفاءت پیشوں میں حضرت امام ابوحنیفہ رح کے قول میں بھی معتبر ہے اور حضرت امام ابویوسف رح کے نزدیک معتبر نہیں مگر یہ کہ وہ پیشہ انتہائی گھٹیا ہو جیسے بنائی ، اور پچھنے لگانا ، اور دباغت دینا ، اور اس کے مثل دیگر پیشے ، اس لئے کہ پیشے لازم اور واجب الوجود نہیں ہوتے کیا تم نہیں دیکھتے کہ وہ شخص اس پیشے کے چھوڑنے پر قادر ہے اور اس پر اشکال پڑتا ہے بنائی اور اس جیسے دوسرے پیشوں سے اس لئے کہ بنائی کرنے والا بھی اس کے ترک پر قادر ہے مگر اس کے باوجود وہ کفاءت میں مخل ہے ۔

٭ ٭ ٭

حرفت وصنعت میں حضرت امام ابوحنیفہ رح نے بھی کفاءت کا اعتبار کیا ہے اور ان کے تلمیذ رشید حضرت امام ابویوسف رح نے بھی صرف تعبیر میں فرق ہے چونکہ حضرت امام ابوحنیفہ رح کے زمانہ میں لوگوں کے پاس خدام اور غلام ہوا کرتے تھے اور وہ لوگ ان ہی کے ذریعے ان امور کو انجام دیتے تھے جس کی وجہ سے ان کے آقاؤں کو پیشے کے گھٹیا ہونے کی وجہ عار وشرمندگی نہیں دلائی جاتی تھی ، کیونکہ وہ لوگ بذاتِ خود اسے نہیں کرتے تھے مگر حضرت امام ابویوسف رح کے زمانے میں لوگوں کے حالات بدل گئے اور وہ لوگ خود اسے بطور پیشہ کے کرتے تھے ، پھر کوئی خراب پیشہ اختیار کرتا تو اسے لوگ عار دلاتے ۔ اس وجہ سے امام ابویوسف رح نے پیشوں میں کفاءت کا اعتبار کیا ۔

اگر پیشوں کی جنسیت ایک ہو تو ان کے درمیان کفاءت ثابت ہوگی۔ مثلاً ایک بزاز دوسرے بزاز کا کفو ہوگا، اور ایک بنکر دوسرے بنکر کا کفو ہوگا۔ اسی طرح پیشوں کی جنسیت مختلف ہو مگر وہ ایک دوسرے کے متقارب ہوں تو ان میں بھی کفاءت ثابت ہوگی جیسے بزاز اور رنگریز، اور اگر جنسیت کے اختلاف کے ساتھ دونوں ایک دوسرے سے ملتے جلتے نہ ہوں تو پھر ان میں کفاءت ثابت نہ ہوگی، علامہ ابن نجیم حنفی مصری اپنی تصنیف لطیف بحر الرائق میں تحریر فرماتے ہیں۔

قد حقق فی غایۃ البیان ان اعتبار الکفاءۃ فی الصنائع ھو ظاھر الروایۃ عن ابی حنیفۃ وصاحبیہ لان الناس یتفاخرون بشرف الحرف ویتعایرون بدناءتھا وھی ان امکن ترکھا یبقی عارھا کما فی المجتبیٰ وفی الذخیرۃ معزیا الی ابی ھریرۃ الناس بعضھم اکفاء لبعض الا حائکا او حجاما وفی روایۃ او دباغا قال مشائخنا ورابعھم الکناس فواحد من ھؤلاء الاربعۃ لا یکون کفوأ للصیرفی والجوھری وعلیہ الفتویٰ وبعد ھٰذا المروی عن ابی یوسف ان الحرف متیٰ تقاربت لا یعتبر

غایۃ البیان میں ذکر کیا ہے کہ پیشوں میں کفاءت کا اعتبار وہ امام ابوحنیفہ اور ان کے صاحبین کی ظاہر روایت ہے۔ اس لئے کہ لوگ پیشوں کے اچھے ہونے پر فخر کرتے ہیں اور خراب پیشے پر عار محسوس کرتے ہیں۔ اور پیشوں کا ترک کر دینا اگرچہ ممکن ہے مگر پھر بھی اس کا عار باقی رہتا ہے جیسا کہ مجتبیٰ میں ہے اور ذخیرہ میں حضرت ابوہریرہ رضؓ کی طرف منسوب کر کے نقل کیا ہے کہ تمام لوگ ایک دوسرے کے کفو ہیں سوائے جُلاہا اور حجام کے اور ایک روایت میں دباغ ہے اور ہمارے مشائخ نے فرمایا کہ چوتھا جاروب کش ہے، پس ان مذکورہ چار افراد میں سے کوئی بھی صیرفی اور جوہری کا کفو نہیں ہوگا۔ اور اسی پر فتویٰ ہے۔ اس کے بعد حضرت امام ابویوسفؒ سے مروی ہے کہ جب پیشے ایک دوسرے کے متقارب ہوں تو تفاوت کا اعتبار نہ ہوگا۔ اور کفاءت ثابت ہوگی۔ پس حائک

التفاوت وتثبت الکفاءۃ فالحائك يكون كفأ للحجام والدباغ يكون كفأ للكناس والصفار يكون كفأ للحداد والعطار يكون كفأ للبزاز قال شمس الائمۃ الحلوانی وعليہ الفتویٰ (بحرالرائق ص ۱۴۲ ج ۳)

حجام کا کفو رہو گا۔ اور دباغت دینے والا جاروب کش کا۔ اور پیتل کا کام کرنے والا لوہار کا، اور عطار بزاز کا۔ شمس الائمہ حلوانی نے فرمایا کہ اسی پر فتویٰ ہے۔

⁂ ⁂ ⁂

مجمع الانہر میں کفاءت کی بحث کرتے ہوئے مصنف علام فرماتے ہیں:۔

وتعتبر الکفائۃ حرفۃ عندھما وعن الامام روایتان" فحائك او حجام او کناس او دباغ غیر کفوء لعطار او بزاز او صراف، وبھا ای باعتبار الکفاءۃ (مجمع الانہر ص ۳۴۲ ج ۱)۔

حرفت وصنعت میں ائمہ ثلاثہ نے کفاءت کا اعتبار کیا ہے جیسا کہ صاحب بحرالرائق نے حضرت امام ابوحنیفہ رح کا مسلک ذکر کیا ہے۔ مذکورہ بالا چاروں افراد آپس میں ایک دوسرے کے کفو اور ہمسر ہوں گے کیونکہ سب کے پیشے ملتے جلتے ہیں۔ البتہ ان میں سے کوئی بھی عطار، بزاز اور صراف کا کفو نہیں ہو گا۔ ــــــ صاحب درالحکام فرماتے ہیں:۔

وتعتبر ایضاً حرفۃ لان التفاخر یقع بھا فمثل حائك لحداد وخفاف ونحوھا لیس کفواً لمثل عطار کبزاز فالعطار والبزاز کفوان۔ ص ۳۵۰ ج ۱

پیشے میں بھی کفاءت معتبر ہے اس لئے کہ اس کے ذریعہ فخر کیا جاتا ہے پس حجام کے مثل جیسے لوہار، موچی اور اس کے مثل عطار اور بزاز کا کفو نہیں ہو گا اور عطار و بزاز ایک دوسرے کے کفو ہوں گے۔

مذکورہ بالا تمام حوالہ جات سے معلوم ہوا کہ پیشوں کے اندر بھی کفاءت معتبر ہے البتہ پیشے کی وجہ سے کسی شخص کو برا نہیں کہا جا سکتا ــــ جیسا کہ قرآن میں ارشاد فرمایا گیا ولا تنابزوا بالالقاب۔ حضرت علی رض فرماتے ہیں:۔

الناس من جھۃ التمثال اکفاء ● ابوھم آدم والام حوا ــــ (دیوان علی۔ یعنی صورت کے

اعتبار سے تمام لوگ کفو ہیں اور سب کے باپ آدم اور ماں حوا ہیں۔

بیان ملکیت متعلقہ ماہنامہ دارالعلوم بابت
رجسٹریشن ایکٹ فارم ۴ رول ۸

نام ——— دارالعلوم

وقفۂ اشاعت ——— ماہانہ

پرنٹر پبلشر ——— مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب

قومیت ——— ہندوستانی

پتہ ——— دارالعلوم دیوبند

ایڈیٹر ——— مولانا حبیب الرحمٰن صاحب قاسمی

قومیت ——— ہندوستانی

پتہ ——— دارالعلوم دیوبند

مالک ——— دارالعلوم دیوبند

میں تصدیق کرتا ہوں کہ مذکورہ بالا تفصیلات میرے علم و اطلاع کے مطابق درست ہیں۔

مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب

۲۲ / مارچ ۱۹۸۸ء

دارالعلوم دیوبند کا ترجمان

ماہنامہ

دارالعلوم دیوبند

شعبان المعظم ۱۴۰۸ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۸۸ء

جلد نمبر ۷۲ | شمارہ ۴ | فی شمارہ -/4 | سالانہ -/40

نگراں
مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب
مہتمم دارالعلوم دیوبند

مدیر
مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی

سالانہ بدل اشتراک بیرونی ممالک سے
عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ کناڈا وغیرہ کا سالانہ 160

فہرست مضامین

ہندوستانی و پاکستانی خریداروں سے ضروری گذارش

(۱) ہندوستانی خریداروں سے ضروری گذارش یہ ہے کہ ختم خریداری کی اطلاع پاکر اول فرصت میں اپنا چندہ نمبر خریداری کے حوالہ کے ساتھ منی آرڈر سے روانہ کریں۔

(۲) پاکستانی خریدار اپنا چندہ مبلغ /۷۰ ۔ مولانا عبد الستار صاحب مہتمم جامعہ عربیہ محمودیہ داؤد والا براہ شجاع آباد ملتان پاکستان کو بھیجدیں

(۳) خریدار حضرات پتہ پر درج شدہ نمبر محفوظ فرمالیں، خط و کتابت کے وقت خریداری نمبر ضرور لکھیں۔

والسلام

منیجر

حرفِ آغاز

حبیب الرحمٰن قاسمی

یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ اسلام کے نام لیوا اور اس کے شیدائیوں کے مقابلہ میں اسلام کے مخالفین ومعاندین کی تعداد ہر دور اور ہر زمانہ میں زیادہ رہی ہے اور اسلام کو اپنے ابتدائے قیام سے آج تک نہ جانے کتنے فتنوں سے دوچار ہونا پڑا ہے، لیکن اس تاریخی شہادت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ علمائے اسلام اور صلحائے امت نے ان تمام فتنوں کا نہایت پامردی سے مقابلہ کیا ہے اور اسلام کے حریفوں کو ہر محاذ پر شکست دیکر اسلام کے کارواں کو آگے بڑھایا ہے۔

چنانچہ اسلام پر اوّل ترین حملہ مادیت کی راہ سے ہوا موروثی حکومت کے تسلسل اور دولت وثروت کی فراوانی سے اسلامی معاشرہ میں تعیش اور راحت پسندی کا عمومی رجحان پیدا ہوگیا تھا جس سے یہ خطرہ ہو چلا تھا کہ خدانخواستہ ملت اسلامیہ بھی اگلی امتوں کی طرح تعیش کی نذر نہ ہو جائے اس فتنہ کے مقابلہ کیلئے حضرات تابعین کی جماعت میدان میں نکل پڑی اور اپنے وعظ ونصیحت، دعوت وتبلیغ اور حرارت ایمانی کے ذریعہ مادیت کے اس سیلاب بلاخیز کو آگے بڑھنے سے روک دیا اور امت کو اس طوفان سے بچا لیا۔

اسکے بعد اسلام پر دوسرا حملہ عقلیت کی راہ سے ہوا، یونانی فلسفہ نے سطحی ذہنوں کو اپنی گرفت میں لے کر اسلامی عقائد واعمال کے خلاف ایک طوفان کھڑا کر دیا جس سے متاثر ہو کر امت دو حصوں میں تقسیم ہوگئی ایک کی قیادت فقہاء اور محدثین کر رہے تھے اور دوسرے کی عقلیت زدہ معتزلہ۔ یہ فتنہ چونکہ علمی انداز میں برپا کیا گیا تھا اور بدقسمتی سے حکومتِ وقت کی سرپرستی بھی اسے حاصل ہوگئی تھی، اسلئے ایسا معلوم ہونے لگا تھا کہ اسلامی علوم وعقائد یونانی افکار ونظریات کے مقابلہ میں اپنی توانائی اور سربلندی

قائم نہ رکھ سکیں گے، ان سنگین حالات میں علماء ہی کی صف سے ایک بزرگ سر سے کفن باندھ کر میدان میں کود پڑے اور اس جرأت و استقامت کے ساتھ کہ خلیفۂ وقت مامون الرشید کے تہدیدی فرامین اور معتصم باللہ کے طوق و سلاسل اور تازیانے ان کے پائے استقامت میں لغزش پیدا نہ کر سکے بالآخر اس مرد جلیل کی ثابت قدمی کی برکت سے یہ فتنہ سرد پڑ گیا اور امت ایک عظیم و تباہ کن خطرہ سے مامون و محفوظ ہو گئی۔

تیسری صدی میں معتزلہ نے اپنی عقلیت پسندی اور اپنی بعض نمایاں شخصیتوں کے سہارے اس سوئے ہوئے فتنہ کو پھر جگانا چاہا، لیکن امام ابوالحسن اشعری جو پہلے انھیں کے کیمپ کے ایک فرد تھے اور ان کے تمام ہتھکنڈوں سے اچھی طرح واقف تھے ان کے مقابلہ میں آگئے اور بحث و مناظرہ اور زبانی تفہیم و تقریر کے ذریعہ ان کے حوصلوں کو پست کر دیا اور آئندہ ان کے مقابلے کیلئے ایک سو سے زائد نہایت اہم اور وقیع کتابیں بھی تصنیف کر دیں، اور ساتھ ہی اپنے تلامذہ کی ایک اچھی خاصی جماعت بھی تیار کر دی جس نے ہر علمی محاذ پر معتزلہ کا تعاقب کیا اور انھیں میدان چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔

معتزلہ کی اس شکست کے بعد اسی فلسفۂ یونان کی کوکھ سے ایک نئے فتنہ نے جنم لیا جو اسلام کے حق میں اعتزال سے بھی زیادہ خطرناک تھا، یہ تھا باطنیت کا فتنہ اس فتنہ کے بانیوں نے اپنی ذہانت اور یونانی فلسفے کی مدد سے دین اسلام کے اصول و نصوص اور قطعیات میں تحریف و تنسیخ کا دروازہ کھولدیا اور اسی کے ساتھ اسلام و اہل اسلام کے خلاف قوت و طاقت کا مظاہرہ بھی کیا جس کی بنا پر اسلامی حکومتیں عرصہ تک پریشان رہیں اور اسلام کی بہت سی منتخب شخصیتیں اس تشدد آمیز فتنہ کا شکار ہو گئیں اس عظیم فتنہ کی سرکوبی کیلئے بھی صف علماء ہی سے ایک مرد کامل آگے بڑھے جنھیں ہم امام غزالی کے نام سے جانتے پہچانتے ہیں انھوں نے براہ راست باطنیوں

سے مقابلہ آرائی کے بجائے فلسفۂ یونان کو نشانہ بنایا جو اکثر فرقِ باطلہ کا ماخذ و مصدر تھا اور اپنے علمی تبحر، قوت استدلال سے اس کی دھجیاں بکھیر کر رکھدیں اور ان فتنوں کے چشموں کو ہمیشہ کیلئے بند کردیا، امام غزالی کے ساتھ اس اہم خدمت میں امام رازی اور ابن رشد کے کارنامے بھی بھلائے نہیں جاسکتے۔

خیر یہ سارے واقعات تو زمان و مکان کے اعتبار سے آپ سے دور تر ہیں، خود اپنے ملک ہندوستان کی تاریخ پر نظر ڈالیئے، عہد اکبری میں "دین الٰہیہ" کے عنوان سے اسلام کے خلاف جو عظیم فتنہ رونما ہوا تھا جس کی پشت پر اکبر جیسے مطلق العنان فرماں روا کی جبروتی طاقت بھی تھی، لیکن حضرت مجدد الف ثانیؒ اور شیخ عبدالحق دہلویؒ اور ان کے ہمنوا علماء نے اپنے پایۂ استقامت سے اس فتنہ کے سر کو ہمیشہ کیلئے کچل دیا اور اس آخری دور میں سلطنت برطانیہ کے جلو میں الحاد و زندقہ کا فتنہ نمودار ہوا تھا اسکے مقابلہ میں بھی اگر کوئی جماعت نبرد آزما نظر آتی ہے تو وہ علماء ہی کی جماعت ہے، جنھوں نے سفید فام انسان نما وحشی درندوں کے ہر جور و ستم کو برداشت کرکے اسلام اور آئین اسلام کی حفاظت کی، اور شہر شہر، قصبہ قصبہ اور قریہ قریہ مدارس کی شکل میں ان کی چھاؤنیاں قائم کرکے پورے ملک میں اسلام کے سپاہیوں کا ایک جال بچھادیا۔

اور خدا کا شکر ہے کہ اسلام کے یہ سپاہی آج بھی اسلام کے عقائد و اعمال کی حفاظت و اشاعت میں پورے طور پر مصروف ہیں، یہی وجہ ہے کہ اسلام کی جڑیں دیگر بلاد اسلامیہ کے مقابلہ میں ہمارے ملک میں زیادہ مضبوط ہیں اور ہم بحمداللہ اس پوزیشن میں ہیں کہ معاندین اسلام کی آنکھوں سے آنکھیں ملاکر کہہ سکتے ہیں ؎

ادھر آ اے ظالم ہنر آزمائیں تو تیر آزما ہم جگر آزمائیں

اس لئے آج کے نام نہاد اسلام کے ہمدردوں کو علمائے اسلام پر اعتراض کرنے سے پہلے ان

کے کارناموں پر غور کرنا چاہئے۔ مجھے یقین ہے کہ جو لوگ جماعت علماء پر قوم کے استحصال کا الزام لگاتے ہیں اگر انھیں اسلامی علوم وعقائد اور دینی اخلاق وکردار کے تحفظ و بقا اور اسکے استحکام واشاعت کے سلسلے میں علمائے اسلام کی خدمات سے ادنیٰ واقفیت بھی ہوتی تو وہ انھیں مورد الزام ٹھہرانے کے بجائے ان کے شکر گذار ہوتے۔

تاریخ اور تجربہ کی بنیاد پر بلا خوف وتردد یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ موجودہ دور میں اور آئندہ بھی علمائے دین ہی کی جماعت اسلام اور مسلمانوں کی پشتیبان بن سکتی ہے بلند بانگ دعوؤں، خوش کن تجویزوں اور جذباتی تقریروں سے کچھ دیر کیلئے گرمیٔ محفل کا سامان فراہم کیا جاسکتا ہے اور ہوش سے عاری پر جوش نوجوانوں سے زندہ باد کا نعرہ بھی لگوایا جاسکتا ہے، لیکن ان خالی دعوؤں سے کسی سنجیدہ، مستحکم، اور ٹھوس نتائج کی توقع نہیں کی جاسکتی کیونکہ بقول امام مالکؒ ماضی سے مضبوط رشتہ کے بغیر امت کی صلاح وفلاح کا تصور ایک فریب ہے، اور آج جو بھی ملت کے درد سے بے چین ہوکر اٹھتا ہے وہ سب سے پہلے ملت کے ماضی ہی پر تیشہ چلاتا ہے، آج کل کے نوخیز قائدین کو یہ بات ذہن نشین کرلینی چاہئے کہ ماضی کے آئینہ کو داغدار بنا کر تابندہ حال اور روشن مستقبل کا خواب دیکھنا، سراب کو آب زلال سمجھنے کی غلطی میں مبتلا ہونا ہے، اسلاف کے نقش قدم سے ہٹ کر جو کارواں بھی زندگی کی راہوں کی تلاش میں نکلے گا وہ مقبروں کی بھول بھلیوں میں بھٹک کر رہ جائیگا۔

عبدالعظیم قاسمی مدرسہ امداد العلوم کوپا گنج اعظم گڈھ

طلاق کا شرعی قانون

اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو ایک کلمہ سے تین طلاق دے یا متفرق کلمات سے تین مرتبہ طلاق طلاق طلاق کہے تو اسی وقت تین طلاق واقع ہو جائیں گی اور وہ اپنی زوجہ سے بغیر حلالہ کے رجوع نہ کر سکے گا۔ یا وہ مر جائے پھر عدت ختم ہونے پر فریقین باہمی رضامندی سے نکاح جدید کر سکتے ہیں

تشریح:۔ طلاق کے ساتھ لفظ تین استعمال کرے یا تین مرتبہ طلاق طلاق طلاق کہے اس بارے میں اختلاف ہے۔ ایک طلاق واقع ہوگی یا تین طلاق واقع ہوگی، یا ایک طلاق بھی واقع نہ ہوگی

مذکورہ مسئلہ میں تین مسلک ہیں

(۱) طلاق واقع نہ ہوگی (۲) صرف ایک طلاق واقع ہوگی (۳) تین طلاق مغلظہ واقع ہوگی
اول مسلک کے حامی صرف شیعہ ہیں

دوسرے مسلک کے حامی:۔ حضرت عطاء، طاؤس، سعید بن جبیر، ابو شعثاء، عمرو بن دینار اور بقول علامہ قرطبی عمر بن اسحاق اور حجاج بن ارطاط کا ایک قول اسی کے مطابق ہے۔

تیسرے مسلک کے حامی:۔ حضرت عمرؓ حضرت علیؓ، ابو ہریرہؓ، ابن زبیرؓ، عائشہؓ، مغیرہ بن شعبہ، سعید بن منصور، ابو نعیم، چاروں ائمہ یعنی امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل اور علقمہ بن قیس، شہاب زہری وغیرہ۔ (شرح وقایہ جلد ثانی مکتبہ تھانوی دیوبند ص۶۳ حاشیہ ۳)

پہلا مسلک:۔ (جس کے حامی صرف شیعہ ہیں) کہ کوئی طلاق واقع نہ ہوگی۔ اس مسلک کے رد میں اکثر و بیشتر علماء نے اپنی تصانیف میں سیر حاصل بحث کی ہے، جن میں امام

ابن حزم متوفی ۴۵۶ھ، شمس الائمہ امام سرخسی متوفی ۴۸۲ھ، امام کاشانی متوفی ۵۸۷ھ، ابن قدامہ ۶۲۰ھ وغیرہ نے بہت تفصیلی کلام کیا ہے مگر یہاں ان کے مسلک سے بحث نہیں ہے

مسلک دوم کا استدلال :-

وہ حضرات جو بیک وقت تین طلاق دینے کی صورت میں صرف ایک طلاق رجعی واقع ہونے کے قائل ہیں اپنے دعوے کے ثبوت میں حسب ذیل آیات قرآنی پیش کرتے ہیں۔

(۱) الطلاق مرتٰن فامساك بمعروف او تسريح باحسان (بقرہ ۲۲۹)

(۲) واذا طلقتم النساء فبلغن اجلهن بمعروف اوسرحوهن بمعروف (بقرہ ۲۳۱)

ان حضرات کا کہنا ہے کہ اسی طریقہ پر طلاق دینا ہے کہ عدت گذرنے سے قبل رجوع کا حق باقی رہے بنا بریں صرف ایک طلاق رجعی واقع ہوگی، کیونکہ تین طلاق بیک وقت واقع کرنا کتاب اللہ کے خلاف ہے۔

احادیث سے استدلال :-

یہ حضرات اپنے دعویٰ کی تائید میں حسب ذیل احادیث سے استدلال کرتے ہیں

(۱) ابوالزبیر سے روایت ہے کہ تین طلاقوں کے شرعی جواز کے بارے میں دریافت کرنے پر ابن عمرؓ نے فرمایا، کیا تم ابن عمر کو جانتے ہو؟ میں نے کہا ہاں، فرمایا میں نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں اس وقت وہ حائضہ تھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسکو سنت کی طرف لوٹا دیا

(۲) حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ رکانہ ابن عبد یزید نے اپنی زوجہ کو ایک مجلس میں تین طلاقیں دیدیں اسکے بعد رکانہ کو اپنے فعل پر شدید رنج ہوا اور آکر طلاق کے سلسلہ میں نبی صلعم سے دریافت کیا، نبی صلعم نے پوچھا کیسے طلاق دی؟

رکانہؓ — میں نے تین طلاق دی! حضورؐ — ایک مجلس میں؟

رکانہؓ — جی ایک ہی مجلس میں! حضورؐ نے اجازت دی اگر چاہو رجوع کرلو (سنن کبریٰ)

مسلک سوم کا استدلال :-

(۱) حضرت عبادہ بن صامتؓ سے منقول ہے کہ میرے آباء میں سے کسی نے اپنی زوجہ کو ایک ہزار طلاق دے دیں تھیں اس کا ذکر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا گیا تو آنحضرت صلعم نے فرمایا وہ عورت تین طلاق سے بائنہ ہوگئی باقی ، ۹۹۷ طلاق اس کی گردن پر گناہ ہیں
(سنن دار قطنی مطبوعہ انصاری پریس دہلی ص ۴۳۲/۳۷)

(۲) حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ تم میں ایک شخص احمق بنتا ہے کہ اپنی بیوی کو ایک ہزار طلاق دیتا ہے، اور پھر ابن عباس ابن عباس پکارتا ہوا آتا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو شخص اللہ سے ڈر کر کام کرتا ہے اللہ اس کیلئے کوئی راستہ نکال دیتا ہے لیکن تم نے خدا سے خوف نہ کھایا لہذا تمھارے لئے کوئی راستہ نہیں ہے تمھاری زوجہ تم سے بائنہ ہوگئی اور تم گنہ گار ہوئے　(السنن الکبریٰ مطبوعہ حیدرآباد دکن ۱۳۵۲ھ ۳۳۷)

(۳) حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو سو طلاقیں دیں آپ نے فرمایا تم نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور تمھاری بیوی تم سے بائن (جدا) ہوگئی تم اللہ سے نہ ڈرے کہ وہ تمھارے واسطے کوئی راستہ نکالے۔
(السنن الکبریٰ، بیہقی مطبوعہ حیدرآباد دکن ۱۳۵۳ھ جلد، ص ۳۳۱)

(۴) حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ ان کی خدمت میں ایک شخص لایا گیا جس نے ایک ہزار طلاق دیں، آپ نے فرمایا تو نے مذاق کیا اور اسے درّے سے مارا اور کہا تیرے لئے تین کافی تھیں　(سنن کبریٰ، بیہقی جلد، ص ۳۳۴)

(۵) حضرت ابن عمرؓ نے اپنی زوجہ کو بحالت حیض ایک طلاق دی پھر ارادہ کیا باقی دو قرء (حیض) میں آخری دو طلاقیں دوں جضور صلعم کو اس کی اطلاع پہنچی تو آپ نے فرمایا اے ابن عمر تم نے سنت کے خلاف کیا پھر ان کو اپنی زوجہ سے رجوع کرنے کا حکم دیدیا، حضرت ابن عمرؓ نے کہا یا رسول اللہ اگر میں تین طلاقیں دیتا تو کیا میرے لئے رجوع حلال ہوتا؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا نہیں وہ تم سے بائنہ ہوجاتی اور یہ عمل معصیت ہوتا۔
(سنن کبریٰ بیہقی مطبوعہ حیدرآباد دکن ۱۳۵۳ھ جلد ۷ ص ۳۳۴)

(۶) حضرت عویمر عجلانی نے بھی تین طلاقیں دی تھیں اس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انکار نہیں فرمایا تھا،

(۷) ایک شخص نے حضرت عباسؓ سے عرض کیا کہ میں نے اپنی زوجہ کو سو طلاقیں دی، آپؓ نے فرمایا تین لے لو باقی لوٹا دو ۔ (موطا امام مالک مع شرح زرقانی مطبوعہ مصر ۱۳۸۲ھ ص ۶۶/ج ۴)

(۸) حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کے پاس ایک شخص آیا اور کہا میں نے اپنی عورت کو آٹھ طلاق دیدی، ابن مسعودؓ نے کہا تیرے بارے میں کیا کہا گیا اس نے جواب دیا کہ میرے بارے میں کہا گیا کہ وہ مجھ سے بائن ہوگئی، ابن مسعود نے کہا بالکل سچ کہا گیا۔
(موطا امام مالک مع شرح زرقانی مطبوعہ مصر ۱۳۸۲ھ ج ۴ ص ۶۵)

(۹) حفص ابن مغیرہ نے اپنی زوجہ فاطمہ بنت قیس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک کلمہ کے ساتھ تین طلاقیں دے دیں پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو زوجہ سے جدا کر دیا
(دارقطنی مطبوعہ دہلی سنہ ۱۳۱۰ھ ج ۲ ص ۴۲۹)

(۱۰) حضرت علیؓ کے پاس ایک شخص آیا اس نے کہا میں نے اپنی زوجہ کو ایک ہزار طلاقیں دیں آپ نے فرمایا تین طلاقوں نے اس عورت کو تیرے اوپر حرام کر دیا۔
(سنن کبریٰ حیدرآباد دکن ۱۳۵۶ھ جلد ۷ ص ۳۳۴)

(۱۱) عمران بن حصینؓ کے پاس ایک شخص گیا جس نے اپنی بیوی کو ایک مجلس میں تین طلاق دی تھیں، عمران بن حصین نے کہا اپنے رب کی نافرمانی کی اپنی بیوی کو اپنے اوپر حرام کر لیا
(سنن کبریٰ حیدرآباد دکن ۱۳۵۶ھ ج ۷، ص ۳۳۲)

(۱۲) حضرت معاذ بن جبلؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کیا ہے کہ جو بدعی طلاق دے ایک یا دو یا تین ہم اس کو لازم کریں گے۔ (سنن دارقطنی مطبوعہ انصاری پریس دہلی سنہ ۱۳۱۰ھ ص ۴۴۴/ج ۲)

تین طلاق کو ایک قرار دینے والوں کے استدلال پر تنقید

جو حضرات یک وقت تین طلاق دینے کی صورت میں ایک طلاق کے قائل ہیں اپنے دعویٰ کے ثبوت میں بالعموم قرآن پاک کی آیت الطلاق مرتٰن اور واذا طلقتم النساء اور چند حدیثوں سے استدلال کرتے ہیں جن کا ذکر اوپر آچکا ہے، جہاں تک قرآن پاک کی مذکورہ آیات کو اس دعویٰ کے ثبوت میں پیش کرنے کا تعلق ہے اس کے متعلق امام ابن حزم کا جواب کافی ہے کہ قرآن پاک کی یہ آیت ایک یا دو طلاقیں دینے کے سلسلے میں وارد ہوئی ہے (المحلی ابن حزم مطبوعہ قاہرہ ۱۳۵۲ھ جلد ۱۰ ص ۱۷۳)

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آدمی اپنی عورت کو طلاق دیتا تھا جتنی چاہتا تھا کبھی ہزار کبھی سو، اور جب عدت ختم ہونے کے قریب ہوتی تو اس سے رجوع کر لیتا اسطرح عورت پریشان رہا کرتی تھی، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آیت نازل فرمائی کہ طلاق رجعی بس دو مرتبہ ہے (روح المعانی ماخوذ تفسیر بیان القرآن جلد ۱ ص ۱۳۲ ادارہ تفسیر دیوبند)

نیز اس آیت سے یہ مطلب نہیں لیا جاسکتا کہ قرآن ایک یا دو یا تین طلاقوں کو ایک ساتھ دیئے جانے کو غیر نافذ قرار دیتا ہے اور حقیقت بھی وہی ہے جو ابن حزم نے بیان فرمائی کہ قرآن پاک احسن طریقہ کو بیان فرما رہا ہے۔

اسکے علاوہ ایک شئی کا محض اقتضاء النص یا مفہوم مخالف کی بنا پر خلاف قرآن ہونا اس شئی کے وجود کو عدم میں کیونکر تبدیل کر سکتا ہے یا یہ کہ اگر ایک فعل کرنے سے قرآن منع کرتا ہے وہ فعل کر لیا جائے تو وہ باطل کیونکر ہو سکتا ہے، اور وہ فعل خارجی طور پر معدوم کیونکر ہو سکتا ہے۔

مثال کے طور پر قرآن زنا اور چوری سے منع کرتا ہے لیکن اگر کوئی شخص زنا کرے یا چوری کرے جو سراسر قرآن کے خلاف ہے تو کیا یہ کہا جائیگا کہ اس کا فعل وقوع پذیر نہیں ہوا۔

ہرگز نہیں یہی کہا جائیگا کہ اس کا فعل وقوع پذیر ہوا لیکن یہ فعل شریعت کی نگاہ میں قبیح ہے اور اسکا مرتکب مستحق سزا ہے ــــــ بالفاظ دیگر کوئی شخص قرآن کریم کے بیان کردہ احسن طریقہ کے خلاف طلاق دینے کا طریقہ اختیار کرے مثلاً بیک وقت دو طلاقیں اس طرح دے کہ تجھے دو طلاق یا تجھے طلاق طلاق یا تین کا عدد استعمال کرے یا حیض میں طلاق دے یا طہر میں ہمبستر ہونے کے بعد مذکورہ طریقوں میں کوئی طریقہ اختیار کرے تو اس کا حکم ظاہر ہے کہ کتاب اللہ میں نہیں ہے۔

ایسی صورت میں ہمیں قیاسی دلائل کے علاوہ احادیث نبوی اور آثار صحابہ سے امداد لینی پڑے گی اور ایسی مستند احادیث موجود ہیں جن سے مذکورہ صورت میں طلاق کا وقوع بلاشک وشبہ از روئے نص ثابت ہے لہذا محض قرآن میں نہ ہونے کی وجہ سے ایک طلاق یا عدم طلاق کا حکم لگانا سراسر غلط ہے۔

تین طلاقوں کا ایک رجعی ماننا جن حدیثوں پر مبنی ہے اسکے بارے میں محدثین اور فقہاء نے نقد وتبصرہ کے بعد یہ نظریہ قائم کیا ہے کہ یہ حدیثیں تین طلاق دفعتًا دیئے جانے کی صورت میں ایک طلاق واقع ہونے پر حجت نہیں ہوسکتیں

دوسرے مسلک کے لوگوں کی حدیثیں جو استدلال کے طور پر پیش کی گئیں اس پر تنقید

(۱) حضرت ابن عمر والی حدیث :۔ اس ضمن میں بیان کیا گیا کہ حضرت ابن عمرؓ نے اپنی زوجہ کو تین طلاق دی تھیں ــــ دار قطنی ـ علامہ قرطبی نے اپنی مشہور تصنیف جامع الاحکام القرآن میں لکھا ہے کہ اس روایت کے متعلق خود دار قطنی نے بیان فرمایا ہے کہ اس روایت کی سند کے تمام راوی شیعہ ہیں، اور لطف کی بات یہ ہے کہ خود شیعہ (امامیہ) اسکے قائل نہیں ہیں۔ دراصل ابن عمر کی محفوظ روایت وہی ہے جس میں حضرت ابن عمر کا اپنی زوجہ کو حالت حیض میں ایک طلاق دینا مذکور ہے جس پر تمام ائمہ اور محدثین کا اتفاق ہے اور یہی روایت

بن کیسان اور موسیٰ بن عقبہ اسمٰعیل بن امیہ، لیث ابن مسعود، ابی ذئب، ابن جریج وجابر
سمٰعیل بن ابراہیم بن عقبہ اور حسن بصریؒ کی نافع سے ہے، ان تمام روایات کے الفاظ
یہ ہیں ان ابن عمر **طلق تطليقة واحدة** اسی طرح امام زہری نے حضرت سالم
سے ان کی والدہ کی حدیث یونس ابن جبیر شعبی وحسن بصری سے روایت کی ہے
(۲) حضرت رکانہؓ والی حدیث :- دوسرے مسلک کی جانب سے پیش کی جانے والی
روایت حضرت رکانہ والی ہے، حضرت رکانہ کے متعلق علامہ قرطبی نے لکھا ہے کہ اس
روایت میں اضطراب ہے اور منقطع ہونے کی وجہ سے اس قابل نہیں کہ حجت بنائی جاسکے
کیونکہ اس حدیث کو ابوداؤد نے ابن جریج سے بنی ابی رافع کے بعض لوگوں کے واسطے
سے روایت کیا ہے، حالانکہ ان لوگوں میں کوئی شخص ایسا نہ تھا جو حضرت عکرمہ کے واسطے
سے حضرت ابن عباس سے روایت کرسکے،

علاوہ ازیں اس حدیث میں کہا گیا ہے کہ رکانہ نے اپنی زوجہ کو تین طلاقیں دی تھیں اور
حضورؐ نے فرمایا تھا کہ رجوع کرلو۔ حالانکہ نافع ابن عجیر سے اس روایت کو متعدد
سندوں کے ساتھ اس طرح روایت کیا گیا ہے کہ رکانہ ابن عبد یزید نے اپنی زوجہ کو
طلاق بتّہ دی تھی یعنی ثلاثہ کے بجائے بتّہ کہا تھا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے
پوچھا کہ بتّہ سے تم نے کس چیز کا ارادہ کیا تھا رکانہ نے قسم کھا کر عرض کیا کہ میں نے صرف ایک
طلاق کا ارادہ کیا تھا تب حضورؐ نے ان کو رجوع کا حکم دیا تھا، لہٰذا رکانہ والی حدیث سے لفظ
بتّہ ثابت ہوا اور لفظ بتّہ کنایہ ہے اس لئے نیت کا اعتبار کیا جائیگا۔ اس لئے اس حدیث
تین طلاق ایک ساتھ دینے کے ثبوت میں نہیں پیش کیا جاسکتا۔ نیز اس حدیث کے بارے
میں امام جصاص متوفی ۳۷۰ھ نے اپنی تفسیر احکام القرآن میں لکھا ہے کہ یہ حدیث منکر
ہے بریں بنا استدلال کے قابل نہیں ہے

حافظ ابن قیم کے تین سوال:- حافظ ابن قیم ان حضرات کے رد میں جو تین

طلاق کے وقوع کے قائل ہیں فرماتے ہیں کہ قرآن کی آیت بالکل عام ہے اس سے صرف
طلاق واقع ہوگی۔
(۲) حضور صلعم کے بعد صحابہ کی تعداد ایک لاکھ کے قریب تھی جس میں بیس کی تعداد ایسے
جو طلاق ثلثہ کے وقوع کے قائل ہوں۔
(۳) حافظ ابن قیمؒ فرماتے ہیں کہ ہمارے لئے یہ صدق پر مبنی ہوگا کہ صحابہ میں سب کے اتفاق
ہیں اور ان کے زمانہ میں تین طلاق ایک مانی جاتی تھی کسی کا اختلاف نہیں تھا، پھر ان کے
حضرت عمرؓ کے زمانہ میں اختلاف ہوا جو آج تک چلا آرہا ہے۔

حافظ ابن قیم کے تین سوالوں کا جواب

حافظ ابن قیم نے اپنے دعویٰ کے ثبوت میں پہلی دلیل برنائے قیاس یہ دی۔
تین طلاق کا جمع کرنا حرام ہے اور بدعت ہے اور بدعت مردود ہے کیونکہ رسول اللہ صلی
وسلم کے حکم کے خلاف ہے اس لئے تین طلاقیں مجموعی طور پر واقع نہ ہوں گی مگر ابن قیم
دلیل میں تناقض ہے کہ کوئی طلاق واقع نہ ہوگی، حالانکہ ابن قیمؒ ایک طلاق کے وقوع کے
ہیں۔ دراصل ابن قیم کی اس دلیل کے پیش نظر رکانہ اور طاؤس کی روایتیں ہیں جن
طلاق کے وقوع پر استدلال کیا ہے۔ حضرت رکانہ والی حدیث کے متعلق کلام کیا جا
اور حضرت طاؤس کی روایت جن سے ایک طلاق کے وقوع پر استدلال کیا جاتا ہے
سے غلط ہے حضرت طاؤس کی روایت کو ابوداؤد نے دو سندوں سے روایت کیا ہے
ابوداؤد مطبع مجیدی کانپور جلد اول ص۲۲۹ دارقطنی نے پانچ سندوں سے روایت کیا ہے
نے طاؤس کی روایت کو تین سندوں سے لیا ہے، امام مسلم نے طاؤس کی روایت کو تین
سے لیا ہے، صحیح مسلم بشرح النووی مطبوعہ مصر ۱۳۴۷ھ طلاق الثلاث ج۱۰ ص۷۲۔
ان احادیث کا بنظر غائر مطالعہ کرنے سے بات واضح ہوجاتی ہے کہ سرے سے ا

ہی نہیں ہیں بلکہ زیادہ سے زیادہ تاریخی واقعہ کے طور پر صحابی کے اثر کا درجہ رکھتی ہیں،
امام جصاص کی بھی یہی رائے ہے، احکام القرآن سنہ ۱۳۳۵ھ مطبوعہ مصر جلد اول ص ۳۸۸ - علامہ
قرطبی کا بھی یہی نظریہ ہے، نیز علامہ ابن عبد البرؒ نے کہا ہے کہ طاؤس کی روایت وہم پر مبنی اور
غلط ہے، امام ابن حزم، ابن قدامہ مقدسی، امام بیہقی وغیرہم کا بھی اسی طرف رجحان ہے - نتیجہ
ایک طلاق واقع نہیں ہوگی - مجموعہ قوانین اسلام، ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن جلد ۲ ص ۵۲۹ تا ۵۳۵
ب - اس بات کو ایک اور مثال سے سمجھئے کہ ایک شخص نے کسی کو تین روپیہ کا مالک بنا کر
کہا کہ یہ تین روپئے آپ کسی مسکین کو دے سکتے ہیں لیکن بہتر یہ ہوگا کہ آپ ان تینوں روپوں
کو تین مختلف اوقات میں دیں - لیکن اس شخص نے کسی وجہ سے تین روپیوں کو بیک وقت
دیدیا تو ظاہر ہے کہ اس نے تینوں روپئے دیدیئے لیکن پہلے شخص کے کہنے کے مطابق مستحسن
طریقہ اختیار نہیں کیا تو کیا اس فقیر کو وہ تین روپے نہیں ملے آپ فوراً کہیں گے کہ مل گئے،
وہی صورت زیر بحث مسئلہ میں ہے (ج) اور الطلاق مرتان کے اندر احسن اور غیر احسن طریقہ
بیان فرمایا ہے اگرچہ تین طلاق بیک وقت واقع کرنا ممنوع ہے لیکن پھر بھی واقع ہو جائے گی
(د) حافظ ابن قیم کا یہ کہنا کہ طلاق ثلثہ کے قائل بیس حضرات بھی نہیں ہیں غلط ہے اور ان
کا یہ کہنا کہ حضرت ابوبکرؓ کے دور خلافت میں اور حضرت عمرؓ کے ابتدائی دور میں اس مسئلہ
پر اجماع ہو چکا تھا ان کا یہ دعوی بلا دلیل ہے کیونکہ انھوں نے اس بارے میں کوئی ایسی
بات نقل نہیں کی ہے، جس سے اس مسئلہ پر صحابہ کا اجماع ثابت کیا جا سکے اس کے برخلاف حضرت
عمرؓ کے عہد سے تمام اکابر صحابہ و تابعین و ائمہ اربعہ اور فقہا نیز مجتہدین اور محدثین مثلاً
حضرت عمرؓ، حضرت عبداللہ ابن عمر، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص
حضرت عثمان، حضرت عبداللہ ابن مسعود، حضرت عمران بن حسین حضرت ابوہریرہ، حضرت علی بن
ابی طالب، حضرت مغیرہ ابن شعبہ، حضرت عبداللہ بن زبیر اور حضرت حسن ابن علی، تابعین و تبع تابعین
میں سے مجاہد، سعید بن جبیر، عطاء بن رباح، عمر بن دینار، مالک بن حارث، محمد بن ایاس ابن ابی بکیر

معاویہ بن عیاش، مالک بن انس، امام اعظم ابوحنیفہ، امام شافعی احمد بن حنبل، ابن ابی لیلیٰ جعفر بن محمد، حبیب ابن ثابت، علقمہ ابن قیس، نافع، سوید ابن علقمہ ابن شہاب زہری اور عاصم وغیرہ سے اس مسئلہ میں تین طلاق کا واقع ہونا ثابت ہے اور حافظ ابن قیم کا دعویٰ اس حیثیت سے بھی باطل ہوجاتا ہے کہ کسی صحابی سے حضرت عمرؓ کی مخالفت منقول نہیں ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ مسلمہ قاعدہ ہے کہ مجتہدین فقہاء کا اعتبار کیا جائیگا اور فقہاء صحابہ نے وقت واحد میں تین طلاق کو تین ہی قرار دیا ہے، فتح القدیر، ابن ہمام مطبوعہ مصر ۱۳۵۶ھ ص ۲۶

(۵) حافظ ابن قیم کا یہ کہنا کہ حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں اجماع تھا کہ تین طلاق ایک ہوتی ہے ہم کہیں گے کہ اول بات یہ ہے کہ اجماع ثابت ہی نہیں ہے اور اگر بالفرض مان لیا جائے تو کیا یہ کہنا صحیح نہو گا کہ جو اجماع حضرت عمرؓ نے کیا تھا اس نے حضرت ابوبکرؓ کے اجماع کو منسوخ کردیا اور حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جو اجماع ہوا تھا وہ آج بھی قائم ہے جس طرح آپ کے زمانہ میں تھا بنابریں امت مسلمہ کیلئے شرعی حکم آج بھی واجب الاتباع ہے کہ تین طلاق ایک ساتھ دینے سے تین ہی واقع ہوگی۔

حضرت عمرؓ کا حکم کیسا تھا؟ حافظ ابن قیم نے کہا کہ حضرت عمرؓ نے جو تین طلاق مقرر کی وہ بطور سزا کے تھی۔ **جواب**:۔ اسکا جواب یہ ہے کہ اگر حضرت محمد صلعم کے عہد مبارک میں اور ابوبکرؓ کے عہد میں اور حضرت عمرؓ کے ابتدائی دور میں تین طلاقیں ایک قرار دی جاتی تھیں تو پھر حضرت عمرؓ کا تین طلاق کو تین ہی قرار دینا اور فلا تحل لہ من بعد حتی تنکح زوجاً غیرہ کے حکم میں داخل کرنا کیونکر جائز اور درست ہوسکتا ہے کیونکہ ایک طلاق رجعی سے جو عورت اس مرد کیلئے حلال تھی وہ اس مرد کیلئے تین طلاق مغلظ قرار دیکر حرام کردی گئی ہے اور ظاہر ہے کہ جو فعل رسول اللہ صلعم اور حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں اور خود حضرت عمرؓ کے ابتدائی عہد میں حلال تھا اس کو حضرت عمرؓ کس طرح حرام قرار دے سکتے ہیں۔

قسط ۲

سات آسمانوں کا وجود
قرآن، حدیث اور سائنس کی روشنی میں

مولانا محمد حنیف۔ بابو نگری۔ بنگلہ دیش

وجود آسمانی اور اہلِ ہیئت قدیم اہل ہیئت کو بھی آسمانوں کا وجود اور تعدد مسلم ہے۔ چنانچہ صاحب "تصریح" افلاک کا شمار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

ثم السمٰوٰت السبع للسیارات السبع المشھورۃ أی زحل والمشتری والمریخ والشمس والزھرۃ و عطارد والقمر (دیکھو تصریح ص)

پھر سات مشہور سیاروں کے سات آسمان ہیں، سات سیاروں سے، زحل، مشتری، مریخ شمس، زہرہ، عطارد اور قمر مراد ہیں۔

اسی طرح یہی بات "شرح الجغمینی" میں بھی مذکور ہے (دیکھو شرح الجغمینی، ص۲۲)

واضح رہے کہ یہاں افلاک کے بارے میں قدیم اہلِ ہیئت کے نظریے کے ذکر کا مقصد اس پورے نظریے سے موافقت کرنا نہیں ہے، بلکہ صرف یہ بتانا ہے کہ قرآن و حدیث کی طرح ان اہلِ ہیئت کو بھی آسمانوں کا وجود اور تعدد تسلیم ہے۔

ایک شبہ کا ازالہ یہاں اشکال ہو سکتا ہے کہ قدیم ہیئت کی کتابوں تصریح وغیرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آسمان نو ہیں، سات تو وہ جو اوپر گذر چکے ہیں، باقی دو، فلک اطلس اور فلک الثوابت ہیں۔ لہٰذا آسمانوں کی تعداد میں سات ہونے کا دعویٰ کیسے صحیح ہو سکتا ہے؟ اس اعتراض کے کئی جواب ہو سکتے ہیں۔ ایک سیدھا

سادھا جواب یہ ہے کہ اہل ہیئت جن کو فلک اطلس اور فلک الثوابت کہتے ہیں شریعت کی زبان میں ان کو سما یا فلک سے موسوم کرنے کے بجائے عرش اور کرسی کہا گیا ہے چنانچہ "تصریح" میں ہے کہ

وھٰذان ای الفلک الاطلس وفلک الثوابت ھما العرش والکرسی بلسان الشرع	اور ان دونوں کو یعنی فلک اطلس اور فلک الثوابت کو شریعت کی زبان میں عرش اور کرسی کہا جاتا ہے۔

(تصریح ص ۱)

پس نام کا فرق ہوا اصل مسمیٰ ایک ہے، لہٰذا کوئی اشکال نہیں۔ اسی طرح جدید ماہر سائنس موریس بکائیے نے بھی اپنی شہرۂ آفاق کتاب "بائبل، قرآن اور سائنس" میں آسمانوں کے وجود اور ان کے تعدد کو کھلے الفاظ میں تسلیم کیا ہے، چنانچہ ایک بحث کے ضمن میں لکھا ہے "لہٰذا بہت سے آسمان ہیں اور بہت سی زمینیں ہیں اور قرآن کے قاری کو یہ جان کر کچھ کم حیرت نہیں ہوتی کہ ہماری زمین کی طرح کائنات میں اور بھی زمینیں ہو سکتی ہیں۔ (بائبل، قرآن اور سائنس ص۱۷۴ و ص۱۷۵)

سمٰوٰات کا تعدد جس کی تعداد قرآن میں سات بیان کی جاتی ہے اور جس کے مفہوم پر ہم بحث کر چکے ہیں جدید سائنس سے اس کی تصدیق ان مشاہدات کی بنا پر ہوتی ہے جو نجمی طبیعیات کے ماہرین نے کہکشانی جہانوں اور ان کی بڑی کثیر تعداد پر کئے ہیں۔ (کتاب مذکور ص۲۳۴)

ایک اور شبہ منکرین آسمان یہ شبہ کر سکتے ہیں کہ عصر حاضر کے جدید سائنس دانوں نے اپنی خلائی تحقیقات میں حیرت انگیز ترقی کی ہے دور دور سفر کیا ہے۔ بڑے بڑے سیارات اور ستارے (جو کرۂ ارضی سے اربوں میل دور واقع ہیں)، ان کو دریافت ہوئے ہیں۔ انھوں نے ایک ایسا سیارہ پایا جو حجم میں سورج سے پانچ ارب گنا بڑا ہونے کے باوجود بہت زیادہ دور واقع ہونے کے سبب ہم کو سورج کیا چاند

کی طرح بھی دکھائی نہیں دیتا ہے۔ اور سورج کے متعلق تو معلوم ہے کہ وہ زمین سے ساڑھے تیرہ لاکھ گنا بڑا ہے اور ہمارے اس قریبی "نظام شمسی" میں پلوٹو نامی ایک سیارہ دریافت ہوا جو زمین سے تقریباً تین ارب ستر کروڑ بیس لاکھ میل دور واقع ہے اسی طرح جس کہکشانی نظام میں ہم واقع ہیں بیسویں صدی عیسوی کی دوربینوں کے ذریعہ اس کے ستاروں کی تعداد تقریباً دس ہزار ملین (دس کروڑ) معلوم ہوئی ہے، پھر بھی ہماری یہ کہکشاں بجائے خود صرف ایک مقامی کہکشانی نظام ہے جس کے علاوہ اور بے شمار کہکشانی نظامات پائے جاتے ہیں۔

(ان معلومات کے لئے ملاحظہ ہوں، مذہب اور سائنس ص۳۲ ازمولانا عبدالباری ندوی، قرآن اور سائنس ازموریس بوکائیے ص۱۷۱ اور روزنامہ جنگ کراچی ۲۴ رجون ۱۹۷۸ء)

اب شبہ یہ ہے کہ جب اہلِ سائنس کو اپنے اس وسیع اور حیرت انگیز خلائی سفر میں (جس میں اتنے بڑے سیارات اور ستارے دریافت ہو رہے ہیں) آسمانوں کا کوئی وجود نہیں دریافت ہو رہا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ درحقیقت آسمان کا کوئی وجود ہی نہیں جو نیلگوں چیز ہم کو نظر آرہی ہے وہ "حدِ نگاہ" ہے۔

اس شبہ کا ازالہ

یہ امر واقعہ ہے جو مذکورہ شبہ سے بھی مفہوم ہوتا ہے) کہ ان لوگوں کے پاس انکارِ آسمان کی کوئی مضبوط اور معتبر دلیل نہیں ہے بلکہ ان کے استدلال کا حاصل صرف یہ ہے کہ ہمیں اپنی تحقیقات میں آسمان کے وجود کا علم نہ ہوسکا، اس لئے ہم اس کے وجود کو تسلیم نہیں کرتے، دوسرے الفاظ میں ان کا یہ خیال علم عدم کے بجائے "عدم علم" پر مبنی ہے لہٰذا ہم (جو قرآن وسنت کی قطعیت پر ایمان رکھتے ہیں) پورے وثوق اور اعتماد کے ساتھ کہتے ہیں کہ اہلِ سائنس کی یہ رائے قطعاً غلط ہے کیونکہ یہ بات مسلّمات میں سے ہے کہ کسی چیز کے "عدم وجدان" یا "عدم علم" سے نفس الامر میں اس کا "عدم وجود" ثابت نہیں ہوتا، بہت ممکن ہے کہ سائنس اپنی کم علمی کی

ہمارے پاس آسمان کو دریافت نہ کر سکی مگر قرآن و سنت کی تصریح کے مطابق (جیسا کہ گذر چکی ہے) اس کا وجود ثابت ہے اس اجمال کی شرح و تفصیل کے لئے ذیل کی اصولی تحقیق پڑھیے۔

حصولِ علم کے تین طریقے وہ دلائل جن کے ذریعہ ہم کسی چیز کا علم حاصل کرتے ہیں تین ہیں **اول** حواسِ خمسہ ہیں یعنی سامعہ، باصرہ، شامہ لامسہ، ذائقہ، ان کے ذریعہ ہم محسوسات کے متعلق علم اور یقین حاصل کرتے ہیں بشرطیکہ حواس صحیح ہوں آفت رسیدہ نہ ہوں اگر یہ حواس صحیح نہ ہوں تو محسوسات کے متعلق صحیح علم حاصل نہ ہوگا۔ مثلاً احول (بھینگا) ایک چیز کو دو دیکھتا ہے اور صفراوی مزاج والا میٹھی چیز کو تلخ محسوس کرتا ہے۔

دوسری دلیل عقل ہے جس کے ذریعہ ہم غیر محسوس چیز کے متعلق علم و یقین حاصل کرتے ہیں اور جہاں حواس کا کام ختم ہوجاتا ہے وہاں عقل کا کام چلتا ہے۔ مثلاً جب ہم دھواں دیکھتے ہیں تو باوجود اس کے کہ ہمیں آگ نظر نہیں آتی ہماری عقل سو فیصد یقین کرتی ہے کہ یہاں آگ موجود ہے اور جب ہم خاک کا اڑنا اور پتوں کو ہلتا دیکھتے ہیں تو ہوا کے جسم سے لگنے سے پہلے ہی عقل فیصلہ کرلیتی ہے کہ یہاں ہوا موجود ہے۔ اسی طرح جب ہم چاند کا گھٹنا، بڑھنا دیکھتے ہیں تو اپنی عقل سے معلوم کرلیتے ہیں کہ چاند کی روشنی سورج سے مستفاد ہے۔

تیسری دلیل حصولِ علم کی کسی با اعتماد اور با وثوق آدمی کی اطلاع اور اخبار ہے۔ جس کے ذریعہ ان چیزوں کا علم حاصل کیا جاسکتا ہے جن کی پہچان سے حواس اور عقل عاجز ہوں، مثلاً ایک شخص نے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ نہیں دیکھا، لیکن اس کا ان شہروں کے وجود کے اوپر پورا یقین ہے۔ اب اس کو یہ یقین اور یہ علم حواس اور عقل کے ذریعہ حاصل نہیں ہوا، بلکہ معتمد اور معتبر اطلاعات کے ذریعہ حاصل ہوا ہے۔ اسی طرح ایک اندھا جو نہ تو کنواں اور سانپ کو دیکھ سکتا ہے اور نہ عقل کے ذریعہ اس کو ان دونوں کی معرفت حاصل ہوسکتی ہے۔ اس کے لئے ایک معتمد اور معتبر شخص کی اطلاع ہی واحد ذریعہ ہے جس سے ان دونوں کے وجود کے متعلق اس کو

یقین حاصل ہو۔ اب اندھے کا یہ کہنا کہ جب تک میں نہ دیکھوں یا جب تک میری سمجھ میں نہ آئے کہ یہ سانپ اور کنواں ہے تو میں ان دونوں کے وجود کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں، اس کا یہ قول سراسر بے وقوفی اور کھلی نادانی ہوگی۔ اسی طرح "عالم غیب" کی باتیں جو انسانی مشاہدہ اور انسانی عقل و ادراک سے بالکل وراء الوراء اور بہت برتر ہیں ان کے متعلق علم و یقین حاصل کرنے کا راستہ صرف اور صرف حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی اطلاع اور اتباع رہے۔

جن کے متعلق ان کے دشمنوں کو بھی اعتراف ہے کہ ان کی زندگی کے پورے ریکارڈ میں کہیں کذب و افتراء کا کوئی شائبہ تک نہیں ہے اور ان سے زیادہ راستباز، لائق اعتماد اور قابلِ وثوق انسان زمین و آسمان کی آنکھوں نے نہ دیکھا ہے اور نہ دیکھ سکیں گی۔

چنانچہ مفکر عالم ڈاکٹر اقبال مرحوم کا ایک ملاقاتی یکایک یہ سوال کر بیٹھا کہ ڈاکٹر صاحب آپ عالم بھی ہیں اور فلسفی بھی، کیا آپ خدا کی ہستی اور باری تعالیٰ کے وجود کو فلسفیانہ دلائل سے ثابت کر سکتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے جواب میں "نہیں" کہا۔ ملاقاتی نے اس پر دریافت کیا کہ جب یہ بات ہے تو پھر آپ کے نزدیک خدا کی حقیقت قابلِ تسلیم کیونکر ہوئی؟ اقبال مرحوم نے فرمایا: یقیناً خدا کی ہستی ناقابلِ انکار حقیقت ہے، اس کے لئے مجھے فلسفیانہ دلیل کی ضرورت نہیں، میرے نزدیک اللہ تعالیٰ کے وجود پر سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ میرے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے، جن کے متعلق ان کے دشمن بھی کہتے تھے کہ انہوں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا جب فرمایا ہے کہ خدا مجھ سے ہمکلام ہوتا ہے تو خدا کی ہستی یقینی ہے (روزگار فقیر ص۱۳۱)

اس کے ساتھ یہاں یہ اصول بھی پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ جب کسی چیز کے وجود اور حصول کے کئی طریقے ہوں تو کسی ایک طریقے کے عدم سے اس چیز کا عدم وجود لازم نہیں آتا۔ کیونکہ ایک طریقہ سے اگر نہ ہو تو دوسرے طریقہ سے وہ چیز موجود اور حاصل ہو سکتی ہے۔

ان مختصر تمہیدی گفتگوؤں کے بعد بات کو طول دیئے بغیر ہم اتنا عرض کرتے

ہیں کہ ان سائنس دانوں کی بے مائیگی اور کم علمی کی وجہ سے اگرچہ وہ حصول کے بعض ذریعہ "مشاہدہ" وغیرہ سے آسمان کو دریافت نہ کر سکے لیکن قرآن کریم کی تصریحات اور صادق و مصدوق، اکمل البشر حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخبار و اطلاع (جو مفصلاً گذر چکی ہیں اور جو "حصول علم" کا سب سے زیادہ معتمد اور معتبر، سب سے زیادہ طاقتور، سب سے زیادہ صحیح اور مستند ذریعہ ہیں) آسمانوں کا وجود یقینی طور پر ثابت ہوتا ہے۔ قرآن وسنت کی ان تصریحات کے باوجود اگر کوئی شخص یہ کہہ کر وجود آسمان کا انکار کر بیٹھے کہ وہ اس کے مشاہدہ یا اس کی عقل میں نہیں آرہا ہے تو اس کی حالت اس کم عقل اندھے سے مختلف نہ ہوگی جو کنواں اور سانپ کا یہ کہہ کر انکار کر دے کہ یہ چیزیں اس کی فہم اور اس کے مشاہدہ میں نہیں آتی ہیں، یا اس کی حالت اس شخص جیسی ہوگی جو مکہ معظمہ، مدینہ منورہ اور امریکہ و لندن کا وجود اس وجہ سے تسلیم نہ کرے کہ ان جگہوں کو اس نے نہیں دیکھا ہے۔

وجود آسمان عقل کی نظر میں

عقل کی روشنی میں اگر زیر بحث مسئلہ کا جائزہ لیا جائے تو صاف بات یہ ہے کہ کائنات کی اتنی بڑی لامحدود، محیر العقول اور بے پناہ وسعتوں کے ہوتے ہوئے سات آسمان کیا اس سے بھی بڑی بڑی مخلوقات کا اس کائنات میں سمانا عین ممکن ہے۔ اس میں کسی قسم کا عقلی استحالہ اور استبعاد نہیں۔ رہا وسعت کائنات کا مسئلہ تو اس کے بارے میں ماہر اسلامی فلاسفر امام رازیؒ کا قول ہے کہ "اس عالم سے باہر ایک لامتناہی خلا کا وجود دلائل عقلیہ سے ثابت ہے (تفسیر کبیر ج ۱/۲)

اور فلسفہ و سائنس کے مشہور عالم مولانا عبدالباری ندوی لکھتے ہیں کہ "ہم عالم سے مراد بعض اوقات صرف اپنا ہی کوکبی نظام (جس کا رکن ہمارا آفتاب ہے) اور ستاروں کا وہ عظیم مجموعہ لیتے ہیں جس کو کہکشاں کہتے ہیں۔ لیکن دراصل یہ صرف ایک عالم یا ہمارا عالم ہے۔ اس کے علاوہ بہ کثرت ایسے عوالم پائے جاتے ہیں جو ہمارے اس عالم سے بالکل باہر نہایت دور دراز فاصلوں پر واقع ہیں ان ہزاروں ہزار عالموں

میں ہر ایک اتنا ہی عظیم الشان ہے جتنا کہ ہمارا یہ عالم (مذہب اور سائنس ص۶۹)

اس قول سے امام رازی کے کلام کی واضح تائید اور شرح ہوتی ہے۔

اور امریکی خلائی مسافر جان گلین نے خلائی سفر سے واپس آکر اقرار کیا کہ کچھ نہیں بتلایا جاسکتا کہ خلا کی وسعت کتنی اور کہاں تک ہے (معارف القرآن ج ۱ ص۸۲)

ایک اور جدید سائنس داں نے کہا کہ " دور دراز سیاروں سے آگے ایک لامحدود خلا ہے جس کو پاٹنے کا کوئی امکان نہیں " (ماہنامہ الحق۔ اکوڑہ خٹک، ربیع الثانی ۱۳۸۹ھ)

الغرض کائنات خداوندی کی وسعت بڑی محیر العقول اور لامتناہی ہے جس میں ان سات آسمانوں کا سمانا بہ نظر عقل عین ممکن ہے، اور یہ اصول مسلمات میں سے ہے کہ عقل جس چیز کو ممکن قرار دیتی ہو اگر کوئی نقلی دلیل (جو یقینی ہو) اس کے وجود کی خبر دے تو اس کو تسلیم کرنا ضروری ہوتا ہے اس کے اصول کے پیش نظر جب عقل کی نظر میں وجود سبع سموات ممکن ہے اور دلیل نقلی یعنی قرآن و سنت (جن کے قطعی ہونے میں ذرہ بھر شبہ نہیں) اس وجود سموات کا اثبات کررہی ہے تو انکار آسمان کی کوئی معقولیت اور اس کا جواز نہیں ہے۔

اس محیر العقول اور بے پناہ وسعت والی کائنات کی ایک حقیر مقدار اور معمولی ذرہ کے برابر چاند یا نظام شمسی یا کہکشانی جہان تک رسائی ہوجانے سے یہ دعوی کرنا کہ آسمانوں کا وجود ہی نہیں، علم و فہم اور عقل و خرد کی تضحیک اور رسوائی نہیں تو اور کیا ہے، کنویں کے مینڈک کی مثال شاید ایسے لوگوں سے بڑھ کر کسی اور پر صادق نہ آئی ہو۔

اور اگر انسان کی سائنسی معلومات میں مسلسل صحیح اضافہ ہوتا رہا تو عین ممکن ہے کہ ان سائنس دانوں کو اپنی اس غلطی (انکار آسمان) کا احساس ہوجائے اور وہ اسی طرح وجود آسمان کو تسلیم کرلیں جس طرح بہت سی ان چیزوں کو تسلیم کیا ہے جن کا پہلے انکار کیا جاتا تھا۔

آسمانوں کی حقیقت مودودی صاحب کی نظر میں

اور بر دس آیات قرآنی، حدیث معراج اقوال صحابہ، اقوال مفسرین، توریت و انجیل

کی تصریحات اور بہت سے اہل سائنس کی آراء کی روشنی میں واضح طور پر ثابت و معلوم ہوا کہ آسمان سات ہیں۔ بعض بعض کے اوپر ہیں، ہر دو آسمان کے درمیان طویل فاصلہ ہے ہر آسمان میں فرشتے ہیں۔ آسمانوں کی صنعت بہت ہی قوی ہے، وہ عظیم اجسام ہیں جو بلند فضا میں کھڑے ہیں اور ان میں دروازے ہیں جو خاص خاص حالات واوقات میں کھولے جاتے ہیں اور دروازوں پر فرشتوں کے مضبوط پہرے مسلط ہیں۔ لیکن جناب سید ابوالاعلیٰ صاحب نے (جنھوں نے اپنی بے پناہ صلاحیتوں سے حضرات صحابہؓ اور سلف صالحین کی راہ سے ہٹ کر تفسیر قرآن کے ایک نئے اسلوب اور اسلام کی ایک بالکل نئی تشریح و تعبیر کی بنیاد ڈالی ہے اور اسے ایک قابل فخر کارنامہ خیال کرتے تھے) سورۂ بقرہ کی انتیسویں آیت کی تفسیر کرتے ہوئے سات آسمانوں کے بارے میں جو تخیل پیش فرمایا ہے وہ قرآن وسنت اور صحابۂ کرامؓ اور حضرات ائمہ تفسیر کے اقوال وآراء سے بالکل مختلف ہے۔ چنانچہ اپنے مخصوص اور بلیغ انداز میں لکھتے ہیں۔

"سات آسمانوں کی حقیقت کیا ہے، اس کا تعین مشکل ہے۔ انسان ہر زمانے میں آسمان، یا بالفاظ دیگر ماورائے زمین کے متعلق اپنے مشاہدات یا قیاسات کے مطابق مختلف تصورات قائم کرتا رہا ہے جو برابر بدلتے رہے ہیں، لہٰذا ان میں سے کسی تصور کو بنیاد قرار دیکر قرآن کے ان الفاظ کا مفہوم متعین کرنا صحیح نہ ہوگا۔ بس مجملاً اتنا سمجھ لینا چاہیئے کہ یا تو اس سے مراد یہ ہے کہ زمین سے ماوراء جس قدر کائنات ہے اسے اللہ نے سات محکم طبقوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ یا یہ کہ زمین اس کائنات کے جس حلقہ میں واقع ہے، وہ سات طبقوں پر مشتمل ہے۔"

(ملاحظہ ہو تفہیم القرآن ج ۱ ص۶۱، بقرہ آیت ۲۹ حاشیہ ۳۴ تاریخ طباعت نومبر ۱۹۸۲ء)

آسمان کے بارے میں مذکورہ مختصر تحقیق کے پیش نظر جناب مودودی صاحب کی اس نئی "تفہیم وتحقیق" کی کمزوریاں اور غلطیاں واضح اور عیاں ہیں۔ تاہم مزید وضاحت کے لئے

(باقی ص ۳۲)

قسط ۲

امام ابو حنیفہؒ کی مرویات اور ان کے مجموعے

(از:- محمد عبید اللہ الاسعدی جامعہ عربیہ ہتھورا ضلع باندہ)

جامع المسانید

امام صاحب کے مسانید سے متعلق اکابر محققین نے مختلف انداز پر کام کیا ہے گذشتہ صفحات سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ امام صاحب کے مسانید کو ایک کتاب میں جمع کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے، یہ کام ابوالمؤید محمد بن محمود بن محمد خوارزمی حنفی م ۶۶۵ھ یا ۶۵۵ھ نے جامع المسانید کے نام سے کیا ہے، یہ وضاحت گذر چکی ہے کہ جامع المسانید میں سارے مسانید شامل نہیں ہیں، نیز اس کی تفصیل بھی کہ اس میں خوارزمی نے کیا کیا چیزیں لی ہیں۔

جامع المسانید کو دو جلدوں میں اور چالیس ابواب پر مرتب کیا گیا ہے، ابواب کی ترتیب فقہ کے مطابق ہے البتہ پہلا باب ایمان سے متعلق ہے اور آخری باب میں کتاب کے رجال کے احوال ذکر کئے ہیں اس میں اکثر مکرر روایات نہیں لی گئی ہیں الا یہ کہ ایک حدیث مختلف ابواب سے متعلق ہو یا مختلف اسانید کے ساتھ مروی ہو تو اس کو مکرر ذکر کیا گیا ہے[1] اس میں جمع کی گئی روایات کل (۱۷۱۰) ہیں جو ہر قسم کی ہیں مرفوع، غیر مرفوع اور مسند و منقطع و مرسل، مرفوع روایتیں (۹۱۶) ہیں اور غیر مرفوع (۷۹۴) ہیں مرفوع میں سے مسند (۳۵۶) ہیں، جن میں سے ایسی روایات نہایت قلیل اور نادر ہیں جن میں امام صاحب اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان پانچ یا چھ راویوں کا واسطہ ہو، عام روایات چار یا تین یا دو واسطوں والی ہیں، چند ایک واسطے والی بھی ہیں، غیر مرفوع میں آثار صحابہ (۳۱۱) اور غیر صحابہ کے آثار (۴۸۳) ہیں جن میں سے (۳۵۵) صرف ابراہیم نخعی

---

[1] مسانید الامام ص ۱۳۹ و ۱۴۰۔

کے ہیں، اور آثار عام طور پر مرفوع روایات کے ضمن میں منقول ہیں[1]۔ کتاب الآثار کی مرویات کی تعداد گذر چکی ہے، جامع المسانید کی مرویات بھی ذکر کردی گئی ہیں اور بعض مسانید کی مرویات کی تعداد الگ الگ بھی ذکر کی گئی ہے اس سے یہ بات پورے طور پر واضح ہوجاتی ہے کہ امام صاحب کی محفوظ کردہ مرویات امام مالکؒ و امام شافعیؒ وغیرہ کی مرویات سے کم نہیں ہیں[2]، بلکہ مجموعی طور پر شاید زیادہ ہی ہوں جیسا کہ ہمارے ذکر کردہ اعداد کے تقابل سے ظاہر ہے۔

مختصرات

۱- امام شرف الدین اسمٰعیل بن عیسیٰ اوغانی مکی م ۸۹۲ھ نے جامع المسانید کا اختصار کیا ہے بنام "اختیار اعتماد المسانید فی اختصار اسماء رجال الاسانید"۔

۲- حصکفی صاحب درمختار صدرالدین موسیٰ بن زکریا بن ابراہیم م ۶۵۰ھ نے مسند حارثی کا اختصار کیا ہے نیز مسانید کے مختصرات حسب ذیل حضرات نے بھی تالیف کئے ہیں۔

۳- حافظ ابوجعفر بن احمد بن شجاع حلبی شافعی م ۹۳۶ھ بنام "لقط المرجان فی مسند النعمان"

۴- جمال الدین محمود بن احمد قونوی دمشقی حنفی معروف بابن السراج ۷۰۹ھ نے بنام "المعتمد مختصر المسند"

۵- محمد بن عباد خلاطی م ۶۵۲ھ نے بنام مقصد المسند۔

۶- ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل بن ابراہیم حنفی م ــــ نے بنام "مختصر المسند۔

۷- محمد بن محمد بن محمد بن عبدالرزاق بلگرامی حنفی معروف بسید مرتضیٰ حسین زبیدی م ۱۲۰۵ھ نے خاص انداز پر جامع المسانید کا اختصار کیا ہے اور وہ یوں کہ مسانید کی وہ روایات احکام جن کو لفظ و معنی دونوں یا صرف معنی کی موافقت کے ساتھ اصحاب صحاح ستہ نے روایت کیا ہے ان کو جمع کیا ہے۔
حسب موقع دوسرے محدثین کی بھی تخریج کا ذکر کیا ہے اور مجموعے کو ابواب فقہیہ کے

---

[1] مسانید الامام ص ۱۵ و ۱۶۰ [2] ایضاً ۱۲ و الخیرات الحسان ص ۱۵۹)

مطابق مرتب کیا ہے، پہلے اعتقادیات کو ذکر کیا ہے پھر عملیات کو اور ہر باب میں ایک یا دو یا چند روایات حسب مواقع ذکر کی ہے مگر نہ تو امام صاحب کی تمام مرویات کو لیا ہے نہ جامع المسانید کی اسلئے کہ ان کی کتاب میں چھ سو کے قریب روایات ہیں اور ہر ہر روایت پر فقہ و حدیث کی رو سے مناسب کلام کیا ہے ان کے مختصر کا نام ہے "عقود الجواہر المنیفہ فی ادلۃ الامام ابی حنیفہ"۔

۴۔ ترتیب و تبویب مسند کے متعلق معروف ہے کہ "مسند" کی ترتیب حضرات صحابہ کے اسماء کے اعتبار سے ہوتی ہے ابواب فقہیہ وغیرہ کے مطابق نہیں اس کی وجہ سے کسی موضوع و مسئلہ سے متعلق کسی روایت کی تلاش میں زحمت ہوتی ہے اسی لئے متعدد حضرات نے "مسانید" کی ترتیب کا بھی کام کیا ہے، گذر چکا ہے کہ جامع المسانید کو ابواب فقہیہ کے مطابق جمع کیا گیا ہے جیسے کہ علامہ زبیدی نے اپنے مختصر کو اسی انداز پر مرتب کیا ہے، شیخ محمد عابد سندھی حنفی م ۱۲۷۵ھ نے حصکفی کے مختصر کو ابواب پر مرتب کیا ہے اس میں پانچ سو سے زیادہ امام صاحب کی مرویات ہیں اور حافظ قاسم بن قطلوبغا نے مسند حارثی اور مسند ابن مقری کو مبوب مرتب کیا ہے۔ اخیر میں مولانا ادریس صاحب بلگرامی ندوی نے "تحصیل المرام بتبویب مسند الامام" کے نام سے مسند کو مرتب کیا ہے[1]۔

۵۔ شروح شیخ قاسم بن قطلوبغا م ۸۷۹ھ نے جامع المسانید کی دو جلدوں میں شرح کی ہے، نیز امام سیوطی نے بھی بنام "التعلیقۃ المنیفہ فی شرح مسند الامام ابی حنیفہ"۔ علامہ زبیدی نے بھی اپنے مختصر کی شرح کی ہے، ملا علی قاری م ۱۰۱۴ھ نے مسند حصکفی کی شرح کی ہے بنام "سند الانام فی شرح مسند الامام" جیسے کہ قونوی نے خود اپنے مختصر کی شرح بنام "المستند" کی ہے، شیخ عابد سندھی نے مسند حصکفی کی ترتیب کے بعد اس کی نہایت ضخیم و مفید شرح لکھی ہے، اسی مسند کی شرح مولانا

---

[1] مقدمہ مسند امام اعظم اردو ص ۳ تا ۷ و مسانید الامام ص ۱۲۲ تا ۱۳۶

محمد حسن صاحب سنبھلی م ۱۳۰۵ھ نے بنام تنسیق النظام فی شرح مسند الامام کی ہے یہ شرح بھی مفید ہے ان میں سب سے ضخیم شرح شیخ عابد کی ہے جس کے متعلق مولانا عبدالرشید نعمانی فرماتے ہیں کہ فتح الباری کے علاوہ اس شان کی کوئی دوسری شرح شروح حدیث میں نہیں ہے متابعات وشواہد، تخریج احادیث وغیرہ اہم موضوعات پر اتنا بڑا ذخیرہ کہیں اور نہیں ہے مسند حصکفی کا اردو میں ترجمہ بھی ہوا ہے اردو ترجمہ مولانا حیدر حسن خاں صاحب ٹونکی م ۱۳۶۱ھ (سابق مہتمم وشیخ الحدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے صاحبزادے مولانا سعد حسن خان صاحب نے کیا ہے[1] اس ترجمہ کے ساتھ مولانا عبدالرشید صاحب نعمانی کا اردو میں مبسوط مقدمہ بھی ہے جو امام صاحب کے مسانید کے تعارف پر مشتمل ہے

۶۔ زوائد واطراف ورجال

حافظ الدین محمد بن محمد کردری م ۸۲۷ھ نے جامع المسانید میں امام صاحب کی صحاح ستہ سے زائد جو روایات ہیں ان کو "زوائد المسند" کے نام سے جمع کیا ہے، حافظ ابوالفضل محمد بن طاہر مقدسی معروف بابن القیسرانی م ۵۰۷ھ (صاحب الجمع بین رجال الصحیحین) نے مسانید کے اطراف کو بنام "اطراف احادیث الامام ابی حنیفہ" جمع کیا ہے۔

ذکر گذر چکا ہے کہ ابن حمزہ حسینی م ۷۶۵ھ نے اپنی کتاب "التذکرہ برجال العشرہ" میں اور ابن حجر رح نے تعجیل المنفعۃ" میں مسند کے رجال پر کلام کیا ہے اور دونوں نے ابن خسرو کے مسند کے رجال کو لیا ہے۔

قاسم بن قطلوبغا نے "مسند ابن مقری"، کے رجال سے متعلق کتاب تالیف کی ہے اور صاحب جامع المسانید نیز ملا علی قاری ومولانا سنبھلی وغیرہ نے اپنی شروح میں مسانید کے رجال پر کلام کیا ہے[2]

---

[1] ایضاً ص ۱۵۱ تا ۱۵۶ ومقدمہ مسند امام اعظم ص ۲۳ تا ۳۶ - [2] مسانید الامام ص ۱۵۱ تا ۱۵۳ مقدمہ اوجز المسالک ص ۶۰ وجواہر البیان ترجمہ الخیرات الحسان ص ۵۰ تا ۵۶ الرسالۃ المستطرفۃ

(ج) اربعینات بعض حضرات نے امام صاحب کی مرویات پر مشتمل اربعینات بھی تحریر فرمائی ہیں مثلاً الشیخ حسن محمد بن شاہ محمد بن حسن ہندی نے اور مولانا ادریس صاحب نگرامی م ۱۲۳۰ھ نے بنام ۰الاربعین من مرویات نعمان سید المجتہدین[1]

(د) وحدانیات متعدد حضرات نے امام صاحب کی ان روایات کو مرتب و جمع کیا ہے جو امام صاحب نے صرف ایک واسطے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کی ہیں۔

۱۔ ابو معشر عبدالکریم بن عبدالصمد شافعی م ۴۷۸ھ نے بنام "جزء ما رواہ ابو حنیفۃ عن الصحابۃ" یہ رسالہ اسی سلسلہ میں معروف ہے جس کو یوسف سبط ابن جوزی نے اپنی کتاب "الانتصار والترجیح للمذہب الصحیح" میں روایت کیا ہے اور امام سیوطی نے اپنی کتاب "تبییض الصحیفہ" میں اس کو شامل کیا ہے۔

۲۔ ابو حامد محمد بن ہارون حضرمی۔ ۳۔ ابو بکر عبدالرحمٰن بن محمد سرخسی

۴۔ ابو الحسین علی ابن احمد بن عیسیٰ نہفقی — ان تینوں کے اجزا کو ابو عبداللہ محمد دمشقی حنفی معروف بابن قولون م ۹۵۳ھ نے اپنے استادسے "المعجم المفہرس" میں روایت کیا ہے جیسے کہ خوارزمی نے جامع المسانید کے مقدمہ میں اپنی سند سے ان کو ذکر کیا ہے اور ابو عبداللہ صیمری م ۴۳۶ھ نے اپنی کتاب "فضائل ابی حنیفۃ واخبارہ" میں امام صاحب کی وحدانیات میں سے اپنی سند سے چار وحدانیات کو ذکر کیا ہے، اگرچہ بعض حضرات نے ان وحدانیات کے ثبوت کی تردید کی ہے اس بنیاد پر کہ امام صاحب کی ولادت صغار صحابہ کے آخری عہد میں ہوئی ہے اور جن صحابہ سے روایات منقول ہیں بعض قرائن سے نقل کی تائید نہیں ہوتی، ان حضرات نے یہ ذکر کرتے ہوئے کہ امام صاحب کی تابعیت کا قول تو راجح و ثابت ہے، اس نقل کی تضعیف کی ہے

---

[1] مسانید الامام ص ۱۵۱ ۔

مگر جیسا کہ مذکورہ بالا تفصیل سے واضح ہے کہ فن حدیث اور نقد حدیث میں امتیازی مقام رکھنے والے بعض اکابر محدثین اور ممتاز محدثین احناف وفقہاء احناف نے اپنی اسناد کے ساتھ ان مرویات کو روایت کیا ہے اور سیوطی نے کہا ہے کہ محض اسناد پر ضعف کے حکم سے بطلان لازم نہیں آتا، ملا علی قاری و علامہ عینی نے بھی اس کا اثبات کیا ہے[1]. اور یہ بات فی الجملہ اس کی تائید کرتی ہے کہ امام صاحب کی ولادت کی بابت معروف قول ۸۰ھ کا ہے اور متعدد صحابہ کی کوفہ اور مکہ وغیرہ میں اس کے بعد وفات ثابت ہے بلکہ حضرت ابوالطفیلؓ کی وفات ۱۱۰ھ کے بعد ہی منقول ہے اور ظاہر ہے کہ پانچ چھ سال کی عمر تمیز کی عمر ہوتی ہے جس کا محدثین کے یہاں اعتبار ہے، مزید یہ کہ امام صاحب کی ولادت کی بابت دو قول اور ہیں ایک ۶۳ھ کا اور دوسرا ۷۰ھ کا، ابن حبان نے دوسرے قول کو ترجیح دی ہے[2]۔

اس پر مزید گنجائش نکل آتی ہے، ظاہر بات ہے کہ جب سن رشد بلکہ بلوغ کے بعد صحابہ کی حیات اور ملاقات بھی ثابت ہے تو ان سے روایات کا سماع محض احتمال کی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ کسی نہ کسی درجہ میں قوت ہی رکھتا ہے

امام صاحب کے امتیازات سابقہ تفصیلات سے یہ بات واضح ہے کہ حدیث کے علم اور متون حدیث کی تالیف و تدوین کے بارے میں امام صاحب کی بابت جو غلط تصورات قائم کیے گئے ہیں ان کے برخلاف امام صاحب کو اس بات میں بھی ایسے امتیازات حاصل ہیں کہ ائمہ اربعہ اور اصحاب ستہ میں سے کسی کو حاصل نہیں چہ جائیکہ دیگر معتمد و معروف متون کے مؤلفین، وہ امتیازات حسب ذیل ہیں

۱ــــ امام صاحب کی کتاب الآثار کے متعدد نسخے مروی و منقول ہیں، اس امتیاز میں امام مالک بھی بایں معنی شریک ہیں کہ موطا مالک کے نسخے تیس تک منقول ہیں اگرچہ معروف نسخے موطا مالک کے بھی دو ہیں جیسے کہ "کتاب الآثار" کے دو نسخے معروف ہیں امام محمد کا

---

[1] ملاحظہ ہو قلائد الازہار ص ۱۴ اور تانیب الخطیب علامہ زاہد الکوثری کی

اور امام ابو یوسف کا، تفصیل گذر چکی ہے۔

۲ —— امام صاحب کی مرویات کو وقت کے اکابر حفاظ حدیث اور ائمہ فن نے مختلف ادوار میں مستقل کتابوں کی صورت میں جمع کیا ہے[۱] اور ان مجموعوں کی تعداد بیس یا اس سے زائد ہے اور جامعین نہ صرف یہ کہ احناف ہیں بلکہ دوسرے تینوں مسالک سے تعلق رکھنے والے بھی ہیں۔

۳ —— کسی ایک امام و محدث سے مروی روایات کو اربعینات کے طور پر جمع کرنا بھی امام صاحب ہی کا امتیاز ہے[۲]۔

۴ —— وحدانیات کا امام صاحب سے مروی ہونا ہی امام صاحب کا نمایاں امتیاز ہے اور امام صاحب کی وحدانیات کا یکجا جمع کیا جانا مستقل ایک امر ہے سند کے علو و نزول کا معاملہ معروف ہے اور محدثین کے نزدیک اس کی اہمیت اس سے ظاہر ہے کہ امام بخاری کی ثلاثیات کو جو کہ تعداد میں بائیس ہیں اور امام احمد کی ثلاثیات کو جو کہ تعداد میں تین سو تریسٹھ ہیں امتیاز حاصل ہے ان کے مستقل مجموعے اور شروح کی تالیف کی گئی ہے، بعض دیگر محدثین کی ثلاثیات کو بھی جمع کیا گیا ہے، امام مالک کی سب سے اعلیٰ روایات ثنائی ہیں[۳]، امام صاحب کا معاملہ یہ ہے کہ وحدانیات کے علاوہ ۲۴۲ ثنائیات ۳۲۰ ثلاثیات ۱۵۰ رباعیات ہیں[۴]۔

۸ — امام صاحب کی مرویات کے دیگر مراجع و ماخذ

امام صاحب کی مرویات کی جامع مستقل کتب جن کا تذکرہ تفصیل کے ساتھ کیا گیا ہے ان کے علاوہ فقہ حنفی کی اولین کتب بالخصوص امام ابی یوسف و امام محمد کی مؤلفات اور ان کی شروح میں امام صاحب کی مرویات بکثرت مذکور ہیں مزید برآں یہ کہ صحاح ستہ کے علاوہ دیگر بہت سے معروف متون اور کتب حدیث میں امام صاحب کی مرویات کا تذکرہ ہے مثلاً مصنفات ابن مبارک مسند وکیع بن جراح مصنف عبدالرزاق مصنف ابن ابی شیبہ مستدرک حاکم صحیح ابن حبان، سنن بیہقی، معاجم طبرانی، سنن دار قطنی وغیرہ اصحاب صحاح ستہ میں سے امام ترمذی نے اپنی کتاب العلل میں نیز نسائی نے بھی امام صاحب سے روایت کی ہے[۵]

۱؎ مقدمہ مسند امام اعظم اردو ص ۱۲۔ ۲؎ مسانید الامام ص ۱۵۱ ۳؎ الرسالۃ المستطرفہ ص ۸۱، ۸۲ ۴؎ مسانید الامام ص ۱۵۹
[illegible]

بقیہ ص ۲۴ سات آسمانوں کا وجود۔

عبارت بالا سے متعلق اجمالاً دو باتیں بیان کر دی جاتی ہیں جو درج ذیل ہیں۔
(۱) ـــــ اس تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ آیت مذکورہ میں " ثم استویٰ الی السماء فسوّٰھن سبع سمٰوٰت " کی تفسیر یا بالفاظ دیگر حقیقتِ آسمان کے تعین وادراک کا راستہ صرف انسانی مشاہدات یا قیاسات سے پیدا شدہ تصورات ہیں اور چونکہ وہ برابر بدلتے رہے ہیں لہٰذا حقیقت آسمان کا تعین مشکل ہے۔

دراصل یہ تصوّر بالکل غلط ہے، کیونکہ آسمانوں کی حقیقت اور کیفیت کے تعین وادراک کیلئے نصوص قطعیہ بالخصوص حدیث معراج کافی وشافی ہیں، ناقص انسان کے ناقص قیاسات کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے، اہل سائنس کے قیاسات یا مشاہدات میں لاکھوں تبدیلیاں بھی آئیں اس سے کبھی آسمان کے ادراک میں کوئی خلل یا کوئی نقصان واقع نہ ہوگا، مودودی صاحب کو یہاں ایسا کہنا چاہئے تھا کہ فلاسفر کی ناقص عقول اگرچہ آسمان کے تعین وادراک سے عاجز ہیں لیکن قرآن وسنت کی تصریحات سے آسمانوں کا وجود یقیناً ثابت ہے مگر افسوس کہ اس واضح اور صاف بات کی جگہ آپ کے زور آور قلم سے وہ مبہم اور گول گول سی بات نکلی جس سے منکرینِ آسمان کی بھرپور تائید ہو رہی ہے۔

(۲) مودودی صاحب نے تو پہلے لکھا تھا کہ سات آسمانوں کی حقیقت کا تعین مشکل ہے، پھر لکھتے ہیں کہ سات آسمانوں سے، اور اے زمین کے سات محکم طبقے یا زمین کائنات کے جس حلقہ میں واقع ہے اس کے سات طبقے مراد ہیں۔

اوّلاً اس عبارت کے اول وآخر میں ایک طرح کا تعارض وتخالف ہے جو ظاہر ہے۔
ثانیاً آیت مذکورہ میں سات آسمانوں سے اس قسم کے سات طبقے مراد لینا، یہ تفسیر (ہمارے علم میں) کسی مفسّر سے منقول نہیں ہے، نہ فلسفہ وتفسیر کے ماہر ترین امام حضرت امام رازی سے، نہ جدید وقدیم کے ماہر اسلامی فلاسفر اور مفسّر کبیر علامہ آلوسی بغدادی

سے اور نہ کسی اور سے ، باقی اس آیت کے تحت "سموات" کی تفسیر میں علمار تفسیر کے اقوال وآرا د کیا ہیں تو ان کا مختصر بیان اوپر ہو چکا۔ وہاں دیکھ لیا جائے ۔

ثالثًا اس تفسیر سے آسمان کا بدیہی اور معروف ومشہور معنیٰ کا (یعنی جرم اور دروازوں والا آسمان ، جو حدیث معراج وغیرہ سے مفہوم ہوتا ہے) سراسر انکار ہو جاتا ہے اور یہ امر واقعہ ہے کہ کسی آیت یا حدیث کا ایسا معنیٰ نکالنا جس سے اس کے مشہور اور بدیہی معنیٰ کا انکار ہو ۔ یہ درحقیقت اس نص کے انکار کی طرح ہے ، نیز اس سے بدیہی اور معروف ومشہور معنیٰ کے اعتبار سے جو آسمان کا انکار ہو رہا ہے وہ بجائے خود ایک بدیہی البطلان امر ہے ، کیونکہ جیسا کہ گزرا ، قرآن وسنت بلکہ تمام ادیان سماویہ کا وجود آسمان پر اتفاق ہے ۔ پس ان وجوہ واسباب کی بنا پر یہ تفسیر کسی معنیٰ میں صحیح اور معتبر نہیں ہو سکتی ۔

آیت مذکورہ کی تفسیر میں اس گول گول سی بات کرنے سے ایسا لگتا ہے (واللہ اعلم بحقیقۃ الحال) کہ ہمارے محترم سید صاحب بعض جدید اہل ہیئت (جو آسمان کے منکر ہیں) کے اقوال ونظریات سے اس قدر مرعوب ومتاثر ہیں کہ مسئلہ آسمان میں نصوص قطعیہ اور ائمہ تفسیر جیسے امام رازیؒ ، امام ابن جریر طبری ، امام قرطبیؒ ، علامہ قاضی بیضاویؒ ، حافظ جلال الدین سیوطی اور جدید وقدیم کے ماہر اسلامی فلاسفر علامہ آلوسی بغدادی وغیرہم کی تصریحات پر اعتماد واطمینان بحال نہ رکھ سکے اور اس مجبوری نے آپ کے سیال اور طاقتور قلم سے وہ بات نکالی جو ناظرین کرام کے ملاحظہ میں آ چکی ہے ۔ اس سلسلہ کی مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ——— "یتیمۃ البیان" از حضرت الاستاذ علامہ محمد یوسف بنوری (ص ۴۲،۴۳،۵۰)

اللہ تعالیٰ ہم سب کو دین کی صحیح فہم وتفہیم اور حضرات صحابہ رضا اور سلف صالحین کے نقش قدم پر چل کر اسلام کی خدمات واشاعت کی توفیق دے اور یہ سب کچھ اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی جوتی کے صدقے میں قبول فرمائے ۔ (آمین)

کلکتہ کا علمی سفر

از:- قاضی اطہر مبارکپوری

اسے اتفاق ہی کہنا چاہیئے کہ راقم اپنے علمی اسفار میں مغرب میں بحر اطلسی کے افریقی سواحل تک جا چکا ہے مگر مشرق میں اب تک بہار و بنگال نہیں پہنچ سکا تھا۔ پچھلے دنوں بہار کی دلہیز یعنی آرہ بھوج پور تک جانا ہوا تھا اور اب ۷ ربیع الثانی ۱۴۰۸ھ (۲۹ نومبر ۱۹۸۷ء) کو ایک علمی و دینی تقریب کے سلسلے میں ادارہ ترجمہ و تالیف کی دعوت پر کلکتہ جانا ہوا، اور مولانا ابوسلمہ شفیع احمد صاحب بہاری رح متوفی ۸ ربیع الثانی ۱۴۰۶ھ (۲۲ دسمبر ۱۹۸۵ء) کے یادگاری مجلہ کے اجراء کی تقریب میں شرکت ہوئی۔

مولانا ابوسلمہ شفیع احمد بہاری رحمۃ اللہ علیہ ۱۹۱۲ء میں بہار شریف میں پیدا ہوئے اپنے دیار میں تعلیم حاصل کرکے دارالعلوم دیوبند اور جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں آخری تعلیم پائی، ان کے اساتذہ و شیوخ میں مولانا محمد انور شاہ صاحب کشمیری، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی کے علاوہ ادیب شہیر مولانا ابوعبداللہ محمد بن یوسف سورتی رح بھی ہیں۔ فراغت کے بعد مختلف مدارس میں تعلیمی خدمات انجام دیں۔ آخر میں کلکتہ کو اپنی علمی و دینی اور عملی سرگرمی کا مرکز بنایا اور عمر کا بیشتر حصہ وہیں گذار کر وہیں سپرد خاک ہوئے۔ مدرسہ عالیہ کلکتہ میں حدیث و تفسیر کے پروفیسر اور میدان کلکتہ کے امام عیدین تھے، اسی کے ساتھ وہاں کی مختلف مساجد میں درس قرآن کی خدمت انجام دی، اور ہر قسم کی علمی، دینی، اصلاحی تحریکات میں پیش پیش رہے، حدیث سے خصوصی تعلق و شغف تھا۔ متعدد کتابوں کے مصنف تھے، ۱۹۵۰ء سے ۱۹۷۴ء تک حدیث سے متعلق ان کے تحقیقی مضامین و مقالات شائع ہوتے رہے، آخر لادارہ

ترجمہ وتالیف قائم کرکے اس سے کئی معیاری کتابیں شائع کیں، یہ ادارہ مولانا مرحوم کے صاحبزادے مولانا محمد طلحہ ابوسلمہ ندوی کی نظامت میں چل رہا ہے۔ ایک مرتبہ حج وزیارت کے سفر میں راقم ان کے ہمسفر تھا اس کے بعد سے تعلقات نہایت خوشگوار تھے۔ مولانا نے بیہقی رح کی معرفۃ السنن والآثار کا پہلا حصہ شائع کیا، اسی طرح ابن حزم کی کتاب "اسماء الصحابۃ الرواۃ وما لکل واحد من العدد" اپنے ہاتھ سے کتابت کرکے شائع کی، یہ دونوں علمی تحفے راقم کے پاس ہیں۔

کلکتہ میں راقم کا قیام جناب حاجی منصور احمد صاحب کے دولتکدہ پر رہا۔ حاجی صاحب کلکتہ کے مشہور اور ہر دلعزیز قومی وملی کارکن ہیں۔ ذاتی کاروبار ہے، نہایت خلیق اور علم وعلماء کے قدرداں ہیں مشاہیر علماء ان کے یہاں قیام میں ہر قسم کی راحت محسوس کرتے ہیں، انتظامات کی مصروفیات کے باوجود مولانا محمد طلحہ ابوسلمہ بار بار خبرگیری کرتے رہے اور راحت رسانی کی کوشش میں لگے رہے۔ ان کا خلوص یاد رہے گا، ۲۹ نومبر کا دن نادیدہ احباب ومخلصین کی دید وملاقات میں گذرا۔ پروگرام کے مطابق مغرب کے بعد مسلم انسٹی ٹیوٹ ہال کلکتہ ۱۶ میں یادگاری جلسہ ہوا۔

اہل علم اور ارباب ذوق سے پورا ہال بھرا ہوا تھا۔ جلسہ کی صدارت مشہور عالم ومحقق عربی زبان کے ادیب اور مصنف مولانا ابومحفوظ الکریم صاحب معصومی پروفیسر حدیث وتفسیر مدرسہ عالیہ نے فرمائی اور ان کے پرمغز علمی خطبۂ صدارت سے جلسہ کی ابتدا ہوئی۔ یوں تو مولانا موصوف سے غائبانہ علمی استفادہ مدت سے رہا ہے اور ان کے علمی وتحقیقی اور ادبی وتاریخی مضامین ومقالات عربی، اردو کے رسائل ومجلات میں پڑھتا رہا۔ مگر ملاقات اب ہوئی۔ اور ایسی ہوئی کہ تلافی مافات ہوگئی۔

تلاوت قرآن، حمد ونعت اور خطبۂ صدارت کے بعد حاجی منصور احمد صاحب اور مولانا محمد طلحہ ابوسلمہ صاحب نے ادارۂ ترجمہ وتالیف کی کارگذاری پیش کی۔ اس کے بعد راقم کے ہاتھوں

یادگاری مجلہ کا اجراء یوں ہوا کہ میں نے اس کی ایک جلد کلکتہ کے مشہور قومی دملی رہنا جناب فاروق اعظم صاحب کی خدمت میں پیش کی، مقررین میں مولانا منت اللہ صاحب رحمانی، مولانا معین الدین صاحب قاسمی، مولانا محمد تسلیم صاحب، مولانا ضیاء الہدیٰ صاحب قادری، مولانا عبدالمنان صاحب استاد مدرسہ عالیہ، جناب سیف الدین صاحب کشمیری، جناب عبدالرؤف صاحب انصاری، سابق ایم، ایل اے وغیرہ نے مولانا ابوسلمہ شفیع احمد صاحب کے علمی و دینی حالات و خدمات کو بیان کرکے بہترین خراجِ عقیدت پیش کیا۔

راقم نے مولانا مرحوم سے اپنے تعلق اور ان کی علمی دینی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ان کی علمی یادگار ادارۂ ترجمہ و تالیف کے کاموں کو آگے بڑھانے میں کلکتہ کے اہلِ علم تعاون کریں۔ یہاں دارالمصنفین اور ندوۃ المصنفین جیسے ادارے قائم ہو سکتے ہیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور سے یہ شہر علم و علماء تصنیف و ترجمہ اور نادر و نایاب کتابوں کی طباعت و اشاعت کا مرکز رہا ہے۔ یہاں رائل ایشیاٹک سوسائٹی، مدرسہ عالیہ اور نیشنل لائبریری جیسے ایشیا کے عظیم علمی ادارے ہیں یہ علمی وسائل و اسباب دوسرے شہروں کو حاصل نہیں ہیں۔

یہ خالص علمی تقریب تین گھنٹے تک جاری رہی۔ خاتمہ پر ماکول و مشروب سے حاضرین کی تواضع کی گئی، بہ عجلت واپسی کی کوشش کے باوجود سفری مشکلات کی وجہ سے دو دن دوشنبہ اور سہ شنبہ کو رکنا پڑا۔ یہ دونوں دن اس اعتبار سے بڑے کارآمد ثابت ہوئے کہ کلکتہ کے بعض اہلِ علم سے ملاقات اور بعض علمی اداروں کے دیکھنے کا موقعہ ملا۔ جواں سال عالم مولانا ابوصالح رضوان الکریم صاحب ایم اے نے مجھے کئی اہلِ علم سے ملایا اور علمی اداروں میں لے گئے، میں ان کا شکر گزار ہوں۔

چنانچہ ان کے ہمراہ پروفیسر محمد صابر خان صاحب کے یہاں حاضری ہوئی۔ موصوف کلکتہ کے مشہور ریسرچ اسکالر اور اسلامیات نگار ہیں۔ زیادہ دن ہوئے بمبئی میں ان سے ملاقات ہوئی تھی، گھر پر بھی آئے تھے، خط و کتابت بھی رہتی تھی، ان کو میری خبر ایسے وقت

ہوئی جب وہ سفر پر روانہ ہو رہے تھے خط لکھ کر مجھے اپنی قیام گاہ پر دعوت دی۔ میں حاضر ہوا تو بڑے خلوص اور تپاک سے ملے۔ ان دنوں ایک ادارہ بنام المجمع الرابطۃ الثقافیۃ بین الھند والعرب۔ قائم کر رکھا ہے وقتاً فوقتاً اس کے جلسے ہوتے ہیں۔ اس سے متعلق ایک کتابچہ بھی مجھے دیا اور اسی موضوع سے متعلق مضمون کی فرمائش کی۔

پروفیسر محمد صابر خاں صاحب سے مل کر پروفیسر مسعود حسن صاحب سابق صدر شعبہ عربی مولانا آزاد کالج کلکتہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ موصوف بیمار تھے، رات کے جلسہ میں شریک نہ ہونے پر معذرت کرتے رہے ضعف و نقاہت کے باوجود دیر تک علمی گفتگو کرتے رہے، موصوف نے امام ابن حزم کی کتاب "جمہرۃ انساب العرب" بڑی محنت سے ایڈٹ کی تھی، مگر جب استاذ عبدالسلام ہارون کی تحقیق و تعلیق کے ساتھ یہ کتاب ۱۳۸۲ھ میں دارالمعارف قاہرہ سے شائع ہو گئی تو پروفیسر صاحب نے اس کی اشاعت کا خیال ترک کر دیا، میں نے جمہرۃ انساب العرب لابن حزم مطبوعہ قاہرہ ۱۳۸۲ھ میں مدینہ منورہ سے ۱۵ ریال میں خریدی ہے، موصوف نے مجھے ابن حزم کی کتاب "مراتب الاجماع" پر اپنا ایک تحقیقی مقالہ عنایت فرمایا جو مجلہ علوم اسلامیہ علی گڑھ میں دسمبر ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا تھا۔

مولانا رضوان الکریم ہی کے ساتھ نیشنل لائبریری کے شعبہ علوم مشرقیہ کی مختصر سیر کی یہاں کے انتظامات اور لکھنے پڑھنے والوں کے لئے آسانی، آرام اور سہولت دیکھ کر حیرت ہوئی۔ اسی کے ساتھ متقدمین علمائے اسلام کی علمی و تحقیقی خدمات کی قدر و قیمت بڑھ گئی کہ ہمارے اسلاف نے ان وسائل کی نایابی کے باوجود تصنیف و تالیف اور تحقیق کا اتنا عظیم اور مستند سرمایہ جمع کر دیا ہے، جس کے پڑھنے کے لئے ایک عمر چاہیئے۔

دوسرے دن مولانا حکیم محمد زماں صاحب حسینی کی ملاقات کے بعد دوپہر میں مدرسہ عالیہ جانا ہوا وہاں سے مولانا ابو محفوظ الکریم صاحب معصومی کے ساتھ رائل ایشیاٹک سوسائٹی چلا گیا۔ مولانا کے ساتھ ہی مدرسہ میں کھانا کھایا اور اسی میں ظہر کی نماز پڑھی۔ مدرسہ عالیہ

۱۷۸۰ء میں سیالدہ کے قریب بیٹھک خانہ روڈ پر کرایہ کی عمارت میں جاری ہوا تھا تقریباً دو سال کے بعد اس کی ذاتی عمارت تیار ہوئی۔ موجودہ عمارت ۱۸۲۴ء میں بنی اور جون ۱۸۲۷ء میں اس میں باقاعدہ تعلیم شروع ہوئی۔ تقسیم ملک کے بعد ۱۹۴۷ء میں مدرسہ عالیہ اور اس کا کل اثاثہ ڈھاکہ منتقل ہوگیا اور ۴ر اپریل ۱۹۴۹ء میں دوبارہ کلکتہ میں جاری ہوا، اس کے پہلے صدر مولانا عبدالحلیم صاحب صدیقیؒ ہوئے۔

مدرسہ عالیہ میں ظہر کی نماز کے بعد مولانا معصومی صاحب کی رہنمائی میں ایشیاٹک سوسائٹی جانا ہوا جو مدرسہ کے قریب ہی واقع ہے۔ اس مجمع علمی کا قیام ۱۷۸۴ء ہوا اس کا محرک کلکتہ ہائی کورٹ کا جج مسٹر ولیم جونس تھا جو عربی اور فارسی کا زبردست عالم و محقق تھا اور اٹھائیس[۲۸] زبانوں سے واقف تھا اس کا انتقال ۱۷۹۴ء میں سینتالیس سال کی عمر میں ہوا۔

اس ادارہ کی طرف سے مختلف علوم و فنون کی بہت سی نادر و نایاب کتابیں پہلی بار چھپکر شائع ہوئیں مثلاً حافظ ابن حجرؒ کی الاصابۃ فی تمییز الصحابہ سترہ جلدوں میں سب سے پہلے یہیں چھپی۔ اس کی تحقیق و تعلیق کلکتہ کے مشہور عالم و محقق شمس العلماء اخوند کار عبدالحی صاحب متوفی ۱۹۵۶ء نے کی تھی۔ ۱۳۵۳ھ میں الاصابہ آٹھ جلدوں میں مصر سے شائع ہوئی جو اسی کلکتہ والے نسخہ کی نقل مع بعض اضافات کے ہے۔ اس کے پہلے صفحہ پر یہ عبارت درج ہے طبعت ھذہ النسخۃ المطبوعۃ سنۃ ۱۸۵۳م فی بلدۃ کلکتا۔ مگر مجھکو بتایا گیا کہ اس کی اشاعت کلکتہ میں ۱۸۷۰ء کے درمیان ہوئی تھی۔ مولانا منت اللہ صاحب رحمانی نے برسبیل تذکرہ بتایا کہ جامعہ رحمانیہ مونگیر میں یہ نسخہ سترہ جلدوں میں موجود ہے یہیں سے سب سے پہلے امام واقدی کی کتاب المغازی چھپ کر شائع ہوئی، اس کا ایک نسخہ دارالمصنفین میں موجود ہے، نیز یہیں سے امام سیوطی کی تاریخ الخلفاء ۱۸۵۷ء میں شائع ہوئی، میرے نانا مرحوم مولانا احمد حسین صاحب رسول پوریؒ کے کتب خانہ میں اس کا ایک نسخہ ہے۔ ان کے علاوہ اور بہت سی کتابیں پہلی بار ایشیاٹک سوسائٹی سے شائع ہوئی ہیں۔

یہ سوسائٹی اپنی جدید، شاندار وسیع و عریض اور کئی منزلہ عمارت میں کتابوں کی ایک

دنیا ہے۔ معلوم ہوا کہ ساڑھے تین لاکھ سے زائد کتابیں ہیں جن میں مطبوعات کے علاوہ مخطوطات کا بیش بہا خزانہ ہے۔ مخطوطات کی مطبوعہ فہرست سرسری طور سے دیکھی۔ ایک الفی قرآن شریف بڑے سائز پر نہایت اچھی حالت میں دیکھا، دو صفحہ میں ایک پارہ ہے یعنی ساٹھ صفحات (تیس ورق میں) تیسوں پارے ہیں اور سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ ہر صفحہ حرف الف سے شروع ہوتا ہے۔ کاتب نے یہ خوبی دکھائی ہے کہ تمام سطریں یکساں ہیں۔ اسی کے باوجود ہر صفحہ الف سے شروع ہوتا ہے، نہایت خوش خط اور حروف صاف ہیں۔ کاتب کا نام اور سنہ کتابت نہیں ہے۔ بادشاہ نامہ کا ایک مخطوطہ دیکھا جو شاہ جہانی کے دورِ سلطنت کی تاریخ ہے، اس کی جلد دوم کے پہلے صفحہ پر حاشیہ میں خود شاہ جہاں کے دست کی یہ تحریر ہے، "ایں نیاز مند درگاہ الہٰی حررہ شاہ جہاں بادشاہ بن جہانگیر بادشاہ بن اکبر بادشاہ غازی"

دلی دکنی کے دیوان کا ایک مخطوطہ خستہ حال میں تھا جس پر ۱۱۴۶ھ لکھا تھا، ایک اور کتاب "فرہنگ اور رنگ" نام کی تین ضخیم جلدوں میں تھی، جس میں دنیا بھر کے حیوانات طیور، وحوش، حشرات الارض، نباتات، جمادات اور احجار کریمہ کا تفصیلی حال اور ہر چیز کی تصویر تھی۔ حیرت ہوئی کہ ان تمام جانوروں اور چیزوں کا حال اور ان کی تصویر گذشتہ زمانہ میں کیسے حاصل ہوئی۔ جبکہ اس ترقی کے دور میں بھی ان کا ملنا بے حد مشکل ہے اور کتاب پر کاتب کا نام اور سنہ وغیرہ درج نہیں تھا۔ بھوج پتر پر تقریباً پانچ ہزار سال پرانی تحریریں دیکھیں، اشوک کے دور کا ایک سنگین کتبہ بھی دیکھا تھوڑے وقت میں جو دیکھ سکا غنیمت تھا۔

سوسائٹی میں مولانا معصومی کے دو اہل علم دوستوں کے ساتھ عصر اور مغرب کی نماز پڑھی۔ یہ دونوں حضرات اسی میں شعبۂ عربی و فارسی کے انچارج ہیں، نہایت علم دوست خلیق اور ملنسار ہیں، اسی میں چائے نوشی بھی ہوئی۔ مغرب کے بعد یہاں سے واپسی پر مولانا معصومی کی قیامگاہ پر حاضری ہوئی، وہاں مجلہ العربی علی گڑھ کا ضخیم نمبر دیکھا

جو مشہور عربی کے ادیب و محقق مولانا عبدالعزیز میمنی راجکوٹی کی خدمات و حالات پر مشتمل تھا اس میں مولانا معصومی صاحب کا عربی زبان میں ایک نہایت فصیح و بلیغ اور طویل قصیدہ تھا جس میں مولانا نے میمنی صاحب کے ہمدرس اصحاب علم کا تذکرہ کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مشہور ادیب و شاعر شیخ محمد طیب مکی متوفی ۱۳۲۴ھ معلم مدرسہ عالیہ رامپور کے تلامذہ میں میمنی کے زملاء میں راقم کے نانا مولانا احمد حسین صاحب رسول پوری متوفی ۱۳۵۹ھ اور مولانا ظفر الدین صاحب بہاری بھی تھے اور یہ تینوں حضرات اپنے اپنے فن میں باکمال ہوئے۔ مولانا میمنی نے عربی زبان کے ادیب و محقق کی حیثیت سے وہ شہرت و ناموری پائی کہ عرب ادبا فخریہ ان کو اپنا استاذ تسلیم کرتے ہیں۔ مولانا ظفر الدین صاحب نے صحیح البخاری کے وزن پر صحیح البہاری تصنیف کی اور راقم کے نانا تدریسی و تصنیفی خدمات انجام دینے کے ساتھ عربی زبان کے صاحب دیوان شاعر ہوئے ہیں نے ان کے عربی اشعار و قصائد کو دیوان احمد کے نام سے ۱۳۷۷ھ میں شائع کیا ہے، بعض قصائد پر مولانا شیخ محمد طیب عرب مکی صاحب کی تصحیح اور دستخط ہے۔ نانا مرحوم کے تلامذہ میں مولانا ابو محفوظ الکریم معصومی کے بڑے بھائی مولانا ڈاکٹر صغیر حسن معصومی ایم۔اے، ڈی فل (آکسن) سابق صدر شعبہ عربی ڈھاکہ یونیورسٹی و اسلام آباد یونیورسٹی مقیم پاکستان بھی ہیں جن سے راقم کی ملاقات کچھ دنوں پہلے اسلام آباد میں ہوئی تھی اور ان کے چھوٹے بھائی سے اب ملاقات ہوئی ــــــ مولانا معصومی نے مجھے اپنا عربی زبان کا ایک مطبوعہ مقالہ دیا جس میں علامہ محمد مرتضیٰ حسینی بلگرامی زبیدی کے دو نایاب عربی رسالے "آداب الطریقۃ النقشبندیہ" منظوم کی تصحیح و تعلیق ہے اور اس مناسبت سے علامہ زبیدی بلگرامی کے حالات نہایت تحقیق و تدقیق کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ یہ مقالہ بڑے سائز کے ۸۷ صفحات میں ہے۔

چند سال ہوئے رسالہ "برہان" دہلی میں ایک صاحب نے علامہ زبیدی کے حالات نہایت کریہہ انداز میں پیش کئے تھے۔ نیز آجکل بعض عرب فضلاء علامہ زبیدی کو بلگرامی کے بجائے یمنی اور عربی ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ اس مقالہ سے ان دونوں غلطیوں کی تصحیح ہو جاتی ہے۔

قیام کلکتہ کے دوران ایک دن عصر کی نماز کے بعد مولانا ابو سلمہ شفیع احمد صاحب کی تعمیر کردہ مسجد میں مصلیوں کو خطاب بھی کیا۔ یہ مسجد نہایت وسیع و عریض اور حسین و جمیل ہے۔ بالائی حصہ زیر تعمیر ہے اور کام جاری ہے۔

مولانا عبد اللہ حسان اعظمی

مولانا مودودی کی تحقیق حدیث دجّال پر ایک نظر

مولانا کی تحقیق

حدیث تابیر نخل[1] سے استدلال مولانا نے اپنے مدعا کے تحت بعض احادیث دجال کو قیاسی ثابت کرنے کیلئے منکرین حدیث کی طرح حدیث تابیر نخل کو بھی مثال میں پیش کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

"اس اصولی حقیقت کو تابیر نخل والی حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود واضح فرما چکے ہیں"

حیرت ہے کہ مولانا تابیر نخل سے استدلال کرتے ہیں حالانکہ حدیث تابیر نخل میں اور

---

[1] رافع بن خدیج رضی اللہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے تو اس وقت لوگوں کی (قدیم زمانے سے) عادت یہ تھی کہ وہ اپنے کھجوروں کے درختوں کی "تابیر" کیا کرتے تھے (یعنی مذکر نخل کا خوشہ لے کر مؤنث کے ساتھ ملا دیتے تھے، اس سے پھل بہت کثرت سے آتا) آپ نے پوچھا ایسا کیوں کرتے ہو انھوں نے عرض کیا (پھلوں میں زیادتی کے لئے) "ہم یہ کام پہلے سے کرتے آئے ہیں، آپ نے فرمایا اگر اب نہ کرو تو شاید بہتر ہو، یہ سن کر لوگوں نے تابیر کرنا چھوڑ دیا، پھل کم آنے لگے، اس پر لوگوں نے آپ کی خدمت میں عرض کیا، آپ نے فرمایا دیکھو میں بشر ہوں، جب تمھیں تمھارے دین کے بارے میں کسی بات کا حکم دوں تو فوراً بلا پس و پیش اختیار کر لو اور جب (دنیا کے معاملات میں) کوئی بات اپنی رائے سے کہوں تو میں صرف ایک بشر ہوں (مسلم) دوسری حدیث میں ہے اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاَمْرِ دُنْیَاکُمْ اپنی دنیوی زندگی کو تم خود بہتر جانتے ہو (ترجمان السنہ حصہ اول ص ۲۲۱ و ۲۲۲ بحوالہ مسلم)

دجال کے متعلق دی ہوئی خبروں میں قیاس مع الفارق ہے۔

اول یہ کہ تابیر نخلہ ایک ایسا واقعہ ہے جس کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے ہی احتمالی لفظ لعل (شاید) فرما دیا تھا اور ظن کا لفظ بھی استعمال فرمایا ہے (ما اظن یعنی ذلک شیئاً) (فانی انما ظننت ظنا) مگر دجال کے زمان و مکان وغیرہ سے متعلق کسی بھی حدیث میں حضورؐ نے اس طرح کے الفاظ نہیں فرمائے۔

دوم یہ کہ حدیث تابیر نخلہ دنیاوی امور اور مشوروں کی قبیل سے ہے اور دجال کے متعلق خبریں مشورہ نہیں بلکہ دینی امور سے ہیں جن کے اتباع کی تاکید خود تابیر نخل والی حدیث ہی میں موجود ہے کہ اِذَا اَمَرْتُکُمْ بِشَیْءٍ مِنْ اَمْرِ دِیْنِکُمْ فَخُذُوْا بِہٖ ـــــ نیز دجال کے متعلق حدیثیں اخبار غیب میں سے ہے جن کا منجانب اللہ ہونا یقینی ہے کیونکہ غیب کی خبریں انبیاء علیہم السلام اپنے قیاس و گمان سے نہیں دیتے ایسی جسارت کاہن ہی کرتے ہیں (دیکھئے نبوت اور کہانت کا فرق ص ـــ)

سوم یہ کہ تابیر نخلہ سبب ہی تو ہے لہذا اسکے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا وہ حقیقت میں غلط بھی نہیں، سوال ہے کہ کیا تابیر نخل پھل لانے میں بذات خود مؤثر ہے؟ اگر نہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا غلط فرمایا۔

حضرت سلمان فارسیؓ ایک یہودی کے غلام تھے، یہودی کسی طرح اس شرط پر ان کو آزاد کرنے کیلئے راضی ہوا کہ وہ چالیس اوقیہ سونا دیں، نیز تین پودے کھجور کے لگا کر اس کی مرمت اور دیکھ بھال کریں جب ان پر پھل آجائے تو آزاد کر دیئے جائیں گے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو ترغیب دی سب نے مال اور دو دو، چار چار پودے جمع کر دیئے آپ نے اپنے دست مبارک سے ان پودوں کو لگایا، خدا کی قدرت کہ وہ پودے اسی سال پھل لے آئے اور سلمان فارسیؓ آزاد ہو گئے (کذا فی اشاعت اسلام ص ۳۰ اثر خامہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ ناظم دارالعلوم دیوبند) تو جنھوں نے قدرت کا یہ مشاہدہ کیا ہو

کہ آج کا لگایا ہوا پودا اسی سال پھل دیدے ان کو اس بات کا کیوں نہ یقین ہوگا کہ اگر قدرت چاہے تو بلا تابیر کے بھی کثرت سے پھل آسکتے ہیں تابیر نخل بذات خود مؤثر نہیں۔

شیخ عبدالعزیز دباغ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کیفیت مشاہدہ کے سلسلے میں ضمناً اس حدیث (تابیر نخل) پر بھی گذرگئے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کو کائنات عالم کے ہر ہر ذرہ میں قدرت کی کارفرمائی کا ایسا مشاہدہ حاصل ہوتا ہے کہ پھر مسببات کا اپنے اسباب کے ساتھ ارتباط صرف برائے بیت نظر آنے لگتا ہے، یہ یقین ومشاہدہ ان پر ہمہ وقت مستولی رہتا ہے اس لئے وہ عالم کی ہر حرکت وسکون کو حقیقی کارساز حق تعالیٰ ہی کو دیکھتے ہیں اور اس یقین کے ساتھ دیکھتے ہیں جیسا کہ ہم اسباب کو، ایک مومن کو بھی انبیاء علیہم السلام کے طفیل میں اس نوع کا مشاہدہ نصیب ہوجاتا ہے مگر نہ وہ اتنا قوی ہوتا ہے اور نہ دائم، آخر بہت جلد اس پر غفلت طاری ہوجاتی ہے پھر اسے اپنی طبعی کشش کے مطابق اسباب ہی کی کارفرمائی نظر آنے لگتی ہے جس پر پہلا مشاہدہ غالب ہوتا ہے وہ بیشک اسباب کی ضعیف کڑیوں کو کوئی اہمیت نہیں دیگا قدرت بھی اس کے مشاہدہ ویقین کے مطابق اس کے ساتھ معاملہ کرے گی لیکن جس پر یہ مشاہدہ غالب نہیں وہ اسباب ہی کو دیکھ رہا ہے۔ وہ اپنے مشاہدہ کے مطابق اس سے معاملہ کرتی ہے ــــ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پہلے مقام میں تھے اس لئے آپ نے جو فرمایا درست فرمایا تھا لیکن صحابہ کرام پر چونکہ اس مشاہدہ کا غلبہ نہ تھا اس لئے انھیں اس درجہ کا جزم ویقین بھی حاصل نہ تھا، قدرت نے بھی ان کے ساتھ ان کے اندازۂ یقین کے مطابق معاملہ کیا اور آخر درختوں پر پھل کم آیا، اگر وہ یقین کے اسی درجہ پر آجاتے تو تابیر کئے بغیر بھی پھل کم نہ ہوتا، آپ نے یہ محسوس کرکے کہ اس مشاہدہ پر دوام ان کے لئے مشکل

ہے، جاذب طبعی انھیں اسباب کی طرف ہی مائل کرتا رہے گا انھیں معذور سمجھا اور فرمایا کہ اچھا تو تم اپنی دنیا کو بہتر جانتے ہو (ماخوذ از ترجمان السنہ حصہ اول ص۲۴۲)

چہارم یہ کہ یہ مذکورہ بالا توجیہ مولانا کو پسند نہ ہو، نہ سہی یہ تو مسلم ہے کہ یہاں جو کچھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ صحابہ کے ایک فعل پر آپ کا ایک مشورہ تھا۔ (منصب رسالت ص۳۶۳)

اور مشاورت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف تدابیر کے معاملے میں کی ہے (ص۹۳، ص۱۴۴) اور دجال کا معاملہ تدابیر کے قبیل سے نہیں ہے، پس اس کو حدیث تابیر نخل پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق نہیں تو اور کیا ہے؟

ایک سوال و جواب

ڈاکٹر عبدالودود صاحب کی ایک گرفت اور اس پر مولانا کا جواب ملاحظہ ہو، ڈاکٹر صاحب مولانا کو لکھتے ہیں کہ

• آپ نے زیر نظر خط و کتابت میں اس سلسلے میں یہ لکھا ہے کہ حضورؐ نے مشاورت صرف تدابیر کے معاملے میں کی ہے آپ اس سے پہلے لکھ چکے ہیں کہ حضورؐ نے اپنی تئیس سالہ نبوت کی زندگی میں جو کچھ کہا یا کیا وہ سب وحی کی بنا پر تھا اور اب آپ تدابیر کو اس سے خارج کر رہے ہیں (منصب رسالت ص۱۸۷)

اس پر مولانا فرماتے ہیں کہ

اس ساری بحث کا جواب یہ ہے کہ جن معاملات میں بھی اللہ تعالیٰ وحی متلو یا غیر متلو کے ذریعہ سے حضورؐ کی رہنمائی نہ کرتا تھا ان میں اللہ تعالیٰ ہی کی دی ہوئی تعلیم کے مطابق حضورؐ یہ سمجھتے تھے کہ اسے انسانی رائے پر چھوڑا گیا ہے اور ایسے معاملات میں آپ اپنے اصحاب سے مشورہ کر کے فیصلے فرماتے تھے اس سے مقصود یہ تھا کہ حضورؐ کے ذریعہ سے لوگوں کو اسلامی طریق مشاورت کی تربیت دیدی جائے، مسلمانوں کو اس طرح کی تربیت دینا خود فرائض رسالت

ہی کا ایک حصہ تھا۔ (منصب رسالت ص۱۷۴ حاشیہ ۴۰)

مشورہ اور حکم اس میں خط کشیدہ عبارت کے پیش نظر میں بھی کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ تابیر نخل میں بھی تو صحابہ کے ایک فعل پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مشورہ ہی تھا جس پر لفظ "لعل" اور "ما اظن" دال ہے اور اس سے بھی طریق مشاورت کی تربیت ہی مقصود تھی، یہ مشورہ کی تربیت ہی تھی کہ حضرت بریرہؓ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بات کہی، حضرت بریرہؓ مشورہ کی تربیت یافتہ تھیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا "یہ مشورہ ہے یا حکم؟" حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ حکم نہیں ہے، مشورہ ہے" تو انھوں نے یہ سمجھ کر کہ مشورہ اگرچہ سرراہ کا ہو اور صائب بھی ہو پھر بھی اس پر عمل ضروری نہیں ہے، اپنی مرضی پر عمل کیا، اسی طرح جنگ احد میں مشورہ ہوا کچھ اکابر صحابہ اور خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مشورہ مدینہ سے نکلنے کا نہ تھا مگر چونکہ یہ مشورہ تھا اور صحابہ طریق مشاورت سے تربیت یافتہ تھے جانتے تھے کہ مشورہ میں رائے صائب ہوتے ہوئے بھی اس پر عمل ضروری نہیں ہے اس لئے صحابہ کی اکثریت نے باہر نکل کر جنگ کرنے کا مشورہ دیا اور اسی پر عمل ہوا۔

تابیر نخل میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مشورہ ہی دیا تھا مگر یہاں تابیر کرنے والوں نے اس کو حکم سمجھ لیا اور حکم ہی کی حیثیت سے اس پر عمل کیا چونکہ انھوں نے باوجود حدیث میں "لعل" اور "ما اظن" فرمائے جانے کے مشورہ کو حکم سمجھ لیا تھا اور یہ ان کی سمجھ کا فرق تھا اس لئے ان کو تنبیہ ضروری ہوئی اور اس کی صورت منجانب اللہ یہ ہوئی کہ پھل کم آیا اور اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشورہ اور حکم کی حقیقت کی پورے طور پر وضاحت فرمائی اور بتایا کہ "جب میں تمھیں تمھارے دین کے بارے میں کسی بات کا حکم دوں اسے تو فوراً بلا پس وپیش اختیار کر لو اور جب دنیا کے کسی معاملہ میں کوئی بات اپنی رائے سے کہوں تو میں صرف ایک بشر ہوں، اپنی دنیوی زندگی کو تم خود بہتر جانتے ہو وغیرہ

حقیقت مشاورت کو واضح کرنے والی اور امت کو اس کی تربیت دینے والی حدیث تابیرنخل سے بڑھ کر اور کون سی حدیث ہو سکتی تھی جس میں مشورہ کو حکم سمجھ لیا گیا جس پر تنبیہ ہوئی اور مشورہ اور حکم کا فرق سمجھایا گیا پس اس حدیث کو اس مقصد کے لئے چن لیا گیا۔ اور یہ باب باندھا گیا کہ

باب وجوب امتثال ما قالہ شرعا دون ما ذکرہ صلی اللہ علیہ وسلم من معایش الدنیا علی سبیل الرای (یعنی باب اس بیان میں کہ واجب صرف ان ارشادات کی پیروی ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شرعی حیثیت سے فرمائے ہیں نہ کہ ان باتوں کی جو دنیا کے معاملات میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی رائے کے طور پر بیان فرمائی ہیں)

یہ باب باندھنے کا یہ مقصد نہیں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر وہ بات جو اپنی رائے سے فرمائی وہ (نعوذ باللہ) غلط تھی جس کی وجہ سے اس کا امتثال ضروری نہیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ مشورہ کے باب میں رائے کا صائب ہونا تو اپنی جگہ ہے صائب ہونے پر بھی اس کا امتثال ضروری نہیں ہے، اس پر عمل کرنا اور نہ کرنا دونوں مساوی ہیں امت کو کسی ایک کے اختیار کرنے کا حق باقی ہے[1] ورنہ کیا وجہ ہے کہ اس باب کے ذیل میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تئیس سالہ زندگی میں سے دوسرے معاملات کی کوئی بھی حدیث نہیں لائی گئی، اگر لائی گئی تو صرف ایک حدیث تابیر نخل۔

مولانا سے سوال | اتمام حجت کے لئے آخر میں مولانا سے سوال ہے کہ آنجناب نے اپنی تحقیق میں جو حدیث تابیر نخل کو پیش کر کے اس سے

---

[1] اور یہ حق اسی وقت تک باقی ہے جب کہ وہ بات جزماً نہ فرمائی گئی ہو ورنہ جزماً فرما دینے کے بعد اس کا امتثال اور اس پر عمل ہی واجب ہو جاتا ہے جیسا کہ سورۂ احزاب کی آیت ۳۶ سے معلوم ہوا (دیکھئے تفسیر بیان القرآن یا کتاب ہذا ـــــ)

دجال کی حدیثوں کو قیاسی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کیا اس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جس ارشاد یا جس پیشین گوئی کو جی چاہے اس کو حدیث تابیر نخل پر قیاس کرکے اور اس کی مثال دے کر جھٹلایا یا غلط ٹھہرایا یا کم از کم شک ہی کی نگاہ سے دیکھا جاسکتا ہے؟۔

اگر مولانا کا جواب اثبات میں ہو تو منکرین حدیث اور مولانا میں فرق ہی کیا رہ جاتا ہے اور اس صورت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کون سا ارشاد یا کون سی پیشین گوئی شکوک سے پاک، غیر قیاسی اور بربنائے وحی کہی جاسکتی ہے؟ اور منکرین حدیث کے اس طرح کے استدلال کا مولانا، منصب رسالت کے مصنف کے پاس کیا جواب رہ جائیگا؟

اور اگر مولانا کا جواب نفی میں ہو اور منصب رسالت لکھنے کے بعد نفی میں ہونا بھی چاہئے تو پھر عرض ہے کہ تحقیق میں تابیر نخل کی مثال کیوں دی گئی؟ اور دینی اور غیبی امور سے متعلق حدیثوں کو دنیاوی امور پر قیاس کیوں کیا گیا۔؟

خود مولانا کا ایک بیان

منکرین حدیث احادیث رسول کو رد کرنے کیلئے حدیث تابیر نخل سے جو استدلال کرتے ہیں اس کے جواب میں مولانا منصب رسالت میں رقم طراز ہیں کہ

"ان میں سے پہلی دلیل خود اس حدیث ہی سے ٹوٹ جاتی ہے جس کا حوالہ انھوں نے دیا ہے۔ اس میں واقعہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ حضورؐ نے اہل مدینہ کو کھجوروں کی باغبانی کے معاملے میں ایک مشورہ دیا تھا جس پر عمل کیا گیا تو پیداوار کم ہوگئی اس پر آپ نے فرمایا کہ "میں جب تمھارے دین کے معاملے میں تمھیں کوئی حکم دوں تو اس کی پیروی کرو اور جب اپنی رائے سے کچھ کہوں تو میں بس ایک بشر ہی ہوں"۔ اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ جن معاملات کو دین اسلام نے اپنے دائرہ رہنمائی میں لیا ہے ان میں تو حضورؐ کے

ارشاد گرامی کی پیروی لازم ہے، البتہ جن معاملات کو دین نے اپنے دائرے میں نہیں لیا ہے ان میں آپ کی رائے واجب الاتباع نہیں ہے، اب ہر شخص خود دیکھ سکتا ہے کہ دین نے کن معاملات کو اپنے دائرے میں لیا ہے اور کن کو نہیں لیا۔ ظاہر ہے کہ لوگوں کو باغبانی یا درزی کا کام یا باورچی کا کام سکھانا دین نے اپنے ذمہ نہیں لیا ہے، لیکن خود قرآن ہی اس بات پر شاہد ہے کہ دیوانی اور فوجداری قوانین عائلی قوانین، معاشی قوانین، اور اسی طرح اجتماعی زندگی کے تمام معاملات کے متعلق احکام و قوانین بیان کرنے کو دین اسلام نے اپنے دائرۂ عمل میں لیا ہے، ان امور کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات کو رد کر دینے کے لئے مذکورہ بالا حدیث کو دلیل کیسے بنایا جا سکتا ہے۔ (منصب رسالت ص۳۶۳ تا ص۳۶۴)

(عدالت عالیہ مغربی پاکستان کا ایک اہم فیصلہ" پر مولانا مودودی صاحب کا تبصرہ)

مولانا کے اس اعتراف کے بعد جو خط کشیدہ عبارت سے عیاں ہے ہم عرض کریں گے کہ دجال سے متعلق حدیثوں کو بھی رد کرنے کے لئے حدیثِ تابیرِ نخل کو دلیل کیسے بنایا جا سکتا ہے اور کیسے آپ نے بنایا جب کہ وہ حدیثیں دینی امور اور اخبارِ غیب پر مبنی ہیں۔

دارالعلوم دیوبند کا ترجمان
ماہنامہ
دارالعلوم دیوبند
ماہ رمضان المبارک سنہ ۱۴۰۸ھ مطابق مئی سنہ ۱۹۸۸ء
جلد نمبر ۷۲
شمارہ نمبر
فی شمارہ چار روپے
سالانہ چالیس روپے
نگران
حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب
مہتمم دارالعلوم دیوبند
مدیر
مولانا حبیب الرحمن قاسمی
سالانہ بدل اشتراک بیرون ممالک سے
سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ کا سالانہ 160/
پاکستان سے =/70
بنگلہ دیش سے (ہندوستانی) =/50
سرخ نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ کا زر تعاون ختم ہوگیا ہے

فہرست مضامین

ہندوستانی و پاکستانی خریداروں سے ضروری گذارش

(۱) ہندوستانی خریداروں سے ضروری گذارش یہ ہے کہ ختم خریداری کی اطلاع پاکر اول فرصت میں اپنا چندہ نمبر خریداری کے حوالہ کے ساتھ منی آرڈر سے روانہ کریں۔

(۲) پاکستانی خریدار اپنا چندہ مبلغ -/۷۰ مولانا عبدالستار صاحب مہتمم جامعہ عربیہ محمودیہ داؤد والا براہ شجاع آباد ملتان، پاکستان کو بھیجدیں

(۳) خریدار حضرات پتہ پر درج شدہ نمبر محفوظ فرمالیں، خط و کتابت کے وقت خریداری نمبر ضرور لکھیں۔

دارالسلام

منیجر

حرفِ آغاز

حبیب الرحمٰن القاسمی

۱۸۵۷ء کی تیز و تند سیاسی آندھی نے جب ہندوستان میں صدیوں سے روشن اسلامی سلطنت کے چراغ کو گل کر دیا اور سرزمین ہند پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا اقتدار قائم ہو گیا تو اس عہد کے اہل دل علماء نے اپنی بصیرت سے مستقبل کے اس عظیم الحادی فتنہ کو دیکھ لیا جو اس سیاسی اور مادی انحطاط کے پس پردہ برق رفتاری کے ساتھ ملتِ اسلامیہ کی جانب بڑھتا چلا آ رہا تھا وہ اپنی فراست ایمانی سے یہ سمجھ رہے تھے کہ اس سیلاب بلاخیز کے آگے بند نہیں باندھا گیا اور اس کے رُخ کو پھیرنے کی کوشش نہیں کی گئی تو اسلامی عقائد و افکار اور دینی اخلاق و کردار اس طوفان کی موجوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائیں گے اور وہ مسلم معاشرہ جو صدیوں کی سعی پیہم اور انہتمک کوششوں کے بعد وجود میں آیا ہے تشتت و انتشار کی نذر ہو جائے گا۔

ان حضرات نے اپنے تجربہ کی بنیاد پر یہ فیصلہ کیا کہ اس ایمان سوز فتنہ کا مقابلہ جو ایک زبردست اور مستحکم سلطنت کے زیرِ سایہ پروان چڑھ رہا ہے طاقت و قوت سے نہیں کیا جا سکتا اس لئے ان اللہ کے بندوں نے تحفظ دین اور بقائے ملت کی اس جنگ میں آہنی اور آتشین اسلحہ کے بجائے علم و للّٰہیت کے ہتھیاروں سے کام لینے کا فیصلہ کیا چنانچہ اسباب و ذرائع سے یکسر محرومی کے عالم میں اللہ کے اعتماد اور بھروسہ پر الحاد و زندقہ کے اس بادِ صرصر کے بالمقابل قصبہ دیوبند میں علم و عرفان کا ایک چراغ روشن کر دیا۔ ہندوستان میں تحفظ دین کی اسی اولین کوشش کا مظہر جمیل "دارالعلوم دیوبند" ہے جس کا آغاز انتہائی نامساعد حالات میں محض اللہ کے اعتماد پر ہوا تھا، پھر اسی قندیل معلق اور چراغ توکل سے مسلسل چراغ روشن ہوتے گئے یہاں تک کہ علم و نور کا یہ سلسلہ پھیلتے پھیلتے

پورے برصغیر پر چھا گیا، اور اس کی ضیا پاش کرنوں نے مسیحی مشنری کی برپا کی ہوئی ظلمتوں کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔ اور اسلامیان ہند کو ایک ایسے مہیب اور خطرناک فتنے سے بچا لیا جس سے اس کا تشخص وامتیاز ہی نہیں وجود خطرے میں پڑ گیا تھا۔

یہ واقعہ ہے کہ اگر ۱۸۵۷ء کے بعد دارالعلوم دیوبند ایک تحریک بن کر نمودار نہ ہوا ہوتا تو شاید برصغیر میں اسلام کی صورت یا تو مسخ و محرف ہو چکی ہوتی یا اس کا نام و نشان مٹ گیا ہوتا دارالعلوم کا یہی ایک کارنامہ نہیں ہے کہ اس نے برٹش امپائر میں برپا الحاد و اسلام کے معرکہ میں قیادت کا کردار ادا کیا ہے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اسلامی تہذیب و اقدار اور اسلام کی مقدس شخصیتوں کے خلاف برصغیر میں جتنی تحریکیں بھی وجود میں آئی ہیں خواہ وہ مسیحیت کے نام سے آئی ہوں یا شدھی وسنگھٹن کے عنوان سے، چاہے وہ قادیانیت وبہائیت کا لبادہ اوڑھ کر میدان میں آئی ہوں یا رافضیت، رضاخانیت اور مودودیت کے لباس میں اسلام کے چہرے کو مسخ کرنے کے درپے ہوئی ہوں، دارالعلوم دیوبند نے ایسی ہر باطل اور گمراہ تحریکوں کا آگے بڑھ کر مقابلہ کیا ہے اور اسلام کی صحیح ترجمانی کا حق ادا کرکے دین کے تحفظ کی اہم ترین خدمت انجام دی ہے۔

ان دفاعی جدوجہد کے ساتھ دارالعلوم دیوبند نے اپنی ایک سو پچیس سالہ زندگی میں ہزاروں ایسے افراد پیدا کئے جنھوں نے تعلیم دین، تزکیۂ اخلاق، تصنیف، افتاء، صحافت، خطابت، تذکیر، تبلیغ، مناظرہ، حکمت، طب وغیرہ فنون علم میں بیش بہا خدمات انجام دیں پھر ان خدمات کا دائرہ کسی خاص خطہ میں محدود نہیں ہے بلکہ برصغیر کے ہر گوشہ اور دیگر بلاد بعیدہ کے ہر ہر حصہ میں پہنچ کر انھوں نے دین خالص کا پیغام پہنچایا، خلق خدا کو جہل کی تاریکی سے نکال کر نور علم کی دولت سے ممتاز کیا، اور تحفظ دین کی تحریک کو آگے بڑھایا، اور دینی وعلمی موضوعات پر لٹریچر کا ایسا عظیم الشان ذخیرہ تیار کر دیا کہ بغداد و قرطبہ کی علمی سرگرمیوں کی یاد تازہ ہو گئی۔

چنانچہ مولانا محمد الحسنی لکھتے ہیں:-

اس حقیقت سے کوئی ہوشمند اور منصف انسان انکار نہیں کرسکتا کہ دارالعلوم دیوبند کے فضلاء نے ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پھیل کر دین خالص کی جس طرح حفاظت کی ہے اور اس کو بدعت تحریف اور تاویل سے محفوظ رکھا ہے اس میں ہندوستان میں اسلامی زندگی کے قیام و بقاء واستحکام میں بیش بہا مدد ملی ہے اور آج جو صحیح اسلامی عقائد، دینی علوم، اہل دین کی وقعت اور صحیح روحانیت اس ملک میں نظر آتی ہے اس میں بلاشبہ اس کا نمایاں اور بنیادی حصہ ہے (پیام مدرہ)

دارالعلوم دیوبند کا یہ امتیاز بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ عوامی چندہ سے تعلیمی نظام چلانے کا طریقہ اسی کا ایجاد کردہ ہے، دارالعلوم کے قیام سے پہلے برصغیر میں جتنے دینی ادارے تھے ان کا وجود وبقا حکومت یا امراء و رؤسا کی داد و دہش کا مرہون منت ہوتا تھا ان مدارس کا عوام سے براہ راست کوئی ربط نہیں ہوا کرتا تھا یہی وجہ ہے کہ اسلامی حکومت کے ختم ہوتے ہی جون پور، لکھنؤ، دہلی وغیرہ کی علمی انجمنیں اُجڑ گئیں، علماء وطلبہ نان شبینہ کے محتاج ہو کر کسب معاش کیلئے اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے، اس کے برخلاف دارالعلوم نے کبھی کسی حکومت یا ریاست کے در پر جبہ سائی کو پسند نہیں کیا بلکہ اس نے اپنا سرمایۂ حیات توکل علی اللہ اور خدا کے صالح بندوں کے مخیرانہ جذبات کو قرار دیا، اور آج تک وہ اپنے اس امتیازی کردار پر پامردی اور مضبوطی کے ساتھ قائم ہے اور ایک نہیں متعدد بار حکومت وقت کے عظیم عطیات کو شکریہ کے ساتھ رد کر چکا ہے۔

برصغیر کو غلامی کی لعنت سے نجات دلانے میں بھی دارالعلوم کا بنیادی کردار رہا ہے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ برادرانِ وطن کے دلوں میں آزادیٔ کامل کا جذبہ پیدا کرنے والے اکابر دارالعلوم اور اسکے فضلاء ہی ہیں، اس سلسلے میں حضرت شیخ الہندؒ اور ان کے تلامذہ حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، حضرت مولانا عبید اللہ سندھی، حضرت

مولانا منصور انصاری حضرت مولانا عزیر گل، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی وغیرہ کی جدوجہد اور مساعی جمیلہ سے کون انکار کرسکتا ہے۔

مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن، مولانا محمد میاں دیوبندی، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی وغیرہ دارالعلوم دیوبند ہی کے سپوت تھے جنھوں نے آزادئ وطن کی خاطر لاٹھیاں کھائیں اور قید وبند کی صعوبتیں برداشت کیں اور اس وقت تک چین سے نہیں رہے جب تک کہ ملک کے چپے چپے کو غاصب انگریزوں کے پنجے سے چھڑا نہیں لیا۔

غرضیکہ دارالعلوم دیوبند نے کتاب و سنت کی اشاعت، اسلامی تہذیب وثقافت کے بقا وتحفظ، اور مذہبی وسیاسی فتنوں سے ملت اسلامیہ کو خبردار رکھنے میں جو ہمہ گیر وحیرت انگیز کارنامہ انجام دیا ہے وہ مدارس اسلامیہ کی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔

دارالعلوم دیوبند کی انھیں مساعی جمیلہ کا یہ اثر ہے کہ آج برصغیر میں اسلام کا قدم دیگر بلاد اسلامیہ کے مقابلہ میں زیادہ مستحکم ہے، مسجدیں آباد ہیں، اسلامی علوم وفنون کے چرچے ہیں اور دینی مدارس کا پورے ملک میں اس طرح جال پھیلا ہوا ہے کہ عالم اسلام کے علماء انھیں دیکھ کر حیرت زدہ رہ جاتے ہیں۔

خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ دارالعلوم اپنی ان تمام خصوصیات کے ساتھ آج بھی کتاب وسنت اور تحفظ دین کی کوششوں میں مصروف ہے، اب یہ ملت اسلامیہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ علم وعرفان کے اس مرکز کو مضبوط سے مضبوط تر بنانے میں پوری سیر چشمی فراخ دلی اور حوصلہ مندی کے ساتھ حصہ لے تاکہ اکابر کی جدوجہد کا یہ مرکز اولین اپنے منصوبے کے مطابق اطمینان وسکون کے ساتھ قوم وملت کی تعمیر وترقی میں ماضی کی طرح مصروفِ عمل رہے۔

اسلام اور ازدواجی زندگی

نکاح وطلاق اسلامی تعلیمات کی روشنی میں

از ـــــــــــ مولانا محمد طلحہ بخاری، آرہ بہار۔

زیر نظر مضمون میں جیسا کہ عنوان میں ہے قرآن وحدیث کی روشنی میں ازدواجی زندگی کی ایجابی وسلبی بلکہ ہر ممکن پہلو کو پیش کیا گیا ہے۔

یوں بھی غور کیا جائے تو دنیا میں دو ایسی چیزیں ہیں جو اس عالم کی بقا اور تعمیر و ترقی میں عمود، بنیادی کردار کا درجہ رکھتی ہیں، ایک عورت، دوسری دولت، لیکن تصویر کا دوسرا رخ دیکھا جائے تو یہی دونوں چیزیں دنیا میں فساد وخوں ریزی اور طرح طرح کے فتنوں کا سبب بھی ہیں، جبکہ یہ دونوں چیزیں دنیا کی تعمیر وترقی اور اس کی رونق کا ذریعہ ہیں۔ لیکن جب کہیں ان کے اصلی مقام اور موقف سے ادھر ادھر کر دیا جاتا ہے تو یہی چیزیں دنیا میں سب سے زیادہ مہلک بھی بن جاتی ہیں، قرآن نے انسان کو نظام زندگی دیا ہے اس میں ان دونوں چیزوں کو اپنے اپنے صحیح مقام پر رکھا گیا ہے تاکہ ان کے فوائد وثمرات زیادہ سے زیادہ حاصل ہوں، اور فتنہ وفساد کا نام نہ رہے۔

شریعت اسلام ایک مکمل اور پاکیزہ نظام حیات کا نام ہے، اس میں نکاح کو صرف ایک معاملہ یا معاہدہ نہیں بلکہ "النکاح من سنتی فمن رغب عن سنتی فلیس منی" کہہ کر "نکاح میری سنت ہے جو اس سنت سے اعراض کرتا ہے وہ ہم میں سے نہیں" ایک گونہ عبادت کی حیثیت بخشی ہے، جس میں خالق کائنات کی طرف سے انسانی فطرت میں

رکھے ہوئے شہوانی جذبات کی تسکین کا ایک مقرر کردہ حد اور ضابطے میں بہترین اور پاکیزہ سامان بھی ہے اور ازدواجی تعلقات سے جو عمرانی مسائل بقائے نسل اور تربیت اولاد کے متعلق ہیں ان کا بھی معتدلانہ اور حکیمانہ بہترین نظام موجود ہے۔

نکاح ایک عربی لفظ ہے، اس کا مادۂ اصلی ن، ک، ح ہے کہا جاتا ہے نکح المرأۃ عورت سے شادی کرنا و نکحہ المطر الارض بارش کا زمین میں جذب ہو جانا۔ نکح الدواء فلانا دوا کا کسی کے اندر اثر کرنا نکح النعاس عینہ آنکھوں میں نیند کا غالب آجانا یعنی کہ مشترک معنی ہے ایک کا دوسرے میں ضم ہو جانا ـــــــ چنانچہ شریعت نے اس من تن شدم تو جاں شدی کے مفہوم کو بلیغ اسلوب میں بیان کیا ہے کہ جس میں نکاح کے مفہوم کی بھی رعایت ہے اور نکاح سے شرعی مطلوب واقعی کا بھی بیان ہے، قرآن کا ارشاد ہے "هن لباس لكم وانتم لباس لهن" گویا جسم اور سایہ کے رشتہ کی تعبیر ہے کہ وہ عورتیں تمہارے لئے بطور لباس کے ہیں، اور تم ان کے لئے لباس کی مانند ہو۔ منافع مشترک ہو گئے، اتحاد باہمی اور خاندانی اشتراک کا عنوان بن گیا، چنانچہ زوجین میں محبت و مودت ایسی پیدا ہو جاتی ہے کہ اس سے پہلے اتنی محبت و مودت نہ دیکھی جاتی ہے اور نہ دیکھی گئی، اور کیوں نہ ہو، یہ تو اللہ کی قدرت کی نشانی ہے، اللہ کی رحمتوں میں سے یہ ایک آیت رحمت ہے اس کی غرض و غایت میں وحدت باہمی اور سکون باہمی ودیعت ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے ومن آیتہ ان خلقكم من انفسكم ازواجا لتسكنوا اليها وجعل بينكم مودة ورحمة" اللہ کی قدرت کی نشانیوں میں سے ہے کہ تمہارے جنس سے تمہارے جوڑوں کو پیدا کیا تاکہ تم ان سے سکون حاصل کر سکو اور تمہارے درمیان محبت و مودت پیدا ہو۔

عربی میں آیۃ قدرت کی نشانی کو کہتے ہیں کہ خدا ہی کر سکے کوئی دوسرا نہ کر سکے زمین، سورج، چاند کو بھی آیت کہا ہے، یہ رات اور اس کی تاریکی بھی ان کی ایک نشانی ہے

کہ ایسی تاریکی پھیلادی کہ مصنوعی ہنڈے، قمقمے لاکھوں کی تعداد میں جلے تو جلے لیکن رات بدستور قائم رہی اور ایک سورج کی آمد آمد ہوئی کہ رات غائب ہوئی، اسی طرح نکاح کو بھی قدرت کی نشانی کہا گیا ہے۔ ایجاب وقبول کے دو بول کے بعد جو انقلاب عظیم برپا ہو جاتا ہے یہ اللہ کے سوا کون کرسکتا ہے، ابھی اجنبیت تھی، ابھی یگانگت پیدا ہوگئی، ابھی بے تعلقی تھی منٹ بھی نہیں گذرا کہ تعلق پیدا ہوگیا، "نشانی آیت" کا یہی معنی ہے کہ دلوں میں روحوں میں انقلاب ہو جاتا ہے ـــــــ پھر ارشاد فرمایا کہ اس نعمت کی عظمت کہ یہ کتنی بڑی ہے غور وفکر کرنے والے ہی سمجھ سکتے ہیں۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ حبب الی من دنیاکم ثلاث " تمھاری دنیا میں سے تین چیزیں مجھے پسند ہیں، ان میں سے ایک چیز فرمائی کہ وہ عورت ہے اس لیے نہیں کہ معاذ اللہ شہوت رانی کا ذریعہ ہے بلکہ اس لئے کہ وہ تعلق ومحبت قائم ہونے کا ذریعہ ہے۔

ارشاد نبوی ہے کہ "تم میں سب سے زیادہ قابل تکریم مسلمان وہ ہے جس کے اخلاق پاکیزہ ہوں اور بیویوں کے ساتھ لطف ومحبت مدارات کا برتاؤ کرتا ہو، سخت گیر نہ ہو، تیز لب ولہجہ نہ ہو، ترش روئی نہ ہو، انسانیت ومحبت کا برتاؤ کرنا چاہیئے، یہی وجہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بعض اوقات ایسی چیزیں عمل میں لاتے تھے کہ جس سے محبت بڑھے، زمانۂ جاہلیت میں یہ دستور تھا کہ حیض کے دنوں میں عورت کے سایہ تک سے بچتے تھے ایک الگ کوٹھڑی میں بٹھادیتے، اچھوت کا معاملہ کیاجاتا کہ یہ عورت نجس ہوگئی - حدیث میں ہے کہ آپ ایسے دنوں میں بھی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ بیٹھ کر ایک برتن میں کھانا تناول فرماتے یہی نہیں بلکہ حضرت صدیقہ رض سے لقمے لیتے اور خود تناول فرمالیتے، ایک پیالہ میں پانی نوش فرماتے اور جہاں سے حضرت صدیقہؓ پانی پتیں اسی جگہ سے حضور بھی پیتے، تاکہ امت کو بتلادیں کہ عورت کی ذات میں کوئی نجاست نہیں آتی اس سے محبت

قطع کردینا اسے اچھوت قرار دینا یہ انسانیت کے خلاف ہے۔
شریعت کا مقصد یہ ہے کہ خاوند بیوی میں مدارات کا برتاؤ ہو اس سے خانگی زندگی بہتر بن جائیگی جس گھر کے اندر خاوند بیوی ایک دل ایک جان ہوں تو اولاد میں بھی محبت پیدا ہوگی، عزیزوں میں محبت پیدا ہوگی اور گھر جنت نشان تبھی بنے گا جبکہ ایک کو دیکھ کر دوسرا خوش ہو، حدیث میں ہے کہ آدمی کی خوش نصیبی اور سعادت کی تین علامتیں ہیں پہلا تو یہ کہ اس کا رزق اسی کے وطن میں ہو، دوسری علامت کہ اس کا گھر وسیع ہو، اور تیسری خوش نصیبی یہ ہے کہ ایسی نیک بخت بیوی ملے کہ جب اس کی صورت دیکھے تو دل کے اندر خوشی بھر جائے، جب اسے گھر پر چھوڑ کر چلا جائے تو مرد کی عزت و ناموس کی حفاظت کرے، اللہ اور خاوند کے حقوق کی ادائیگی کرتی ہو ـــــ واقعی وہ خوش نصیب ہے، اسے بڑی نعمت حاصل ہے بیوی اگر صالح ہو اور حسن و جمال بھی ہو تو یہ دونوں کی خوش نصیبی ہے کہ وہ اسے دیکھ کر خوش ہے اور وہ اس سے راضی ہے تو نکاح سے شریعت کا مقصود محبت باہمی ہے۔

اسلامی تعلیمات اور اصول کا اصل رخ یہ ہے کہ مرد و عورت میں اسلامی اصول کے مطابق ازدواجی زندگی قائم ہو تو وہ عمر بھر کیلئے پائیدار رشتہ ہو اس کے توڑنے اور ختم کرنے کی کبھی نوبت ہی نہ آئے کیونکہ اس معاملہ کے توڑنے ختم کرنے کا اثر صرف فریقین پر ہی نہیں پڑتا بلکہ نسل و اولاد کی تباہی و بربادی اور بعض اوقات خاندانوں اور قبیلوں میں فساد تک نوبت پہنچ جاتی ہے، کبھی تو جان و جائداد کے تلف، عزت و آبرو کی ہتک کا ذریعہ بن جاتی ہے پورا معاشرہ بری طرح متاثر ہوتا ہے، چونکہ ازدواجی معاملات کی درستگی ہی پر عام نسل انسانی کی درستگی موقوف ہے اسلئے قرآن کریم میں ان عائلی مسائل کو دوسرے تمام معاملات سے زیادہ اہمیت دی ہے، قرآن کریم کے مطالعہ سے عیاں ہے کہ دنیا کے عام معاشی مسائل میں سب سے اہم تجارت، شرکت

اجارہ وغیرہ میں، قرآن نے تو صرف ان کے اصول بتلانے پر اکتفا کیا ہے، ان کے فروعی مسائل قرآن میں شاذ و نادر ہیں، بخلاف نکاح و طلاق کے، ان کے صرف اصول بتانے پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ ان کے اکثر و بیشتر فروع جزئیات کو بھی براہ راست حق تعالیٰ نے قرآن میں نازل فرمایا ہے، یہ مسائل قرآن کی اکثر سورتوں میں متفرق اور سورۂ نسار میں کچھ زیادہ تفصیل سے آئے ہیں، دنیا کے ہر مذہب و ملت کے پیرو ہمیشہ سے اس پر متفق ہیں کہ نکاح اور ان کے معاملات کو ایک خاص مذہبی تقدس حاصل ہے اسی کی ہدایات کے تحت یہ کام سرانجام پانا چاہئے، اہل کتاب، یہود و نصاریٰ سینکڑوں تحریفات کے باوجود قدر مشترک بھی ان معاملات میں کچھ مذہبی حدود و قیود کے پابند ہیں، ان کی پابندی لازم سمجھتے ہیں، اور انھیں اصول و رسوم پر تمام مذاہب و فرقے کے عائلی قوانین چلتے ہیں۔

زوجین کی ازدواجی زندگی کے ہر معاملہ اور ہر حال کی جو ہدایتیں قرآن و سنت میں مذکور ہیں ان سب کا حاصل یہی ہے کہ یہ رشتہ زیادہ سے زیادہ مستحکم ہوتا چلا جائے اور ٹوٹنے نہ پائے، چنانچہ ان تعلق کی تلخیوں اور رنجشوں سے پاک وصاف رکھنے کی اور اگر کبھی پیدا بھی ہو جائے تو ان کے ازالہ کی پوری کوشش کی گئی ہے اور شریعت نے دونوں کو اپنے اپنے فرائض کا احساس دلاتے ہوئے مردوں سے کہا کہ عورت تیری باندی محکوم نہیں ہے وہ تو تیری برابر کی شریک زندگی ہے جو تیرا حق ہے وہی اس کا حق ہے تمھارے ہی جیسی انسان ہے ایک ہی جان سے پیدا ہوئی ہے، چنانچہ فرمایا گیا "عاشروھن بالمعروف" یعنی عورتوں کے ساتھ معروف طریقہ پر اچھا سلوک کرو اسی کے ساتھ یہ ارشاد فرمایا۔ ولھن مثل الذی علیھن بالمعروف کہ جس طرح عورتوں کے حقوق مردوں پر ہیں کہ جن کی ادائیگی ضروری ہے اسی طرح مردوں کے عورتوں پر حقوق ہیں کہ جن کی ادائیگی ضروری ہے۔

یہ آیت حقوق باہمی کی ادائیگی پر شرعی ضابطہ کی حیثیت رکھتی ہے، البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ مردوں کا درجہ عورتوں سے بڑھا ہوا ہے، ہر دو عورت میں درجہ کا تعلق دنیوی معاملات میں ہے آخرت کی فضیلت میں اس کا کوئی اثر نہیں، مردوں کی برتری جو عورتوں پر ہے تو محض آمریت استبداد کی حکومت کی نہیں بلکہ مرد بھی قانون شرع اور مشورہ کا پابند ہے، محض اپنی طبیعت کے تقاضہ سے کوئی کام نہیں کرسکتا اور پھر یہ ہے کہ دنیا میں اللہ نے خاص مصلحت و حکمت کے تحت ایک کو ایک پر بڑائی دی ہے کسی کو افضل کسی کو مفضول بنایا جیسے ایک خاص گھر کو اللہ نے بیت اللہ اور قبلہ قرار دیا، بیت المقدس کو خاص فضیلت دی اسی طرح مردوں کی حاکمیت بھی ایک خداداد فضیلت ہے کہ جس میں مردوں کی سعی و کوشش و عمل یا عورتوں کی کوتاہی و بے عملی کا کوئی دخل نہیں — مردوں کی افضلیت کے بیان کے لئے قرآن کریم کا عجیب اسلوب بیان ہے قرآن نے بعضہم علی بعض کے الفاظ اختیار کئے ہیں، اس اسلوب میں حکمت یہ ہے کہ عورتوں اور مردوں کو ایک دوسرے کا بعض اور جزء قرار دیکر اس طرف اشارہ کیا ہے کہ اگر کسی چیز میں مردوں کی برتری اور فوقیت ثابت ہوتی ہے تو بھی اس کی مثال ایسی ہے کہ انسان کا سر اس کے ہاتھ سے افضل ہے یا کہ انسان کا دل اس کے معدہ سے افضل ہے تو جس طرح سر کا ہاتھ سے افضل ہونا ہاتھ کے مقام اور اہمیت کو کم نہیں کرتا اسی طرح مرد کا حاکم ہونا عورت کے درجہ کو نہیں گھٹاتا کیونکہ یہ دونوں ایک دوسرے کیلئے مثل اعضاء و اجزاء کے ہیں گو مرد سر ہے تو عورت بدن ہے انسانی جسم اسی وقت خوش و خرم اور زندگی کا حقیقی سکون حاصل کرسکتا ہے جبکہ جسم کے سارے اعضا تندرست و توانا و صالح ہوں، نیک بیویاں مرد کی سعادت کی علامت ہیں، حدیث ہے کہ جو عورت اپنے شوہر کی تابعدار مطیع و فرمانبردار ہے اسکے لیے پرندے ہوا میں مچھلیاں دریا میں فرشتے آسمانوں میں درندے جنگلوں میں استغفا کی دعائیں کرتے ہیں، اسلئے کہ بیوی کی سرکشی و نافرمانی بڑے بڑے فتنہ کا پیش خیمہ بنتی ہیں

اور گھر جہنم کدہ بن جاتا ہے۔

شوہر و بیوی کے تعلقات انتہائی ذاتی ہوتے ہیں وہ فرشتے تو نہیں ہیں انسان ہی تو ہیں، بعض دفعہ خاوند ناخوش ہوجاتا ہے ڈانٹ ڈپٹ کردیتا ہے، بعض دفعہ بیوی بھی ناخوش ہوجاتی ہے اسے بھی ناز ہوتا ہے بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ خاوند بیوی میں جھڑپ ہوجاتی ہے، تو اس میں ہدایت یہ کی گئی ہے کہ عورت کی پیدائش آدم علیہ السلام کی سب سے نچلی والی پسلی سے ہوئی ہے جو کہ تمام پسلیوں میں سے نسبتاً زیادہ ٹیڑھی ہوتی ہے اس لئے اسکے مزاج میں تھوڑی سی کجی ہے، ارشاد فرمایا کہ نہ تو اسے بالکل ویسا ہی چھوڑ دو ورنہ اور ٹیڑھی بنے گی، اور نہ تو بالکل سیدھی کرنے کی فکر میں رہو ورنہ ٹوٹ جائیگی گویا کہ کچھ نرمی کچھ گرمی، کچھ مدارات کچھ ڈانٹ ڈپٹ اعتدال کا معاملہ رہنا چاہئے یہ ایک مسلم خاوند کا فرض ہے۔

زوجین کے بارے میں اسلام کا تصور تو یہ ہے جیسا کہ قرآنی ہدایات اور رسول اللہ کے ارشادات سے معلوم ہوا کہ زوجین یک جان دو قالب کی تصویر و تعبیر ہوں، تاہم اگر اس میں اتفاق سے کوئی ناچاقی پیدا ہوگئی مرد کو عورت کی طرف رجوع کرکے سکون حاصل نہ ہو رہا ہو اور عورت کو مرد کی خدمت کرکے سکون نہ مل رہا ہو تو جانبین کو ذرا صبر و تحمل سے کام لینا چاہئے مردوں کو خطاب کرکے سمجھایا گیا کہ اگر عورت سے نافرمانی یا اطاعت میں کچھ کمی محسوس کرو تو سب سے پہلے سمجھا بجھا کر ان کی ذہنی اصلاح کرو اس سے کام چل گیا تو معاملہ یہیں ختم ہوگیا، عورت ہمیشہ کے لئے گناہ سے اور مرد قلبی اذیت سے گویا دونوں رنج و غم سے بچ گئے، اگر فہمائش سے کام نہ چلا تو دوسرا درجہ یہ ہے کہ اس کی تنبیہ کرو اور ان سے اپنی ناراضگی کا اظہار کرنے کے لئے خود علیحدہ بستر پر سوؤ یہ ایک معمولی سزا اور بہترین تنبیہ ہے کہ وہ سمجھیں گی کہ خاوند کی نگاہ پھر گئی ہے ایسا نہ ہو کہ بالکل ہی بیزار ہوجائیں، صرف جدائی بستر "مضاجع" میں ہو، یہ رعایت ضروری

ہے کہ عورت کو مکان میں تنہا نہ چھوڑ دے اگر اس سے عورت متنبہ ہو گئی تو جھگڑا یہیں ختم ہو گیا، اگر وہ شریفانہ سزا پر بھی اپنی کجروی سے باز نہ آئیں تو تیسرے درجہ میں معمولی مار مارنے کی اجازت دے دی گئی جس کی حد یہ ہے کہ بدن پر اس مار کا زخم اور اثر نہ ہو۔ ائمہ فرماتے ہیں کہ صرف اس قدر مارنے کی اجازت ہے کہ ان کے دوپٹہ میں چند گرہیں لگا کر دو چار مار دیں کیونکہ وہ اس سے سمجھ لے گی کہ کل کو اگر اس کے ہاتھ لکڑی آگئی تو کیا ہوگا، تو اگر اس سے معاملات درست ہو گئے تب بھی مقصود پورا ہو گیا، اور ارشاد فرمایا گیا کہ "اس کے بعد اگر اطاعت کرے تو اب راستہ چھوڑ دو، الزام تراشی میں مت لگو زیادہ اسے تنگ مت کرو" ــــ مقصد پورا ہو گیا،

یہ تھا وہ نظام کہ جس کے ذریعہ گھر کا جھگڑا گھر ہی میں ختم ہو جائے، لیکن بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ جھگڑا طول پکڑ لیتا ہے خواہ اس کی وجہ عورت کی طبیعت میں ناز باتی و سرکشی ہو یا اس بنا پر کہ مرد کا قصور ہو اور بجائے شدادر زیادتی ہو رہی ہو، تو ان حالات میں جانبین سے ایک اشتعال اور پھر دو شخصیتوں کی لڑائی خاندانی جھگڑے کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ قرآن کریم نے اس فساد عظیم کا دروازہ بند کرنے کے لئے ایک ایسا پاکیزہ طریقہ بتایا کہ جس سے فریقین کے اشتعال و الزام تراشی کے راستے بھی بند جائیں اور مصالحت کی راہ بھی نکل آئے، عدالت میں مقدمہ کی صورت میں کوچہ و بازار میں یہ جھگڑا نہ چلے، وہ یہ کہ "حکم" بنالیں، ایک حکم عورت کی طرف سے آئے اور ایک حکم مرد کی طرف سے آئے، دونوں طرف سے ایک ایک ثالث مقرر ہو۔ اب ان دونوں کے اختیارات کیا ہیں ــــ تو قرآن نے اس کو متعین نہیں فرمایا ہے، البتہ ایک جملہ ارشاد فرمایا کہ۔ اگر یہ دونوں حکم اصلاح حال اور باہمی مصالحت کا ارادہ کریں گے تو اللہ ان کے کام میں امداد فرمائیں گے اور دونوں کے درمیان اتفاق فرما دیں گے ــ صلح و صفائی ہو جائے گی تو جو کدورت بیٹھ گئی تھی وہ نکل جائیگی۔ یہ ارشاد کس قدر حکیمانہ ہے کہ اگر معاملہ خاندان سے آگے بڑھ گیا تو بات بڑھ جانے

اور دلوں میں زیادہ بعد پیدا ہو جانے کا خطرہ ہے۔

لیکن بعض اوقات ایسی صورتیں پیش آتی ہیں کہ اصلاح حال کی تمام کوششیں ناکام ہو جاتی ہیں اور نکاح راحت بخش ہونے کے بجائے طرفین کے لئے آپس میں مل کر رہنا ایک نسوہان روح وجان ہو جاتا ہے ایسی حالت میں ازدواجی تعلق کو ختم کردینا ہی طرفین کیلئے راحت وسلامتی کی راہ ہو جاتی ہے، اس ازدواجی تعلق کو ختم کرنے کو "طلاق" کہتے ہیں، جن مذاہب میں طلاق کا اصول نہیں، ان میں ایسے اوقات میں سخت مشکلات کا سامنا ہوتا ہے اور بعض اوقات بہت برے نتائج سامنے آتے ہیں، اس لئے اسلام نے قوانین نکاح کی طرح طلاق کے بھی اصول اور قواعد مقرر کئے ہیں بلکہ اس کے لئے ایک حکیمانہ قانون بنایا ہے، بعض دوسرے مذاہب کی طرح یہ بھی نہیں کیا کہ یہ رشتۂ ازدواج ہر حال میں ناقابل فسخ ہی رہے، بلکہ طلاق، فسخ نکاح کا قانون بنایا۔

طلاق کا اختیار صرف مرد کو دیا کہ جس میں عادۃً فکر و تدبر اور تحمل کا مادہ عورت سے زیادہ ہوتا ہے، عورت کے ہاتھ میں یہ آزادانہ اختیار نہیں دیا کیونکہ وہ وقتی تاثرات سے مغلوب ہو جاتی ہیں اور یہ طلاق کا سبب نہ بنتی رہیں، لیکن عورت کو بھی بالکل اس حق سے محروم نہیں رکھا کہ وہ شوہر کے ظلم و ستم سہنے پر مجبور ہو جائے، اس کو یہ حق دیا کہ حاکم شرع کی عدالت میں اپنا معاملہ پیش کرے اور شکایات کا ثبوت دیکر نکاح فسخ کراسکے، یا پھر طلاق حاصل کرسکے۔

اسلام نے طلاق کی حوصلہ افزائی نہیں کی بلکہ تا بہ مقدور اس سے روکا ہے، لیکن بعض ضرورت کے مواقع پر اجازت دی ہے، تو اس کے لئے کچھ اصول و قواعد بنا کر اجازت دی ہے، صرف بحالت مجبوری اجازت دی ہے اور ساتھ ساتھ یہ ہدایات بھی دی ہیں کہ طلاق اللہ کے نزدیک نہایت مکروہ مبغوض کام ہے جہاں تک ممکن ہوسکے اس سے پرہیز کرے، احادیث میں موجود ہے کہ "حلال چیزوں میں سب سے زیادہ ناپسند اللہ کے نزدیک طلاق ہے" ارشاد

ہے کہ نکاح کرو اور طلاق نہ دو، کیونکہ طلاق سے رحمٰن کا عرش ہل جاتا ہے ۔"

ان ارشادات کا حاصل یہ ہے کہ اس رشتہ ازدواج کو ختم کرنا ہی ضروری ہو جائے تو وہ بھی خوبصورتی اور خوش اسلوبی سے انجام پائے، محض غصہ نکالنے اور انتقامی جذبات کا کھیل بننے کی صورت نہ بن پائے چنانچہ اس سلسلہ میں احادیث کے ذخیرہ اور قرآنی آیات کے جائزہ لینے سے مندرجہ ذیل ہدایات سامنے آتی ہیں کہ جن سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شریعت نے طلاق کی اجازت اور اسکی ممانعت کے بارے میں اول ہی مرحلہ سے کس قدر حکیمانہ اور معتدل راہ اختیار کی ہے ۔

(۱) شریعت نے نکاح سے قبل اپنی منگیتر کو دیکھنے کی اجازت دی ہے تاکہ نکاح دیکھ بھال کر ہو اور محض صورت کی ناپسندیدگی کی وجہ سے جدائی نہ پڑ جائے ۔ الحدیث

(۲) شوہر کو حکم دیا گیا کہ اپنی بیوی کی غلطی اور زیادتیوں پر ہی صرف نگاہ نہ رکھے ، بلکہ چاہئے کہ اس کی اچھائیوں پر نظر رکھے، اس کی خوبیوں کی وجہ سے اسکے بے ڈھنگے پن پر صبر کرے، اللہ کا ارشاد ہے: "تو اگر تم ناپسند کرنے لگو تو کیا عجب ہے کہ کسی چیز کو تم ناپسند کرو اور اللہ اس میں بہت سی بھلائی ودیعت رکھ دے"۔ فان کرھتموھن فعسیٰ ان تکرھوا شیئًا ویجعل اللہ فیہ خیرًا کثیرًا ۔ حدیث میں ہے کہ "کوئی مومن شوہر اپنی مومن بیوی سے بغض نہ رکھے ، اگر اس کی کوئی خصلت پسند نہ آئی تو اس کی دوسری باتوں سے راضی ہو جائیگا ۔" مسلم شریف"

(۳) شوہر کو حکم دیا گیا کہ جب وہ اپنی بیوی سے کوئی ایسی بات دیکھے کہ جسے برداشت نہ کر سکتا ہو تو بھی پہلی مرتبہ میں طلاق دینے میں جلدی نہ کرے ، بلکہ ممکن حد تک اس کی اصلاح کی کوشش کرے ، اللہ کا ارشاد ہے واللاتی تخافون ..... الآیۃ

(۴) اگر زوجین کے درمیان اختلاف اس قدر بڑھ گئے ہوں کہ ان تینوں مراحل کے ساتھ بھی نہیں ختم ہو سکتے ہیں تو ان کے اعزا، واقربا، کو حالات کے ہموار اور معتدل بنانے

میں مداخلت کرنے کا حکم ہے، چنانچہ ارشاد ہے ان خفتم شقاق بینھما الآیۃ
(۵) اگر ان دونوں حکم کی بھی کوشش بارآور نہ ہوسکی اور آپسی اختلافات قائم رہے تو اس وقت شریعت نے شوہر کو طلاق دینا مباح کر دیا۔ یہ کہتے ہوئے کہ " ان ابغض المباح الی اللہ الطلاق۔ اخرجہ ابوداؤد۔
(۶) پھر شریعت نے اس کی بھی تنبیہ کی کہ بیوی کو حیض کی حالت میں طلاق نہ دے اس حکم میں یہ مصلحت پوشیدہ ہے کہ طلاق کا سبب کوئی وقتی کراہت کا نتیجہ نہ ہو۔
(۷) پھر شریعت اسلامیہ نے اسے ناپسند کیا کہ طلاق دینے والا اپنی بیوی کو ایک ہی مرتبہ میں طلاق دیدے، بلکہ کہا کہ اپنی بیوی کو ایک ہی طلاق دے پھر قطع تعلق کرے یہاں تک کہ اس کی عدت ختم ہوجائے، فقہاء کی اصطلاح میں یہ طلاق " احسن " ہے، ایسا اس لئے کہ تاکہ عدت کے دوران شوہر کو رجوع کا حق حاصل رہے، اور عدت گذر جانے کی صورت میں بھی حالات ہموار ہونے کی صورت میں نکاح کی تجدید ممکن رہ سکے۔
(۸) اور اگر زوج یہ چاہے کہ وہ عورت اب کبھی بھی اس کی طرف نہ لوٹ سکے تو بھی شریعت اسے ایک ہی کلمہ میں تین طلاق دینے سے منع کرتی ہے، بلکہ اس کیلئے " طلاق سنت " مشروع کی گئی وہ یہ کہ ہر طہر میں بیوی کو ایک طلاق دے یہانتک کہ تین طہر میں تین طلاقیں پوری ہوجائیں تاکہ عورت یکبارگی اسکے ہاتھوں سے نہ نکل جائے بلکہ دو طہر یعنی دو مہینہ کی مدت تک اسے اختیار حاصل رہے، تاکہ معاملہ میں غور و فکر کرلے اور اپنے طلاق کے نتائج کو دیکھ لے، اگر عورت حقوق واجبات کو پہچاننے لگے تو پھر تین طلاق پورے ہونے سے پہلے اس سے رجوع کرلے۔
(۹) پھر شریعت نے طلاق کو شوہر کا ہی حق رکھا، عام حالات میں عورت کے ہاتھ میں نہیں دیا اس لئے کہ عورت فطری طور پر معاملات میں جلدبازی کرتی ہیں تو اگر طلاق کا

اختیار ان کے ہاتھ میں ہوتا تو پھر فرقت چھوٹی چھوٹی باتوں پر ہوجایا کرتی۔

(۱۰) لیکن شریعت نے عورت کی جانب سے فرقت کے مطالبہ کو بالکل بند نہیں کر دیا ہے بلکہ خاص حالات میں عورت کو بھی اس کی اجازت دی ہے، خلع کی بھی اجازت دی ہے نیز شوہر اگر حقوق کی ادائیگی میں قاصر ہے تو پھر قاضی سے فسخ نکاح کا مطالبہ کرسکتی ہے۔

ان ہدایات کو دیکھتے ہوئے آپ نے اندازہ کیا کہ شریعت نے کتنی نگہداشت کی ہے۔ کہ اگر اس رشتہ کو ختم کرنا ہی ہے تو وہ بھی خوبصورتی اور حسن معاملہ سے انجام پائے محض غصہ نکالنے لاابالی پن اور یا پھر انتقامی جذبات کا کھیل نہ بننے پائے۔

بقیہ عقیدہ ختم نبوت سے اہل بدعت کا انحراف۔

حضرت حذیفہ نے فرمایا ہر وہ عبادت جس کو اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا، تم بھی مت کرو (الاعتصام) امام مالک کا یہ ارشاد کتنا حقیقت افروز ہے: "جس نے اسلام میں کوئی بدعت نکالی اور اسکو وہ اچھا سمجھتا ہے تو اس نے یہ گمان کیا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے پیغام رسالت میں خیانت کی ہے اور اسلئے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے الیوم اکملت لکم دینکم الخ سو جو چیز اس دین میں پہلے داخل نہ تھی وہ آج بھی دین نہیں ہوسکتی (الاعتصام ص۲۸) اور مقدمہ رد المحتار ص۴۶ پر امام شعرانی کے حوالہ سے چاروں اماموں کا قول منقول ہے کہ اذا صح الحدیث فھو مذہبی یعنی جو صحیح حدیث سے ثابت ہو وہی میرا مذہب ہے۔

غرضیکہ دین میں کسی قسم کی زیادتی بدعت نوازی درحقیقت دین کے مکمل نہ سمجھنے کا اظہار ہے اور عقیدۂ ختم نبوت سے درپردہ انحراف ہے حضور خاتم النبیین کا دین آفاقی اور دائمی ہے ہر دور میں ہدایت کیلئے کافی ہے اللہ تعالیٰ اس پر قائم رکھے اور ہر قسم کی دینی تحریف سے محفوظ رکھے آمین۔

مولانا امام علی دانش قاسمی لکھیم پور

عقیدۂ ختم نبوت سے اہل بدعت کا انحراف

حضرت محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالی کے آخری نبی ہیں، اسلام کا یہ وہ بنیادی عقیدہ ہے کہ جسے قرآن وحدیث میں تواتر کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اس لئے وہ شخص بھی قطعی مسلمان نہیں ہے جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی ورسول تو مانتا ہے مگر خاتم النبیین تسلیم نہیں کرتا۔ عقیدۂ ختم نبوت کا انکار جس دور میں جس کسی نے بھی کیا مخلص مسلمانوں نے ایسے منکر شخص کے ساتھ مرتد کافروں جیسا معاملہ کیا، اور نبوت محمدی کے قصر رفیع پر حملہ کرنے والوں کا مقابلہ کرکے ان کے فتنوں کا قلع قمع کیا، مسیلمہ کذاب سے لیکر متنبیٔ قادیان مرزا غلام احمد قادیانی تک جھوٹے نبوت و رسالت کے دعویداروں کی شرانگیزیوں کو کبھی امت مسلمہ نے گوارا نہیں کیا اور نہ آئندہ کسی متنبی کے تلبیسی فریب کو چلنے دیا جائیگا۔ انشاء اللہ العزیز۔

اسلام کے دشمنوں نے صاف اور صریح طور پر نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرنے والوں کے برے انجام کو دیکھ کر دام ہمرنگ زمین بچھا کر اسلام کا نام لیکر مسلمانوں کو دین سے بیگانہ کرنے کی کوششیں شروع کردیں، سب سے پہلے ابن سبا یہودی نے اسلام کا بادہ اوڑھ کر اور محبت اہل بیت کا زبانی نعرہ لگا کر بارگاہ نبوت کے فیض یافتہ صحابۂ کرامؓ کو مطعون کرکے اسلام میں تحریف شروع کی اور دیکھتے ہی دیکھتے اسلام کے متوازی ایک نیا دین ایجاد کر ڈالا گیا، جس میں عقیدۂ نبوت کے مقابل عقیدۂ امامت کو داخل کرکے انبیاء کرام کی صفات سے کچھ زائد اوصاف ائمہ اہل بیت میں تسلیم کرنے کی

دعوت دی گئی اور کتاب و سنت میں ذکر کئے گئے دین کو ناقابل اعتماد قرار دیتے ہوئے قرآن مجید میں تحریف کا عقیدہ گڑھا گیا۔ یہ سبائی فتنہ اسلام کے تمام عقائد (بشمول عقیدۂ ختم نبوت) کی بیخ کنی کیلئے دشمنان اسلام نے کھڑا کر دیا جو مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتا رہا ہے، اسی فتنۂ کبریٰ کی ایک شاخ غالی مبتدعین ہیں جو اسلامی شریعت میں من مانے طریقے اور عقیدے داخل کرکے درپردہ ختم نبوت کا انکار کرتے رہتے ہیں کیونکہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری نبی ہونے کا لازمی تقاضہ یہ ہے کہ آپ کی شریعت کو ناقابل تغیر اور آپ کے دین کو کامل ومکمل اور جامع یقین کیا جائے حضرت محمد عربی کے دین میں کمی و زیادتی کرنا سراسر گمراہی ہے اپنی طرف سے مقرر کردہ کسی عمل میں ثواب سمجھنا بدعت ضالہ ہے اور شریعت کے ناقص سمجھنے کا پوشیدہ اقرار ہے اور خاتم النبیین پر دین مکمل کئے جانے کے قرآنی اعلان کی خلاف ورزی ہے اسی لئے قرآن وحدیث اور ارشادات صحابہ وائمہ دین میں بدعت پر سخت نکیر موجود ہے اور دین کے جامع ومکمل ہونے کی صراحت بار بار کی گئی ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ۝ (سورۂ مائدہ پ ۵۷)	آج کے دن تمہارے لئے تمہارے دین کو میں نے پورا کردیا اور میں نے تم پر اپنا انعام تمام کردیا اور میں نے اسلام کو تمہارا دین بننے کیلئے پسند کرلیا۔

دین کی تکمیل کے بعد اب اس میں کسی بھی ترمیم واضافہ کی قطعی گنجائش باقی نہیں رہ گئی ہے دینی عقائد میں تحریف، شرعی اعمال میں بدعت پسندی اس آیت مذکورہ کی روشنی میں بہت بڑا ظلم اور نعمت ربانی کی ناشکری ہے۔

خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں نے کوئی ایسی چیز نہیں چھوڑی جو تم کو جنت سے قریب کر دے مگر میں نے اس کو تم سے بیان کر دیا اور میں نے کوئی ایسی

چیز نہیں چھوڑی جو دوزخ سے تمکو دور کردے مگر وہ تمہیں تبلادی ہے، تمہارے سامنے میں نے ایک روشن شریعت چھوڑی ہے کہ اس کی رات بھی دن کی طرح ہے، میرے بعد اس سے وہی ہٹے گا جو ہلاک ہونے والا ہے (ترجمہ شرح اربعین نووی ؒ)

بخاری شریف کی روایت ہے کہ حضور اکرم ؐ نے فرمایا جس نے ہمارے دین میں وہ بات نکالی جو اس میں نہیں ہے وہ مردود ہے، مسلم شریف میں حدیث پاک نقل کی ہے کہ جس نے ایسا عمل کیا جس پر ہمارا حکم نہیں ہے وہ مردود ہے، متعدد روایات کتب حدیث میں منقول ہیں جن میں ارشاد نبوی کل بدعۃ ضلالۃ (ہر بدعت گمراہی ہے) موجود ہے، اسی لئے حضرت مجدد الف ثانی اپنے مکتوبات میں فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کل بدعۃ ضلالۃ، تو اب کسی کو حق نہیں ہے کہ وہ کہے بعض البدعۃ ضلالۃ وبعض البدعۃ حسنۃ (کہ بعض بدعات گمراہی ہیں اور بعض بدعات اچھی ہیں)

احادیث طیبہ میں جہاں ایک طرف طریق سنت پر گامزن رہنے والوں کو بشارتیں دی گئی ہیں کہ ان کو شہیدوں جیسا ثواب اتباع سنت میں ملیگا، وہاں دوسری جانب بدعت نوازوں کیلئے شدید وعیدیں بھی آئی ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان اللہ حجب التوبۃ عن صاحب کل بدعۃ حتی یدع بدعتہ (اللہ تعالی نے ہر بدعت والے کو توبہ سے محروم کردیا ہے جب تک وہ بدعت نہ چھوڑ دے (طبرانی بحوالہ حسام الحرمین للبریلوی)

مشہور روایت ہے کہ جس نے کسی صاحب بدعت کی تعظیم کی اس نے اسلام کے ڈھانے میں مدد کی : حضرت عبد اللہ ابن مسعودؓ کا ارشاد ہے اتبعوا آثارنا و لاتبتدعوا فقد کفیتم (الاعتصام) ہمارے نقوش قدم پر چلو اور اپنی طرف سے ایجاد مت کرو، تمہارے لئے کافی ہے

(باقی بر ص ۱۸)

علمائے سلف کی درسگاہیں

از: قاضی اطہر مبارکپوری

موجودہ طرز کے مدرسوں کے قیام سے پہلے اسلامی علوم کی تعلیم وتدریس اور علمائے اسلام کی تعلیمی وتدریسی خدمات کا اندازہ ان کے تعلیمی حلقوں اور مجلسوں سے ہوتا ہے جو موقع بموقع برپا ہوتی تھیں جبکہ بہت سے علماء ذاتی طور سے اپنے یہاں تعلیمی سلسلہ جاری رکھتے تھے — نہ مدرسہ کی شاندار عمارت، نہ طلبہ کے قیام وطعام اور راحت وآرام کا انتظام، نہ ہی مدرسین کی تنخواہ کا تصور ان سب باتوں کے باوجود پورے عالم اسلام میں علوم دینیہ کی تعلیم اعلیٰ پیمانہ پر ہوتی تھی اور نہایت ذوق وشوق سے تعلیم وتعلم کا مشغلہ جاری تھا۔ ذیل میں چند ذاتی مجالس درس کا تذکرہ دلچسپی کا باعث ہے اور اس سے ہمارے طلبہ مدرسین سبق حاصل کرسکتے ہیں۔

درخت صنوبر کے زیر سایہ درسگاہ

حافظ امام ابوعبداللہ محمد بن رافع قشیری نیشاپوری متوفی ۲۴۵ھ رحمۃ اللہ علیہ

اپنے زمانہ کے نامی گرامی حُفّاظ حدیث میں سے ہیں، سفیان بن عیینہ، عبداللہ بن ادریس نضر بن شمیل، عبدالرزاق صنعانی جیسے ائمہ واعلام سے حدیث کا سماع کیا تھا، ان کے تلامذہ میں بڑے بڑے محدثین ہیں، ان کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ

وھو احد من عُنِیَ بالسنن حالاً ومالاً — انھوں نے اپنی جان ومال سے احادیث پر توجہ کی۔

فقر واستغناء علمائے اسلام کیلئے دثار وشعار ہے، اس بارے میں امام محمد بن رافع

اپنے اسلاف کے پرتو تھے، ایک مرتبہ امیر طاہر نے آپ کی خدمت میں پانچ ہزار درہم نذر کئے اور اپنے خاص آدمی کے ذریعہ یہ خطیر رقم آپ کے پاس بھجوائی، یہ شام کا وقت تھا سورج کا سایہ دیواروں پر آگیا تھا اور رات کے کھانے کا کوئی خاص انتظام نہ تھا مگر آپ نے اس کو قبول نہیں کیا، حالانکہ امیر طاہر کی اولاد آپ کے حلقۂ درس میں آکر استفادہ کرتی تھی، امام ابن رافع اپنے مکان کے صحن میں صنوبر کے درخت کے زیر سایہ اپنا حلقۂ درس قائم کرتے تھے، جس میں محدثین کبار اور امراء کی اولاد شریک ہوتی تھی اس حلقۂ درس کے رعب داب اور وقار کا اندازہ ذیل کے بیان سے ہوتا ہے۔

قال جعفر بن احمد الحافظ مارأيت في المحدثين اهيب من محمد بن رافع. كان يستند الى شجر الصنوبر في داره، فيجلس العلماء بين يديه على مراتبهم واولاد الطاهرية ومعهم الخدم كان على رؤسهم الطير فياخذ الكتاب ويقرء بنفسه ولا ينطق احد ولا يتبسم اجلالاً له فان نطق احد قام۔
(تذكرة الحفاظ ج ۲ ص ۸۴، ۸۵)

حافظ جعفر بن احمد کا بیان ہے کہ میں نے محدثین میں محمد بن رافع سے زیادہ بارعب و ہیبت کسی کو نہیں دیکھا وہ اپنے مکان میں صنوبر کے درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھتے تھے اور ان کے سامنے علماء حسب مراتب اور خاندان طاہر کی اولاد اپنے حشم و خدم کے ساتھ بیٹھتی تھی، سکون و وقار کا یہ حال تھا کہ گویا اہل مجلس کے سروں پر پرندے ہیں محمد بن رافع ہاتھ میں کتاب لے کر خود قرأت کرتے تھے اور ان کے ادب و احترام کی وجہ سے کوئی شخص نہ بولتا تھا اور نہ مسکراتا تھا اگر کوئی بول دیتا تو مجلس سے اٹھ جاتا تھا۔

صنوبر کی زیر سایہ اسلام کی اس کھلی یونیورسٹی میں ہزاروں طلبہ جن میں علماء فقہاء

محدثین، امراء و اعیان شامل ہیں حدیث کی تعلیم حاصل کرتے تھے، اس کے مدرس و معلم امام محمد بن رافع قشیریؒ کسی سے معاوضہ کیا وصول کرتے خود اپنے مال و دولت کو خدمت حدیث میں لٹاتے تھے اور امراء کے گراں قدر عطیے واپس کر دیتے تھے، ان کا یہ خانگی مدرسہ ہر طبقہ کیلئے کھلا رہتا تھا، رعب و داب اور سکون و وقار کا یہ حال تھا کہ حاضرین میں کوئی ہنس بول نہیں سکتا تھا اور جس نے اسکے خلاف کیا کسی طبقہ سے ہو فوراً درسگاہ سے اٹھا دیا جاتا تھا، فقر و استغناء کی بارگاہِ جلال من و تو کے امتیاز سے بہت بلند و بالا ہوتی ہے، ساتھ ہی اسکے جمال کا پہلو اتنا وسیع اور پرکشش ہوتا ہے کہ دنیا اسکی طرف کھنچی آتی ہے۔

درختِ جوز کے زیرِ سایہ درسگاہ

سمرقند کے قریب قدیم زمانہ میں صغد نامی ایک نہایت سرسبز و شاداب اور پُرفضا علاقہ تھا جو اپنی شادابی اور حسن منظر کی وجہ سے دنیا کی جنت کہا جاتا تھا اسی علاقہ میں ایک بستی خشوفغن نامی تھی جو علاقہ صغد کی سب سے زیادہ پرفضا جگہ تھی اس بستی میں ایک مشہور محدث ابوحفص بُجیری صغدی رحمۃ اللہ علیہ تھے، ان کے بارے میں علامہ سمعانی نے حافظ حمزہ بن احمد کی یہ روایت بیان کی ہے کہ

قُرئ کتاب الجامع علی ابی حفص البجیری الصغدی بخشوفغن فی کرمه تحت شجرة الجوز وهی شجرة عظیمة وسط الکرم۔

ایک مرتبہ خشوفغن میں امام ابوحفص بُجیری صغدی سے ان کے انگور کے باغ میں بادام کے درخت کے زیر سایہ صحیح بخاری پڑھی گئی یہ درخت وسطِ باغ میں بہت بڑا تھا

اپنے انگور کے باغ میں درخت کے زیر سایہ درس حدیث کا یہ منظر دیکھ کر امام ابوحفص نے طلبہ کو مخاطب کرکے کہا کہ اس وقت ہم لوگ جنت میں ہیں، طلبہ نے اس کی وجہ معلوم کی تو کہا کہ لوگوں کے خیال میں دنیا میں جنت تین ہیں دریائے اُبلّہ، غوطۂ دمشق اور سمرقند کا صُغد

اور پورے علاقۂ صُغد میں ہمارے اس دیہات خشو فغن سے زیادہ دلفریب اور پر فضا کوئی بستی نہیں ہے، اور اس بستی میں میرے اس انگور کے باغ سے عمدہ باغ نہیں ہے اور اس باغ میں جس مجلس میں ہم درخت کے نیچے بیٹھے ہیں اس سے زیادہ فرحت بخش اور دل کشا کوئی مجلس نہیں ہے اس لئے ہم لوگ اس وقت جنت میں ہیں

(الانساب سمعانی ج ۸ ص ۳۱۳)

جوز کے درخت کے زیرسایہ یہ درسگاہ صنوبر کے درخت کے زیر سایہ مدرسہ سے مختلف ہے، وہاں جلال تھا یہاں جمال ہے، قدرتی مناظر کی فراوانی ہے سبزہ زاروں کے درمیان حسین بستی میں انگور کا باغ ہے جس میں جوز کا بہت بڑا درخت سایہ فگن ہے جہاں طلبۂ حدیث کی پاکیزہ مجلس درس قائم ہے جمال فطرت کے تمام سامان بہم ہیں اور حدیث کا درس ہو رہا ہے گویا یہاں جنت اتر آئی ہے، کیسے خوش وقت اور اہل ذوق علماء تھے جو اپنے علم سے اس دنیا کو جنت کا نمونہ بنائے ہوئے تھے

لب دریا کی درسگاہ

امام ابو یعقوب اسمٰعیل بن قتیبہ بن عبدالرحمٰن سُلمی بُشتنقانی متوفی ۲۸۴ھ رحمۃ اللہ علیہ نہایت عابد وزاہد عالم ومحدث تھے، ان کا وطن بشتنقان شہر نیشاپور سے نصف فرسخ پر تھا شہر نیشاپور کے محلہ رجالہ میں بھی ان کا ایک مکان تھا جمعرات کو یہاں آتے اور شب جمعہ کی شام اور جمعہ کی صبح کو حدیث کا درس دیتے اور جمعہ پڑھ کر اپنے گاؤں بشتنقان واپس چلے جاتے تھے امام ابوبکر بن اسحاق صبغی کا بیان ہے کہ ۲۸۰ھ پہلی بار میں ان کے یہاں حدیث پڑھنے کیلئے گیا، ان کا یہ حال تھا کہ

وکان الانسان اذا راٰہ یذکر السلف لسمتہ و زھدہ وورعہ۔

جب انسان ان کو دیکھتا تھا تو ان کی ہیئت اور زہد وتقویٰ کی وجہ سے سلف کو یاد کرتا تھا۔

اسکے بعد ابو بکر بن اسحاق صبغی بیان کرتے ہیں

كنا نختلف الى بشتنقان فيخرج الينا فيقعد على حصباء النهر، والكتاب بيده، فيحدثنا وهو يبكى۔	ہم طلبۂ حدیث بشتنقان جاتے تھے تو وہ ہم کو لے کر دریا کے سنگلاخ ساحل پر بیٹھتے اور ان کے ہاتھ میں کتاب ہوتی تھی ہم سے حدیث بیان کرتے جاتے اور روتے جاتے تھے۔

بشتنقان کے بارے میں سمعانی نے لکھا ہے کہ وهى احدى متنزهات نيشابور، یعنی یہ بستی نیشاپور کی تفریح گاہوں میں سے ایک ہے، اس بستی کے حسن منظر اور دلفریبی کو دیکھ کر ابونصر بن ابوالقاسم قشیری نے کہا ہے

ياغرمة الايك سلام عليك	سلام صب مستهام اليك
ثلاثة ليس لها رابع	بشتنقان ذو خك وايك

(الانساب سمعانی ج ۲ ص ۲۴۳، ۲۴۲)

دریا کی روانی اور ساحل کی ہریالی اور درس حدیث کی مجلس پڑھنے پڑھانے والوں کے ذوق لطیف کا پتہ دیتی ہے قدرتی مناظر کے یہ متحرک مدرسے کیف وکم کے اعتبار سے بڑے قیمتی ہوتے تھے۔

رحبۂ غسان کی درسگاہ

امام ابومسلم کجی بصری متوفی ۲۹۲ھ رحمۃ اللہ علیہ کا نام ابومسلم ابراہیم بن عبداللہ بن مسلم بن ماعز ہے، ذہبی نے ان کو الحافظ المسند، صاحب کتاب السنن کے ساتھ بقیۃ الشیوخ کے لقب سے یاد کیا ہے، بڑے شاندار اور صاحب ثروت محدث تھے، انھوں نے جب اپنی مجلس درس منعقد کی اور درس حدیث شروع کیا تو اس موقع پر دس ہزار درہم صدقہ کیا، اور اپنی تصنیف کتاب السنن کے درس سے فراغت کے موقع پر اپنے شاگردوں کی شاندار

دعوت کی جس میں ایک ہزار دینار خرچ کئے۔

امام ابو مسلم کجی آخر عمر میں بصرہ سے بغداد آئے ان کی آمد پر اہل بغداد نے ان سے حدیث کا سماع کیا، ایک وسیع وعریض میدان میں محدثین جمع ہوئے اور امام ابو مسلم نے اپنے مستملی کے ذریعہ حدیث کا املاء کر دیا اس مجلس درس کے بارے میں احمد بن جعفر ختلی کا بیان ہے۔

لما قدم الکجی بغداد املی فی رحبة غسان، فکان فی مجلسه سبعة مستملین یبلغ کل واحد منهم الآخر ویکتب الناس عنه قیاما، ثم مسحت الرحبة وحُسب من حضر بمحبرة فبلغ ذلك نیفا واربعین الفا سوی النظارة۔

ابو مسلم کجی نے بغداد آکر غسان چوک میں حدیث کا املاء کرایا طلبہ کا مجمع اس قدر زیادہ تھا کہ ان کی مجلس درس میں سات مستملی تھے جو ایک کی آواز دوسرے تک پہونچاتے تھے اور لوگ کھڑے کھڑے حدیث لکھتے تھے بعد میں اس میدان کی پیمائش کرکے ان لوگوں کا حساب لگایا گیا جو دوات لے کر آئے تھے تو دواتوں کی تعداد چالیس ہزار سے زائد تھی یہ منظر دیکھنے والوں کی تعداد اسکے علاوہ تھی۔

(تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۷۷)

جس حلقہ درس میں حدیث لکھنے کیلئے چالیس بیالیس ہزار دوات ہو اسکے حاضرین کی تعداد کا اندازہ مشکل ہے، ظاہر ہے کہ ایک دوات سے کئی طلبہ لکھتے رہے ہوں گے رحبۂ غسان بغداد کا وسیع وعریض میدان تھا مگر طلبہ کی کثرت کی وجہ سے بیٹھنے کی جگہ نہیں تھی اور لوگ کھڑے کھڑے حدیث لکھتے تھے، امام ابو مسلم کجی حدیث کی متحرک درسگاہ تھے جہاں چلے جاتے وہیں مدرسہ بن جاتا جس میں لاکھوں طلبہ حدیث جمع ہو جاتے تھے

رحبۂ نخل کی درسگاہ

امام ابوالحسین عاصم بن علی بن عاصم تیمی واسطی متوفی ۲۲۱ھ رحمۃ اللہ علیہ کی ذات بھی متحرک درسگاہ تھی وہ جہاں جاتے طلبۂ حدیث لاکھوں کی تعداد میں ان کے گرد جمع ہو جاتے تھے، ان کی مجلس درس کی کثرت درونق اسلامی شان وشوکت کا مظہر تھی احمد بن عیسیٰ کہتے ہیں کہ مجھ سے خواب میں کہا گیا کہ تم عاصم کی مجلس میں شریک ہوان کی مجلس درس سے اہل کفر جلتے بھنتے ہیں ایک مرتبہ امام عاصم بن علی اپنے شہر واسط سے بغداد آئے اور حدیث کی مجلس درس قائم کی تو اہل علم کا بے پناہ ہجوم ہوا۔ ابوالحسین بن مبارک اور عمر بن حفص سدوسی کا بیان ہے کہ اس مجلس درس کا اندازہ لگایا گیا کہ ایک لاکھ سے زیادہ انسان اس میں شریک تھے امام عاصم بن علی چھت پر بیٹھ کر مجمع کو حدیث کا املاء کراتے تھے اور ان کا مستملی ہارون کھجور کے ایک ٹیڑھے درخت پر بیٹھ کر ان کی آواز مجمع تک پہنچاتا تھا، پھر بھی لوگوں تک آواز نہیں پہنچتی تھی، ایک مرتبہ امام عاصم نے کہا حدثنا اللیث بن سعد مجمع اس کو سن نہ سکا اور بار بار دہرانے کی خواہش کرتا رہا، حتیٰ کہ امام عاصم نے چودہ بار یہ جملہ دہرایا یہ مجلس رحبۂ نخل نامی میدان میں منعقد ہوئی تھی خلیفہ معتصم نے اس مجلس کے شرکاء کی تعداد معلوم کرنے کیلئے خصوصی انتظام کیا تو معلوم ہوا کہ اس میں ایک لاکھ بیس ہزار طلبۂ حدیث شریک تھے، عمر بن سدوسی کا بیان ہے

وجّه المعتصم من يحزر مجلس شيخنا عاصم في رحبة النخل وكان يجلس على سطح وينشر الخلق، حتى سمعته يوما يقول حدثنا الليث بن سعد وهم يستعيدونه	خلیفہ معتصم نے آدمی بھیجا جو رحبۂ نخل میں ہمارے استاد عاصم کی مجلس درس کا تخمینہ لگائے وہ چھت پر بیٹھ کر لوگوں کو سناتے تھے ایک دن میں نے سنا کہ وہ حدثنا اللیث بن سعد کہہ رہے ہیں اور حاضرین اس جملہ کا اعادہ کرار ہے ہیں،

فاعاده اربع عشر مرة والناس لا يسمعون، وكان هارون يركب نخلة معوجة يستملي عليها فحرز المجلس بعشرين ومائة الف

انھوں نے چودہ بار اس کا اعادہ کیا، پھر بھی لوگ نہیں سن رہے تھے اور ہارون مستملی کھجور کے ٹیڑھے درخت پر بیٹھ کر آپ کی آواز مجمع تک پہنچا رہا تھا، تخمینہ لگایا تو ایک لاکھ بیس ہزار آدمی تھے،

تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۵۹)

کس قدر بازوق، اور صاحب جمالیات اساتذہ و تلامذہ تھے اور کس ذوق و شوق سے درس کے حلقے قائم ہوتے تھے؟ ایسا معلوم ہوتا ہے اس دور میں علم دین کے حصول کا عام مزاج تھا اور ہر لکھا پڑھا آدمی دین کا عالم ہوتا تھا، آج کی طرح علم دین مخصوص جماعت میں محصور نہیں تھا اور نہ ہی اس کیلئے اہتمام و انتظام کرنا پڑتا تھا۔
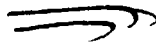
مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی

قسط اوّل

حضرت شیخ الاسلام کے تین امتیازات

(۱) حضرت شیخ الہند سے کثرت استفادہ
(۲) مسجد نبوی میں تدریس
(۳) الجزائر کے جہاد آزادی میں رہنمائی

[یہ مقالہ شیخ الاسلام سیمنار مدنی ہال دہلی میں ۸ ؍ مارچ ۱۹۸۸ء کو پڑھا گیا بعض احباب کے شدید اصرار پر افادۂ عام کی غرض سے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ رسالہ دارالعلوم میں شائع کیا جارہا ہے۔]

شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی بظاہر ایک شخصیت کا نام ہے، لیکن بباطن وہ اپنی جامعیت کے اعتبار سے " ان ابراھیم کان امۃ " کی تفسیر تھے، کیونکہ وہ بیک وقت علوم و معارف کے امام، مجلس ارشاد کے صدر نشین، عزیمت و استقامت کے جبل عظیم، فقر و تواضع کے بحر عمیق، بصائر و حکم کے سر چشمہ، زہد و قناعت کے مجسمہ، اخلاص و ایثار کے پیکر، سخاوت و شجاعت کے مخزن، میدان صبر و رضا کے شہسوار، قافلہ جہد و عمل کے تاجدار اور سلف صالحین کی مکمل و متحرک یادگار تھے "کثر اللہ امثالہ"

آپ نے سیاست کے بحر مواج میں اپنے سفینہ کی تختہ بندی کی، مگر اس بصیرت کے ساتھ کہ اس کی چھینٹیں آپ کے دامنِ حیات کو نمناک نہ کرسکیں آپ نے مذہب و سیاست کے جام و سندان کو باہم آمیز کردیا، مگر اس کمال فراست کے ساتھ کہ دونوں کی نزاکتوں سے ایک لمحہ کیلئے بھی صرف نظر نہیں کیا۔

خدمات اور کارناموں پر ایک اجمالی نظر

۱۹ شوال ۱۲۹۶ھ کو آپ کی ولادت ہوئی اور ۱۲ جمادی الاولیٰ ۱۳۷۷ھ (۵ دسمبر ۱۹۵۷ء) کو ساڑھے اکیاسی سال کی عمر میں اس جہان فانی کو چھوڑ کر رہ گرائے عالم جاودانی ہوئے، اس اکیاسی سالہ حیات کے ۲۰ سال تعلیم و تحصیل میں بسر ہوئے اور تقریباً ۸ سال سے کچھ کم و بیش قید فرنگ کی نذر ہو گئے، زندگی کے باقی ۵۳ سال میں سے اگر کم از کم ۱۰ برس خواب و خور اور دیگر حوائج بشریہ کی تکمیل کیلئے نکال دیئے جائیں تو کارکردگی کی مدت صرف ۴۳ سال رہ جاتی ہے، ان ۴۳ سال کے محدود ایام کو پیش نظر رکھ کر حضرت شیخ الاسلام کی تعلیمی تربیتی، تصنیفی اور سیاسی خدمات اور کارناموں کا جائزہ لیجئے کہ مدینۃ الرسول علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام، مدرسہ عالیہ کلکتہ، اور آسام کے علاوہ صرف دارالعلوم دیوبند میں چار ہزار سے زائد وہ تلامذہ ہیں جنھوں نے آپ کے شمع علم سے اکتساب نور کیا۔ لاکھوں سے زیادہ وہ طالبین حق ہیں جنھوں نے تربیت گاہ مدنی سے تصحیح عقائد تحسین اخلاق و تزکیۂ باطن کا درس لیا جن میں ڈیڑھ سو سے اوپر وہ خوش بخت اور جواں ہمت بھی ہیں جو احسان و سلوک کی منزلیں طے کر کے سند اجازت و خلافت سے مشرف ہوئے، اصلاح معاشرہ اور تبلیغ دین کیلئے اس وسیع و عریض ملک کے چپے چپے کا دورہ، اسلامی عنوانات پر ہزاروں سے زائد خطبات و تقریریں، استخلاص وطن حریت قومی اور ملت کی سربلندی کی خاطر وقت کی سب سے بڑی استعماری طاقت سے محاذ آرائی علوم اسلامی کی اشاعت کی غرض سے ہزاروں مکاتیب دینیہ و مدارس اسلامیہ کی سرپرستی و نگرانی، پھر ہمہ جہت و مختلف النوع مشاغل کے ساتھ مختلف دینی، علمی، سیاسی اور تاریخی موضوعات پر کتب و رسائل کی تالیف و تصنیف نیز ہزاروں صفحات پر پھیلے ہوئے ان مکاتیب کی تحریر جن میں تفسیر آیات، تشریح احادیث تفصیل عقائد، توضیح مسائل فقہیہ، رموز

احسان اور تاریخ وسیاست سے متعلق بیش بہا نادر معلومات کا ایک عظیم ذخیرہ جمع کردیا ہے جس کے متعلق پورے اعتماد سے کہا جاسکتا ہے کہ مکتوبات وملفوظات کی طویل فہرست میں مخدوم شرف الدین احمد منیری متوفی ۷۸۲ھ اور مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی متوفی ۱۰۳۴ھ کے مجموعۂ مکاتیب کے بعد شیخ الاسلام کے مکتوبات اپنی افادیت، اپنی اثر آفرینی، کثیر معلومات اور جامعیت میں سب پر فوقیت رکھتے ہیں، اور جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ مکتوبات قلم برداشتہ اور بالعموم اسفار یا قید وبند کی حالت میں لکھے گئے ہیں جس سے حضرت شیخ الاسلام کے علمی استحضار وعبقریت کا کسی قدر اندازہ لگایا جاسکتا ہے پھر تکمیل ذات کیلئے آہ نیم شبی کا مشغلہ اور رب کریم وآقائے بے نیاز سے عرض ونیاز جو زندگی کا ایک جزبن گیا تھا، بسا اوقات پورا دن ٹرین، تانگہ اور بیل گاڑیوں کے تکلیف دہ سفر میں گذر جاتا، اور رات کا بیشتر حصہ جلسہ اور وعظ میں، لیکن کیا مجال کہ رات کے اس محبوب معمول میں ذرا بھی فرق آجائے، الحاصل آپ کی زندگی فی اللیل رہبان وفی النہار فرسان کا مکمل نمونہ تھی،

واقعہ یہ ہے کہ ایسی جامع کمالات ومتضاد صفات کی حامل شخصیت پر قلم اٹھانے والا محامد ومحاسن کے ہجوم میں متحیر ہو کر رہ جاتا ہے، وہ اگر مسجد نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام اور دارالعلوم دیوبند میں آپ کے درس وتدریس، اصحاب عمل اور مردان کار کی تعلیم وتربیت کو موضوع سخن بنانا چاہتا ہے تو اسی لمحہ میدانِ جہاد میں آپ کے محیر العقول کارنامے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لیتے ہیں وہ اگر آپ کے صدارت جمعیۃ کے عہد پر لکھنے کا ارادہ کرتا ہے تو اسی آن عرفان واحسان کی وہ کیف آگیں بزم جس کے آپ صدر نشین تھے اس کے رہوار تخیل کی زمام اپنی سمت موڑ لیتی ہے، وہ اگر آپ کے تبلیغی مواعظ اور اصلاحی مکاتیب کے سلسلے میں اپنے تأثر بیان کرنا چاہتا ہے تو آپ کے خطبات صدارت اور کراچی کی عدالت میں سنگینوں کے زیر سایہ اعلان حق

تاریخ عزیمت کا ایک نیا باب اس کی نگاہوں کے سامنے کر دیتے ہیں وہ اگر آپ کے محاسن اخلاق اور بلندیٔ کردار کو اپنی بحث و تحقیق کا عنوان بنانا چاہتا ہے. تو آپ کے بحر علم سے اسرار و حکم و علوم و معارف کی اٹھتی ہوئی موجیں اس کے اشہب فکر کو اپنی آغوش میں لے لیتی ہے اور بالآخر فضائل و کمالات کی ان مسلسل اور بے پناہ جلوہ طرازیوں سے مبہوت ہو کر وہ پکار اٹھتا ہے ؎

دامان نگہ تنگ گل حسن تو بسیار
گلچیں زتو تنگیٔ داماں گلہ دارد

یقین جانئے یہ شاعری یا عقیدت کی کرشمہ کاری نہیں ہے بلکہ ان مشکلات و کیفیات کا صحیح اظہار ہے جن سے ان سطور کو سپرد قلم کرتے ہوئے گذرنا پڑا ہے، ظاہر ہے اس پریشان خیالی میں کسی مرتب و مفصل تحریر کی ہوس بے سود تھی اس لئے یوسف کے خریداروں میں نام لکھوانے کی غرض سے یہ بضاعۃ مزجاۃ بعنوان "تین امیازات" لے کر حاضر ہو گیا ہوں ـــــ گر قبول افتد زہے عز و شرف ۔

امتیاز :۔ ① شیخ الہندؒ سے طویل استفادہ

حضرت شیخ الاسلام ماہ صفر ۱۳۰۹ھ میں بغرض تحصیل علم دیوبند پہنچے اور آخر شعبان ۱۳۱۶ھ تک یہاں آپ کا قیام رہا، ساڑھے چھ سال کی اس مدت میں سترہ فنون پر مشتمل سرسٹھ درسی کتابیں اساتذۂ دار العلوم سے پڑھیں جن میں ۲۴ کتابیں خود حضرت شیخ الہند نے پڑھائیں، اس اجمال کی تفصیل خود حضرت شیخ الاسلام کے الفاظ میں ملاحظہ کیجئے

خلاصہ یہ کہ صفر ۱۳۰۹ھ سے شعبان ۱۳۱۶ھ تک دیوبند میں قیام رہا، اس مدت میں مندرجہ ذیل کتابیں مندرجہ ذیل اساتذہ کے پاس ہوئیں۔

(۱) حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ العزیز = دستور المبتدی، زرادی، زنجانی

مراح الارواح، قال اقول، مرقات، تہذیب، شرح تہذیب، قطبی تصورات، قطبی تصدیقات، میر قطبی، مفید الطالبین، نفحۃ الیمن، مطول، ہدایہ اخیرین، ترمذی شریف بخاری شریف، ابو داؤد شریف، تفسیر بیضاوی شریف، نخبۃ الفکر، شرح عقائد نسفی حاشیہ خیالی، مؤطا امام مالک، موطا امام محمد رحمہما اللہ تعالیٰ

(۲) مولانا ذو الفقار علی (والد ماجد حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہما) فصول اکبری

(۳) مولانا عبد العلی صاحب رحمۃ اللہ علیہ مدرس دوم دارالعلوم

مسلم شریف، نسائی شریف، ابن ماجہ شریف، سبعہ معلقہ، حمد اللہ، صدرہ شمس بازغہ، توضیح تلویح

(۴) مولانا خلیل احمد صاحب مرحوم مدرس دارالعلوم دیوبند = تلخیص المفتاح

(۵) مولانا الحکیم محمد حسن صاحب مرحوم مدرس دارالعلوم دیوبند = پنج گنج، صرف میر مختصر المعانی، سلم العلوم، ملا حسن، جلالین شریف، ہدایہ اولین

(۶) مولانا المفتی عزیز الرحمٰن صاحب مرحوم مدرس دارالعلوم دیوبند = شرح جامی بحث فعل کافیہ، ہدایۃ النحو، منیۃ المصلی، کنز الدقائق، شرح وقایہ، مائۃ عامل، اصول الشاشی

(۷) مولانا غلام رسول صاحب مرحوم بغوی، مدرس دارالعلوم دیوبند = نور الانوار حسامی، قاضی مبارک، شمائل ترمذی۔

(۸) مولانا منفعت علی صاحب مرحوم = میر زاہد رسالہ، میر زاہد ملا جلال، میبذی خلاصۃ الحساب، رشیدیہ، سراجی

(۹) مولانا الحافظ احمد صاحب مرحوم = شرح جامی بحث اسم

(۱۰) مولانا حبیب الرحمٰن صاحب = مقامات حریری، دیوان متنبی

(۱۱) بڑے بھائی صاحب مرحوم (مولانا سید محمد صدیق صاحب) منشعب، ایساغوجی[1]

---

[1] نقش حیات ج ۱ ص ۴۵، ۴۶ —

(۱) ـــــــ تعلیم و تحصیل کا یہ ساڑھے چھ سالہ دور حضرت شیخ الہند کے زیرسایہ اور ملازمت میں بسر ہوا، کیونکہ اس پوری مدت میں آپ کا قیام حضرت کے مکان کے متصل ایک کوٹھی میں رہا، اس قربت مکانی کے علاوہ آپ کے بڑے بھائی مولانا محمد صدیق صاحب حضرت شیخ الہند کے خدام میں سے تھے، اس تقریب سے ابتداہی سے آپ کو حضرت شیخ الہند کا تقرب حاصل ہوگیا۔

(۲) ـــــــ فراغت تعلیم اور مدینہ منورہ میں اقامت پذیر ہوجانے کے بعد ۱۳۲۷ھ میں جب عارضی طور پر ہندوستان تشریف لائے تو تقریباً ایک سال مزید حضرت شیخ الہند کی خدمت میں رہ کر ترمذی و بخاری کو دوبارہ بحث و تحقیق سے پڑھا۔ لکھتے ہیں۔

۱۳۲۶ھ کے آخر میں (مدینہ منورہ) سے روانہ ہوکر ۱۳۲۷ھ میں دیوبند پہنچا ...... اور ترمذی، بخاری میں شریک ہوگیا اور بالالتزام ان دونوں کتابوں کو پڑھا مسائل پر پوری بحث کرتا تھا حضرت رحمۃ اللہ بھی اس مرتبہ غیرمعمولی توجہ فرماتے تھے اور خلاف عادت تحقیقی جواب نہایت وضاحت سے دیتے تھے [۱]

(۳) ـــــــ علاوہ ازیں اسارت مالٹا کا پورا زمانہ حضرت شیخ الہند کی معیت و صحبت میں گزرا، اور اس کنج تنہائی میں حضرت شیخ کے آفتاب فیض سے باطمینان خاطر علم و فکر کی روشنی اخذ کرتے رہے، اس طرح مجموعی طور پر دس گیارہ سال تک آپ کو حضرت شیخ الہند کی صحبت و ملازمت کا شرف حاصل ہوا۔

حضرت شیخ الاسلام کا یہ ایسا امتیاز ہے جس میں ان کے رفقاء و معاصرین میں کوئی بھی ان کا شریک و سہیم نہیں، علم و فکر کی پختگی میں شیخ سے طول ملازمت کا جو مقام ہے، اہل نظر سے مخفی نہیں، سچ پوچھئے تو اسی اتصال و یک نفسی نے حضرت

---

[۱] نقش حیات ج ۱ ص ۴۴

شیخ الاسلام کی ذات کو ایک ایسا آئینہ بنادیا تھا جس میں شیخ الہند کے سراپا کو بخوبی دیکھا جاسکتا تھا۔

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا

امتیاز (۲) مسجد نبویؐ میں حلقۂ درس:۔

شعبان ۱۳۱۶ھ میں آپ کو تعلیم وتحصیل سے فراغت حاصل ہوئی، اور اسی سال ماہ شعبان میں آپ کے والد ماجد نے مدینہ طیبہ زادہا شرفاً وتعظیماً کی جانب ہجرت کے ارادہ سے رختِ سفر باندھا، والد محترم کے حکم سے حضرت شیخ الاسلام نے بھی انھیں کی معیت میں ہندوستان کے بجائے ارضِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا مسکن وماویٰ بنالیا، جیساکہ خود رقم طراز ہیں

"محرم ۱۳۱۷ھ کی ابتدائی تاریخوں میں مدینہ منورہ میں شرف حضور حاصل ہوا، حرم نبویؐ کے باب النساء کے قریب زقاق البدور کے کنارے پر ایک مکان کرایہ پر لیکر قیام کیا گیا۔[1]

مدینہ منورہ میں پہونچ کر رہائش وغیرہ کے معاملات سے مطمئن ہوجانے کے بعد آپ نے درس وتدریس کا سلسلہ شروع کردیا، اس اجمال کی تفصیل خود حضرت شیخ الاسلام کی زبانی سماعت کیجئے - فرماتے ہیں

"درس وتدریس کی تفصیل یہ ہے کہ اواخر شعبان ۱۳۱۶ھ میں جبکہ ہم تینوں بھائی (حضرت شیخ الاسلام مولانا محمد صدیق صاحب ومولانا سید احمد صاحب) دیوبند سے آخری طور پر روانہ ہوئے، تو منجملہ رخصت کرنیوالوں کے حضرت شیخ الہند قدس سرہ العزیز ساتھ ساتھ اسٹیشن دیوبند تک تشریف لائے تھے، راستہ میں پر زور طریقہ پر ہدایت فرمائی کہ پڑھانا

---

[1] نقش حیات ج ۱ ص ۵۱

ہرگز نہ چھوڑنا چاہیے وہ ایک طالب علم ہی ہوں" اسلئے تعلیمی مشغلہ کا خیال
بہت زیادہ ہوگیا تھا مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد بعض بعض طلبہ ہندوستان
اور عرب بعض کتابوں کی تدریس کے خواستگار ہوئے (اور حسب ہدایت
حضرت شیخ الہند قدس سرہ العزیز اس کام کو شروع کردیا" [1]

چونکہ حضرت شیخ الاسلام کی عمر ابھی کم تھی اور یہاں کے نووارد بھی تھے اور بقول سعدیؒ

تامرد سخن نگفتہ باشد　　عیب وہنرش نہفتہ باشد

آپ کے علمی مقام و مرتبہ اور صلاحیتوں پر اجنبیت اور عدم واقفیت کا پردہ پڑا ہوا تھا اسلئے ابتدا میں تقریباً ایک سال تک طلبہ کا رجوع آپ کی طرف کم رہا، لیکن دو سال گذرتے گذرتے آپ کا نہال علم ایک تناور درخت ہوگیا جس کے سائے میں حجاز، ترکستان بخاری، ہندوستان، کابل، الجزائر، قازان، مصر وغیرہ دور ونزدیک سے مسافران علم کے قافلے در قافلے اترنے لگے اور آپ کے تبحر علمی کے غلغلے سے مدینۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کے گلی کوچے پر شور ہوگئے، آپ کے درس کو اس درجہ مقبولیت حاصل ہوئی کہ قدیم اساتذہ مسجد نبوی کے حلقہ ہائے درس سونے پڑ گئے اور ان کی ساری رونق سمٹ کر حضرت شیخ الاسلام کے قدموں میں نچھاور ہونے لگی۔ سہ

وہ آئے بزم میں اتنا تو میرؔ نے دیکھا　　پھر اسکے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

ایک نووارد اور وہ بھی ایک نوعمر کا اس قدر جلد شہرت ومقبولیت کے بام عروج پر پہنچ جانا عام حالات میں بڑے بڑے وسیع ظرف اور سیرچشموں کیلئے بھی رشک ورقابت اور حسد کا سبب ہوجاتا ہے کچھ اسی طرح کا معاملہ حضرت شیخ الاسلام کے ساتھ بھی پیش آیا کہ آپ کا علمی عروج دیکھ کر مسجد نبوی علی صاحبہا الصلوۃ والسلام کے قدیم اساتذہ کی رگ حسد پھڑک اٹھی، جس کی بنا پر آپ کو چند ے مشکلات اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا،

---

[1] نقش حیات ج ۱ ص ۵۷

لیکن جس آقائے کریم نے سر پر مقبولیت کا تاج رکھ کر آپ کو سرفراز فرمایا تھا اسی نے ان مشکلات کا مداوی بھی کر دیا، اور آپ کی نیک نامی دن دونی رات چوگنی بڑھتی ہی رہی خود حضرت شیخ الاسلامؒ نے مدینہ منورہ میں اپنے مشاغل علمیہ پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے

۱۳۱۸ھ شوال تک ...... میں ابتدائی کتابیں مختلف فنون کی دو دو چار چار طالب علم کو پڑھاتا رہا ۱۳۱۸ھ ذی قعدہ میں قطب عالم حضرت گنگوہی قدس سرہ العزیز کے ارشاد کے مطابق گنگوہ کا سفر کیا۔ اور ۱۳۲۰ھ محرم میں مدینہ منورہ واپس ہوا، یہاں پہونچنے کے بعد مدرسہ شمسیہ باغ معروف بہ توطیہ کے مدرسہ میں بعہدہ مدرسی ۳۵ روپے ماہوار ملازم ہو گیا چونکہ طلبہ کا ہجوم ہوا اس لئے خارج از مدرسہ اوقات میں حرم محترم میں کتابیں شروع کرادیں، سمجھدار اور جدوجہد کرنیوالے طلبہ کا اجتماع میرے پاس بہت زیادہ ہو گیا جس سے مدرسین حرم محترم کو حسد اور رقابت پیدا ہو گئی طلبہ صرف اہل مدینہ نہ تھے بلکہ ترک، بخاری قازانی، قزق، ترکستان، کابلی، مصری وغیرہ بھی تھے (اس حسد کا نتیجہ یہ ظاہر ہوا کہ) ..... ناظر مدرسہ شمسیہ باغ کو اصرار ہوا کہ خارج از اوقات مدرسہ میں کہیں نہ پڑھایا جائے اس قسم کی چند باتیں اور پیش آئیں جن کی وجہ سے بمجبوری مدرسہ کی ملازمت سے استعفا دینا پڑا اور یہ ارادہ کر لیا گیا کہ لوجہ اللہ بلامعاوضہ حرم محترم میں اسباق پڑھائے جائیں اور رزق کو اسکے کفیل جناب باری عز اسمہ کی کفالت پر رکھا جائے، چنانچہ کتب درسیہ کا میدان وسیع کر دیا گیا، حضرت گنگوہی قدس سرہ کی بارگاہ میں ان اسباق کی فہرست اور مشاغل کی تفصیل لکھی ..... (کہ) طلبہ علوم کا اصرار بہت زیادہ ہے مجبور ہو کر میں نے دن رات کا اکثر حصہ اسی میں صرف کر رکھا ہے، جواب میں حضرت رحمۃ اللہ نے ارشاد فرمایا "پڑھاؤ خوب پڑھاؤ، اس سے ہمت زیادہ بڑھ گئی، روزانہ چودہ اسباق پڑھاتا تھا، پانچ صبح کو تین یا چار

ظہر کے بعد دو عصر کے بعد، دو مغرب کے بعد ایک عشاء کے بعد۔[1]

آگے چل کر لکھتے ہیں۔

۱۳۲۰ھ سے ۱۳۲۶ھ تک مسلسل طور پر میرا مشغلہ علمی مدینہ منورہ میں جاری رہا .... چونکہ مدینہ منورہ میں منگل اور جمعہ کو تعطیل ہوتی ہے۔ تو ان تعطیل کے ایام میں بھی خصوصی دروس چار پانچ ہوتے تھے ...... علوم میں جد و جہد کرنے والے طلبہ کا ہجوم اس قدر ہوا کہ علماء و مدرسین کے حلقہ ہائے درس میں اس کی مثال نہیں تھی۔[2]

۱۳۲۷ھ میں آپ پھر ہندوستان وارد ہوئے اور ۱۳۲۹ھ تک ہندوستان ہی میں قیام پذیر رہے اسی سفر میں آپ نے حضرت شیخ الہند سے ترمذی و بخاری دوبارہ پڑھی جس کا تذکرہ اوپر گذر چکا ہے، نیز اس عارضی قیام کے زمانہ میں آپ کو اکابر دارالعلوم نے باقاعدہ طور دارالعلوم کا استاذ بھی منتخب کر لیا تھا اور اس تصریح کے ساتھ کہ یہ انتخاب دوامی ہے، درمیان میں وقفہ کے بعد جدید تقرر کی ضرورت نہیں ہوگی بلکہ یہی تجویز تقرر کافی سمجھی جائیگی، یہ حضرات اکابر رحمہم اللہ کی جانب سے آپ کی علمی لیاقت پر اعتماد اور وثوق کی ایسی گرانقدر سند ہے جو فضلائے دارالعلوم میں سب سے پہلے آپ ہی کو مرحمت ہوئی، اور غالباً آپ ہی پر اس کا آخر بھی ہو گیا۔ ذٰلک فضل اللہ یعطیہ من یشاء"

حضرت شیخ الاسلام نے بھی اس یادگار تجویز کا تذکرہ فرمایا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں

۱۳۲۷ھ شوال میں اکابر نے مجھ کو تدریس کا حکم دیا جلسہ اہل شوریٰ نے حضرات مہتممین رحمہما اللہ تعالیٰ کی خواہش پر تجویز پاس کر دیا کہ حسین احمد کو بالفعل بمشاہرہ ۳۴ روپے ماہوار مدرس کر دیا جائے اور اسکے بعد جب بھی وہ مدینہ منورہ سے ہندوستان آئے اس کو بغیر تجدید اجازت از مجلس شوریٰ مدرس کیا جائے۔[3]

---

[1] نقش حیات ج ۱ ص ۵۰ تا ۴۷ باختصار [2] ایضاً ج ۱ ص ۹۶ تا ۹۹ باختصار [3] ایضاً ج ۱ ص ۱۳۲

۱۳۲۹ھ میں آپ مدینہ منورہ واپس حاضر ہو گئے، ۱۳۳۱ھ میں چند مہینوں کے لئے پھر ہندوستان آنا ہوا اس کے بعد مسلسل محرم ۱۳۳۵ھ تک آپ کا قیام مدینہ ہی میں رہا اور مشاغل درس و تدریس برابر جاری رہے تا آنکہ صفر ۱۳۳۵ھ میں حکومت برطانیہ کی سازش اور ایماء پر حضرت شیخ الہند (جو اس وقت حجاز مقدس ہی میں تھے) اور دیگر رفقاء کے ساتھ آپ کو گرفتار کر کے مالٹا جیل میں پہنچا دیا گیا، اس تفصیل سے واضح ہوتا ہے کہ آپ نے اپنی سترہ سالہ اقامت مدینہ کے دوران باستثناء وقفہ قیام ہند کم و بیش ۱۲-۱۳ سال مسجد نبوی میں خود صاحب وحی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے زیر نظر کتاب و سنت اور دیگر فنون اسلامیہ کا کامیاب درس دیا، مجد و شرف کا یہ تاج جو حضرت شیخ الاسلام کے سر پر رکھا گیا بارگاہ صمدیت کا ایسا بیش بہا اور عظیم عطیہ ہے جو بندگان خاص ہی کو عطا کیا جاتا ہے، بغیر کسی خوف تردید کے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ حضرت شیخ الاسلامؒ کا یہ ایسا طرۂ امتیاز ہے جس میں وہ اپنے تمام ہم عصر علماء میں بالکل منفرد و ممتاز ہیں،

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا"

اس خصوصی تربیت گاہ مدنی کے افق سے علم و فکر اور جہد و عمل کے کیسے کیسے ماہ و اختر طلوع ہوئے افسوس کہ آپ کے سوانح نگاروں نے اپنی سہل انگاری اور سہولت پسندی کی بنا پر اس کی جانب کوئی توجہ ہی نہ کی، اس طرح حیات مدنی کا یہ زریں در روشن باب ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا اور اب اس پر ماہ و سال کے اس قدر دبیز پردے پڑ چکے ہیں کہ انھیں ہٹا کر حقیقت حال کو واضح کرنا غیر ممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے لیکن اس مشکل کی وجہ سے اس اہم ترین موضوع سے آنکھ بند کر کے گذر جانا کسی طرح مناسب نہیں، اس لئے اس کی طرف مختصر طور پر ہی سہی کچھ اشارات ضروری ہیں، ممکن ہے آگے آنے والے مورخ کو انھیں اشاروں کی روشنی میں بحث و نظر کیلئے کوئی واضح شاہراہ مل جائے اور وہ اپنی تحقیق کے دائرے کو وسیع کر سکے سو ما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت و الیہ انیب

"طلبہ کا اس قدر ہجوم ہوا کہ علماء و مدرسین کے حلقہ ہائے درس میں اس کی مثال نہیں تھی"

حضرت شیخ الاسلام کا یہ اشارہ بتا رہا ہے کہ شمع مدنی کے گرد اکٹھا ہونے والے پروانوں کی تعداد سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں میں رہی ہوگی، پھر خود حضرت ہی یہ اطلاع دے رہے ہیں کہ "یہ طلبہٴ علوم صرف مدینہ منورہ ہی کے نہیں تھے بلکہ اس ہجوم میں ہندوستان ترک، بخاری، قازان، قزق، ترکستان، کابل مصر وغیرہ کے طالبان علم بھی تھے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حلقہٴ درس ودائرہ تربیت نہایت وسیع تھا۔ مجلہ المنہل مدینہ منورہ کے بیان سے بعض تلامذہ کے ناموں کی تعیین بھی ہو جاتی ہے، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ضروری اقتباس اس موقع پر پیش کر دیا جائے، مجلہ المنہل نے حضرت شیخ الاسلام کی وفات کے موقع پر جو تعزیتی مضمون شائع کیا تھا یہ اقتباس اسی مضمون سے ماخوذ ہے

تلقی علیہ العلم الناس کثیرون وانتفع الطلاب من تعلیمہ وکان من تلامیذہ مدرسون وقضاۃ وحکام ومدیرون ورؤساء یذکرون منھم المرحومین المشائخ عبدالحفیظ الکردی الکورانی عضو المحکمۃ الکبری بالمدینۃ واحمد البساطی نائب القاضی بھا سابقا ومفتی الاحناف بھا ومحمود عبدالجواد رئیس بلدیۃ المدینۃ وکذلک الشیخ محمد البشیر الابراھیمی العالم الجزائری المجاھد فی سبیل التطویح ببغاۃ الاستعمار من الجزائر العربیۃ العریقۃ۔ [1]

بہت سے لوگوں نے آپ سے علم حاصل کیا اور کثیر طلبہ آپ کی تعلیم وتدریس سے منتفع ہوئے آپ کے تلامذہ میں مدرسین قاضی وحکام، سرکاری محکموں کے سکریٹری اور رؤسا

---

[1] نقش حیات

تھے ان میں حسب ذیل مرحومین مشائخ کا ذکر کیا جاتا ہے۔
(۱) الشیخ عبدالحفیظ الکردی الکورانی رکن محکمۂ کبری مدینہ منورہ (۲) الشیخ احمد البساطی نائب قاضی و مفتی احناف مدینہ منورہ (۳) الشیخ محمود عبدالجواد صدر میونسپلٹی مدینہ منورہ (۴) محمد البشیر الابراہیمی الجزائری جنھوں نے الجزائر سے استعماری باغیوں کو دور کرنے میں زبردست جہاد کیا۔

مجلہ الوعی الاسلامی کویت سے مزید ایک اور الجزائری مجاہد کے نام کی تعیین ہوتی ہے الامام عبدالحمید بن بادیس المصلح الجزائری المعاصر کے عنوان سے الوعی الاسلامی نے ڈاکٹر محمود بن محمد قاسم کا ایک ادر مقالہ شائع کیا اس مقالہ میں ڈاکٹر صاحب موصوف شیخ عبدالحمید بن بادیس کے سفر حجاز کے ضمن میں لکھتے ہیں۔

ثم سافر الی مکة لاداء فریضة الحج فی سنة ۱۹۱۳ء وفی الحجاز لقی عددا من علماء مصر والشام وتتلمذ علی الشیخ حسین احمد الهندی الذی نصحه بالعودة الی الجزائر، اذ لاخیر فی علم لیس بعده عمل۔

پھر شیخ عبدالحمید بن بادیس نے فریضۂ حج کی ادائیگی کی غرض سے مکہ معظمہ کا سفر کیا اور حجاز میں متعدد علماء مصر و شام سے ملاقات کی اور شیخ حسین احمد ہندی سے (شرف) تلمذ حاصل کیا جنھوں نے شیخ عبدالحمید کو الجزائر واپس جانے کی نصیحت کی کیونکہ اس علم میں کوئی خوبی نہیں جس کے بعد عمل نہ ہو

ان مراجع سے درج ذیل تلامذہ کی نشاندہی ہوتی ہے جنھوں نے آپ سے قیام مدینہ منورہ کے زمانہ میں اخذ فیض کیا شیخ عبدالحفیظ کردی کورانی (رکن محکمہ کبری) مدینہ منورہ شیخ احمد بساطی نائب قاضی و مفتی احناف مدینہ منورہ، شیخ محمود عبدالجواد (صدر میونسپلٹی مدینہ منورہ) شیخ محمد البشیر الابراہیمی جزائری، آخرالذکر دونوں جزائری تلامذہ کے سلسلے میں ہم قدرے تفصیلی گفتگو کر رہے ہیں کیونکہ ہمارے موضوع کے آخری جز سے انھیں ہر دو حضرات کی خدمات و کارنامے متعلق ہیں اور آج تک اس پر کچھ لکھا بھی نہیں گیا ہے

(باقی آئندہ)

حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی قدس سرہ کے دس غیر مطبوعہ مکاتیب

یہ تمام مکتوبات مولانا محمد ایوب جان بنوری کے نام ہیں اور دو ایک کے علاوہ سبھی تصوف کے موضوع پر ہیں جو اہل نظر کیلئے بڑی اہمیت کے حامل ہیں، مخدوم زادہ حضرت مولانا سید ارشد مدنی کے ہم شکر گذار ہیں کہ انھوں نے اس نادر مجموعے کی فوٹو کاپی عنایت فرماکر ہمیں اس قابل بنا دیا کہ اس خزانہ عامرہ کو قارئین دارالعلوم کی خدمت میں پیش کرسکیں۔ حبیب الرحمٰن قاسمی

مکتوب (۱)

محترم المقام زید مجدکم — السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ، مزاج شریف

میں ۳ رذیقعدہ کو بقصد زیارت حرمین شریفین دیوبند سے روانہ ہوگیا اور ۵ رذیقعدہ کو کراچی پہنچا، ۹ ذیقعدہ کی شام کو جہاز خسرو پر بیٹھا اور ۶ بجے شام کو جہاز مذکورہ روانہ ہوکر، ۱۷ رذیقعدہ کو کامران بخیر وعافیت پہنچا۔

طریقہ ذکر جو کچھ آپنے لکھا ہے، صحیح ہے، اس ذکر جہر شروع کرنے سے پہلے درود شریف ۳ مرتبہ سورۂ فاتحہ ۳ مرتبہ سورۂ اخلاص ۱۲ مرتبہ درود شریف ۳ مرتبہ پڑھ کر دعا کر لیا کریں کہ اللہ تعالیٰ اس کا ثواب میرے مشائخ طریقت کو پہونچا دے اور ان کے طفیل میں میرے قلب کو ماسواسے پاک اور اپنی معرفت کے انوار سے منور کردے اسکے بعد ذکر شروع کیا کریں۔

پاس انفاس کی مشق اس قدر کریں کہ طبیعت ثانیہ بن جائے اور بلا اختیار و بلا ارادہ ہر وقت سانس اسی طرح جاری رہے، سانس میں کوئی آواز یا تیزی پیدا

نہونی چاہیے، حسب عادت جاری ہو، زبان اور ہونٹ کو حرکت نہونی چاہیے۔

آپ کو جلد از جلد اپنا نکاح کرنا چاہیئے، مناظر کے استحسان کے وقت یہ ہی خیال کرنا چاہیئے کہ یہ چہرہ منی اور حیض جیسی نجس چیزوں سے بنایا گیاہے، اور عنقریب یہ حسن وجمال خاک میں پیپ اور لہو بنکر کیڑے پڑکر مل جائیگا، ان آنکھوں میں ہر روز علی الصباح کیچڑ نکلتا ہے ناک اور منھ سے غلیظ بلغم قابل نفرت نکلتاہے، منھ سے لعاب قابل نفرت نکلتاہے، کانوں سے میل بدمزہ اور بدصورت نکلتاہے، مصور فطرت نے ناپاک اور نجس چیزوں کو امتحان کیلئے زینت دیکر سجا دیا ہے فتبارك الله احسن الخالقین! زین للناس حب الشھوات من النساء والبنین الآیۃ استغفار کی کثرت رکھیں والد صاحب اور بھائی صاحبوں اور دیگر احباب واعزہ واقفین پرسان حال سے سلام مسنون کہدیں　والسلام

ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہٗ

[یہ مکتوب ذیقعدہ ۱۳۵۴ھ کے اوائل میں لکھا گیا ہے کیونکہ جس خط کے جواب میں یہ سپرد قلم ہوا ہے اس پر ۲۸ رشوال ۱۳۵۴ھ کی تاریخ لکھی ہوئی ہے]

مکتوب ــــ (۲)

محترم المقام، زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ - مزاج شریف

والانامہ باعث سرفرازی ہوا، یادآوری کا شکریہ ادا کرتا ہوں، اگر خدا کو منظور ہے تو جلد ملاقات نصیب ہوگی، آپ استقلال کے ساتھ والدین ماجدین کی خوشنودی اور رضا کے تحت اذکار واعمال کو انجام دیتے رہیں - اگر ہو سکے تو صراط مستقیم مصنفہ حضرت شاہ محمد اسمٰعیل صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ زیر مطالعہ رکھیں، دعوات صالحہ سے

فراموش نہ فرمائیں، والد صاحب اور مولوی یوسف صاحب اور دیگر واقفین سے سلام مسنون عرض کردیں۔ والسلام

ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہٗ
سلہٹ، نئی سڑک ۹ ر رمضان المبارک ۵۵ھ

مکتوب (۳)

محترم المقام زید مجدکم ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

والانامہ باعث سرفرازی ہوا، پڑھانا بہت مبارک مشغلہ ہے اوراد کو ترک کرنا نہ چاہئے البتہ پڑھانے کیلئے سترہ اسباق زیادہ ہیں اس میں کچھ کمی کردیجئے، مستقل طور پر اسباق میں سے وقت بچا کر مراقبہ میں اور ذکر میں وقت صرف کرتے رہئے۔

فرنٹیر میں آنے کے متعلق میرا ابھی تک کوئی خیال نہیں ہے، فرصت بالکل نہیں ہوتی، مجالس سے گھبرانا اچھی بات ہے جس قدر ممکن ہو ذکر میں وقت صرف ہونا چاہئے یا علم وتعلیم میں۔ والسلام۔ والد صاحب اور چچا صاحب اور دوسرے واقفین کی خدمات عالیہ میں سلام مسنون عرض ہے۔ والسلام۔

ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہٗ
۲۱ صفر ۵۷ھ

مکتوب (۴)

محترم المقام۔ زید مجدکم — السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

والانامہ محررہ ۲۳ ر رمضان المبارک بالکل آخری ایام رمضان المبارک میں پہونچا عدیم الفرصتی شدید تھی اسلئے جواب سے معذور رہا، عید کے بعد مختلف جگہوں میں جلسوں

کی وجہ سے سخت مصروفیت رہی، اب دیوبند واپس ہو رہا ہوں اس وقت بھاگلپور کے قریب سفر کر رہا ہوں، ریل میں سے جواب لکھ رہا ہوں، آپ کا ماہ شعبان میں نہ آسکنا کوئی حرج نہیں رکھتا، والد ماجد اور عم محترم کی خدمت گذاری نعمت عظیم ہے بالخصوص والدین ماجدین کی رضا جوئی اور خدمت گذاری جس قدر بھی ممکن ہو ان کو خوش رکھیں اور خدمات انجام دیتے رہیں۔ تعلیمی اشغال بھی نہایت ضروری اور مفید ہیں مگر اذکار کیلئے بھی وقت ضرور رکھیں اور کمی نہ کریں اس وقت میں مراقبہ میں وقت صرف کرنا اشد ضروری ہے، پاس انفاس اور ذکر قلبی چونکہ جاری ہو چکے ہیں ان کے لئے کوئی خاص وقت معین کرنے کی ضرورت نہیں رہی وہ خود بخود جاری رہیں گے، ان کا تعلق اسم سے ہے اور مراقبہ کا تعلق مسمی سے ہے مسمی تک پہونچنے کے بعد اسم کو زیادہ تر اہمیت نہیں رہتی۔ مقصود بالذات مسمی ہے اسم وسیلہ ہے اس لئے اس کی طرف توجہ کرنی اہم اور اشد ضروری ہے، اس میں وقت ضروری طور پر صرف کرنا چاہئے، قلب میں درد کا محسوس کرنا عارضی امر ہے، آہستہ آہستہ یہ جاتا رہے گا، کوئی جسمانی محنت کی جاتی ہے تو جسم کو درد محسوس ہونے لگتا ہے، جسمانی ورزشوں کو ملاحظہ فرمائیے، ذات مقدسہ منزہ عن شوائب النقص والزوال متصف بغایۃ الجاہ والجلال کی تجلی اور تصور سے یقیناً قلب پر ثقل عظیم پڑے گا حالانکہ وہ ذات بے چون وبلا کم وکیف قلب اور روح اور تمام لطائف میں بلا کیف جلوہ پذیر ہے وفی انفسکم افلا تبصرون ونحن اقرب الیہ من حبل الورید مگر انسان اس سے غافل ہے غفلت کے دور ہونے پر ثقل کا ہونا لازم ہے ان اللہ اذا تجلی لشئ خضع لہ مقولہ معتبرہ ہے لا یسعنی ارضی ولا سمائی الا قلب عبدی المومن حدیث قدسی ہے مگر لا یسعنی کے معنی لا یتحملنی ولا یطیقنی کے ہیں، قلب مؤمن (یعنی قلب حقیقی جو کہ قلب صنوبری میں حال ہے) عالم امر کی چیز اور فضل عرش نہایت قوی مادہ سے ہے وہ تجلیات ذاتیہ کا متحمل ہو سکتا ہے، عالم امکان میں یہ مادی

دنیا ظلی وجود رکھنے والی تجلیات ذاتیہ کی متحمل نہیں ہوسکتیں فلما تجلّٰی ربہ للجبل جعلہ دکا الآیہ بہرحال جس قدر فراغ ممکن ہو صبح وشام اس مراقبۂ ذات بلاکیف و بلاکم میں خرچ کریں وہ ذات مقدسہ نورا ورنارا درجملہ عوارض ممکنہ سے منزہ اور پاک ہے صورت شمس وغیرہ جو بھی پیش آئیں سب سے اعراض کریں، یہ چیزیں دکھائی دیں گی مگر بجز ذات وحدہٗ لاشریک لہ بلاکیف موجود حقیقی ومحبوب تحقیقی کسی کو بھی مقصود اور قبلہ توجہ قرار نہ دیں، اس کے جاہ وجلال عظمت وکمال کو زیر نظر رکھیں بلغکم اللہ علی اسی المرادات والحقکم وایانا بالرفیق الاعلیٰ ومع الذین انعم اللہ علیھم والدین ماجدین اور عم بزرگوار اور متعلقین سے سلام مسنون عرض کردیں، دیگر واقفین وپرسان حال سے بھی سلام مسنون عرض کردیں، اس مدبر روسیاہ کو دعوات صالحہ سے فراموش نہ فرمائیں وفقکم اللہ وایانا لما یحبہ ویرضاہ آمین

ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہ

۱۵ رشوال ۱۳۵۸ھ

مکتوب (۵)

محترم المقام - زید مجدکم۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ، مزاج شریف، والانامہ باعث سرفرازی ہوا، یادآوری کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ امید اینکہ آپ بخیر وعافیت ہوں گے۔

میرے محترم! آپ کو معلوم ہے کہ اس دنیائے فانی میں ہمارے قیام کے دن بہت تھوڑے ہیں مگر یہی دن کمانے کے ہیں، ان دنوں کے گذر جانے کے بعد کسی کمال کو حاصل کرنا غیر ممکن ہے، پس جو کچھ بھی سعی آپ کو ان ایام میں ممکن ہو اس میں دریغ نہ فرمادیں تمام مقاصد اور آرزوؤں میں سب سے اعلیٰ اور انفع قرب خداوندی اور اس کی خوشنودی ہے، حافظ شیرازی مرحوم کہتا ہے۔

؎ دنیا و آخرت را بگذار حق طلب کن
کایں ہر دو لولیاں را من خوب می شناسم

تکملہ مثنوی میں ہے

ہر نفس بہرت مسیحائیست چیست گر نداری پاس او از جہل ست
ایں چنیں انفاس خوش ضائع مکن غفلت اندر شہر جان شائع مکن

دعوات صالحہ سے فراموش نہ فرمائیں، والد صاحب اور چچا صاحب اور دوسرے واقفین پرسان حال سے سلام مسنون کہدیجئے۔ والسلام

ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہٗ
۴ رجمادی الاول ۵۹ھ

ماہنامہ

دارالعلوم

دیوبند

دارالعلوم دیوبند کا ترجمان

ماہ شوال المکرم ۱۴۰۸ھ

مطابق

ماہ جون ۱۹۸۸ء

شمارہ ۶ ✤ جلد ۷۳

نگران

حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب

مہتمم دارالعلوم دیوبند

مدیر

مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی

فی شمارہ ——— چار روپے

سالانہ ——— چالیس روپے

سالانہ بدل اشتراک غیر ممالک سے

سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ

امریکہ وغیرہ کا سالانہ =/160

پاکستان سے =/70

بنگلہ دیش سے (ہندوستانی) =/50

○

سرخ نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی زر تعاون ختم ہو گیا

مطبوعہ محبوب پرنٹنگ پریس دیوبند

فہرست مضامین

ہندوستانی و پاکستانی خریداروں سے ضروری گذارش

۱ — ہندوستانی خریداروں سے ضروری گذارش یہ ہے کہ ختم خریداری کی اطلاع پاکر اولین فرصت میں اپنا چندہ نمبر خریداری کے حوالہ کے ساتھ منی آرڈر سے روانہ کریں۔

۲ — پاکستانی خریدار اپنا چندہ مبلغ /۷ مولانا عبدالستار صاحب مہتمم جامعہ عربیہ محمودیہ داؤد والا براہ شجاع آباد ملتان، پاکستان کو بھیجدیں۔

۳ — خریدار حضرات پتہ پر درج شدہ نمبر محفوظ فرمالیں، خط وکتابت کے وقت خریداری نمبر ضرور لکھیں۔

والسلام

منیجر

نکاح کے شرعی قوانین

قسط اوّل

مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی

تعریف نکاح ا — نکاح ایک شرعی معاہدہ ہے جس کے ذریعہ مرد و عورت کے درمیان جنسی تعلق جائز اور اولاد کا نسب صحیح ہو جاتا ہے اور زوجین کے درمیان دیوانی حقوق پیدا ہو جاتے ہیں۔

تشریح نکاح کے لغوی معنی "ملانا" اور حقیقی معنی "جماع" کے ہیں، اور اس کا مقصد جائز اولاد پیدا کرنا ہے[۱]۔

معاهدہ نکاح کی نوعیت اور عدالتیں

جہاں تک معاہدۂ نکاح کی نوعیت کا تعلق ہے اس بارے میں عدالت ہائے عالیہ ہند و پاک اور پریوی کونسل کا زمانہ دراز سے یہ نقطہ نظر رہا ہے کہ دیگر عام معاہدات کی طرح نکاح ایک دیوانی معاہدہ ہے چنانچہ غیر منقسم ہندوستان کے مشہور جج جسٹس محمود نے تقریباً اسّی سال قبل بمقدمہ عبدالقادر بنام سلیمہ بی اسلامی قانون میں نکاح کی نوعیت پر بحث کرتے ہوئے اس سے اتفاق کیا کہ مسلمانوں میں نکاح ایک مذہبی رسم نہیں بلکہ ایک خالص دیوانی معاہدہ ہے — جسٹس محمود کے اس نقطۂ نظر کو اختیار کرنے کے بعد ہند و پاک کی تقریباً تمام ہی عدالتوں نے نکاح کو ایک خالص دیوانی معاہدہ قرار دیا — حالانکہ اسلامی نکاح کو خالص دیوانی معاہدہ کہنا اسلامی تصور نکاح کے ساتھ سراسر زیادتی اور ناانصافی ہے۔

---

[۱] النکاح فی اللغۃ الضم ثم یستعمل فی الوطء .... والتوالد والتناسل من المقاصد، کفایۃ علی الھدایۃ ص ۹۸۔

صحیح نقطۂ نظر:-

حقیقت یہ ہے کہ نکاح ایک مقدس شرعی معاہدہ ہے، البتہ جو حقوق و فرائض اسکے ذریعہ زوجین کے درمیان پیدا ہوتے ہیں وہ دیوانی نوعیت کے حامل ہیں، اور عدالتوں کے ذریعہ نافذ کرائے جاسکتے ہیں ـــــ لیکن محض حقوق کے دیوانی ہونے کی بنا پر نکاح کو خالص دیوانی معاہدہ نہیں کہا جا سکتا، وہ حقوق کسی ملک کے قانون ساز دارے نے عطا نہیں کئے ہیں بلکہ ایجاب و قبول سے جو معاہدۂ نکاح مشہود ہوتا ہے اسکے ساتھ ہی وہ جملہ حقوق و ذمہ داریاں ایک دوسرے سے وابستہ ہوجاتی ہیں جو اللہ تعالیٰ کے فرمان اور شارع علیہ السلام کی ہدایات پر مبنی ہیں اسی لئے فقہائے اسلام نے نکاح کو عبادات اور معاملات دونوں میں داخل کیا ہے۔

نکاح ـــــ ایک شرعی حکم

نکاح کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اور انبیاء کی سنت کہا ہے[۱]، چنانچہ حالتِ اعتدال میں نکاح سنت مؤکدہ ہے[۲]۔ اور جب زنا میں پڑجانے کا خوف ہو اور مرد عورت کے مہر ونفقہ پر قادر ہو تو نکاح واجب ہے، جس کا نہ کرنا باعث گناہ ہے[۳]

---

[۱] قال صلی اللہ علیہ وسلم اربع من سنن المرسلین الحناء والتعطر والسواک والنکاح رواہ الترمذی، وقال اتزوج النساء فمن رغب عن سنتی فلیس منی، فتح القدیر، ص ۱۰۱ [۲] قیل مستحب وقیل انہ سنۃ مؤکدۃ وھو الاصح وھو محمل قول من اطلق الاستحباب وکثیرا ما یتساھل فی اطلاق المستحب علی السنۃ. فتح القدیر، ص ۱۰۱ - [۳] وفی النہایۃ ان کان لہ خوف الوقوع فی الزنا بحیث لا یتمکن من التحرز الا بہ کان فرضا - فتح القدیر، ص ۱۰۰ - فھو فی حالۃ الاعتدال سنۃ مؤکدۃ وحالۃ التوقان واجب وحالۃ خوف الجور مکروہ کذا فی الاختیار شرح مختار، عالمگیری، ج ۱، ص ۲۶۷ -

نکاح ——— ایک عبادت

صحابۂ کرام و حنفی فقہاء کے اقوال کے بموجب نکاح کی مشغولیت نفل عبادت سے افضل ہے[1]

مختلف اسلامی فرقوں اور مذاہب کے افراد کے درمیان نکاح

مسلمان فرقوں میں نکاح

۲ ——— مسلمانوں کے ہر فرقے کے مرد و عورت کے درمیان باہم نکاح جائز ہے۔

تشریح:- ایک مسلمان مرد یا عورت خواہ اس کا تعلق کسی مسلمان فرقے یا مکتب فکر سے ہو باہم آزادی کے ساتھ نکاح کر سکتے ہیں، چنانچہ مسلمان مرد یا عورت کا ایسے فرقوں سے جن کو باجماع امت مسلم تصور کیا گیا ہے، متعلق ہونا عورت کی قابلیت نکاح کو متاثر نہیں کرتا اور باہم نکاح جائز ہوگا۔

مختلف فرقوں سے متعلق ہونے کی صورت میں زوجین کے حقوق و فرائض کا تعین

۳ ——— زوجین کا تعلق اگر مختلف مسلم فرقوں سے ہو تو ان کے ازدواجی حقوق و فرائض اس فرقے کے مطابق ہوں گے جس کے وہ بوقت نکاح پابند ہوں ـــ الا یہ کہ انھوں نے یا ان میں سے کسی ایک نے اپنی مرضی سے اپنے فرقے کے مذہب کو چھوڑ کر دوسرے فرقے کے مذہب کو اختیار کر لیا ہو، اس صورت میں ان کے حقوق و فرائض اس کے اختیار کردہ مذہب کے مطابق ہوں گے۔

تشریح:- زوجین کے مختلف مسلم فرقوں سے متعلق ہونے کی صورت میں ہر فریق کے ازدواجی حقوق و فرائض کا تعین اس فرقے کے احکام کے مطابق ہوگا۔

---

[1] وهو افضل من التخلي لنفل العبادة - الكفايه على شرح الهدايه ص ۹۸ -

جس سے وہ بوقت نکاح متعلق تھا، چنانچہ نکاح کے بعد عورت اپنی جداگانہ حیثیت برقرار رکھ سکتی ہے اور اسے مجبور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ شوہر کے فرقے کے احکام کی پیروی کرے، البتہ کوئی فریق اپنی مرضی سے اپنے فرقے کو چھوڑ کر دوسرے فرقے کے مذہب کو اختیار کر سکتا ہے، ایسی صورت میں اسکے حقوق و فرائض اس تبدیل شدہ فرقے کے مطابق ہوں گے۔

کتابیہ سے نکاح

۴ ــــــــ مسلمان مرد کا کتابیہ عورت سے نکاح جائز ہے مگر کتابیہ حربیہ سے نکاح مکروہ ہے۔

تشریح:۔ مسلمان مردوں کا نکاح ان غیر مسلم عورتوں سے جائز ہے جو اہل کتاب ہوں یعنی کسی آسمانی کتاب کی معتقد ہوں[۱]

اہل کتاب سے عیسائی و یہودی مذاہب کے پیرو مراد ہیں

اگر کسی عورت کے باپ یا ماں میں سے ایک کتابی ہو اور دوسرا مشرک مجوسی وغیرہ تب بھی وہ عورت کتابیہ کہلائے گی۔ مگر امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ کے نزدیک ایسی عورت کتابیہ نہ ہوگی اور اس سے نکاح حلال نہیں ہے[۲]

---

[۱] ذهب جمهور الفقهاء الى انه يحل الزوجة بالذمية من اليهود والنصارىٰ واستدلوا بهذه الآية الكريمة " والمحصنٰت من الذين اوتوا الكتاب من قبلكم " ۔ تفسير آيات الاحكام محمد على الصابونى ج ۱ ص ۵۳۲ ۔

[۲] ۔ اذا كان احدهما كتابيا والآخر مجوسيًا أمًا وابًا. فحكمنا بان الولد كتابى يجامع الانظر للولد فى الدنيا بالاقتراب من المسلمين بالاحكام من حل الذبيحة والمناكحة .... والشافعى يخالفنا اى فيما اذا كان احدهما كتابيا والآخر مجوسيا فيقول فيما اذا كان الاب كتابيا والام مجوسية انه مجوسى فى اصح قوليه وبه قال احمد ۔ فتح القدير ج ۳ ص ۲۸۷۔

نکاحِ کتابیہ اور قرآن

کتابیہ عورتوں سے نکاح کی اجازت خود قرآن پاک میں دی گئی ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں " والمحصنٰت من المؤمنات والمحصنٰت من الذین اوتوا الکتاب من قبلکم (پ ٦ رکوع ٥) یعنی (حلال ہیں پاک دامن عورتیں جو مسلمان ہیں اور پاک دامن عورتیں ان میں سے جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی۔

کتابیہ حربیہ سے نکاح مکروہ قرار دینے کی وجہ یہ ہے کہ اس نکاح سے یہ اہم ترین خطرہ پیدا ہو جاتا ہے کہ غیر مسلم ماں کی آغوش میں تربیت پائی ہوئی اولاد اسلامی معاشرے کیلئے کار آمد ثابت نہ ہوسکے گی، اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک مسلمان گھرانے میں غیر اسلامی طریقے اختیار کرے، چنانچہ حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ نے جب ایک یہودیہ سے نکاح کیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس کی اطلاع پہنچی تو آپ نے حذیفہ رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ اس عورت کو چھوڑ دو، حذیفہؓ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا کہ یہ حکم کس بنا پر ہے؟ کیا کتابیہ عورت سے نکاح حرام ہے؟ آپ نے جواب دیا کہ حرام نہیں ہے مگر مجھے خوف ہے کہ کہیں تم لوگ اہل کتاب کی آبرو باختہ عورتوں میں نہ پھنس جاؤ۔[1]

نکاحِ کتابیہ اور شیعہ مکتب فکر:-

کتابیہ عورتوں سے نکاح جائز (مگر مکروہ) ہونے کے بارے میں سنیوں کا اتفاق ہے لیکن شیعہ مکتب فکر میں اس سلسلے میں اختلاف پایا جاتا ہے، چنانچہ اصول

---

[1] معارف القرآن، از مولانا مفتی محمد شفیعؒ، ج ٣ ص ٦٢، ٦٣۔ بحوالہ احکام القرآن جصاص رازی، کتاب الآثار امام محمد ص ١٥٦۔

شیعہ اور معتزلہ، احناف سے متفق ہیں اور کتابیہ عورتوں سے نکاح کو جائز سمجھتے ہیں جبکہ اخباری شیعوں کے نزدیک مسلم کا غیر مسلمہ کے ساتھ نکاح دائمی طور پر جائز نہیں، ان کے نزدیک کتابیہ عورتوں سے صرف متعہ جائز ہے[1]

انعقاد اور جواز نکاح

اہلیت نکاح ۵ ــــــ ہر عاقل، بالغ مسلمان مرد اور عورت بلا وساطت ولی نکاح کی اہل ہے، البتہ عورت کے مہر مثل سے کم پر یا غیر کفو سے نکاح کر لینے کی صورت میں اسکے ولی کو بذریعہ عدالت (شرعی پنچایت) نکاح فسخ کرانے کا حق حاصل ہوگا۔

تشریح:- یہ مسئلہ متفق علیہ ہے کہ ایک عاقل بالغ مرد اپنا نکاح خود کرنے کا اہل و مجاز ہے اسی طرح ایک بالغہ ثیبہ (شوہر دیدہ عورت جو مطلقہ یا بیوہ ہو) بھی اپنا نکاح خود کرنے کی مجاز ہے۔ لیکن باکرہ، عاقلہ، بالغہ عورت کے اپنا نکاح خود کرنے کے بارے میں ائمہ کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے، امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اور صاحبین کے آخری قول کے مطابق ایک باکرہ بالغہ عاقلہ عورت کو اپنا نکاح بلا وساطت ولی خود کرنے کا اختیار حاصل ہے۔[2]

اس بارے میں شیعہ مکتب فکر بھی حنفیہ سے متفق ہے لیکن مالکیہ اور شافعیہ مکتب فکر کے نزدیک ایک باکرہ بالغہ و عاقلہ عورت اپنا نکاح ولی کی وساطت کے بغیر نہیں کر سکتی

---

[1] اما الکتابیۃ من الیھودیۃ والنصرانیۃ ففیہا اقوال اشھرھا المنع فی النکاح الدائم والجواز فی المنقطع، قیل بالمنع مطلقا قیل بالجواز کذلک والاقوی الجواز فی المنقطع واما فی الدائم فالاحوط المنع ۔ تحریر الوسیلۃ للخمینی ج ۲ ص ۲۴۲ ۔

[2] وینعقد نکاح الحرۃ العاقلۃ البالغۃ برضاھا وان لم یعقد علیھا ولی بکرا کانت او ثیبا عند ابی حنیفۃ وابی یوسف رحمھما اللہ فی ظاہر الروایۃ ...... وقال مالک والشافعی رحمھما اللہ لا ینعقد النکاح بعبارۃ النساء اصلا ۱ھ ۔ ھدایہ مع فتح القدیر ج ۳ ص ۱۵۷

صحیح شرعی حکم

دونوں نقطۂ نظر کی تفصیلات دیکھنے سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ شافعیہ کا یہ نظریہ کہ عورت نکاح کی حقیقت سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتی اور اس کے نکاح کیلئے ولی کی وساطت ناگزیر ہے، دراصل عورت کی آزاد مرضی کو مشروط بنانے اور اسکے ذاتی حق واختیار پر ایک قدغن کے مرادف ہے، البتہ مسلم معاشرے کو انتشار سے محفوظ رکھنے کیلئے شرع نے اولیاء کو یہ حق دیا ہے کہ اگر لڑکی نے ولی کی اجازت کے بغیر غیر کفو میں نکاح کر لیا ہو یا مہر مثل سے کم پر کیا ہو تو ولی عدالت (شرعی پنچایت) میں تنسیخ نکاح کا دعویٰ کر سکتا ہے اور عدالت معقول شرعی وجوہ کی بناء پر نکاح کو فسخ کر سکتی ہے

انعقادِ نکاح | ۶ ——— نکاح مرد وعورت کے ایجاب وقبول سے منعقد ہوتا ہے۔

تشریح:۔ نکاح کا انعقاد ایجاب وقبول پر منحصر ہے، ایجاب نکاح کی پیش کش کرنے والے کلام اول کو کہتے ہیں، اور اس کو منظور کرنے والے کلام کو قبول کہتے ہیں۔ الکافی میں لکھا ہے کہ ایجاب وقبول نکاح کے ستون ہیں پہلا قول خواہ کسی فریق کی جانب سے ہو ایجاب کہلائے گا اور اس کا جواب دوسرے فریق کی جانب سے قبول [1]

قاضی کی ضرورت | ۷ ——— انعقاد نکاح کے لئے کسی رجسٹرار قاضی یا نکاح خواندہ کی ضرورت نہیں ہے

تشریح:۔ فریقین ایک دوسرے سے خود اپنا نکاح کر سکتے ہیں، یہ ضروری نہ ہوگا کہ کوئی دوسرا شخص ان کا نکاح پڑھائے

---

[1] واما رکنہ فالایجاب والقبول کما فی الکافی والایجاب ما یتلفظ بہ اولا من ای جانب کان والقبول جوابہ، ھکذا فی العنایہ۔ عالمگیری ج ۱ ص ۲۶۷۔

اسلام میں نکاح کے لئے قاضی یا پادری کی ضرورت نہیں ہے۔

ایجاب و قبول زبانی یا تحریری

۸ ——— ایجاب و قبول زبانی یا تحریری دونوں طرح جائز ہے۔

تشریح: اگر فریقین اصالتاً یا وکالتاً مجلس نکاح میں موجود ہوں تو زبانی ایجاب و قبول لازم ہوگا؛ اِلّا یہ کہ کسی معذوری کے سبب ایسا کرنا ممکن نہ ہو۔ اور اگر کوئی فریق اصالتاً یا وکالتاً مجلس نکاح میں موجود نہ ہو بلکہ اس کی طرف سے ایجاب مستند تحریری شکل میں موجود ہو اور وہ ایجاب بموجودگی گواہان مجلس نکاح میں پڑھا جائے اور فریق ثانی اسکے جواب میں اپنی منظوری ظاہر کردے تو نکاح منعقد ہوجائے گا۔[1]

---

[1] فلفظ النکاح فی قوله النکاح ينعقد بمعنى العقد اى ذلك العقد خاص ينعقد حتى تتم حقيقته فى الوجود بالايجاب والقبول والانعقاد هو ارتباط احد الكلامين بالآخر على وجه يسمى باعتباره عقدا شرعيا و يستعقب الاحكام وذلك بوقوع الثانى جوابا معتبرا محققا لغرض الكلام السابق ويسمع كل من العاقدين كلام صاحبه .... فلو كتبا الايجاب والقبول لا ينعقد۔ فتح القدير ج ۳ ص ۱۰۲۔ وفى عالمگیریة ولا ينعقد بالكتابة من الحاضرين فلو كتب تزوجتك فكتبت قبلت لم ينعقد هكذا فى النهر الفائق۔ فتاوى عالمگیریه ج ۱ ص ۲۷۰۔ و فى الفتاوى الخانية رجل قال بحضرة الشاهدين تزوجت فلانة فبلغها بحضرة الشاهدين فقبلت لم يجز فى قول ابى حنيفة ومحمد رحمهما الله ولو ارسل الرجل رسولا اليها اوكتب اليها كتابا انى تزوجتك على هذا فقبلت بحضرة الشاهدين ان سمعا كلام الرسول او قراء الكتاب عليهما فقبلت جاز وان لم يسمعا كلام الرسول اولم يقرء الكتاب عليهما فقبلت لا يجوز۔ فتاوى قاضى خان حاشيه برعالمگیری ج ۱ ص ۳۲۶۔

ایجاب و قبول اصالتاً یا وکالتاً

۹ ــــــــــ (۱) ایجاب و قبول اصالتاً یا وکالتاً دونوں طرح جائز ہے بشرطیکہ وکیل عقل و تمیز رکھتا ہو۔ (۲) اگر شخص غیر مجاز (فضولی) کسی کا نکاح کردے یا اپنے اختیار سے تجاوز کرتے ہوئے مؤکل کی جانب سے نکاح کا ایجاب یا قبول کرلے تو ایسا نکاح موکل کی اجازت پر موقوف رہے گا، اگر اس نے اجازت دے دی تو نافذ ہوجائے گا ورنہ کالعدم قرار پائے گا۔

تشریح:۔ یہ مسئلہ متفقہ ہے کہ نکاح میں ایجاب و قبول وکلار کے ذریعہ ہوسکتا ہے۔

وکیل نکاح کی اہلیت:۔

حنفیہ کے نزدیک ایسے عاقل لڑکے کو جو اچھے و برے، نفع و نقصان کی تمیز و سمجھ رکھتا ہو اگرچہ بالغ نہ ہو وکیل بنا نا جائز ہے، احناف کے نزدیک وکالت میں بلوغ و حریت کی شرط نہیں ہے، صرف عاقل ہونا شرط ہے، امام شافعیؒ کے نزدیک صبی (نابالغ لڑکے) کی وکالت درست نہیں کیونکہ وہ غیر مکلف ہے۔

کلکتہ ہائی کورٹ نے ایک مقدمہ عرفان الدین بنام بدن شیخ میں یہ قرار دیا کہ یہ امر کہ وہ وکیل جس نے لڑکی کی جانب سے بحیثیت وکیل عمل کیا نابالغ تھا نکاح کے جواز کو متاثر نہیں کرتا کیونکہ زیر دفعہ ۱۸۴ معاہدہ ۱۸۷۲ء ایک نابالغ اصل شخص اور شخص ثالث کے درمیان بحیثیت کارندہ عمل کرسکتا ہے (۱۵ انڈین کیسز ۵۸۳)

ایجاب و قبول کے الفاظ

۱۰ ــــــــــ نکاح ایجاب و قبول کے ایسے الفاظ سے منعقد ہوسکتا ہے جو اپنی تاثیر کے اعتبار سے عاقدین نکاح کو شرع کے مطابق فوری طور پر رشتہ اندواج میں منسلک کردیں۔ مثلاً

(الف) میں نے اپنی لڑکی تمھارے نکاح میں دے دی

(ب) میں نے اپنی لڑکی تمھارے ملک میں دے دی

(ج) میں نے اپنی لڑکی تمھیں ہبہ کردی۔

تشریح:۔ احناف کے نزدیک نکاح مختلف کلمات مثلاً نکاح، تزویج، تملیک، ہبہ وغیرہ سے منعقد ہوسکتا ہے، لیکن امام شافعی کے نزدیک نکاح صرف نکاح یا تزویج کے الفاظ سے منعقد ہوتا ہے، اسی طرح شیعہ مکتب فکر میں بھی نکاح یا تزویج کے الفاظ کے بغیر نکاح منعقد نہیں ہوتا، بہرحال ایجاب وقبول کے الفاظ ایسے ہونے چاہئیں جو لفظاً ومعناً اور عرفاً نکاح پر دلالت کرتے ہوں[1]

گونگے بہرے کا ایجاب وقبول:۔

اگر فریقین یا ان میں سے کوئی ایک گونگا یا بہرا ہو تو ایجاب وقبول اشارے کے ذریعہ ہوسکتا ہے لیکن وہ اشارہ ایسا ہونا چاہئے جس سے فریقین پر یہ واضح ہوجائے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ رشتہ زوجیت میں منسلک ہورہے ہیں[2]

---

[1] وینعقد بلفظ النکاح والتزویج والهبة والتملیک والصدقة وقال الشافعی رحمه الله لاینعقد الا بلفظ النکاح والتزویج هدایه مع فتح القدیر ج ۲ ص ۱۰۵۔

[2] وکما ینعقد بالعبارة ینعقد بالاشارة من الاخرس ان کانت اشارة معلومة کذا فی البدائع - عالمگیری ج ۱ ص ۲۷۰۔

(باقی آئندہ)

قصابوں کے طبقہ سے تعلق رکھنے والے ارباب فضل وکمال

مولانا عبدالقیوم حقانی

امام سمعانی رقمطراز ہے

یہ جو تمہارے سامنے تابعین فقہاء محدثین ومفسرین اور ائمہ وعلماء کی طویل فہرست ہے اس میں نظر دوڑاؤ! کتنے بڑے بڑے ائمہ محدث، مفسر، مجتہد، فقیہہ علماء اور ملت کے رہنما نظر آرہے ہیں یہ سب علم دین کے ماہر، قرآن وحدیث کے عالم فاضل اور امت کے عظیم محسن و رہنما تھے انھوں نے کبھی بھی غیر کے سامنے دست سوال نہیں پھیلایا، احتیاج کا اظہار تک نہیں کیا دین اور علم دین کی تحصیل، تدریس اور خدمت واشاعت کی اور اجر کی امید صرف خدا سے رکھی، زندگی گذارنے کے لئے رزق حلال کمایا۔ کوئی بین الاقوامی تجارت وسیع کاروبار یا کارخانوں اور بڑے بڑے صنعت وحرفت سے نہیں بلکہ حلال جانور ذبح کرکے، گوشت فروشی کرتے اور خدمت دین میں اطمینان حاصل کرنے کے لئے اپنے ہاتھوں کی مشقت اور مزدوری سے اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالتے، چنانچہ انساب ورجال کی کتابوں میں ہر پیشہ سے متعلق کثیر علماء کی تعداد نظر آتی ہے آج کی صحبت میں پیشۂ قصابی سے متعلق علماء کا ذکر علامہ سمعانی کی کتاب الانساب سے اخذ کرکے کیا جارہا ہے۔

علامہ سمعانی نے لفظ قصاب کی تشریح یوں بیان کی ہے "بفتح القاف وتشدید الصاد وفی آخرہا الباء الموحدہ" عربی میں اس شخص کو کہتے ہیں جو اپنے ہاتھوں سے بکری اور دیگر حلال جانور کو ذبح کرتا ہے اور پھر ان کا گوشت بازار میں فروخت کرتا ہے، اردو وفارسی اور

بعض دوسرے علاقائی زبانوں میں بھی حلال جانوروں کو ذبح کرکے ان کا گوشت بیچنے والوں کو قصاب کہتے ہیں، یہ عربی زبان سے ماخوذ اور مانوس لفظ ہے مگر اس حیثیت سے نامانوس ہے کہ بڑے بڑے علماء، محقق، مصنف، مبلغ اور محدث بھی قصاب گزرے ہیں، قصابی کے پیشہ سے تعلق رکھنے والے ارباب علم وفضل، علماء اسلام اور رہنمایان ملت اور مشاہیر اہل علم کی تعداد بے شمار ہے ان کی ذات سے توحید کو فروغ علوم ومعارف کو ترقی، اخلاق کو بالادستی اور اسلام کے پیغام کو ہمہ گیری حاصل ہوئی ہے۔

قصابوں کی فہرست کے آغاز میں امام سمعانی نے شیخ حسن بن عبداللہ کا تذکرہ کیا ہے، موصوف اپنے وقت کی عظیم شخصیت، عالم وفاضل اور علم دین کے بے لوث خادم تھے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے مولیٰ حضرت نافعؓ سے علم حدیث کی تحصیل کی۔ موزوں پر مسح کی مشہور روایت حضرت نافعؓ کے واسطہ سے بیان فرمایا کرتے تھے

عن الحسن بن عبد اللہ القصاب عن نافع عن عبد اللہ بن عمر قال وقت لنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی المسح علی الخفین یوما ولیلۃ وللمسافر ثلثۃ ایام ولیالیھا

حسن بن عبداللہ قصاب سے روایت ہے کہ فرماتے ہیں حضرت نافع نے عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے موزوں پر مسح کیلئے وقت کی تعیین فرمائی مقیم کیلئے ایک دن اور ایک رات اور مسافر کیلئے تین دن اور تین رات تک موزوں پر مسح کرنے کی اجازت ہے

امام حسن قصاب طلب علم اور پھر اشاعت علم دونوں مرحلوں میں کردار واعمال اور سیرت واخلاق اور ظاہر وباطن کے لحاظ سے یکساں تھے باطن ظاہر سے اور ظاہر باطن سے خوب تھا تمام زندگی تحصیل واشاعت علم سے وابستہ رہے مگر رزق حلال اور معاشی ضروریات کے لئے در غیر پر جبیں سائی کی خست وذلت سے اپنی جبین کو آلودہ نہیں کیا، سب سے بے نیاز

اور خدا کے نیازمند رہے، قوت لایموت اور زندگی کی معاشی ضرورت کی کفالت کیلئے قصابی کا پیشہ اختیار کیا

علم کی فضیلت، اہل علم کی صف میں اوّلیت، اپنے ہم زمانہ ارباب علم وفضل کے ساتھ معاصرت، معاشرہ میں بلند قدر ومنزلت اور علو شان، اس پیشہ کے اختیار کرنے میں ان کے لئے شرم وعار بن کر سامنے آئے اور نہ رزقِ حلال کے کمانے سے کسی مانع کو رکاوٹ بن کر سامنے آنے کا موقعہ دیا۔

موصوف تابعی تھے، صحابہؓ کی زیارت سے مشرف تھے، ان نگاہوں کو دیکھا تھا جو براہ راست چہرۂ نبوت کے انوار وتجلیات سے منوّر تھے اور ایسی نگاہوں کے منظورِ نظر تھے جو تاجدارِ نبوت ؐ کے رخ انور کی ضیا رپاشیوں سے معمور اور عشق نبوّت کی کیف ومستی سے مخمور تھے، ان کا اسوہ صحابہ کا نمونہ اور ان کے سیرت وکردار کی ایک جھلک تھی، ان کا فقر ودرویشی ان کی خدمت واشاعتِ علم، ان کا کسبِ حلال اور ان کی محنت ومشقّت پر حضراتِ صحابہ کی مہر لگی ہوئی تھی، امام حسن قصّاب کی زندگی اور پاکیزہ کردار پوری امت کے علماء اور خدام اسلام کیلئے ایک سبق، ایک عبرت انگیز نصیحت، شوقِ علم اور ذوقِ عمل کی انگیخت کا ذریعہ ہے۔

قصابوں کے پیشہ سے تعلق رکھنے والے مشاہیر علماء اسلام کی اس فہرست میں دوسرے نمبر پر علامہ سمعانی نے ابوعبداللہ حبیب بن ابی عمرہ القصاب کا تذکرہ فرمایا۔ حبیب قصاب بہت بڑے محدث، مرجعِ علم اور منبع جود وسخا تھے طالبان علوم نبوت کے حلقہ میں مشہور تدریسی معیار کے لحاظ سے محبوب، گویا طلبہ کے دل کی دھڑکن تھے، علمی مقام اور روحانی قدر ومنزلت میں علوشان کے مالک تھے، ذاتی وجاہت اور شخصی کردار نے انھیں تمام حلقوں اور عام معاشرہ میں ایک بلند مقام دیدیا تھا، مرکز علم کوفہ جو محدثین کا شہر فقہ کا گہوارہ علوم ومعارف کا گڑھ اور تفسیر وحدیث کا مخزن تھا جس کی ہوائیں اور فضائیں

بھی علم و معرفت کے انوار سے معمور تھیں، موصوف کا تعلق بھی اسی شہر سے تھا، یہی ان کا مسکن تھا اور اس نسبت پر انھیں ناز اور فخر تھا، ان کے اساتذہ کثیر اور بے شمار تھے مگر حضرت سعید بن جبیر ان سب میں گلِ سر سبد تھے، موصوف کو ان سے تلمذ اور روایتِ حدیث کا شرف حاصل ہے، جبیب قصاب کے تلامذہ کا حلقہ پھیلا ہوا اور بہت وسیع ہے گو علامہ سمعانی نے ان کے تلامذہ کی فہرست نہیں دی اور نہ اس سلسلہ میں کوئی تفصیلی عندیہ بیان فرمایا ہے تاہم ان کے اس ایک ارشاد سے جبیب قصاب کی عظمتِ تدریس اور مرتبہ علم کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، علامہ سمعانی ارشاد فرماتے ہیں

وروی عنہ الثوری	یعنی ان سے امام سفیان ثوری نے حدیث کی روایت کی ہے

علم حدیث کے جلیل القدر امام حضرت سفیان ثوری آپ کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہیں، آپ کے سامنے استفادہ اور تحصیل علم کی خاطر زانوئے تلمذ تہہ کر چکے ہیں اور آپ سے روایتِ حدیث بھی کرتے ہیں اور آپ سے تلمذ پر ناز اور فخر و اعزاز کا اظہار بھی کرتے ہیں جبیب قصاب کے عظمتِ مقام اور رفعتِ شان کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ حضرت امام سفیان ثوری جیسے عظیم محدث نے آپ سے کسب فیض کیا اور آپ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا ہے

(۳) عبد العزیز بن موسیٰ قصاب بھی کسی بڑے کاروباری خاندان، یا سرمایہ دار اور کارخانے دار باپ کے بیٹے نہیں تھے اور نہ ہی ان کی یہ بے مثال عزت اور بے نظیر عظمت دولت و سرمایہ کی مرہونِ منت تھی اور نہ ہی انھیں کوئی دنیوی جاہ و منصب عہدۂ قضا یا وزارت کی کرسی حاصل تھی جس نے لوگوں کو ان کا تابع بنا دیا تھا بلکہ فقر و درویشی اور علوم نبوت کی مصاحبت نے انھیں شہرت دی، پاکیزہ کردار نے انھیں عظمت بخشی

اور اخلاص وللہیت نے انھیں رفعت عطا کی، اللہ کی حقیقی عبدیت نے انھیں عظمتِ آبرو کا سرتاج بنادیا ان سب کا مرجع اور نقطۂ مرکز دین اور علم دین سے پُرخلوص، دائمی اور بے غرض وابستگی ہے، علم زندہ ہے جو اس سے وابستہ ہوگیا ہمیشہ کی زندگی پا گیا ؎

بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

موسیٰ قصاب کے بیٹے عبدالعزیز قصاب بھی کوئی شہنشاہ نہیں تھے قصاب تھے، بکریاں اور حلال جانور ذبح کرکے گوشت بیچتے، اس سے جو کمائی ہوتی اس سے خود بھی گذر اوقات کرتے اور اپنے بچوں اور افراد خاندان کا پیٹ پالتے مگر ان کا نام اور کام زندہ ہے اور بادشاہوں کے تذکروں سے ہزار چند بڑھ کر تابندہ ہے، موصوف مرو کے رہنے والے تھے، مرو کے باشندے انھیں اپنا شیخ تسلیم کرتے ہیں اور جب بھی ان کا نام آتا ہے تو ان کی عظمت و رفعتِ شان سے اہل مرو کے سر جھک جاتے ہیں -

عبدالعزیز قصاب کو بھی خدا تعالیٰ نے طبیعت معتدل اور فطرت سلیم بخشی تھی دنیا کا حسن و جمال اور اس کی ظاہری چمک و رعنائی ان کی نگاہوں کو خیرہ نہ کرسکی آپ نے دنیا داروں اور سرمایہ داروں کی راہ چلنے کے بجائے علم اور خدمتِ دین فقر و درویشی اور غربت و مسکنت کی زندگی کو ترجیح دی، انھوں نے بادشاہوں کے درباروں، سرمایہ داروں کی چوکھٹوں اور دنیا داروں کے دروازوں پر انسانیت کی آبرو کو رسوا نہیں کیا بلکہ خالق کون و مکاں کی بارگاہ صمدیت میں سجدہ کیا اور ایسا سجدہ کہ سب سے بے نیاز ہوگئے ؎

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

ان کی نظر اللہ کے جمال اور اس کی قدرت و کمال پر تھی، تو ذات پات، نسب و نسبت مزدوری اور پیشہ و دست کاری ان کیلئے رکاوٹ نہ بن سکی، تحصیلِ علم اور

ذوقِ طلب کی تکمیل کیلئے ابوالحسین عبدالرحمٰن بن محمد دہان (روغن ساز اور روغن فروش) کی درسگاہ میں پہنچ کر فنا فی العلم ہو گئے اس وقت آنکھ اٹھائی جب ان کا دامن علوم و معارف کے خزینہ سے لبریز ہو چکا تھا، علوم نبوت اور عرفان و معرفت کے لازوال خزانوں سے مالامال ہو چکے تھے، جو سب سے کٹ کر علم سے جڑ جائے تو علم اس کے سینہ کا دفینہ بن جاتا ہے۔ "العلم لایعطیک بعضہ حتی تعطیہ کلک" علم تجھے اپنا بعض حصہ بھی نہیں دیگا جب تک تو اپنے تمام جذبات و احساسات، تعلقات و معاملات، دنیوی اور قلبی علائق سے کٹ کر صرف اور صرف علم ہی کا طالب، اسی کا عاشقِ زار اور اپنی ہر ادا سے اسی کا ہی چاہنے والا نہ بن جائے، عبدالعزیز قصاب نے اسی راہ کو اپنایا، اسی کو اپنی زندگی کا اصول بنایا اسی کو اپنے نفع وضرر اور اللہ کے قرب کا ذریعۂ وصول بنایا، علم کی راہ سے منزل تک پہنچنا چاہا، پہنچے اور ایسے پہنچے کہ خدائے فقیری میں امیری، بے کسی میں بادشاہی اور بے بسی میں من چاہی کی رفعتوں پر پہنچا دیا، ان کے شرف و منزلت اور مرتبہ و مقام کیلئے کیا یہ کوئی کم دلیل ہے کہ علامہ سمعانی نے اعاظمِ رجال کی اس فہرست میں تیسرے نمبر پر ان کا تذکرہ فرمایا ہے اور ان سے اپنے دادا کی روایت و تلمذ کو فخر و ناز اور عزت و امتیاز کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔

ارشاد فرمایا کہ: عبدالعزیز قصاب کا ہمارے خاندان کے اکابر اور خاندانی بزرگوں پر بھی بڑا احسان ہے کہ ان ہی کے ذریعہ سے ہمارے خاندان میں علم نبوت کی دولت منتقل ہوئی ہے، فرمایا

سمع منہ جدی الامام ابوالمظفر السمعانی	میرے جد بزرگوار امام ابوالمظفر سمعانی نے ان سے حدیث کا سماع کیا

اسکے بعد علامہ سمعانی نے ابورافع قصاب [۴]، ابوعبداللہ محمد بن علی قصاب [۵] کا تذکرہ کیا ہے۔ (۶) بالخصوص ابوخباب عباد بن عوف قصاب کے سوانح و آثار، ان کے

حالات کا تذکرہ کمالات پر تبصرہ اور ان کی علمی و دینی اور اشاعتی خدمات، بڑی عقیدت و اعتراف اور بڑی محبت اور بڑے جوش و جذبے سے کیا ہے

لکھتے ہیں: "حضرت عباد قصاب مصر کے رہنے والے تھے اس لئے مصر کی نسبت سے مشہور تھے گوشت فروشی ان کا پیشہ تھا انھیں تابعین میں جلیل القدر اساتذۂ حدیث اور ماہرین فن سے علوم نبوت کی تحصیل و تکمیل کا شرف حاصل ہوا ان کے اساتذہ میں سرفہرست حضرت قتادہ اور حضرت زرارہ بن ابی اوفی ہیں، حضرت عباد قصاب دونوں حضرات سے حدیث کی روایت کرتے ہیں اور دونوں سے نسبت تلمذ پر انہیں فخر تھا، موصوف کا علم، مسائل اور فتادیٰ اس لئے مشہور مقبول اور معتمد تھے کہ براہ راست حضرت قتادہ اور حضرت زرارہ کی مہر لگی ہوئی تھی، آپ کے علم و فضل اور شرف و تفوق کی ایک دنیا قائل تھی، آپ کے ہاں طالبان علوم نبوت کا ہجوم رہتا تھا دسیوں کے دامن مرادوں سے بھرے جا رہے ہیں، دسیوں کو دستار فضیلت اور سند علم سے نوازا جا رہا ہے، دسیوں کو نئے داخلے مل رہے ہیں عجیب سماں تھا، عجیب منظر تھا اسلام کی عظمت شان جھلکتی نظر آتی تھی، بصرہ کے تمام مشائخ محدثین اور بڑے بڑے علماء نے آپ سے کسب فیض اور علم حدیث کا اکتساب کیا، اس لئے آپ اہل بصرہ کے شیخ مانے جاتے تھے۔

(۷) ابوحمزہ میمون قصاب، موصوف بہت بڑے متقی، پرہیزگار، اور سیرت و کردار کے مالک تھے انھیں ابتدائے شعور ہی سے تحصیل علم حدیث کا شوق تھا جو انھیں حضرت ابراہیم نخعی اور امام حسن بصری کی درسگاہ میں لے گیا، میمون قصاب نے دونوں اساتذۂ حدیث سے مکمل استفادہ کیا، اساتذہ نے بھی طلب صادق اور جوہر با صفا دیکھ کر پوری توجہ کی اور شفقت فرمائی، علوم نبوت کا وافر خزانہ اپنے اس ہونہار شاگرد کے دل و دماغ اور قلب میں گویا انڈیل دیا، قصابوں کے گروہ سے تعلق رکھنے والے اللہ کے اس نیک

بندے اور اسلام کے عظیم خادم اور علوم نبوت کے بے مثال عالم و فاضل کے علم و فضل اور علم حدیث و تفسیر میں عبور کامل کے چرچے پوری دنیا میں پھیل گئے طلبہ دور و دراز علاقوں سے رخت سفر باندھ کر حاضر خدمت ہوتے اور جھولیاں مرادوں سے بھر بھر کر واپس ہوتے۔ علوم و معارف نبوت کی تقسیم جاری تھی میمون قصاب ساقی کے مرتبہ بلند پر فائز تھے،

عظیم اور جلیل القدر محدثین، امام المحدیث حضرت سفیان ثوری، علم حدیث کے مشہور امام حماد بن سلمہ اور عبدالحمید بن منصور جیسے افاضل و ائمہ حدیث بھی آپ ہی کی بارگاہِ علم و فضل میں خادمانہ حاضر ہوکر، علم حدیث کی دولت سے مالا مال ہوئے،

اس قدر جلیل القدر اکابرین اور ائمہ حدیث کے استاد و شیخ الحدیث، پیشہ اور کاروبار کے لحاظ سے قصاب تھے مگر سبحان اللہ! کہ علم و فضل اور دینی خدمات و درجات کے لحاظ سے ایک دنیا کے امام و مقتدا تھے۔

مولانا امام علی دانش قاسمی

اسلام میں انسانیت کا احترام

آج پوری دنیا تباہی کے دہانے پر کھڑی ہے خشکی و تری میں فساد برپا ہے، جو نام نہاد مفکر و رہنما مساوات کے نعرے بلند کرتے ہیں ان کے ملکوں میں سیاہ و سفید کی تفریق موجود ہے، امریکہ اور جنوبی افریقہ میں کالے اور گورے کا امتیاز ایک بین الاقوامی مسئلہ بنا ہوا ہے، خود اپنے جمہوری اور اور سیکولر نواز ملک میں آریائی اور غیر آریائی نسلوں میں معرکہ آرائی جاری ہے اونچ اور نیچ کا تصور مذہبی عقیدہ کی حیثیت سے پایا جاتا ہے جس کے نتیجہ میں ہریجنوں کے ساتھ مساوات کا سلوک معاشرہ میں نہیں برتا جاتا، طبقاتی کشمکش، نسلی و مذہبی تصادم، فرقہ وارانہ فسادات، ملکی و قومی ریاستی وعلاقائی بنیادوں پر امتیاز و تفریق کا غیر منصفانہ سلسلہ پوری دنیا میں موجود ہے انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین اور منسوخ شدہ محرّف کردہ مذاہب اپنی افادیت ختم کر چکے ہیں صرف اسلام ہی وہ خدائی قانون اور ہدایت و فلاح کا دستور ہے جس کی رہبری اعتقادی و عملی طور پر تسلیم کر کے ہی دنیائے انسانیت کو تباہی و بربادی سے بچایا جا سکتا ہے۔

اسلام انسانیت کا دین ہے فطرت کا دستور ہے خدا کا نازل کردہ قانون ہے، اسلام ہر قسم کے فساد و سرکشی اور ظلم و طغیان کو حرام و ممنوع قرار دیتا ہے، اسلام انسانیت کے احترام کی تعلیم دیتا ہے۔ انسانی جان کی قدر و قیمت اسلام کے حکموں میں بنیادی طور پر شامل ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ جس نے کسی انسان کو خون کے بدلے یا زمین

اَوْفَسَادًا فِی الْاَرْضِ فَکَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیْعًا
(مائدہ ۷)

میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ سے قتل کیا اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر دیا۔"

سورۂ انعام میں فرمایا گیا۔
"اور کسی جان کو جسے اللہ نے قابلِ احترام بنایا ہے ہلاک مت کرو مگر حق کے ساتھ"
سورۂ مائدہ میں اعلان کیا گیا
"اور جس نے کسی کی زندگی بچائی اس نے گویا تمام انسانوں کی زندگی بچائی۔"
ایک حدیث شریف میں ہے " اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا اور انسانوں کا قتل کرنا بڑا گناہ ہے۔"
دوسری مشہور روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اللہ اس پر رحم نہیں کرتا جو دوسروں پر رحم نہیں کرتا۔
قتل ناحق اور ظلم وفساد کو قرآن وحدیث میں کبیرہ گناہ شمار کیا گیا ہے، قرآن مجید میں انسانیت کی تخلیق کا جو عقیدہ بیان ہوا ہے وہ بجائے خود عدل ومساوات اور انسانیت کے احترام کا سبق سکھاتا ہے
سورۂ حجرات میں فرمایا گیا۔
" اے لوگو ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہارے قبیلے اور خاندان بنائے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو، بلاشک اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے پرہیزگار ہے، اللہ سب کچھ جاننے والا اور خبر رکھنے والا ہے۔"
حجۃ الوداع کے موقع پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے تاریخی خطبہ میں اعلان فرمایا کہ: اے لوگو، خبردار ہو جاؤ کہ تمہارا پروردگار ایک ہے کسی عربی کو کسی عجمی پر فوقیت

حاصل نہیں ہے نہ کسی عجمی کو کسی عربی پر بڑائی حاصل ہے، اسی طرح کسی کالے انسان کو کسی گورے پر اور کسی گورے کو کسی کالے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے سوائے تقویٰ کی بنیاد پر کیونکہ تم سب میں زیادہ عزت والا خدا کے نزدیک وہی ہے جو سب سے بڑا پرہیزگار ہے

اسلام کے برخلاف دوسرے مذہبی تصورات

اسلام کے علاوہ دوسرے مذاہب و نظریات میں امتیاز و تفریق کی تعلیم موجود ہے، یہودی قوم اپنے کو مذہبی طور پر تمام دنیا کی قوموں سے برتر و فائق سمجھتی ہے اور تمام دنیا پر حکمرانی اپنا پیدائشی حق قرار دیتی ہے، عیسائیوں کے یہاں بھی نسلی و علاقائی تفریق موجود ہے، اپنے ملک میں سناتن دھرم کے ماننے والوں کی اکثریت ہے ان کے یہاں منوسمرتیوں میں مذہبی بنیاد پر اونچ نیچ کی تعلیم موجود ہے، چند حوالے پڑھ کر اندازہ لگائیے۔

• برہما نے اپنے منہ سے برہمن کو، ہاتھ سے چھتری کو، ران سے ویشیا کو، اور پاؤں سے شودر کو پیدا کیا (۱ : ۳۱)۔

• برہمن کا نام تقدس ظاہر کرنے والا، چھتری کا طاقت کو، ویش کا دولت کو اور شودر کا ذلت کو" (۲ - ۳۱)

• خدا نے شودر کو صرف ایک فرض نبھانے کے لئے پیدا کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ بلا چون و چرا برہمن، چھتری اور ویش کی خدمت کرتا ہے (۱ : ۹۱)

• برہمن کو حکم ہے کہ وہ شودر کے سامنے وید نہ پڑھے " (۴ : ۹۹)

انسان کی تخلیق میں ہی جو مذہب تفریق و امتیاز کا عقیدہ سکھاتا ہے اس کے ذریعہ انسانی مساوات کا نظام کیسے قائم ہو سکتا ہے؟ اسی لئے اس مذہب کے مصلحین اپنے مذہبی نظریہ سے انحراف کرتے ہوئے برابری اور چھوت چھات کے خاتمہ کا اعلان کرتے رہتے ہیں مگر یہ اعلانات مذہبی حیثیت تو اختیار نہیں کر سکتے، حقیقی مساوات اور انسانیت کے احترام کا پیغام اسلام کو اپنا کر ہی سکھایا جا سکتا ہے۔

اسلامی تعلیم اور اسکے اثرات

اسلام نے انسانیت کا احترام سکھایا ہے، اسی کا اثر اور نتیجہ ہے کہ اسلامی فقہ میں ہر ہر مرحلہ پر انسانوں کی عظمت وعزت کو بحال رکھا گیا ہے۔ انسانی جسم اور اسکے اعضاء کی خرید و فروخت اور بے احترامی کو ممنوع قرار دیتے ہوئے حکم دیا گیا کہ جسم سے روح نکلنے کے بعد بھی بدن کا احترام کرتے ہوئے پورے اعزاز واکرام کے ساتھ زمین کے نیچے ادب کے ساتھ چھپا دیا جائے، انسان کے جھوٹے کو (خواہ وہ کسی بھی قوم ومذہب کا ہو) پاک قرار دیا گیا۔ کسی مرحلہ پر یہ اجازت نہیں دی گئی کہ دوسرے مذہب کے معبودوں اور پیشواؤں کو گالی دی جائے برا کہا جائے معبودان باطل کی بے چارگی اور غلط نظریات کی تردید سلیقہ سے کرنے کا حکم دیا گیا۔ کسی مقام پر غیر مسلموں نے مسلمانوں پر ظلم کیا ہے ان کو ناحق قتل کیا ہے اجاڑا ہے اس کا بدلہ دوسری جگہ کے غیر مسلموں سے لینے سے اسلام نے سختی سے منع کیا ہے۔

قرآن مجید میں واضح حکم موجود ہے کہ "کسی قوم کی دشمنی تم کو اس پر برانگیختہ نکرے کہ تم عدل سے پھر جاؤ (حکم دیا جاتا ہے کہ) تم عدل کرتے رہو، یہی پرہیزگاری کے مناسب ہے (المائدہ)

دوسرے مقام پر فرمان خداوندی ہے "اے ایمان والو! انصاف پر قائم رہو اور خدا کے واسطے گواہی دو اگرچہ تمہارے انصاف اور تمہاری گواہی کی زد خود تمہاری اپنی ذات پر یا تمہارے والدین اور تمہارے رشتہ داروں پر ہی کیوں نہ پڑتی ہو فریق مقابل چاہے مالدار ہو یا غریب اللہ تم سے زیادہ ان کا خیرخواہ ہے اسلئے خواہش نفس کی پیروی میں انصاف نہ چھوڑو اور اگر تم نے لگی لپٹی بات کہی یا سچائی کو چھوڑا تو یقین رکھو کہ تم جو کرتے ہو اللہ کو اس کی خبر ہے (النساء)

اسی اسلامی تعلیم کا نتیجہ واثر ہے کہ مسلمان جتنا زیادہ مذہب سے قریب ہوتا ہے

اسی قدر وہ فساد سے دور رہتا ہے اور ہر معاملہ میں عدل و انصاف پر قائم رہتا ہے ، اسلام کی صدق دلی سے پابندی کرنے والے مسلمان کبھی تشدد ، بدامنی ، ناانصافی ، انسانیت کی پامالی گوارہ نہیں کرتے ، مسلمانوں کی جو بعض تنظیمیں دہشت گردی اور تشدد پسندی کا شکار ہیں وہ دراصل کمیونزم کے زیر اثر ہیں ، الحاد و اشتراکیت کے علمبردار مختلف ناموں اور شکلوں میں دنیا کے اندر ہیجان ، بدنظمی اور افراتفری پیدا کرتے ہیں اسلام کے سچے ماننے والے خدائی قانون کے وفادار ہمیشہ امن و سلامتی اور عدل و انصاف کا درس دیتے رہتے ہیں مسلمان فطری اور طبعی طور پر روا دار اور مظلوم کا حمایتی ہوتا ہے ۔

غیروں کا اعتراف حق اور ہماری ذمہ داری

اس حقیقت کا اعتراف غیروں نے بھی کیا ہے ، مسٹر گاندھی جی نے ایک اخباری بیان میں کہا تھا کہ :- میں نے ایک بے غرض طالب علم کی طرح پیغمبر اسلام کی زندگی اور قرآن کا مطالعہ کیا ہے اور میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ قرآن کی تعلیمات کے اصلی اجزاء عدم تشدد کے موافق ہیں :"

مسٹر این ، سی مہتہ نے اپنے خطبۂ صدارت میں کہا تھا ۔

پیغمبر اسلام نے اسلام کے اصول سادگی ، حق پرستی اور مساوات قرار دیئے ہیں ۔

(بحوالہ مکتوبات نبوی)

سلطان سعود اول کے دورۂ ہند کے موقعہ پر وزیر اعظم ہند پنڈت جواہر لال نہرو نے لال قلعہ کی استقبالیہ تقریب میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا ۔

:- اسلام جو ایک بڑا اور عظیم الشان مذہب ہے اور جس نے دنیا پر گہرے اثرات ڈالے ہیں ، ہندوستان میں پرامن اور دوستانہ طور سے داخل ہوا وہ اپنے ساتھ امن اور صلح کا پیغام لایا ۔ (حوالہ بالا)

لالہ ایشوری پرشاد نے ایک جگہ لکھا ہے ۔

" اگر مسلمان تنگ نظر اور متعصب ہوتے تو اتنے لمبے عرصے تک ہندوستان پر حکومت نہ کرسکتے، کیا یہ ممکن ہے کہ مسلم اقلیت ہندو اکثریت پر ظلم و زیادتی کرتی، اور اکثریت اسے برداشت کرتی رہتی، ہندوستان میں مسلمانوں کی پالیسی اول سے آخر تک رواداری پر قائم رہی ہے "

تاریخ ہند کا مشہور واقعہ ہے کہ اورنگ زیب نے خالص اسلامی صوبہ افغانستان پر جو نائب سلطنت مقرر کیا تھا وہ ہندو راجپوت تھا۔

سچا مسلمان کبھی متعصب، تنگ نظر، ظالم، انسانیت کُش نہیں ہوسکتا، اسلام کے دشمن یہودی اور عیسائی مستشرق مورخوں نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نفرت وعداوت کی فضا تیار کرنے کیلئے ہمیشہ مسلم حکمرانوں کے ظلم کی فرضی داستانوں کو حقیقت کے روپ میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور آج بھی اسلام کے دشمنوں کی یہ سعی نامشکور جاری ہے ـــــ ضرورت ہے کہ اسلام کی روشن تعلیمات کو اور اسلامی تاریخ حق وصداقت کو اہل علم وارباب انصاف صحیح طور پر پیش کرکے حقیقت کو واضح کرکے دنیا کو غلط روی سے بچانے کی خدمت انجام دے کر موجودہ تعصب و نفرت اور انسانیت کے خلاف شیطنت وظلم کی مسموم فضا کو عدل وانصاف اور انسانیت نوازی اور عدل پروری کی شمعوں سے نورانی بناکر اپنی منصبی ذمہ داری کا حق ادا کریں۔ واللہ الموفق۔

حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی قدس سرہٗ کے
دس غیر مطبوعہ خطوط

(مکتوب ۱ تا ۵ گذشتہ شمارہ "دارالعلوم ماہ مئی ۱۹۸۸ء" میں شائع ہوچکے ہیں)

یہ تمام مکتوبات مولانا محمد ایوب جان بنوری کے نام ہیں اور دو ایک کے علاوہ سبھی تصوف کے موضوع پر ہیں جو اہل نظر کے لئے بڑی اہمیت کے حامل ہیں، مخدوم زادہ حضرت مولانا سید ارشد مدنی کے ہم شکر گذار ہیں کہ انھوں نے اس نادر مجموعے کی فوٹو کاپی عنایت فرماکر ہمیں اس قابل بنایا کہ اس خزانۂ عامرہ کو قارئین دارالعلوم کی خدمت میں پیش کرسکیں ——— (حبیب الرحمٰن قاسمی)

مکتوب ——— (۶)

محترم المقام زید مجدکم ——— السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

والا نامہ باعث سرافرازی ہوا، یاد آوری کا شکر گذار ہوں، میں حسب عادت سلہٹ ۳ ر رمضان المبارک کو پہنچ گیا، متعلقین ٹانڈہ ضلع فیض آباد ہیں، اس اہلیہ پر بھی سحر کیا گیا، جو کہ بروقت اطلاع پا جانے اور مختلف طرق مدافعات عمل لانے کی وجہ سے اب تک اپنا کام پوری طرح نہ کرسکا مگر ابھی تک اس سے پیچھا بھی نہیں چھوٹا ہے، شعبان کے آخر میں ریل میں جبکہ وطن کو آرہا تھا اثر ہوا، اور مکان پہنچکر ہوا، دست آرہے ہیں، اللہ تعالیٰ فضل فرمائے، آمین۔

میں مولوی عبدالرؤف صاحب کے پہنچنے سے پہلے ہی روانہ ہوچکا تھا ۲۶ ر شعبان کی شام کو روانہ ہوا ہوں، اگر خدا کو منظور ہے اور کوئی مانع نہ ہوا تو انشاء اللہ نصف شوال تک دیوبند پہنچ جاؤں گا، خواب میں جو تعبیر آپ نے سمجھی ہے صحیح معلوم

ہوتی ہے، آپ کو جہاں تک بھی ممکن ہو ذکر پر مداومت کرنی چاہئے اذکروا اللہ حتی یقولوا انہ لمجنون، والدین ماجدین، اہلیہ محترمہ، مولانا محمد یوسف صاحب اور دیگر واقفین پرسان حال سے سلام مسنون عرض کردیں۔

محتاج دعوات صالحہ

ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہٗ

وارد حال سلہٹ، نئی سڑک۔ ۱۰ رمضان المبارک (۱۳۵۹ھ از مرتب)

مکتوب (۷)

محترم المقام زید مجدکم ــــ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مزاج شریف۔ والانامہ باعث سرافرازی ہوا۔ یاد آوری کا شکر گذار ہوں حسب ارشاد دعا کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ مقاصد دارین میں کامیاب فرمائے آمین مراقبہ کے لئے دو زانو بیٹھنے کی خصوصیت نہیں ہے جس طرح سے آسانی ہو بیٹھا کریں، اور اگر کبھی بیٹھنے میں دقت ہو تو لیٹ کر کے کرتے رہیں۔

جو خواب جناب نے میرے متعلق لکھا ہے میری خواہش ضرور ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو صحیح کردے اور اپنی قربت میں امتیازی شان عطا فرمائے وما ذلک علی اللہ بعزیز۔ مگر افسوس کہ میری موجودہ حالت تو مسلمان ہونے میں بھی تامل پیدا کرتی ہے

سود تا گشت نہ سجدہ را بتاں پیشانیم
چند بر خود تہمت دین مسلمانی نہم

فلا نجاۃ الا ان یتغمدنی اللہ تعالیٰ بخاصۃ رحمتہ۔

منسلک سوال مردان کا ارسال کرتا ہوں، آپ اور مولانا یوسف صاحب

مناسب کارروائی کریں، ہم فتویٰ یہاں سے کیا مرتب کرسکتے ہیں، والسلام مولانا یوسف صاحب سے سلام مسنون کہدیں۔

والد صاحب چچا صاحب اور دیگر پرسان حال سے سلام مسنون عرض کردیں

ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہٗ

از نئی سڑک سلہٹ، ۲۵ رمضان ۵۹ھ

مکتوب (۸)

محترم المقام زید مجدکم — السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مزاج شریف! والا نامہ محررہ ۲۸ رمضان المبارک پہنچا، والد صاحب مرحوم کے وصال پر ملال کی خبر سے صدمہ ہوا، موصوف کا سایہ یقیناً ظل رحمانی تھا اسکے اٹھ جانے سے آپ کو اور دیگر اعزہ کو جس قدر بھی صدمہ ہو طبعی امر ہے، مگر یہ امر کہ ماہ رمضان المبارک کے مبارک ایام، اور موصوف کا عمر طبعی کو پہنچکر متجاوز ہونا اور صراط مستقیم پر قائم رہتے ہوئے داعیٔ اجل کو لبیک کہنا اس صدمہ کو زائل کرنے والا ہے، بہرحال دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور مغفرت و رضا سے نوازے۔ پسماندگان کو صبر جمیل اور اجر جزیل عطا فرمائے۔ ولنبلونکم الخ الآیۃ کی ہدایات پر عمل کیجئے۔ والسلام

مولانا محمد یوسف صاحب سے سلام مسنون عرض کردیں

ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہٗ

از سلہٹ۔ ۵ شوال ۵۹ھ

مکتوب (۹)

محترم المقام زید مجدکم — السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج شریف! والانامہ باعث سرافرازی ہوا اور بادام بھی پہنچے، اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے آمین۔

فتویٰ کے متعلق مولانا محمد یوسف صاحب نے کچھ نہیں تذکرہ کیا، چونکہ وہ وہاں کے احوال کے متعلق تھا اسلئے میں نے آپ کے پاس بھیجدیا تھا، جمعیۃ صوبہ سرحد یا شہر پشاور کی نظامت کی انجام دہی آپ نہیں کرسکتے، اور کوئی دوسرا کرسکتا ہے تو مضائقہ نہیں آپ اراکین کی رائے سے کسی دوسرے کو تفویض کردیں اور نگہداشت رکھیں، حسب استطاعت حصہ لیتے رہیں، والد مرحوم کا سایہ یقیناً ظل ربانی تھا اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور جزائے خیر عطا فرمائے، نعمت کی قدر انسان کو بعد از زوال ہی معلوم ہوتی ہے ۔ بہرحال فرائض خانہ داری اور متعلقین و اعزہ کی خبر گیری سے غفلت نہ چاہیئے، رسالہ اربعین پشتو میں بہت مناسب ہے۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے اور مسلمانوں کو انتفاع کا موقع عنایت فرمائے، میرے خیال میں الاربعین من صحاح احادیث سید المرسلین (علیہ السلام) مناسب ہوگا بشرطیکہ وہ سب روایات صحیح ہوں اور مناسب بھی یہی ہے کہ یہ مجموعہ صحیح روایات کا ہو۔ پشتو زبان میں کتابیں عموماً رطب و یابس سے بھری ہوئی ہیں، اور اگر صحاح نہ ہوں تو اس لفظ کو ساقط کردیجئے، دیباچہ میں رسالہ کی ضرورت ظاہر کرتے ہوئے صحیح روایات کی ضرورت اور اہمیت بھی ظاہر فرمادیجئے۔ ذکر میں غفلت کو ہرگز روا نہ رکھئے، دعوات صالحہ سے فراموش نہ فرمائیے۔ واقفین پرسان حال سے سلام

ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہ
۱۱ ذی قعدہ ۵۹ھ

مکتوب (۱۰)

محترم المقام زید مجدکم - السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج شریف! آپ کا والا نامہ معہ شہد وزیرہ باعث سرافرازی ہوا، عنایات دیا دآوری کا شکر بیادا کرتا ہوں، آپ کی پریشانیوں کی خبروں سے پریشانی ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم کے سایۂ عاطفت میں دین و دنیا میں رکھے آمین -

محترما! دنیا دارالمحن ہے مگر ضرورت استقلال اور ثابت قدمی کی ہے، اس کے پھیر میں آکر ذکر سے غافل ہوجانا کسی طرح درست نہیں لاتلھیھم تجارۃ ولا بیع عن ذکر اللہ واقام الصلوٰۃ الآیہ کو ہمیشہ پیش نظر رکھیں۔ الدنیا ملعونۃ وملعون ما فیھا الا ذکر اللہ وما والاہ. الحدیث- پر عمل پیرا رہیں ؎

جز یاد دوست ہرچہ کنی عمر ضائع است ؛ جز سر عشق ہرچہ بخوانی بطالت است
سعدی بشوی لوح دل از نقش غیر حق ؛ علمے کہ راہ حق ننماید جہالت است

دعوات صالحہ سے فراموش نہ فرمائیں مردانہ وار ثابت قدم رہیں، اتباع سنت میں کمی نہو، رضائے حق کی طلبگاری میں سستی نہ ہو، وفقنا اللہ وایاکم لما یحبہ ویرضاہ آمین۔ والسلام-

ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہٗ

۵ ـ ربیع الاول ۶۰ھ

(قسط دوم)

حضرت شیخ الاسلام کے تین امتیازات

مولانا حبیب الرحمن قاسمی

(۳) الجزائر کی جہاد حریت میں حضرت شیخ الاسلام کا حصہ

تفصیلات میں جانے سے پہلے اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ الجزائر میں شیخ ابن بادیس اور محمد بشیر ابراہیمی کیا مقام حاصل ہے تو مختصر طور پر یہ سمجھ لیجئے کہ ہندوستان میں حکومت اور عوام کے نزدیک جو حیثیت گاندھی جی اور جواہر لال کی ہے علی الترتیب یہی درجہ و مرتبہ شیخ عبدالحمید بن بادیس اور شیخ محمد بشیر الابراہیمی کا الجزائر میں ہے۔

ایک الجزائری مصنف لکھتے ہیں، ۱۹۴۰ء میں جس تاریخ کو شیخ ابن بادیس کی وفات ہوئی اس وقت میری عمر صرف دس سال کی تھی اور میں ایک مکتب (مدرسہ حیات الشباب) میں زیر تعلیم تھا، ہم درجے میں جانے کی تیاری کر رہے تھے کہ ہمارے درجہ کے استاذ نے آکر کہا، آج سبق نہیں ہوگا شیخ عبدالحمید بن بادیس کا انتقال ہوگیا ہے۔ ہم بچوں کو شیخ کے مقام و مرتبہ کی کیا خبر تھی تو اس غیر متوقع چھٹی مل جانے پر بڑی مسرت ہوئی، راستے میں کھیلتے کودتے گھر آئے میرے والد شیخ کی علالت کی اطلاع پر قسنطینہ ان کی عیادت کو گئے ہوئے تھے اور میری یہ عادت تھی کہ جب معلوم ہوتا کہ والد صاحب گھر میں نہیں ہیں تو دروازے کی کنڈی خوب زور زور سے بجاتا چنانچہ حسب عادت آج بھی میں نے ایسا ہی کیا، اس کے بعد گھر میں داخل ہوا میری والدہ شام کا کھانا پکا رہی تھی، میں نے بے وقت آنے کی وجہ بتلاتے ہوئے ان سے کہا کہ مدرسہ میں تعطیل ہوگئی ہے کیونکہ شیخ عبدالحمید بن بادیس کا انتقال ہوگیا ہے میرے منہ سے یہ جملہ نکلنا تھا کہ میری والدہ بے قابو ہو کر چیخ اٹھیں۔ اصبح ما نقول" کیا تم

سچ کہہ رہے ہو، میں نے جب مؤکد طور پر یہی بات دہرائی اور انھیں اس کا یقین ہو گیا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں، اس وقت مجھے کچھ احساس ہوا کہ یہ کوئی غیر معمولی حادثہ ہے، دوسرے دن شیخ کی تجہیز و تکفین کے بعد میرے والد قسنطینہ سے واپس لوٹے، ان کی عادت تھی کہ جب بھی وہ کبھی شہر جاتے تو میرے لئے کھلونے وغیرہ ضرور لاتے، میں اس بار بھی منتظر تھا کہ عادت کے مطابق میرے لئے ضرور کھلونے لائیں گے۔ لیکن اس مرتبہ جب وہ گھر واپس آئے تو ان کی عجیب و غریب کیفیت تھی، گم سم، گویائی کی طاقت بالکل ناپید، بولنے کی کوشش کرتے بھی تو صرف ہونٹوں میں حرکت ہو جاتی آواز بالکل نہیں نکلتی تھی، شدت غم سے تحیر کی یہ حالت ان پر کئی دن تک طاری رہی[۱]

اس واقعہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ الجزائر میں شیخ ابن بادیس کو کیا مقام حاصل تھا اور الجزائری انھیں کس نگاہ سے دیکھتے تھے۔

ابن بادیس کا مختصر تذکرہ

الشیخ عبدالحمید بن بادیس ۴ دسمبر ۱۸۸۹ء ۱۳۰۶ھ کو الجزائر کے مشہور شہر قسنطینہ میں پیدا ہوئے

۱۳ سال کی عمر میں حفظ قرآن سے فراغت کے بعد قسنطینہ ہی میں شیخ حمدان لونیسی سے علوم عربیہ کی تحصیل شروع کر دی، اور پانچ سال تک انھیں کی خدمت میں رہ کر ابتدائی مرحلے کی تعلیم مکمل کی اور آگے کی تعلیم کے لئے ۱۹۰۸ء میں جامعہ زیتونیہ تیونس میں داخل ہو گئے، چار سال وہاں رہ کر بقیہ تعلیم پوری کی اور ۱۹۱۲ء میں عالمیت کی سند لے کر گھر واپس آگئے، پھر ۱۹۱۳ء ۱۳۳۲ھ میں حج و زیارت کے ارادے سے مکہ معظمہ کا سفر کیا، فریضۂ حج ادا کر کے مدینہ منورہ حاضر ہوئے اور تقریباً تین ماہ یہاں قیام کیا، اسی قیام کے دوران حضرت شیخ الاسلام سے استفادہ کیا۔ بعد ازاں حضرت شیخ الاسلام ہی کے مشورہ پر وطن واپس آئے، اور درس و تدریس اور وعظ و تذکیر میں مشغول ہو گئے، ۱۹۲۵ء میں المنتقد

---

[۱] محمد المیلی: ابن بادیس و عروبۃ الجزائر ص ۷، ۸۔

کے نام سے اصلاحی ہفت روزہ جاری کیا، حکومت کی پابندی عائد کردینے کی وجہ سے اس کے صرف ۱۸ شمارے نکل سکے، اسکے بند ہونے کے بعد دوسرا جریدہ الشہاب کے نام سے جاری کیا جو ابتدا میں ہفت روزہ تھا بعد میں ماہانہ ہوگیا تھا جسمیں علمی اصلاحی اور سیاسی مضامین شائع ہوتے تھے اور پورے الجزائر میں بڑے ذوق وشوق سے پڑھا جاتا تھا۔ ۱۹۳۱ء میں جمعیۃ علماء الجزائر قائم کی اور تاحیات اس کی صدارت کے منصب پر فائز رہے اسی کے پلیٹ فارم سے الجزائر کی آزادی کی جنگ کا آغاز کیا، ۵۱ سال کی مختصر عمر میں بمرض کینسر ۸ ربیع الاول ۱۳۵۹ھ مطابق ۱۶ اپریل ۱۹۴۰ء کو وفات پائی۔[1]

حضرت شیخ الاسلام کا مشورہ اور تحریک کی ابتدا

تعلیم وتحصیل سے فراغت کے بعد شیخ ابن بادیس حجاز پہنچے اس سے پانچ سال قبل ان کے استاذ شیخ حمدان استعماری جبر وتشدد سے تنگ ہوکر الجزائر سے ہجرت کرکے مدینہ منورہ میں آباد ہوگئے تھے، چنانچہ ابن بادیس جب مدینہ منورہ پہنچے تو انھیں بھی یہی مشورہ دیا کہ الجزائر اب رہنے کی جگہ نہیں وہاں سے قطع تعلق کرکے جوار رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں مقیم ہوجائیں، لیکن ان کے برعکس حضرت شیخ الاسلامؒ نے انھیں الجزائر واپس جانے اور وہاں اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کرنے کی رائے دی، اس سلسلے میں تحریک الجزائر کے دوسرے لیڈر شیخ ابن بادیس کے رفیق کار تلمیذ شیخ الاسلام الشیخ محمد البشیر الابراہیمی کا درج ذیل بیان قابل ملاحظہ ہے۔

> مولانا سید اسعد مدنی، ظلہ نے احقر سے بیان فرمایا کہ میں ۱۹۵۰ء میں عم محترم الشیخ السید محمود رحمہ اللہ کی خدمت میں مدرسۃ الشرعیہ المدینۃ المنورہ میں بیٹھا تھا کہ ایک بزرگ تشریف لائے اور چچا سے معانقہ ومعانقہ کے بعد دریافت کیا: این شیخی دکیف "میرے شیخ کہاں اور کس حال میں ہیں، چچا نے بتایا کہ ہندوستان میں ہیں

---

[1] ماخوذ ترکی رابح، الشیخ عبدالحمید ابن بادیس باعث النہضۃ الاسلامیۃ

اور بحمداللہ خیروعافیت سے ہیں، پھر میری جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ ان کے خلف اکبر ہیں، یہ سنتے ہی مجھ سے چمٹ گئے اور دیر تک مجھے گلے سے لگائے رکھا اس کے بعد اپنا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ میں محمد البشیر الابراہیمی الجزائری ہوں اور آپ کے والد ماجد کا ایک ادنیٰ تلمیذ، ہمیں حضرت نے جہاد حریت کی ترغیب دیکر الجزائر واپس بھیجا تھا[1]

قریب قریب یہی بات شیخ ابراہیمی نے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب سے ایک ملاقات کے موقع پر بتائی تھی مولانا ندوی صاحب اپنے مکتوب بنام مولانا سید ارشد مدنی میں لکھتے ہیں

میں ۱۹۵۶ء میں جب دمشق محاضرات کے سلسلے میں گیا ہوا تھا تو الشیخ محمد بشیر الابراہیمی دمشق آئے تھے انھوں نے ذکر کیا تھا کہ الجزائر کی جنگ و آزادی جہاد کے قائد شیخ عبدالحمید کا خیال ہجرت اور مستقل قیام کا ہو رہا تھا حضرت نے ان کو واپس جانے کا مشورہ دیا، وہ واپس گئے اور انھوں نے تحریک کی قیادت کی[2]

ان معتبر بیانات کے علاوہ خود ابن بادیس کی یہ تحریر ملاحظہ کیجئے۔

اذکرانی لما زرت المدینۃ المنورۃ واتصلت فیھا بشیخی الاستاذ حمدان لونیسی المھاجر الجزائری وشیخی حسین احمد الھندی اشار علی الاول بالھجرۃ الی المدینۃ المنورۃ وقطع کل علاقۃ لی بالوطن واشار الثانی وکان عالما حکیما۔ بالعودۃ الی الوطن و خدمۃ الاسلام فیہ والعربیۃ بقدر جھد فحقق اللہ رأی الشیخ الثانی ورجعنا الی الوطن بقصد خدمتہ[3]

---

[1] روایت حضرت مولانا سید اسعد مدنی:۔ [2] مکتوب حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی مورخہ ۸۲/۹/۲۷ [3] ابن بادیس، الشہاب ج ۸ ص ۳۵۵ عدد اکتوبر ۱۹۳۷ء بحوالہ ترکی رابح الشیخ عبدالحمید بن بادیس ص ۲۷۔

مجھے خوب یاد ہے میں جب مدینہ منورہ حاضر ہوا اور وہاں میری ملاقات اپنے قدیمی استاذ شیخ حمدان مہاجر جزائری اور دوسرے استاذ شیخ حسین احمد ہندی سے ہوئی تو پہلے استاذ (شیخ حمدان) نے مجھے مشورہ دیا کہ الجزائر کو خیرآباد کہہ کر مدینہ منورہ ہی کو اپنا مسکن و مستقر بنالوں اور دوسرے استاذ (شیخ الاسلام) جو عالم محقق تھے کی رائے یہ ہوئی کہ میں الجزائر جاؤں اور وہاں اسلام و عربیت کی خدمت کروں، اللہ تعالیٰ نے شیخ ثانی کی رائے کو محقق فرمایا اور میں الجزائر کی خدمت کیلئے واپس آگیا۔

لیکن ان مصادر سے یہ بات بالکل نہیں واضح ہوتی کہ حضرت شیخ الاسلام نے اس عظیم خدمت کو انجام دینے کیلئے ابن بادیس کو کیا ہدایات دیں اور کن افکار اور طریقۂ عمل کے تحت انھیں کام کرنے کی ترغیب دی، ظاہر ہے کہ ایک ۲۴ سالہ نوجوان کو جس کی ابتک کی پوری زندگی گھر یا تعلیم گاہ کے ماحول میں گذری ہو جو تنظیم و تحریک کے تجربات سے بالکل ناآشنا ہو اسے یکایک بغیر کسی تعلیم و تربیت کے ایسے اہم ترین صبرآزما اور دوررس نتائج کی حامل خدمت پر مامور کردیا جائے عقل اسے باور کرنے کیلئے تیار نہیں ہے اس لئے لازمی طور پر یہ ماننا پڑے گا کہ حضرت شیخ الاسلام نے ضروری اصول وضوابط سمجھانے کے بعد ہی انھیں اس جوکھم کام پر لگایا ہوگا، لیکن وہ اصول وضوابط کیا تھے کن افکار و نظریات کے تحت اس تحریک کا آغاز کرایا گیا تھا، نہ تو شیخ ابن بادیس کی تحریروں سے اس کا سراغ ملتا ہے اور نہ شیخ ابراہیمی کے بیانات ہی سے، اسوقت کے احوال وظروف کا تقاضہ یہی تھا کہ اس جہاد سے حضرت شیخ الاسلام کے براہ راست تعلق کو واضح نہ کیا جائے، ورنہ شیخ کے لئے مشکلات و مصائب پیش آسکتی تھیں، اور جب حالات سازگار ہوئے تو بیان کرنے والے ہی دنیا سے جاچکے تھے اس لئے یہ راز پردۂ راز ہی میں رہ گیا، لیکن علمی و منطقی اعتبار سے اگر یہ درست ہے کہ تلمیذ و شیخ کے

فکر و عمل میں یکسانیت اور توافق اس بات کی دلیل ہے کہ تلمیذ نے ان افکار و اعمال کو اپنے شیخ سے اخذ و جذب کیا ہے تو بغیر کسی پس و پیش کے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ حضرت شیخ الاسلام نے قائد جہاد شیخ ابن بادیس کو مکمل طور پر اصول و ضوابط کے کیل کانٹے سے لیس کر کے میدان عمل میں اتارا تھا، کیونکہ دونوں کے نظریات اور طریقۂ عمل میں اس قدر موافقت اور یکسانیت ہے کہ الجزائر کے جہاد حریت کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والا ایک لمحہ کیلئے یہ سوچنے لگتا ہے کہ وہ الجزائر کی تاریخ آزادی کو پڑھ رہا ہے یا حضرت شیخ الہند کی تحریک ریشمی رومال اور جمعیۃ علماء ہند کی تاریخ اسکے پیش نظر ہے، اس موقع پر طوالت سے بچتے ہوئے چند نظائر پیش کئے جاتے ہیں۔

فکر و عمل میں یکسانیت

حضرت شیخ الاسلام کا نظریہ تھا کہ ہندوستان کی آزادی تنہا ہندوستان کی آزادی نہیں ہے بلکہ یہ ایشیا کی آزادی کا پیش خیمہ ہے، اور ایشیا کی آزادی مشرق کے کتنے ہی پسماندہ اور کمزور قوموں کی آزادی کا ذریعہ ہے، اپنے احوال ظروف کے مطابق اسی نظریہ کا اعلان شیخ ابن بادیس ان الفاظ میں کر رہے ہیں

"نعم ان لنا وراء هذا الوطن الخاص اوطانا اخرى عزيزة علينا هي دائما على بال ونحن فيما نعمل لوطننا الخاص نعتقد انه لابد ان تكون قد خدمناها واوصلنا اليها النفع والخير من طريق خدمتنا لوطننا الخاص واقرب هذه الاوطان الينا هو المغرب الاقصى والمغرب الادنى والمغرب الاوسط ثم الوطن العربي الاسلامي ثم الانسانية العام"[1]

اس وطن خاص (الجزائر) کے علاوہ ہمارے اور بھی اوطان ہیں، جو ہمیں بہت

---

[1] ابن بادیس الشہاب بحوالہ محمد المیلی: ابن بادیس دعروبہ الجزائر ص ۵۶

محبوب ہیں جن کا خیال ہمہ وقت رہتا ہے اور ہم جو خدمات اپنے وطن کی انجام دے رہے ہیں ہمیں یقین ہے کہ اس راہ سے ہم ان اوطان کی بھی خدمت کر رہے ہیں اور انھیں بھی نفع وخیر پہنچا رہے ہیں، اوران میں ہم سے سب سے قریب مغرب اقصیٰ مغرب ادنیٰ اور مغرب اوسط ہیں، ان کے بعد یہ نفع وطن عربی اسلامی اور پھر وطن انسانیت کو پہنچے گا۔

(۲) حضرت شیخ الاسلام کا نظریہ تھا کہ مشرق کی ساری تباہی اور فساد کی جڑ مغربی اقتدار کا غلبہ ہے اگر مغرب کا یہ استعماری غلبہ ختم ہوجائے تو مشرق کے مزاج کی اصلاح ہوسکتی ہے۔ اس نظریہ کی بازگشت شیخ ابن بادیس کے کلام میں سنی جاسکتی ہے

اننا نفرق جیدا بین الروح الانسانیة والروح الاستعماریة فی کل امة فنحن بقدر ما نکرہ ھذہ وتقاومھا نوالی تلک ونؤیدھا لاننا نتیقن کل الیقین ان کل بلاء العالم ھو من ھذہ وکل خیر یرجی للبشریة انما یکون یوم تسود تلک فتسقط الروح الاستعماریة ولمتندحر ولترتفع الروح الانسانیة ولتنتشر [۱]

ہم روح انسانیت اور روح استعماریت کے درمیان فرق کو اچھی طرح جانتے ہیں اور ہم اسی فرق کے مطابق استعماریت کو ناپسند کرتے اور اس کی مخالفت کرتے ہیں اور روح انسانیت کو دوست رکھتے اور اس کی تائید کرتے ہیں اس لئے کہ ہمیں یقین کامل ہے کہ عالم کی تمام تر مصیبت کا سبب یہی استعماریت ہے اور انسانیت کیلئے کسی خیر کی امید اسی وقت کی جاسکتی ہے جس وقت کہ انسانیت کی سیادت اور بالاتری حاصل ہوجائے، لہذا اس وقت روح استعماریت ساقط اور ختم ہوجائے گی اور روح انسانیت بلند اور چھا جائے گی۔

---

[۱] ابن بادیس، الشہاب ۱۹۳۸ء بحوالہ محمد المیلی: ابن بادیس وعروبة الجزائر ۵۳

(۳) حضرت شیخ الاسلام کا نظریہ تھا کہ ہندوستانی مسلمان اپنی ملی حیثیت کے تحفظ کے ساتھ ہندوستانی قومیت کا ایک عنصر ہیں کیونکہ آج کل قومیت کا تشخص وطنیت کی بنیاد پر کیا جاتا ہے اور لفظ قوم اپنے معنٰی کے اعتبار سے اسی جماعت پر منطبق ہوتا ہے جس میں جامعیت کا کوئی سبب موجود ہو۔

شیخ ابن بادیس نے اس نظریہ کی تعبیر حسب ذیل الفاظ میں کی ہے۔

المسلم هو المتدين بالاسلام والاسلام عقائد واعمال واخلاق بها السعادة فى الدارين والجزائري انما ينسب للوطن افراده الذين ربطتهم ذكريات الماضى ومصالح الحاضر وآمال المستقبل فالذين يعمرون هذا القطر وتربطهم هذه الروابط هم الجزائريون[1]

مسلم وہ شخص ہے جو دین اسلام کا پابند ہے اور اسلام ایسے عقائد، اعمال اور اخلاق کو شامل ہے جس سے دارین کی سعادت متعلق ہے، اور جزائری تو صرف وطن کی جانب منسوب ہیں جس کے افراد کو ماضی کی تاریخ، حال کے مصالح اور مستقبل کی امیدوں نے باہم مربوط کر رکھا، لہٰذا جو لوگ اس ملک میں آباد اور ان مذکورہ روابط میں مربوط ہیں وہ جزائری ہیں۔

(۴) حضرت شیخ الاسلام کا نظریہ تھا حق و انصاف میں ذات و مذہب کی بنیاد پر امتیاز غلط ہے ملک کے تمام باشندے خواہ وہ کسی بھی ذات و مذہب سے تعلق رکھتے ہوں حق و انصاف میں سب کے حقوق یکساں ہیں۔

شیخ ابن بادیس اس نظریہ کا اعلان یوں کرتے ہیں

فنهضتنا نهضة بنيت على الدين اركانها فكانت سلاما على البشرية .... لا يخشاها والله النصرانى لنصرانيته ولا

---

[1] ابن بادیس: الشہاب ج ۱۰ عدد نومبر۔

الیهودی لیهودیته بل ولا مجوسی لمجوسیته ولکن یجب والله ان یخشاها الظالم بظلمه والدجال لدجله والخائن لخیانته[۱]

ہمارے اس انقلاب کی اساس دینی ہے جو انسانیت کی سلامتی کا ذریعہ ہے، اس میں نصرانی اپنی نصرانیت اور یہودی اپنی یہودیت کی وجہ سے خائف نہیں ہوگا بلکہ مجوسی کو بھی اپنی مجوسیت کی بنا پر کوئی اندیشہ نہ ہوگا۔ البتہ ظالم اپنے ظلم دجال اپنے دجل وفریب اور خائن اپنی خیانت کی بنیاد پر خوف زدہ ہوگا۔

نظریات میں اس وحدت کے بعد ایک سرسری جائزہ طریقۂ کار اور دستور العمل پر بھی ڈالتے چلئے۔ حضرت شیخ الہند نے اپنی تحریک کی ابتدا درس وتدریس سے کی تھی، دورانِ درس جن تلامذہ میں صلاحیت پاتے تعلیم علوم کے ساتھ اس کی سیاسی تربیت بھی فرماتے تھے ایک عرصہ تک اس طرح کام کرنے کے بعد جب ملک کے اطراف وجوانب میں تلامذہ کی ایک جماعت منظم طور پر کام کو آگے بڑھانے کے لئے تیار ہوگئی تو جمعیۃ الانصار کی داغ بیل ڈالی اور پھر دہلی میں مولانا عبید اللہ سندھی کے ذریعہ نظارۃ المعارف کے عنوان سے درس قرآن کا ایک حلقہ قائم کیا، اس طرح سے ملک کے ذہین، بیدار مغز، متحرک اور فعال افراد پر مشتمل ایک جماعت اپنے گرد اکٹھا کرلی اور پھر انھیں کے واسطے سے تحریک کا جال پورے ملک میں بچھا دیا، تحریک کی اسی ہمہ گیری کا نتیجہ تھا کہ حضرت شیخ الہند کی گرفتاری اور قید وبند کی وجہ سے کام کرنے والوں میں اضمحلال نہیں پیدا ہوا بلکہ انھوں نے خلافت کمیٹی اور جمعیۃ علما کے نام سے ایک محاذ کے بجائے دو دو محاذ کھول دیئے اور بالآخر اسی جمعیۃ علماء کے پلیٹ فارم سے آزادی کی بھرپور جنگ لڑی گئی۔ اس پس منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے شیخ ابن بادیس کی تاریخ جہد وعمل کا مطالعہ کیجئے۔

---

[۱] ابن بادیس: الشہاب ۱۹۳۶ء بحوالہ سابق

وہ ۱۹۱۳ء میں حضرت شیخ الاسلام کی ہدایت پر الجزائر واپس آئے اور ہر مشغلہ سے بالکل یکسو ہو کر درس و تدریس وعظ و تذکیر میں لگ گئے اور ایک دو سال نہیں بلکہ پورے دس سال اس خالص علمی مشغلہ کو جاری رکھا وہ خود لکھتے ہیں

قضينا عشر سنوات في الدرس لتكوين نشئ العلمي لم تخلط به غيره من عمل اخر فلما كملت العشر و ظهرت بحمد الله نتيجتها الخ

ہم نے پورے دس سال (الجزائر) کی نشأ علمی میں گذار دیئے جن میں ترویج علوم کے علاوہ ہم نے کوئی کام نہیں کیا اور الحمد للہ جب اسکے اچھے نتائج بھی ظاہر ہوئے

طریقہ یہ تھا کہ رات کو قرآن حکیم کا عمومی درس ہوتا تھا، جس کے ضمن میں اپنے سیاسی، اجتماعی اور اصلاحی نظریات کو بھی مدلل طور پر بیان کرتے رہتے تھے، اس درس کو اس درجہ مقبولیت ہوئی کہ شہر قسطنطینہ کے علاوہ مضافات سے بھی بڑی جماعت اس میں شرکت کے لئے آتی تھی، اور دن کو خصوصی درس ہوتا تھا جس میں صرف طلبہ شریک ہوتے تھے، اس درس میں تفسیر قرآن، مؤطا امام مالک، مقدمہ ابن خلدون اور بعض فقہ اور تاریخ کی کتابیں ہوتی تھیں، اس طرح سے دس سال کی مدت میں انھوں نے آگے کے کام کی زمین تیار کر لی اور اپنے تلامذہ اور مستفیدین کے ذریعہ پورے ملک میں اپنے نظریات کو عام کر دیا اس کے بعد ۱۹۲۵ء میں یکے بعد دیگرے علی الترتیب دو رسالے المنتقد اور الشہاب جاری کئے (ممکن ہے الشہاب نام حضرت شیخ الاسلام کی فاضلانہ کتاب "الشہاب الثاقب" کے نام سے اخذ کیا ہو، یہ کتاب اس وقت شائع ہو چکی تھی) جس میں اپنے سیاسی، اجتماعی اور اصلاحی نظریات پر کھل کر بحث کرتے تھے، اس کا اثر بھی ملک پر نہایت اچھا پڑا اور لوگوں میں سیاسی بیداری پیدا ہو گئی بعد ازاں ۱۹۳۱ء میں جمعیۃ علماء الجزائر کی بنیاد رکھی جس کے خود ہی تاحیات صدر رہے، شیخ بادیس کے جانشین جمعیۃ علماء کے دوسرے شیخ محمد بشیر الابراہیمی جمعیۃ علماء کی اہمیت

ضرورت کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں

لو تأخر ظهور جمعية العلماء عشرين سنة لما وجدنا في الجزائر من يسمع صوتنا "اگر جمعیۃ علماء کی تاسیس میں دس بیس سال کی تاخیر اور ہو جاتی تو ہماری باتیں سننے کیلئے الجزائر میں ایک آدمی بھی نہ ملتا۔

پھر جمعیۃ علماء کے پلیٹ فارم سے کھل کر آزادی کی جنگ لڑی گئی۔

فکر و عمل کا یہ اتحاد بلا شبہ اس بات پر شاہد عدل ہے کہ الجزائر کی جنگ آزادی حضرت شیخ الاسلام کے متعین کردہ خطوط پر برپا کی گئی ورنہ اس طرح کا کلیۃً اتحاد ممکن نہیں تھا، اس لئے تاریخ کا طالب علم اگر یہ دعوی کرتا ہے کہ جس طرح ہندوستان کی تاریخ آزادی میں اگر حضرت شیخ الہندؒ کا تذکرہ نہ کیا جائے تو وہ تاریخ ناقص اور ادھوری ہوگی ٹھیک اسی طرح اگر الجزائر کے جہادِ حریت کی تاریخ میں شیخ الہند کے جانشین مولانا حسین احمد مدنیؒ کا ذکر نہ ہو تو وہ تاریخ بھی غیر مکمل و ناتمام ہوگی، تو اس کا دعویٰ یقیناً مبنی بر حق ہوگا حضرت شیخ الاسلام کا یہ ایک ایسا عظیم اور بے مثال امتیاز ہے جس کی نظیر ہندوستان کے کسی بھی قومی لیڈر اور سیاسی رہنما میں تلاش کرنا بے سود ہے۔ ع

"یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا"

وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العٰلمين والصلوٰة والسلام على خاتم المرسلين وعلى آله واصحابه اجمعين۔

---

[1] ابن بادیس کے جہد و عمل کی ترتیب کے لئے ترکی رابح الشیخ عبد الحمید بن بادیس باعث النهضة الاسلامية في الجزائر کے صفحات ۴۲، ۷۵، اور ۱۵۳ ملاحظہ ہوں۔

کوائفِ دارالعلوم

(۱) ـــــــ دستورِ تعامل کے مطابق ۱۰ شوال کو دارالعلوم کھل گیا، داخلہ کے امیدوار طلبہ کی آمد کا سلسلہ اگرچہ رمضان المبارک ہی سے شروع ہوگیا تھا اور سیکڑوں جدید طلباء حاطۂ دارالعلوم میں فروکش ہوکر پوری تندہی کے ساتھ امتحانِ داخلہ کی تیاری میں لگے ہوئے تھے لیکن دارالعلوم کے کھلتے ہی جدید طلبہ سیلاب کی طرح امنڈ پڑے اور دیکھتے دیکھتے دارالعلوم کی وسیع وعریض عمارتیں طلبۂ عزیز سے کھچا کھچ بھر گئیں دارالعلوم اور اس سے متصل مسجدیں نمازیوں کی کثرت سے تنگ ہوگئیں۔ دفترِ تعلیمات نے اعلان کے مطابق ۴ شوال سے ہی درخواست داخلہ کا فارم لینا شروع کردیا تھا، ۱۰/۱۱ شوال تک ڈھائی ہزار سے زائد درخواستیں جمع ہوگئیں اس کارروائی کی تکمیل کے بعد امتحانات شروع ہوئے، دورۂ حدیث سے درجۂ چہارم تک کے امیدواروں کا تحریری امتحان لیا گیا اور اس سے نیچے کا تقریری اس طرح درجاتِ عربیہ کے امتحانات ۱۹ شوال تک مکمل ہوگئے اور ان کے نتائج بھی شائع کردیئے گئے تاکہ ناکام امیدوار دیگر مدارس میں داخلہ لے سکیں، ظاہر ہے کہ ڈھائی تین ہزار طلبہ کے امتحانات، ان کی کاپیوں کی جانچ پھر انکے نتائج کا اعلان اس قلیل مدت میں کوئی آسان کام نہ تھا لیکن طلبہ عزیز کی سہولت کی غرض سے حضرات اساتذہ اور دفترِ تعلیمات کے کارکنان مشین کی طرح شب و روز مصروفِ کار رہ کر ہفتہ کے اندر اندر ان سارے امور کو بحسن و خوبی مکمل کردیا، گزشتہ سال کی تعداد کے لحاظ سے جدید داخلہ کی گنجائش مجموعی طور پر ساڑھے پانچ سو تھی لیکن امیدواروں کی کثرت اور دارالعلوم سے ان کی والہانہ وابستگی کے پیشِ نظر حضرت مہتمم صاحب مدظلہ کے خصوصی حکم سے تقریباً ساڑھے نو سو جدید طلبہ کا داخلہ لیا گیا، دارالعلوم کے وسائل کی تنگ دامانی اور طلبہ کی ناکامیوں نے حضرت مہتمم صاحب کو مجبور کردیا ورنہ طلبہ کے ساتھ ان کی عنایت و محبت چاہتی

تھی کہ ہر ایک طالب علم کو اپنے دامن شفقت میں سمیٹ لے، گذشتہ سے پیوستہ سال جب طلبہ کی کثرت کی بنا پر دارالعلوم نے مقابلہ کے امتحان کا قانون وضع کیا تو اس سال امیدواروں کے نتائج بڑے مایوس کن تھے، گزشتہ سال کے امتحان میں کچھ بہتری آئی، اور اس سال کے نتائج امتحان بڑے حوصلہ افزا تھے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دارالعلوم کا یہ طریقہ امتحان معیار تعلیم میں بلندی کا ایک بہترین ذریعہ ہے اور داخلے کے خواہشمند طلبہ پوری جد و جہد کو کام میں لا رہے ہیں۔ فالحمد للہ علیٰ ذلک۔

داخلے کی مہم کو سرانجام دینے کے بعد ۲۹ شوال کو فقیہ العصر حضرت مولانا مفتی محمود حسن دامت برکاتہم کے درس بخاری اور دعا سے نئے سال کی تعلیم کا آغاز کر دیا گیا، تقریباً دو ڈھائی ماہ کے وقفہ کے بعد دارالعلوم میں تعلیمی چہل پہل پھر سے شروع ہو گئی ہے اور اس کے در و بام قال اللہ وقال الرسول کی حیات بخش صداؤں سے گونجنے لگے ہیں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ گذشتہ سالوں کی طرح اس سال کو بھی بحسن وخوبی انجام تک پہنچائے اور اساتذہ وطلبہ کو افادہ واستفادہ کی بھرپور توفیق ارزانی فرمائے۔ آمین۔

(۲) جامع مسجد دارالعلوم کی تعمیر کا سلسلہ تقریباً ایک سال سے جاری ہے تہہ خانے کی چھت پڑ چکی ہے، تہہ خانے کی یہی چھت اصل عمارت کی کرسی ہے اس زیر تعمیر وسیع و عریض مسجد کے مسقف حصہ میں بیک وقت ڈھائی ہزار افراد نماز ادا کر سکتے ہیں طلبۂ دارالعلوم کی کثرت کی بنا پر قدیم مسجد عرصہ سے بالکل ناکافی ہو چکی تھی، ارباب انتظام ایک وسیع مسجد کی تعمیر کی فکر میں تھے لیکن موجودہ ہوش ربا گرانی کی وجہ سے اس کثیر المصارف کام کو چھیڑنے کی ہمت نہیں کر رہے تھے۔ خدا بھلا کرے بمبئی کے مسلمانوں کا کہ انھوں نے ہفتہ عشرہ کے اندر آٹھ نو لاکھ روپے کا انتظام کر کے حضرت مہتمم صاحب اور دیگر اصحاب عمل کو ہمت دلائی اور خدا کے نام پر بزرگوں کے ہاتھوں سنگ بنیاد رکھ دیا گیا اور قدرے توقف کے بعد تعمیر کا کام بھی شروع کر دیا گیا، خدا کے فضل اور ارباب

خیر کی ہمت و توجہ سے بحمد اللہ کام برابر جاری ہے اور ایک اندازے کے مطابق اب تک چالیس پینتالیس لاکھ روپئے تعمیر میں خرچ ہو چکے ہیں، اہل خیر و صلاح کیلئے ایک عظیم صدقۂ جاریہ میں حصہ لینے کا یہ زریں موقع ہے، امید ہے کہ یہ حضرات اس کی طرف پوری توجہ فرمائیں گے۔

(۳) ـــــ ابھی ابھی جمعیۃ علماء ہند کے دفتر واقع دہلی سے بذریعہ فون یہ اندوہناک اطلاع آئی ہے کہ دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے رکن رکین الحاج علاء الدین صاحب مقیم بمبئی کا انتقال ہو گیا ہے۔ مرحوم ایک بے لوث دینی و سماجی کارکن تھے جماعت تبلیغی، دارالعلوم دیوبند، اور مظاہر علوم سہارنپور سے بیک وقت خصوصی تعلق رکھتے تھے اور ان کی ہر نوع کی خدمت کو اپنا فرض منصبی سمجھتے تھے۔ مرحوم کی وفات ان تینوں اداروں کے لئے ایک بڑے خسارے کا سبب ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس قحط رجال کے دور میں حاجی صاحب جیسا صائب الرائے، فعال، حق گو، ہر دل عزیز دینی خدمت گار ملنا مشکل ہے، دارالعلوم مرحوم کے اعزہ و اقارب کے غم میں برابر کا شریک ہے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، ان کے پسماندگان کو صبر جمیل و جزائے جزیل سے نوازے اور دارالعلوم کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے آمین۔

تعارف مطبوعات جدیدہ

تعارف و تبصرہ کیلئے کتاب کے دو نسخے لازمی ہیں ورنہ تبصرہ سے معذوری ہوگی

انوار الباری شرح اردو صحیح بخاری جلد ہفتدھم قسط نوزدھم

مؤلفہ مولانا سید احمد رضا بجنوری، تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۲۰۸، قیمت تیس روپے، شائع کردہ مکتبہ ناشر العلوم بخارہ روڈ، بجنور، یوپی۔

مولانا سید احمد رضا بجنوری تلمیذ حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی و علامہ انور شاہ کشمیری، عصر حاضر کے متبحر اور وسیع النظر علماء میں شمار ہوتے ہیں قدیم و جدید علمی تحقیقات و انکشافات سے موصوف کو پوری واقفیت ہے، علمائے دیوبند بالخصوص محدث کشمیری کے افادات و تحقیقات کے بہترین جامع و شارح ہیں، موصوف تقریباً بیس سال سے انوار الباری کے نام سے صحیح بخاری کی اردو زبان میں نہایت مبسوط و محققانہ شرح لکھ رہے ہیں جو وقفہ کے ساتھ قسط وار شائع ہوتی ہے، زیر تبصرہ مجموعہ اسی شرح کا انیسواں جزء ہے جس میں صحیح بخاری کی کتاب الجنائز اور کتاب التوحید والعقائد پر شرح و بسط کے ساتھ بحث کی گئی ہے، دیگر حصوں کی طرح اس حصہ میں بھی مؤلف موصوف کے ذہن رسا اور سیال قلم نے نادر اور کمیاب تحقیقات کے ایسے ایسے عجیب اور خوشنما گل بوٹے جمع کر دئے ہیں کہ تحزب و جتھہ بندی کی ذہنیت سے الگ ہو کر اس کا مطالعہ کرنے والا داد و تحسین سے باز نہیں رہ سکتا، دینی علوم بالخصوص حدیث سے شغف رکھنے والے طلبہ و علماء کیلئے یہ ایک گرانقدر تحفہ ہے جس سے انھیں ذوق و شوق کے ساتھ مستفید ہونا چاہئے۔

تذکرۃ الانبیاء حصہ اول و دوم

مرتبہ مولانا قاری شریف احمد، تقطیع کلاں، کاغذ عمدہ، کتابت و طباعت نفیس، جلد مضبوط و دیدہ زیب الصفحات

جلد اول ۶۴۰، جلد دوم ۱۴۱۰ مع ضمیمہ، ناشر مکتبہ رشیدیہ قاری منزل چوک ــــ کراچی پاکستان ۔ قیمت درج نہیں۔

مولانا قاری شریف احمد بڑے بافیض عالم دین ہیں ان کے قلم سے مختلف دینی موضوعات پر اب تک تقریباً دو درجن چھوٹی بڑی کتابیں نکل چکی ہیں اور سب ہی شائع ہوکر مقبول خاص وعام ہیں ان میں معلم الدین اردو، فارسی، پنجابی اور انگریزی چاروں زبانوں میں چھپی موصوف کی یہ سب سے بڑی خوبی ہے کہ جو کچھ لکھتے ہیں قرآن وحدیث اور علمائے حق کی تحقیقات کی روشنی میں لکھتے ہیں، انداز تحریر نہایت سادہ، سلیس اور سہل الفہم ہے جسے معمولی پڑھے لکھے لوگ بھی اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں، ان کی یہ تازہ ترین تصنیف تذکرۃ الانبیاء بھی انھیں خوبیوں کی حامل ہے، تذکرۃ الانبیاء کے موضوع پر اردو فارسی اور عربی میں بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں جن میں علامہ عبدالوہاب نجار کی قصص الانبیا اور مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی کی قصص القرآن علمی حلقوں میں مشہور ومتداول ہیں لیکن علامہ نجار کی کتاب عربی میں ہے اور مولانا سیوہاروی کی یہ بلند پایہ تصنیف علمی اسرار وحکم اور ادق تفسیری مباحث پر مشتمل ہونے کی وجہ سے علماء وفضلا کے دائرہ تک ہی محدود رہیں، اور ان اہم کتابوں کے منصۂ شہود میں آنے کے باوجود یہ ضرورت اپنی جگہ باقی رہی کہ اس موضوع پر آسان اردو میں صحیح ومستند حوالوں کے ساتھ ایک کتاب مرتب کی جائے جس سے عام اردو خواں مستفید ہوسکیں، مستحق صد تحسین ہیں مولانا قاری شریف احمد صاحب کہ ان کے ہاتھوں یہ مبارک کام بتمام حسن وخوبی پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا، کتاب کے پہلے حصہ میں حضرت آدم علی نبینا وعلیہ الصلوۃ والسلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک اٹھائیس حضرات انبیاء کے تذکرے ہیں جن میں حضرت یوشع حضرت حزقیل اور شموئیل علیہم السلام کے علاوہ ان حضرات انبیاء کا انتخاب کیا گیا ہے جن کے واقعات یا کم از کم اسماء قرآن حکیم میں مذکور ہیں، دوسرا حصہ حضرت خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محاسن ومحامد

کے تذکرے پر مختص ہے جس میں ولادت نبوی سے وفات تک کے حالات و واقعات بڑے دل نشین پیرائے میں بیان کئے گئے ہیں، کتاب کے دونوں حصے ہر اعتبار سے لائق ستائش ہیں اور بجا طور پر یہ امید کی جا سکتی ہے کہ موصوف کی دیگر تصانیف کی طرح یہ مبارک مجموعہ بھی دیندار حلقوں میں خصوصیت کے ساتھ پڑھا سنا جائیگا۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ نماز

از مولانا مفتی جمیل احمد نذیری فاضل دیوبند۔ تقطیع متوسط، کاغذ درمیانی۔ کتابت وطباعت صاف ستھری، مجلد مع کاغذی کور، صفحات ۳۹۰۔ قیمت ۳۵ روپے

ناشر مکتبہ صداقت مبارکپور اعظم گڈھ یوپی، ملنے کے پتے مکتبہ صداقت مبارک پور مکتبہ القرآن ۳۱ نیا گاؤں ویسٹ لکھنؤ، مکتبہ ندوۃ العلماء لکھنؤ، مکتبہ البدر دارالعلوم فاروقیہ کاکوری لکھنؤ، مکتبہ رحمانیہ ہتھورا ضلع باندہ (یوپی) دارالاشاعت اسلامیہ کولوٹولہ اسٹریٹ کلکتہ ۳۳ مکتبہ قاسمی ۶/۴۳ غیبی نگر بھیونڈی ضلع تھانہ مہاراشٹر، دارالکتاب دیوبند سہارنپور (یوپی)

بعض خود پسند حلقوں کی جانب سے ایک عرصہ سے یہ مہم چلائی جا رہی ہے کہ احناف کا طریقہ نماز سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ہے، بہت سے کم پڑھے لکھے مسلمان اس غلط پروپیگنڈے کا شکار ہو کر شکوک و شبہات میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور اس فریب میں آکر بسا اوقات اس اہم ترین فریضہ ہی سے دست کش ہو جاتے ہیں اس لئے اس خطرناک اور مہلک پروپیگنڈے کے مسموم اثرات کو زائل کرنے کیلئے ضرورت تھی کہ عام فہم اردو میں ایک ایسی کتاب مرتب کیجائے جس میں پورے حنفی طریقہ نماز کو کتب فقہ کے بجائے قرآن وسنت کے حوالوں سے مدلل کر کے پیش کیا جائے، عام علمائے دین بالخصوص حنفی مکتب فکر سے متعلق علماء کی طرف سے مولانا مفتی جمیل احمد صاحب فاضل دیوبند مستحق صد شکر ہیں کہ انھوں نے یہ کتاب مرتب کر کے حضرات علماء کے سر سے ایک بہت بڑے قرض کو چکا دیا ہے۔ "ایں کار ساز تو آید مرداں چنیں کنند" حقیقت یہ ہے کہ کتاب اپنے موضوع و مقصد میں مکمل اور کامیاب ہے۔ ضرورت ہے کہ اس مجموعۂ خوبی کو گھر گھر پہنچایا جائے حضرات ائمہ اپنی اپنی مسجدوں میں لاسے پڑھ کر سنائیں اور مدارس و مکاتب کی کوئی بھی لائبریری اس سے خالی نہ رہے۔

ماهنامہ

دارالعلوم

دارالعلوم دیوبند کا ترجمان

دیوبند

ماہ ذی قعدہ ۱۴۰۸ھ

مطابق

جولائی ۱۹۸۸ء

نگراں :

حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب

مہتمم دارالعلوم دیوبند

مدیر

مولانا حبیب الرحمن قاسمی

استاذ دارالعلوم دیوبند

سالانہ بدل اشتراک بیرون ممالک سے

سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ کا سالانہ	160/=
پاکستان سے	70/=
بنگلہ دیش سے (ہندوستانی)	50/=

فی شمارہ ۴/- سالانہ چالیس روپے شمارہ ۷ جلد ۷۳

سرخ نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ کا زر تعاون ختم ہو گیا ہے

فہرست مضامین

ہندوستانی و پاکستانی خریداروں سے ضروری گذارش

① ہندوستانی خریداروں سے ضروری گذارش ہے کہ ختم خریداری کی اطلاع پا کر اول فرصت میں اپنا چندہ نمبر خریداری کے حوالہ کے ساتھ منی آرڈر سے روانہ کریں۔

② پاکستانی خریدار اپنا چندہ مبلغ -/۷۰ مولانا عبدالستار صاحب مہتمم جامعہ عربیہ محمودیہ داؤد والا براہ شجاع آباد ملتان پاکستان کو بھیجدیں۔

③ خریدار حضرات پتہ پر درج شدہ نمبر محفوظ فرمالیں، خط و کتابت کے وقت خریداری نمبر ضرور لکھیں۔

والسلام

منیجر

مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی

ھندوستان ایک سیکولر ملک ہے، یہاں کے آئین کی رو سے اس ملک میں موجود ہر مذہب کو پھولنے پھلنے اور ترقی کرنے کا یکساں حق حاصل ہے، اس میں بسنے والے اپنے مذہبی رسوم اور طور طریقے میں آزاد ہیں، چنانچہ دستور ہند میں "مذہب کی آزادی کا حق" کے تحت صاف لفظوں میں درج ہے کہ "تمام اشخاص کو آزادیٔ ضمیر اور آزادی سے مذہب قبول کرنے، اس کی پیروی اور اس کی تبلیغ کرنے کا مساوی حق ہے (بھارت کا آئین حصہ ۳ بنیادی حقوق دفعہ ۲۵ ص ۴۶)

دستور کی اس واضح بنیادی اور مضبوط ضمانت کے باوجود حکومتِ وقت اس کے ماتحت ادارے حتیٰ کہ عدلیہ تک کا رویہ مسلمانوں کے مذہبی امور کے متعلق نہ صرف غیر منصفانہ بلکہ جارحانہ ہے۔ "بابری مسجد" ہی کا معاملہ لے لیجئے، جس کا مسجد ہونا تاریخ کے ٹھوس دلائل ہی سے نہیں خود سرکاری و عدالتی کاغذات سے بھی ثابت ہے، لیکن اسے کس آسانی کے ساتھ مندر میں تبدیل کردیا گیا۔ کہ اس سلسلہ میں مسلمانوں کی ہر چیخ و پکار صدا بصحرا بن کر رہ گئی ہے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کے سامنے یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے، کچھ اسی طرح کا رویہ مسلمانوں کی ڈاڑھی کے بارے میں بھی اختیار کیا جارہا ہے۔ فوج و پولیس میں مسلم ملازمین کو ڈاڑھی منڈوانے پر مجبور کیا جاتا ہے اور ستم ظریفی کی حد ہے کہ اس غیر قانونی اور نامنصفانہ اقدام پر عدالت عالیہ کی جانب سے سندِ جواز بھی عطا کردی جاتی ہے، مسٹر پی سی بال

کرشنا مینن جسٹس کیرالا ہائی کورٹ کا فیصلہ ہمارے اس دعویٰ پر شاہد عدل ہے جبکہ ڈاڑھی رکھنا ایک خالص مذہبی عمل ہے، کیونکہ یہ سنتِ رسول اور اسلام کا شعار ہے، رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پاک ارشادات میں ڈاڑھی بڑھانے پر خاص ہدایت فرمائی ہے۔ ایک موقع پر فرمایا۔ د فروا اللحی واحفوا الشوارب (بخاری شریف) ایک دوسرے فرمان میں اسی بات کی تاکید ان الفاظ میں فرمائی انھکوا الشوارب واعفوا اللحیٰ (صحیح بخاری) صحیح مسلم کی روایت میں یہ الفاظ ہیں جزوا الشوارب وارخوا اللحیٰ۔ ان سب احادیث کا حاصل یہی ہے کہ مونچھوں کو کترا جائے اور ڈاڑھی کو بڑھایا جائے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس فرمان پر خود عمل کرکے امت کو عملی طور پر بھی ڈاڑھی بڑھانے کی تعلیم دی اور آپ کے اعمال و افعال کے بارے میں علمائے دین اور اسلامی قانون کے ماہرین کا فیصلہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال اگر قرآن حکیم میں مذکور احکام یا خود آپ کے فرمان کی تشریح و تعیین کر رہے ہیں تو قرآن کے ان احکام اور نبی کریمؐ کے ان فرمان کا جو درجہ ہوگا وہی آپ کے اس عمل کا بھی ہوگا جس سے قرآن وسنت کے ان احکامات کی توضیح و تشریح ہو رہی ہے، اگر قرآن وسنت کا وہ حکم واجب کے درجے میں ہوگا تو آپ کا یہ عمل بھی واجب ہوگا، اور اگر اس حکم سے سنت یا استحباب کا ثبوت ہو رہا ہے تو آپ کا یہ عمل بھی سنت و مستحب ہوگا، اور فقہائے اسلام اس پر متفق ہیں کہ ارشاد نبوی "واعفوا اللحیٰ" سے سنت موکدہ کے درجہ میں ہے اس لئے آپ کے عمل سے بھی ڈاڑھی کا سنت مؤکدہ ہونا ہی ثابت ہوگا، لہذا آپ کے عمل کو رسم و عادات پر محمول کرنا اسلامی قوانین سے عدم واقفیت کی دلیل ہوگی، ڈاڑھی کی اسی شرعی حیثیت کی بنا پر تمام اصحاب رسول علمائے اسلام اور صلحائے اُمت ابتدائے اسلام سے برابر اس پر عمل کرتے چلے آرہے ہیں اور آج کے فیشن پرستی

کے دور میں بھی اسلامی احکام و اعمال اور مذہبی طرز معاشرت پر چلنے والے مسلمان اپنے پیارے رسول کی اس پیاری سنت کو گلے سے لگائے ہوئے ہیں۔

اس تفصیل سے یہ بات آفتاب نیمروز کی طرح آشکارا ہوگئی کہ ڈاڑھی کا معاملہ رسم و رواج سے تعلق رکھتا بلکہ یہ اسلامی معاشرے کا ایک شعار اور اسلامی تہذیب کا ایک نشان ہے، جس طرح ہندو دھرم میں سر پر چوٹی رکھنا، جنیو پہننا یا عیسائی مذہب میں گردن میں صلیب لٹکانا اور سکھ پنتھی میں سر اور ڈاڑھی کے بال کا بڑھانا مذہبی علامت ہے، اور جس پر کسی قسم کی بندش یا قدغن لگانا، آئین ہند کے سراسر خلاف ہوگا اور اس رویہ کو بجا طور پر خلاف قانون، ناانصافی اور ظلم سمجھا جائے گا۔ اسی طرح مذہب اسلام میں ڈاڑھی کا بڑھانا مذہبی شعار اور دینی علامت ہے جس پر کسی طرح کی بھی بندش اور رکاوٹ مداخلت فی الدین، اور ایک خالص مذہبی معاملہ میں خلل اندازی ہوگی، جو دستور ہند سے انحراف اور ایک غیر منصفانہ حرکت کہی جائے گی

کیرلا اور اندھرا کی ریاستوں کے بعد اخبارات کی اطلاع کے مطابق اب اتر پردیش میں بھی یہ ظالمانہ رویہ اپنایا جارہا ہے، چنانچہ پولیس ریڈیو ڈیپارٹمنٹ میں ایک مسلم ملازم کو محض ڈاڑھی رکھنے کی بنا پر اس ڈیپارٹمنٹ کے افسران پریشان کررہے ہیں اور اسے اس بات پر مجبور کیا جارہا ہے کہ وہ اپنے برگزیدہ رسول کی سنت اور مذہبی علامت سے دست بردار ہوجائے۔

لیکن حکومت ہند اور ملک کے فرقہ پرست سرکاری افسران کو یہ بات اچھی طرح سے ذہن نشین رکھنی چاہئے کہ مسلمان اپنے مال و جان کے زیاں کو برداشت کرسکتا ہے، لیکن اپنے مذہبی معاملات میں مداخلت کو کسی قیمت پر بھی انگیز نہیں کرسکتا۔ اس لئے کسی طوفان کے سر اٹھانے سے پہلے حکومت ہند کو

چاہئے کہ سنجیدگی کے ساتھ ان مذہبی معاملات کو دستور ہند کی روشنی میں جلد از جلد حل کر دے، یہی انصاف کا تقاضہ ہے اور سیاسی دوراندیشی بھی اسی بات کی متقاضی ہے کہ اس طرح جذباتی مسائل کو معرض التوا میں ڈالنے کے بجائے انھیں جلد از جلد قانون وانصاف کے مطابق حل کر دیا جائے کیونکہ اس طرح کے سلگتے ہوئے مسائل میں ٹال مٹول سے فرقہ پرست افراد اور تنظیموں کو شر انگیزی کا موقع ملتا ہے جس سے ملک کی یکتا اور سالمیت کے علاوہ خود حکومت کو بھی نقصان پہنچ سکتا ہے۔

از مولانا حبیب الرحمن قاسمی

قسط دوم

نکاح کے شرعی قوانین

ایجاب وقبول کے صیغے

۱۱ ــــــ ایجاب وقبول کے الفاظ میں دونوں صیغے ماضی کے ہوں گے یا ایک ماضی اور دوسرا مستقبل کا۔

تشریح: ایجاب وقبول کے لئے دونوں صیغے ماضی کے ہوں جیسے کوئی کہے کہ میں نے اپنا یا اپنی بیٹی کا یا اپنی مؤکلہ کا نکاح تجھ سے کیا اور دوسرا کہے میں نے قبول کیا۔ نکاح ان دو لفظوں سے بھی منعقد ہوجاتا ہے جن میں سے ایک لفظ ماضی کے لئے موضوع ہو اور دوسرا مستقبل یا حال کیلئے، مستقبل سے مراد امر کا صیغہ ہے، جیسے کوئی کہے کہ میرا نکاح اپنی ذات سے کردے۔ یا یوں کہے کہ میری بیوی ہوجا، اور دوسرا کہے کہ میں نے تیرا نکاح اپنی ذات سے کردیا، یا میں تیری بیوی ہوگئی۔ نکاح ان دو لفظوں سے بھی ہوسکتا ہے جن میں ایک صیغہ ماضی کا اور دوسرا مضارع کا ہو لیکن صیغہ مضارع سے اس وقت نکاح منعقد ہوگا جب کہ متکلم اس سے استقبال کے معنی کا ارادہ نہ کرے، بلکہ حال مراد ہو، ورنہ وعدۂ نکاح ہوگا نہ کہ ایقاع نکاح۔ بہرحال ایجاب وقبول میں سے ایک صیغہ ماضی کا ہونا ضروری ہے[1]

---

[1] وینعقد بالایجاب والقبول وضعا للمضی او وضع احدھما للمضی والآخر لغیرہ مستقبلا کان کالامر او حالا کالمضارع کذا فی النہر الفائق عالمگیری ج ۱ ص ۲۷۰۔

ایجاب و قبول میں مطابقت

۱۴ ——— ایجاب و قبول کیلئے ایک کلام کا دوسرے کلام سے مطابق ہونا ضروری ہے۔

تشریح:- ایجاب و قبول کیلئے ضروری ہے کہ ایک کلام دوسرے سے مختلف نہ ہو، چنانچہ اگر ایک نے دوسرے سے کہا کہ میں نے اپنی بیٹی کا نکاح تجھ سے ایک ہزار درہم پر کیا اور مرد نے جواب دیا کہ میں نے قبول کیا لیکن مہر قبول نہیں کرتا تو نکاح بالکل باطل ہوگا، یعنی سرے سے منعقد ہی نہ ہوگا[1]۔

جواز نکاح

۱۳ ——— نکاح کا جواز دونوں نکاح کرنے والے یا ان کے اولیاء کے عاقل و بالغ ہونے اور دو عاقل و بالغ مردوں یا ایک مرد اور دو عورتوں کی سماعت میں برضامندی فریقین ایک مجلس میں ایجاب و قبول پر منحصر ہے بشرطیکہ دونوں نکاح کرنے والے یا ان میں سے کسی ایک کی ذات میں کوئی ایسا امر شرعی موجود نہ ہو جو مانع نکاح ہو۔

تشریح:- فقہاء نے نکاح کی شرائط کو تین انواع میں تقسیم کیا ہے۔

۱۔ شرائط انعقادِ نکاح

۲۔ شرائط جوازِ نکاح

۳۔ شرائط لزومِ نکاح

انعقاد نکاح کی شرائط کو دو انواع میں تقسیم کیا گیا ہے۔

(الف) وہ شرائط جن کا تعلق عاقدین نکاح سے ہے۔

(ب) وہ شرائط جن کا تعلق مجلس عقد سے ہے۔

---

[1] او قال رجل لرجل زوجتك ابنتي على كذا فقال الزوج قبلت النكاح ولا اقبل المهر قالوا لا يصح النكاح وهو باطل۔ فتاویٰ قاضی خاں۔

انعقاد نکاح کی پہلی شرط ـــ عقل

جن شرائط کا تعلق عاقدین نکاح سے ہے ان میں ایک عقل ہے، نکاح کے منعقد ہونے کے لئے عاقل ہونے کی شرط لازمی ہے کیونکہ پاگل یا بے عقل لڑکا نکاح کی اہلیت نہیں رکھتا لیکن صبی عاقل کا کیا ہوا نکاح اسکے ولی کی اجازت پر موقوف ہوگا۔

انعقاد نکاح کی دوسری شرط ـــ بلوغ

انعقاد نکاح کی دوسری شرط بلوغ ہے کیونکہ نکاح کی قابلیت بلوغ ہی سے پیدا ہوتی ہے اگر متناکحین یا ان میں سے کوئی ایک بالغ نہ ہو تو ان کا کیا ہوا نکاح منعقد نہ ہوگا البتہ نابالغ کی طرف سے اس کا ولی ایجاب یا قبول کر سکتا ہے[۱]

بلوغ اور حنفیہ و شافعیہ مکاتیب فکر:

شرعاً لڑکی اس وقت بالغ سمجھی جاتی ہے جب کہ اسے حیض شروع ہو جائے، حیض آنے کی کم از کم مدت ۹ سال ہے، حیض نہ آنے یا بلوغ کی کوئی دوسری شہادت نہ ہونے کی صورت میں امام ابو حنیفہ کے نزدیک لڑکی کی عمر بلوغ سترہ سال ہے۔

لڑکا اس وقت بالغ سمجھا جاتا ہے جبکہ اسے احتلام ہونے لگے اس کی کم از کم عمر ۱۲ سال ہے احتلام یا بلوغ کی کوئی دوسری شہادت نہ ہونے کی صورت میں امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک لڑکا اٹھارہ سال کی عمر میں بالغ سمجھا جائیگا، لیکن امام ابو یوسف اور امام محمد نے اس مسئلہ میں امام اعظم سے اختلاف کیا ہے ان کے نزدیک اگر لڑکا محتلم یا لڑکی حائض ہو جائے یا دونوں اپنی عمر کے پندرہ سال پورے کریں تو بالغ متصور ہوں گے، امام شافعیؒ نے بھی صاحبین کی رائے سے اتفاق کیا ہے۔ احناف اب اسی قول پر فتویٰ دیتے ہیں[۲]۔

---

[۱] واما شروطه فمنها العقل والبلوغ والحرية فى العاقد الا ان الاول شرط الانعقاد، فلا ينعقد نكاح المجنون والصبى الذى لا يعقل والاخيران شرطا النفاذ فان نكاح الصبى العاقل يتوقف نفاذه على اجازة وليه، هكذا فى البدائع ج۲ ص ۲۳۲ و ۲۳۳ فتاوى عالمگیری ج۱ ص ۲۶۷۔

شیعہ مکتب فکر:-

شیعہ مکتب فکر کے نزدیک بھی لڑکے اور لڑکی دونوں کا بلوغ شرعی پندرہواں سال قمری ختم ہونے پر قیاس کرلیا جائیگا، الآیہ کہ شہادت سے ثابت کر دیا جائے کہ بلوغ اس سے پہلے ہوچکا تھا۔

تیسری شرطِ انعقادِ نکاح — رضامندی

عاقدین نکاح سے متعلق نکاح کی تیسری شرط رضامندی ہے، طرفین کی رضامندی کے بغیر نکاح جائز نہوگا خواہ عورت باکرہ بالغہ ہو یا ثیبہ رضامندی لازمی ہے، احناف کے نزدیک اس کا ولی اس کو نکاح پر مجبور نہیں کرسکتا یہ ولی خواہ اس کا باپ ہی کیوں نہ ہو[1]

معنوی رضامندی:-

رضامندی صریح یا معنوی دونوں طرح ہوسکتی ہے، باکرہ لڑکی کا مسکرا دینا، ہنس دینا، یا خاموش رہنا یا بلا آواز رونا معنوی رضامندی سمجھی جائیگی، لیکن اگر ہنسی سے تضحیک یا تمسخر ظاہر ہوتا ہو یا خاموشی سے غم وغصہ کا اظہار ہوتا ہو تو وہ معنوی رضامندی نہیں کہلائے گی۔[2]

---

[1] ولا یجوز علی بالغۃ صحیحۃ العقل من اب وسلطان بغیر اذنہا بکرا کانت او ثیبا فان فعل ذلک فالنکاح موقوف علی اجازتہا فان اجازتہ جاز وان ردتہ بطل کذا فی السراج الوہاج، فتاوی عالمگیری ج۱ ص ۲۸۷، وفی الہدایہ ولا یجوز اجبار البکر البالغۃ علی النکاح ج۲ ص ۲۹۴ -

[2] ولو ضحکت البکر عند الاستئمار او بعدها بلغها الخبر فهو رضا ...... وقالوا ان ضحکت کالمستہزئۃ لما سمعت لا یکون رضا کذا فی المبسوط للامام السرخسی والکافی وعلیہ الفتوی کذا فی البحر الرائق، وان تبسمت ہو رضا ہو الصحیح من المذہب ذکرہ شمس الائمۃ الحلوانی کذا فی المحیط وان بکت اختلفوا فیہ والصحیح ان البکاء اذا کان بخروج الدمع من غیر صوت یکون رضا وان کان الصوت والصیاح لا یکون رضا کذا فی فتاوی قاضیخان وہو الاوجہ وعلیہ الفتوی کذا فی الذخیرۃ وان استاذن الولی البکر البالغۃ فسکتت فذلک اذن منہا فتاوی عالمگیری ج۱ ص ۲۸۷ -

معنوی رضامندی اسی وقت صریح اجازت یا رضامندی کی قائم مقام ہوگی جب نکاح کی اجازت کا طالب ولی اقرب ہو اگر ولی ابعد یا اجنبی باکرہ بالغہ سے اجازت حاصل کرے گا تو ثیبہ کی طرح اس کی صریح رضامندی لازمی ہوگی [1]

فقہاء نے معنوی رضامندی کا اصول صرف باکرہ کے نکاح کے سلسلے میں قبول کیا ہے لیکن ثیبہ (یعنی بسبب طلاق یا وفات شوہر سے جدا) عورتوں کی صریحی رضامندی ضروری ہے۔

اگر کسی عورت کا پردۂ بکارت اچھل کود، حیض، زخم یا عمر کی زیادتی کے سبب زائل ہو جائے تو حنفی ائمہ کے نزدیک وہ عورت باکرہ ہی متصور ہوگی اور نکاح کیلئے اس کی معنوی رضامندی کافی ہوگی، لیکن امام شافعیؒ کے نزدیک وہ عورت رضامندی کے معاملہ میں ثیبہ کے حکم میں داخل ہوگی [2]

اگر کسی عورت کی بکارت زنا کے سبب سے زائل ہو جائے تو امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک نکاح کیلئے باکرہ کی طرح معنوی رضامندی قابل اعتبار ہوگی، امام ابو یوسفؒ و امام محمدؒ کے نزدیک ثیبہ کی طرح صرف صریح رضامندی کا اعتبار کیا جائیگا، یہی مسلک امام شافعیؒ کا بھی ہے [3] عقلاً امام اعظم کا قول مستحسن ہے کیونکہ کوئی عورت اپنے زنا کا اعلان نہیں کیا کرتی،

---

[1] وان فعل هذا غير الولي يعني استامر غير الولي او ولي غيره اولى منه لم يكن رضا حتى تتكلم به - هدايه ج ۲ ص ۲۹۴ -

[2] واذا زالت بكارتها بوثبة او حيضة او جراحة او تعنيس فهي في حكم الابكار، وقال في الكفاية وفيه خلاف الشافعي وهو يقول ان البكر اسم لامرأة عذرتها قائمة والثيب من زالت عذرتها وهذه زالت عذرتها فتكون ثيبا الخ الكفاية شرح هدايه مع فتح القدير ج ۳ ص ۱۶۹ -

[3] واما اذا زالت عذرتها بالزنا فانها تزوج كما تزوج الابكار في قول ابي حنيفة وعند ابي يوسف ومحمد والشافعي تزوج كما تزوج الثيب، بدائع الصنائع ج ۲ ص ۲۴۴ -

رضا بالجبر:-

رضامندی اگر جبر یا فریب سے حاصل کی گئی ہو تو نکاح فاسد ہوگا، بجز اس کے کہ بعد میں توثیق ہو جائے۔

رضامندی بذریعہ غلط بیانی:-

اگر کسی مرد نے خود کو باعتبار نسب ایسا ورکرا کر، جو وہ حقیقتاً نہیں ہے، عورت سے نکاح کی مرضی حاصل کرلی ہو اور نسب کے معاملہ میں اس کو دھوکہ دیا ہو تو عورت کو فسخ نکاح کا حق حاصل ہوگا لیکن اگر مرد نسب کے اعتبار سے اس سے بہتر ہو جو اس نے ظاہر کیا ہے تو عورت کو حق فسخ حاصل نہ ہوگا[1]

اور اگر عورت خود کو مرد کا کفو ظاہر کرے جبکہ حقیقت میں وہ مرد کی کفو نہ ہو تو مرد پر نکاح لازم ہو جائیگا کیونکہ کفاءت کے معاملہ میں عورت کا اعتبار نہیں کیا جاتا ہے[2]

انعقادِ نکاح کی چوتھی شرط ـــــ اتحادِ مجلس:

وہ شرائط جن کا تعلق مجلس عقد سے ہے دو ہیں ایک مجلس نکاح یعنی مکان عقد اور دوسری شرط مجلس عقد میں گواہوں کی موجودگی ہے

مجلس سے مراد وہ نشست ہے جو انعقاد نکاح کیلئے منعقد کی جاتی ہے۔ ایجاب وقبول کیلئے یہ امر لازمی ہے کہ دونوں ایک ہی مجلس میں ہوں، چنانچہ اگر ایک مجلس میں ایجاب اور دوسری مجلس میں قبول ہو تو نکاح منعقد نہ ہوگا[3]

---

[1] ولو انتسب الزوج لها نسبا غیر نسبه فان ظهر دونه وهو لیس بکفوء فحق الفسخ ثابت للکل وان کان کفأ فحق الفسخ لها دون الاولیاء وان کان ما ظهر فوق ما اخبر فلا فسخ لاحد کذا فی الظهیریة . فتاویٰ عالمگیری ج ۱ ص ۲۹۳ -

[2] ولو کانت هی التی غرت الزوج وانتسبت الی غیر نسبها لاخیار للزوج وهی امرأة ان شاء امسکها وان شاء طلقها کذا فی شرح الجامع الصغیر لقاضی خان فتاویٰ عالمگیری ج ۱ ص ۲۹۳

[3] واما الذی یرجع الی مکان العقد فهو اتحاد المجلس اذا کان للعاقدان حاضرین وهو ان یکون الایجاب والقبول فی مجلس واحد حتی لو اختلف المجلس لا ینعقد النکاح الخ بدائع الصنائع ج ۲ ص ۲۳۲ -

گواہوں کی موجودگی وسماعت :

مجلس عقد کی دوسری شرط ایجاب وقبول کے وقت گواہوں کی موجودگی اور ایجاب وقبول کی سماعت ہے، اسکے تین جزء ہیں۔

(۱) موجودگی گواہان جواز نکاح کی شرط کے طور پر۔

(۲) تعداد گواہان۔

(۳) اہلیت گواہان۔

گواہوں کی موجودگی :

ایجاب وقبول کے وقت مجلس عقد میں گواہوں کی موجودگی جواز نکاح کی شرط کی حیثیت سے امام مالکؒ کے علاوہ عام علماء کے نزدیک مسلم ہے[۱]۔ جمہور علماء کی رائے میں نکاح میں گواہوں کی موجودگی اور سماعت عام معاہدات کے برعکس بصورت انکار تصدیق کیلئے نہیں بلکہ بجائے خود معاہدۂ نکاح کے جواز کے لئے ہے بالفاظ دیگر ان کے نزدیک ایجاب وقبول کے وقت گواہوں کی موجودگی اور سماعت معاہدۂ نکاح کا ایک جزء ہے نہ کہ محض شہادت کا کوئی قاعدہ۔

گواہوں کی تعداد :-

فقہاء نے آیت مداینت "یاایھا الذین آمنوا اذا تداینتم بدین الی اجل مسمیً فاکتبوہ...... واستشھدوا شھیدین من رجالکم فان لم یکونا رجلین فرجل وامرأتان ممن ترضون من الشھداء الخ" کی پیروی میں معاہدۂ

---

[۱] قال عامۃ العلماء ان الشھادۃ شرط جواز النکاح وقال مالکؒ لیست بشرط وانما الشرط ھو الاعلان حتی لو عقد النکاح وشرط الاعلان جاز وان لم یحضرہ شھود الخ
بدائع الصنائع ج ۲ ص ۲۵۲ -

نکاح کیلئے بھی دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتوں کی شہادت کو کافی قرار دیا ہے، البتہ امام شافعیؒ کے نزدیک دونوں گواہوں کا مرد ہونا ضروری ہے[1]۔

بہرکیف یہ لازم ہے کہ ایجاب وقبول کے وقت دو عاقل بالغ مسلمان مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں مجلس نکاح میں موجود ہوں اور طرفین کے ایجاب وقبول کو دونوں سنیں۔

گواہوں کی اہلیت:۔

گواہوں کے سلسلے کی تیسری کڑی بوقت نکاح ان کی اہلیت ہے، یہ مسئلہ متفقہ ہے کہ گواہوں کا آزاد، عاقل، بالغ اور مسلمان ہونا ضروری ہے[2]

البتہ اگر مرد مسلمان اور عورت غیر مسلمہ ہو تو شیخین (امام اعظمؒ وامام ابو یوسفؒ) کے نزدیک نکاح غیر مسلم گواہوں کے روبرو ہو سکتا ہے، اور امام محمد وامام زفر وامام شافعی وغیرہ کے نزدیک غیر مسلموں کی گواہی میں نکاح کسی بھی صورت میں جائز نہیں[3]

اگر گواہ فاسق یا اندھے ہوں تو احناف کے نزدیک ان کی گواہی درست ہوگی، امام شافعیؒ کے نزدیک ایسی گواہی درست نہیں ہے کیونکہ عدالت گواہی کی شرط ہے اسی طرح ان کے نزدیک گواہ کا بینا ہونا بھی ضروری ہے۔

---

[1] ولا ینعقد نکاح المسلمین الا بحضور شاهدین حرین عاقلین بالغین مسلمین، او رجل وامرأتین....... ولا یشترط وصف الذکورة حتی ینعقد بحضور رجل و امرأتین وفیه خلاف الشافعی - هدایه ج ۲ ص ۲۸۶ -

[2] اما صفات الشاهد الذی ینعقد به النکاح وهی شرائط تحمل الشهادة للنکاح فمنها العقل ومنها البلوغ ومنها الحریة......... ومنها الاسلام فی نکاح المسلم المسلمة - بدائع الصنائع ج ۲ ص ۲۵۳ -

[3] واما المسلم اذا تزوج ذمیة بشهادة ذمیین فانه یجوز فی قول ابی حنیفة وابی یوسف سواء کانا موافقین لها فی الملة او مخالفین وقال محمد وزفر وشافعی لایجوز نکاح المسلم الذمیة بشهادة الذمیین - بدائع الصنائع ج ۲ ص ۲۵۳ -

موانع شرعی:-

نکاح کے شرعی موانع چار قسم کے ہیں

(۱) نسبی (۲) رضاعی (۳) ازدواجی (۴) سببی

۱ — نسبی موانع وہ ہیں جو قرابت نسب یعنی خون کے رشتے سے پیدا ہوتے ہیں چنانچہ ماؤں، بیٹیوں، پھوپھیوں، خالاؤں، بھتیجیوں سے خواہ وہ کتنے ہی بالائی یا زیریں درجہ کی ہوں نکاح بوجہ قرابت نسب ممنوع ہے

۲ — رضاعی موانع وہ ہیں جو بچے کے کسی اجنبی عورت کا دودھ پی لینے کی بنا پر پیدا ہوتے ہیں چنانچہ رضاعی ماؤں، رضاعی بہنوں وغیرہ سے نکاح بوجہ رضاعت ممنوع ہے۔

۳ — ازدواجی موانع وہ ہیں جو ازدواج کی بنا پر پیدا ہوتے ہیں چنانچہ مدخولہ بیوی کی بیٹی، بیوی کی ماں، بیٹے، پوتے، نواسے کی بیوی سے نکاح کی ممانعت ہے۔

۴ — سببی موانع وہ ہیں جو مختلف اسباب کی بنا پر پیدا ہوتے ہیں مثلاً ایسی عورت سے نکاح جو کسی دوسرے کے نکاح میں ہو یا جس کی عدت نہ گذری ہو یا چار بیویوں کی موجودگی میں پانچواں نکاح یا ایسی حاملہ سے نکاح جس کا حمل ثابت النسب ہو اس وقت تک کیلئے نکاح ممنوع ہے جب تک سبب امتناع دور نہ ہوجائے۔

تعدد ازدواج

۱۴ — ایک مرد ایک زوجہ کو نکاح میں رکھتے ہوئے دوسرا نکاح کرنے کا بشرط ذیل شرعاً مجاز ہے۔

الف — وہ شخص حسب ضرورت مالی استطاعت رکھتا ہو۔

ب — بیویوں میں عدل و انصاف قائم رکھ سکتا ہو۔

ج — دوسرے نکاح سے کوئی اہم شرعی مصلحت فوت نہ ہو رہی ہو۔

تشریح:- اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے

" وان خفتم الا تقسطوا فی الیتمٰی فانکحوا ما طاب لکم من النساء مثنٰی وثلٰث ورٰبع فان خفتم الا تعدلوا فواحدۃ او ماملکت ایمانکم ذٰلک ادنٰی الا تعدلوا" (سورۃ النساء آیت ۳)

یعنی اگر تمھیں اس بات کا احتمال ہو کہ تم یتیم لڑکیوں کے معاملہ میں انصاف نہ کرسکو گے تو (انھیں اپنے نکاح میں نہ لاؤ) اور جو عورتیں تمھیں پسند آئیں ان سے نکاح کرلو، دو دو، تین تین، اور چار چار، لیکن اگر تمھیں اندیشہ ہو کہ عدل نہ کرسکو گے تو پھر ایک ہی زوجہ پر اکتفا کرو یا جو کنیز تمھاری ملکیت میں ہو (اسی پر اکتفا کرو) بے انصافی سے بچنے کے لئے ایسا کرنا زیادہ قرینِ صواب ہے۔

قرآنی حکم مشروط ہے:-

مذکورہ بالا آیت مسلمان مردوں کے بیک وقت چار عورتوں کو اپنے نکاح میں رکھنے کی اجازت پر دلالت کرتی ہے لیکن اس اجازت کے ساتھ ہی مرد کو اس کی اخلاقی ذمہ داری کا احساس دلا کر اس اجازت کو " اقامت عدل " پر مشروط کردیا گیا ہے چنانچہ "فان خفتم الا تعدلوا فواحدۃ " میں صاف الفاظ میں بیان کردیا گیا ہے کہ اگر تم متعدد بیویوں کے درمیان عدل ومساوات قائم نہ کرسکو تو پھر ایک ہی عورت پر اکتفا کرو۔

باقی آئندہ

اسلام کا نظامِ اخلاق

ایک اجمالی جائزہ

محمد سعید الرحمٰن شمس القاسمی ــــــــــــ مدیر نصرۃ الاسلام کشمیر

تمہید:- اللہ تعالیٰ نے حضرتِ انسان کو موالیدِ ثلاثہ میں نمایاں شرف و عظمت، امتیازی و اختصاصی مقام اور برتری و فضیلت عطا فرمائی ہے۔ اس کی وجہِ امتیاز اور سببِ اختصاص کیا ہے اور اسے عام حیوانات سے جدا کرنے والی اصل چیز کیا ہے اس کا جواب سوائے اخلاقِ عُلیا اور حُسنِ عمل کے کچھ اور ہو نہیں سکتا۔ ورنہ صرف ظاہری شکل و صورت، چال ڈھال، وضع قطع، رنگ و روپ، ٹیپ ٹاپ، خوبصورت، حسین، دلکش و دلفریب اور فیشن ایبل لباس، بہترین اور اعلیٰ حسب و نسب اور مال و دولت کے بل بوتے پر کوئی شخص انسان اور انسانیت کے اعلیٰ اوصاف و خصائص کا حامل نہیں ہو سکتا۔ درحقیقت انسانیت کا اصل جوہر اس کا اخلاق اور کردار ہی ہے۔ اور اگر یہ وصف اس کے اندر نہ ہو تو اس میں اور ایک جانور میں کوئی فرق باقی نہیں رہ جاتا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ روزِ اوّل سے جتنے مذاہب، ادیان، فلسفے، نظامِ زندگی

اور افکار و نظریات وجود میں آئے یا لائے گئے، تقریباً ان سب کی بنیاد اخلاق اور شرافت پر ہی رکھی گئی ہے اور بقول "مؤلف اخلاقِ رسولؐ" :

"دنیا میں جب سے انسان کا وجود ہے اُس وقت سے اخلاقی تعلیم کا وجود بھی ہے۔ اپنے جسم کی زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے انسان روٹی اور پانی کی ضرورت کو محسوس کرتا ہے اور پھر اس کے لیے محنت کرتا ہے۔ اسی طرح اپنی انسانیت کو زندہ رکھنے کے لئے اسے اخلاقی تعلیم اور اس پر عمل کرنے کی ضرورت پڑتی ہے اسلئے شروع زندگی سے لے کر آج تک سینکڑوں اخلاقی معلم اخلاقی ہدایات لے کر آتے رہے۔ اور انھوں نے آسمانی تعلیمات کے مطابق دنیا کو اچھے اخلاق کا راستہ بتایا اور اس پر چلایا۔ اسی طرح عقل و دانش کی روشنی میں اخلاقیات کا سبق دینے والے حکمائے اخلاق بھی ہر دور میں پیدا ہوتے رہے اور اپنے اخلاقی فلسفے سے دنیا کو اخلاقِ حسنہ کی روشنی پہنچاتے رہے۔"

(بحوالہ اخلاقِ رسولؐ ص۲)

دو قوتوں کا مجموعہ

مسندِ ہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اپنی معرکۃ الآرا اور شہرہ آفاق کتاب "حجۃ اللہ البالغہ" میں لکھا ہے کہ :-

"انسان میں دو قوتیں پائی جاتی ہیں ایک تو حیوانی قوت ہے جو کھانے پینے سونے اور شادی بیاہ کرنے وغیرہ پر مشتمل ہے۔ یہ قوت انسانی زندگی کے ظاہری مظاہر سے تعلق رکھتی ہے۔ اور دوسری ملکوتی قوت ہے جو انسان کے عمدہ اخلاق اور اُس کے حُسنِ عمل کا نام ہے جو اس کی قوتِ ارادی کے تحت سرزد ہوتے ہیں، جب کسی شخص میں یہ دونوں قوتیں اعتدال اور توازن کے ساتھ پائی جاتی ہیں تو وہ ایک مکمل اور بہترین انسان کہلاتا ہے مگر جب کسی شخص

میں اس کی حیوانی قوت اس کی ملکوتی قوت پر غالب آجاتی ہے یعنی اس کے اخلاق رخصت ہوجاتے ہیں تو وہ انسان سے حیوان بن جاتا ہے لہٰذا انسان کو انسان بننے کے لئے اپنی حیوانی قوت پر قابو اور کنٹرول رکھنا ضروری ہے"

اخلاق کیا ہے؟

انسانیت، حیوانیت کی ضد ہے، اخلاق نام ہے اچھی عادتوں اور نیک خصلتوں کا، جن کے اظہار کو شرافت کی نشانی قرار دیا جاتا ہے. محبت و مروّت، شفقت و رحمدلی، مخلوق پروری، صلح و آشتی، باہمی روا داری اور عدل و انصاف وغیرہ اعلیٰ اخلاقی صفات ہیں جن سے انسانیت کی تکمیل ہوتی ہے. اس کے برعکس باہمی نفرت و عداوت، بات بات میں جھگڑنے کی عادت، ایک دوسرے کی حق تلفی، جبر و استبداد، تعصب و ناحق کوشی اور ظلم و ستم وغیرہ انتہائی بداخلاقی اور بُری عادتیں ہیں جو انسانیت کو حیوانیت کی سطح پر لے آتی ہیں۔ (بحوالہ اسلام اور عصر جدید ۸۵ تا ۱۰۴)

بہترین مذہب

اہلِ فکر و دانش اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ "بہترین مذہب" وہی ہے جس کا اخلاقی دباؤ اپنے ماننے والوں اور پیروکاروں پر اتنا ہو کہ وہ اس کے قدم کو سیدھے راستے سے بہکنے اور بھٹکنے نہ دے. اور ظاہری قانون اور ضوابط کی پابندی کی نوبت ہی نہ آئے۔

اسلام کی تکمیلی حیثیت

دینِ اسلام جو انسانی زندگی کے ہر گوشہ کے لئے اپنے اندر مکمل اور تکمیلی حیثیت رکھتا ہے. عام مذاہب اور افکار سے بلند تر اس کا نظامِ اخلاق اور فلسفہ اخلاق بھی ہے. اخلاق کیا ہے؟ اخلاق سے مقصود دراصل باہم بندوں کے حقوق و فرائض کے وہ تعلقات ہیں جن کو ادا کرنا ہر انسان کے لئے مناسب بلکہ ضروری ہے.

انسان جب اس دنیا میں آتا ہے تو اس کا ہر شے سے تھوڑا بہت تعلق پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی تعلق کے فرض کو بحسن و خوبی انجام دینا اخلاق ہے۔ (بحوالہ سیرۃ النبی جلد ۶)

اسلام اور اخلاق حسنہ

تمام مذاہب کی بنیاد اور اساس میں اخلاق کا عنصر شامل ہے۔ چنانچہ اس عرصۂ ہستی میں جس قدر پیغمبر مصلح اور ریفارمر آئے سب کی یہی تعلیم رہی کہ سچ بولنا اچھا اور جھوٹ بولنا بُرا ہے، انصاف بھلائی اور ظلم بُرائی ہے، خیرات نیکی اور چوری گناہ ہے۔ لیکن مذہب کے دوسرے ابواب کی طرح اس باب میں بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تکمیلی حیثیت رکھتی ہے۔ (بحوالہ سیرۃ النبی جلد ۶)

علم اخلاق کے رہنما

علم اخلاق کے آسمانی رہنماؤں اور معلموں میں حضرت آدم ؑ سے لے کر حضرت عیسیٰ ؑ تک بڑے بڑے اخلاقی معلم نظر آتے ہیں جن کی اخلاقی عظمت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اور سقراط، افلاطون اور ارسطو جیسے حکمائے اخلاق کی فلسفیانہ کاوشوں کو بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ آج کی دنیا کے سامنے ایسا اخلاقی معلم کون ہے، جس کے پاس اخلاقِ حسنہ کی تعلیم اور اعلیٰ اخلاقیات کا نظام بھی مکمل طور پر موجود ہو۔ اور اس تعلیم و فلسفہ کے مطابق عملی زندگی کے ہر شعبے کے لئے اسکے اعلیٰ اخلاق کا نمونہ بھی دنیا کے سامنے بے نقاب ہو۔ اس سے انکار کون کرسکتا ہے کہ ہندوستان، ایران اور چین میں بڑے بڑے اخلاقی معلم آئے۔ اور توراۃ و انجیل کے ادیانِ مقدسہ نے بھی جو اخلاقی روشنی پھیلائی اس کے اثرات آجتک زندہ ہیں۔ لیکن بحث تو ایک اعلیٰ اور افضل نمونہ کی ہے۔ اور سوال تو یہ ہے کہ وہ اخلاقی معلم کون ہے جس نے زندگی کے ہر شعبہ اور حیاتِ انسانی کے ہر گوشہ کے لئے اعلیٰ اخلاق کا نمونہ چھوڑا ہو اور تاریخ نے اس کے ایک ایک اخلاقی کردار کو پوری احتیاط سے

محفوظ رکھا ہو۔ تاریخ نے ایسے کامل اخلاقی معلّم کے طور پر اگر کسی کو پیش کیا ہے تو وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اس سے کسی اخلاقی معلّم کے مرتبہ میں کمی کا خیال نہ کیا جائے۔ حضرت موسیٰ ہوں یا حضرت عیسیٰ، ہندوستان کے کرشن جی ہوں یا مہاتما بدھ، یا ایران کے زرتشت، یہ سب اخلاقی پیشوا اپنے اپنے دور میں اپنے اپنے حالات کے مطابق اپنی اپنی قوموں اور بستیوں کو اخلاقی روشنی پہنچانے کا کام پورا کرکے اس دنیا سے چلے گئے، لیکن اخلاق کی تکمیل کے لئے آخر میں آنے والے اخلاقی مُعلّم (رسول عربیؐ) کے ذمہ یہ کام چھوڑ گئے کہ جب انسانی زندگی اپنے پورے پھیلاؤ کے ساتھ درجۂ کمال کو پہنچنے لگے تو اس وقت وہ آخری رسول اپنی مکمل تعلیم اور اپنی مکمل سیرت کے ساتھ دنیا پر ظاہر ہو جائے اور انفرادی زندگی سے لیکر سماجی، اجتماعی اور سیاسی زندگی کے ہر گوشہ میں اعلیٰ اخلاق کا عملی نمونہ دنیا کے سامنے پیش کردے۔ (بحوالہ اخلاقِ رسولؐ ص۲)

اخلاق کی قوت

قوموں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اخلاق کے ذریعہ بڑے بڑے کام لئے جا سکتے ہیں جو قوت اور طاقت کے ذریعہ نہیں لئے جا سکتے۔ نرمی و ملائمت اور محبت و مروّت بعض اوقات تلوار کی دھار سے بھی زیادہ مؤثر ہوتے ہیں۔ ایک شریف اور اچھے کردار والے شخص کی ہر جگہ قدر کی جاتی ہے اور وہ ہر ایک کی آنکھوں کا تارا بنا رہتا ہے حُسنِ اخلاق ہی کی بدولت تہذیب و تمدن کی کلیاں چٹکتی ہیں۔ جس معاشرہ میں لڑائی جھگڑے اور فتنے فسادات ہوتے ہوں وہ مثالی معاشرہ نہیں بن سکتا اور ترقی کے منازل طے نہیں کرسکتا اسی طرح مکارمِ اخلاق کی تباہی کسی قوم کو گھُن کی طرح کھا لیتی ہے، جو آخر تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔ (بحوالہ اسلام اور عصر حاضر ص۱۰۸)

اخلاق کی عام اہمیت اور اس کی قوت کارکردگی کے بعد غور کیا جائے اسلام کے اخلاقی

نظام پر دین اسلام کے نزدیک اخلاق کی اہمیت اور قدر و منزلت کیا ہے؟ اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت و بعثت کا سب سے بڑا مقصد اخلاقِ حسنہ کی تکمیل قرار دیا گیا ہے۔ اسلئے کہ اسلام دینِ فطرت ہے، جسکی تکمیل رب العالمین نے محسنِ انسانیت، نبیٔ رحمت، ہادیٔ عالم، معلمِ اخلاق جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور بعثت سے فرما دی ہے۔ آپؐ بذاتِ خود اخلاقِ علیا کے بلند ترین مقام پر فائز تھے۔

معلمِ اخلاق

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ رحمۃ للعالمین اور ساری دنیا کیلئے معلمِ اخلاق بنا کر بھیجے گئے تھے اسلئے خود آپ کی سیرتِ مبارکہ اخلاقِ کریمانہ کا بہترین نمونہ تھی۔ چنانچہ آپؐ نہ صرف ایک کامیاب ہادی اور رہبر تھے، بلکہ ایک کامیاب استاد، ایک کامیاب قاضی، ایک عظیم مقنن، ایک عظیم سیاستدان، ایک بے مثال حاکم، ایک بے نظیر جرنیل، سب سے بڑے حق گو، بڑے ہی عابد و زاہد، سب سے زیادہ خدا ترس اور رحمدل، سب سے زیادہ بندہ پرور اور امین در است باز اور فقید المثال انسان تھے۔ یہ عظیم الشان نیرنگی صفات پوری انسانی تاریخ میں کسی بھی انسان کے اندر نہیں پائی گئیں۔ اگر بالفرض پائی بھی گئیں تو ان کا ریکارڈ تاریخ کے اوراق میں محفوظ نہیں رہا۔ اس لئے آپ کی سیرتِ طیبہ کو قیامت تک ہر قسم کے انسانوں کے لئے نمونۂ عمل قرار دیا گیا ہے۔ "لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ"۔ (الاحزاب) بلاشبہ رسول اللہ (کی ذاتِ مبارکہ) میں تمہارے لئے ایک بہترین نمونۂ عمل موجود ہے۔ (بحوالہ اسلام اور عصرِ حاضر ص۱۸۹)

بے شک رسولِ رحمتؐ کی پوری زندگی اخلاقِ حسنہ کا خوبصورت گلدستہ اور گلِ سرسبز ہے۔ ایک جامع اور مکمل تصویر ہے۔ آپؐ کا ہر قول، ہر عمل، ہر فعل اور آپ کی تعلیمات و ارشادات کا ایک ایک جزء دراصل اخلاقِ علیا کے گل دبوٹے ہیں جس نے تاریخ انسانی کے دھارے کو موڑ کر عام لوگوں کی زندگیوں اور اندازِ فکر میں ایک صالح انقلاب پیدا کر دیا ہے

ذرہ نشانی نے تیری قطروں کو دریا کر دیا ۔ دل کو روشن کر دیا آنکھوں کو بینا کر دیا
خود نہ تھے جو راہ پر اوروں کے ہادی بن گئے ۔ کیا نظر تھی جس نے مردوں کو مسیحا کر دیا

اسلام کا اخلاقی نظام

یہ صرف زبانی دعویٰ نہیں بلکہ اُس کی پُشت پر تاریخی دلائل اور شواہد موجود ہیں اور دنیا نے حقیقت کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھ لیا ہے کہ اسلام کا جو اخلاقی نظام ہے وہ ہر لحاظ سے مکمل، جامع، ہمہ گیر، مفید، فطرتِ انسانی سے ہم آہنگ، زمان و مکان کے تقاضوں اور ضرورتوں کی تکمیل کے ساتھ ساتھ ہر قسم کے نقائص، عیوب اور خامیوں سے پاک ہے۔

دینِ اسلام اور پیغمبرِ اسلام صلے اللہ علیہ وسلم کی تمام تعلیمات اور ہدایات کا خلاصہ صرف دو لفظوں میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ ایک "ایمان" اور دوسرے "اخلاق"۔ ایمان جس کا تعلق براہِ راست اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس کے حقوق کی ادائیگی کے ساتھ ہے، اخلاق جس کا ربط سماجی اور معاشرتی زندگی کے ساتھ ساتھ اجتماعی، ملی اور قومی معاملات سے ہے۔

رُوحِ اسلام

اسلام لوگوں کو عمدہ اور بہترین اخلاق کی تعلیم دیتا ہے اور انھیں رحمدلی، مروّت، ایثار، خلوص، غریب پروری، سخاوت، سچائی، امانت داری، احسان شناسی، وعدہ وفائی، صلح جوئی، تحمل و بردباری، اخوت و بھائی چارگی، ہر قوم سے رواداری، مساوات، عدل وانصاف اور تمام اخلاقی فضائل سے متصف ہونے پر اُبھارتا ہے۔ اس کے برعکس وہ بے رحمی، تنگ نظری، بدعہدی، خیانت، غدّاری، ریاکاری، مکروفریب، اسراف، ناپ تول میں کمی بیشی، چوری ڈاکہ زنی، زناکاری، شراب نوشی، نمائشی پارسائی، دوسروں کی حق تلفی، نسلی و قومی تفاخر، غیروں کی تحقیر، ناحق کونشی، غیر قوموں سے بے انصافی، ظلم وستم اور جبرواستبداد وغیرہ ہر قسم کی برائیوں اور بداخلاقیوں سے روکتا اور اسکی مذمت کرتا ہے۔ (بحوالہ اسلام اور عصر حاضر ملت ۱۹۶۹ء)

جمہوری اسلامی ایران کے کارنامے

ایک ایرانی عالم کی تازہ ترین رپورٹ

ع۔ق۔ ایرانی

ایرانی انقلاب سے پہلے جبکہ تہذیبِ جدید کا درندہ پوری انسانیت کو ہڑپ کرنا چاہتا تھا اور دنیا تباہی و بربادی کے دہانہ پر کھڑی تھی اور شہنشاہیت کی خدا فراموشی، وحشت، استبداد اور طوقِ لعنت نے لوگوں کے رونگٹے کھڑے کئے ہوئے تھے۔ ایسے قائد و رہبر اور مخلص کی ضرورت تھی جو دنیا کو گھٹا ٹوپ اندھیروں سے دور، فطرتِ انسانی کو نورِ حق کی روشنائیوں سے ہمکنار اور عالمِ انسانیت کو حیوانیت کی رسم و رواج کی غلامی سے آزاد کر کے لوگوں کی خداداد صلاحیتوں کو صحیح جگہ پر استعمال کرے۔

ایران کے عوام کی دلی آرزو تھی کہ ایران کی سرسبز زمین اور زرخیز مٹی، اغیار کی دست نگر نہ ہو۔ بہت قربانیوں کے بعد ایران کی کایا پلٹی اور خدا تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کا ظہور اس طور پر ہوا کہ عوام نے خالی ہاتھ کے باوجود بڑے طاقتور اور سیاستدان بادشاہ کا تختہ اُلٹ دیا۔ اور شہنشاہیت کا ہزار سالہ عزت بالکل ختم ہوگیا۔ اور اس کی جگہ جمہوری اسلامی ایران نے لے لی۔

چنانچہ ایران میں اسلامی انقلاب کے اقتدار میں آنے کے بعد ظلمتوں میں نور کی کرنیں جگمگانے لگیں اور ایرانی لوگ خوشی کے گیت گانے لگے کہ اب اہلِ فرنگ کے قیدِ سلاسل سے آزاد ہو کر اسلامی امن دامان کی خوشگوار اور بادقار فضا میں سانس لے رہے ہیں۔

لیکن کچھ مدت گزرنے کے بعد جمہوری اسلامی ایران کے فریفتہ اور شیدائیوں کی تمام خوشیاں اور نعرے ملیا میٹ ہوگئے۔ پھر سے ایران کی سرزمین کو خوف و دہشت نے اپنی لپیٹ میں لے لیا، نئے بھیس میں لوگ ظلم، تشدد اور بربریت کے شکار ہوگئے۔ حتیٰ کہ بندوق کی طاقت لوگوں کی گردنوں پر سوار ہوگئی اور ایک دم فضا تبدیل ہوگئی اور اب اسلامی جمہوری کی بدولت لوگ اسلام کا نام سننے کے لئے تیار نہیں۔ امیر، غریب، عالم، جاہل سب اس خانماں سوز آگ کی لپیٹ میں آگئے ہیں۔ انسانیت کا ضمیر مرچکا ہے۔ خوف و ہراس اتنا عام ہوگیا ہے کہ لوگوں کے لئے گھروں میں راحت و آرام کی نیند تو دور کی بات ہے، بات کرنی دشوار ہے۔ ایران کے بارے میں جو کہا جائے حقیقت سے خالی نہیں اگرچہ الحکی بات کیوں نہ معلوم ہو۔ اور ایران کے یہ حالات دیدنی ہیں شنیدنی نہیں۔ اب یہاں کی پالیسی اور طرزِ عمل عجیب ہے، جو دوسرے ملک میں نہیں پائی جاتی۔ عام طور پر ایران میں دو گروہ اور دو مذہب نمایاں ہیں اور حکومتِ ایران انہی دو مذہبوں سے متشکل ہے (۱) سُنّی (۲) شیعہ۔ دوسرے مذہب بھی ہیں لیکن ان دو مذہبوں کے مقابل میں ان کی حیثیت نہیں۔ انقلاب کے پہلے دور میں حکمران محترم نے زہریلے سانپ کی طرح نقش و نگار، ظاہری نعرہ بازی، وحدت کلمہ کے فریبکارانہ طرزِ عمل، امریکہ اور روس پر موت کی صدائیں ہر جگہ عام کردیں اور مذہب کے نام پر اور سنی و شیعہ اتحاد کے نعرہ سے مسلمانوں کے جذبات، حمیتِ دینی، غیرتِ اسلامی کو جوش میں لاکر اپنی حکومت کا سکہ دلوں پر بٹھا دیا اور جب ان کے دانت حکومت کی

رسیوں پر اچھی طرح جم گئے تو اپنی دیرینہ آرزو اور ہدفِ اصلی کو برملا ظاہر کرنے لگے۔
اور اس کے لئے ایران کی سرزمین کو جعفری، امامی اور اثنا عشری لباس پہنانے کی اسکیم
بنائی اور باقی مذہبوں کو اقلیت میں قرار دے کر ان کے حقوق پامال کرنے کی پہلی
اینٹ رکھدی۔ اب اگر کوئی اس کے خلاف سر اٹھاتا ہے تو فوراً مفسد فی الارض یا امریکہ
کا ایجنٹ، روس کا کٹھ پتلی وغیرہ القاب سے فتویٰ صادر کرکے، اس کا خون مباح قرار
دیتے ہیں۔ اب پوری ملتِ ایران شیعیت کی زد میں ہے اور شیعیت کے اثرات تعلیم یافتہ
طبقوں میں عام ہورہے ہیں۔ حکومت کی چال اور طریقہ، کار، پروپیگنڈے کے اسباب،
مبلغین کی تعداد اور فوجیوں کے مختلف گروپ نے انسانی رحمدلی اور شفقت کا پورا ختم
کردیا ہے اور انکی کثرت اور بڑھ رہی ہے اور جو اسکے خلاف منہ پھیرتا ہے یا ان کے
انجمن یا جلسوں میں شرکت کرنے سے روگردانی کرتا ہے بغیر مہلت اس کا جسد گولیوں سے
چھلنی ہوجاتا اور اس کا پورا خاندان اور احباب و متعلقین تکالیف کا شکار ہوجاتے ہیں۔
ایسے ناگفتہ بہ حالات میں بھی علمائے حق اسلام کے شیدائی اور جانباز سپاہی اور
شہادت کے بھوکوں نے سر پر کفن باندھ کر بڑی جرأت اور شجاعت کے ساتھ ایسے
حالات کا مقابلہ کیا۔ اور کفر و اسلام، حق و باطل کے درمیان خلیج قائم کرنے کے لیے اپنی
اپنی جدو جہد اور انتھک کوشش جاری رکھی اور قید و سلاسل اور جانی و جسمانی
تکالیف جھیلنے میں فراخدلی سے کام لیا اور خود اپنا تعارف اور علمائے اسلام کے
جانباز سپاہیوں کا شیوہ اور مدارِ معرفتِ اسلامی اس کو قرار دیا کہ دین کے حامی اور
محافظ وہی ہیں جو فلک بوس کفری عمارت کو زمین بوس کردیں۔ جب حکومت کے بھوکوں
نے اپنے مفاد کو بادِ خزاں کے دھارے پر دیکھا تو ان سے برداشت نہ ہوا اور اس
مبارک جماعت اور انسانیت کے قائدین سے خوف کھاکر اپنی ناپاک اسکیم بنائی اور
مسلمانوں اور علماء کے درمیان پھوٹ ڈالنے کا آخری حربہ استعمال کیا اور اختلاف

باندازہ حکومت کن کو اپنا نصب العین بنا کر اس نام نہاد حکومت اسلامی نے کام شروع کردیا اور عام طور پر مسلمانان ایران کو ۳ ٹولیوں میں بانٹ دیا (۱) علماء کے گروہ (۲) عوام الناس کی جماعت (۳) جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کا طبقہ۔ سب سے پہلے حکومت والوں نے علماء کے کردار اور رویہ اور ان کی خداداد صلاحیتوں کو داغدار اور بدنما دکھانے کی مذموم کوشش کی۔ بعض جاہل محض اور ضمیر فروش عوام کو علماء کے لبادے پہنا کر اپنا دست نگر، آلۂ کار اور پٹھو بنایا اور انہی لوگوں نے ارمار آستین، بنکر علماء کرام کے خلاف زہر اگلنے کی ذمہ داری سنبھال لی۔ سب سے پہلے ان علماء کے کارناموں کو تنقیدی نظر سے دیکھنے اور عوام الناس کی نظروں کو ہٹانے اور نوجوانوں کو ان سے بدظن کرنے اور انکی صلاحیتوں کو زک پہنچانے کا چکر چلایا جبکہ لوگ ان کی خاطر کٹ مرنے پر تیار تھے۔

بالآخر وہ علماء جو عالم انسانیت کے قلب کی حیثیت رکھتے تھے اور انکی بات تلوار کی دھار سے زیادہ کارگر تھی اور ان کا حکم حکومتی قانون سے کم نہیں تھا۔ اب پر کاہ کی قیمت نہیں رکھتے، وہ اتحاد و اتفاق اور شوق دینی اور حمایت علماء جو جوانوں میں تھا، ختم ہوگیا۔ شروع میں نوجوان طبقے کی یہ حالت تھی کہ جو کوئی مسئلہ یا دشواری ان کو پیش آتی تو وہ فوراً علماء کی آغوش رحمت میں پناہ لیتے تھے اور دل کی تڑپ اور بھڑاس نکال کر اپنا ایمان غیروں کی دست برد سے بچاتے۔ علماء کے حکم وایماء کے بغیر قدم اٹھانے کی جرأت نہیں رکھتے تھے۔ اب نام نہاد اسلامی حکومت نے علماء کو جوانوں سے اور عوام کو دونوں سے جدا کردیا۔ جوان طبقے جو جسمانی قوت کے حامل اور ایمانی جذبے اور بھرپور صلاحیتوں کے مالک تھے، صحیح راہنما اور قائد سے محروم ہوگئے جو ان کو منزل مقصود تک پہنچادے اور ان کے جذبات کو صحیح راستہ میں صرف کرے۔ جوان طبقہ وادیٔ گمراہی کے کنارے پر چیختا چلاتا رہا۔ لیکن علماء کی حمایت اور عوام

کی پشت پناہی ان کو نصیب نہ ہوئی بلکہ غنڈے، بدمعاش، بدچلن اور اخیر میں کمیونسٹ سوشلسٹ وغیرہ کے القاب کی داد ملی۔ اور اب جوان طبقے ردّ عمل کے طور پر علماء حق کے خلاف دریدہ دہنی کرنے لگے ہیں۔

اس چپقلش سے حکومت والوں کو اپنے کرتب دکھانے کا موقع مل گیا۔ لہٰذا جوان طبقے آئندہ کی امید جن سے وابستہ تھی پکڑ دھکڑ کی زد میں آگئے۔ آخر کار بعض جوان مجبور بہ فرار ہو کر ملک بدر ہوئے اور بعض اپنی صلاحیتوں سمیت تختہ دار چومنے پر مجبور ہو گئے۔ اور عوام نے بھی جو کہ علمی کمالات اور عاقبت اندیشی کے انداز کار سے سراسر جاہل تھے۔ حکمرانوں کے دام تزویر میں آکر اپنے ہونہار اور نوجوان اولاد کو بے سہارا چھوڑ دیا۔ اور علماء کرام کی سرپرستی سے تہی دست کر دیا اور بالآخر سب بے عنان ہو گئے اور اب حکومت والے جس کو چاہتے ہیں بہانہ بنا کر جیل و قید میں ڈالتے ہیں یا گولیوں کی بوچھاڑ کرتے ہیں اور ان کے اموال و ناموس پر ڈاکہ ڈالتے ہیں۔ لوگوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جاتی ہیں، نہ رونے کی قدرت نہ مقابلہ کی جرأت رکھتے ہیں۔ اور ناتجربہ کار بچوں کو اسکاؤٹ کہہ کر کے "تسبیح عمومی، کمیتہ انقلاب اسلامی، حزب اللہ، پاسدار اسلام،" اور ہزاروں اور نام دے کر بہترین اسلحے اور رائفلیں ان کے سپرد کر دی گئی ہیں۔ اور وہ بھی دہی کرتے ہیں جو جی چاہے۔ حتیٰ کہ نوبت بہ اینجا رسید کہ علماء کی قدر و قیمت اور وقار جاتا رہا۔ جوانوں کی اکثریت نے اسلام کے حلقہ بگوش ہونے سے ناک چڑھانا شروع کر دیا۔

جب جوان اور عوام کی حمایت اور پشت پناہی علماء سے ہٹ گئی تو بڑی بے رحمی اور سفاکانہ انداز میں علمائے حق کو گردن جھکانے پر مجبور کیا۔ ظلم و وحشی گری اور گرگ صفتی کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ اور دوسرے ملکوں پر دھاوا بولنے کی غرض سے اور اپنی انسان سوز حرکات پر پردہ ڈالنے کی نیت سے "ہفتہ وحدت"

کا شرمناک ترین رویہ اختیار کیا۔ جس کو " ہفتہ نفرت ،، سے تعبیر کرنا ہزار درجہ اچھا معلوم ہوتا ہے۔ اور اسی ہفتہ نفرت میں جو ہر سال کی آبان (ماہ نومبر) میں منعقد ہوتا ہے۔ اہلِ سنّت کی شخصیات اور اکابرین کی بے آبروئی، امہات المومنین رض، حضرات شیخین رض اور بقیہ اجلہ صحابہ کرام پر دریدہ دہنی سے کام لیتے ہیں۔ اور کسی کی مجال نہیں کہ شکوہ کرے۔ ورنہ مصائب کا طوفان اس پر اور اس کے کنبے اور متعلقین و احباب پر کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ کہ ان کے سننے سے انسانیت پر کپکپی طاری ہوتی ہے۔

اب " واقعہ مکہ ،، بقول ان کے " فاجعہ خونیں مکہ ،، کے بعد ان کی دریدہ دہنی عام ہو گئی ہے اور بغیر کسی تقیہ اور پردہ کے کھُلم کھُلا گالیوں کا تانتا بندھا ہوا ہے اور اہلِ سنت پر حملہ جاری ہے اور طریق القدس یمر من بغداد، سنحرر القبلتین عن سیطرۃ الکفر، جنگ جنگ تا پیروزی، جنگ جنگ تا دفع فتنہ، امن از عالم، وغیرہ آوازیں رات دن گلی کوچوں اور ریڈیو میں گونج رہی ہیں۔

عوام بلکہ پوری ملتِ ایران، اسلامی حکومت سے متنفر ہے۔ ایران کی حالت مذہبی لحاظ سے بالکل ضلالت و گمراہی کی راہ پر گامزن ہے اور " ولایتِ فقیہ ،، کی بحث خود خمینی اور خامنہ ای کے درمیان زیرِ غور ہے اور یہ مسئلہ بہت خطرناک اسنہ اختیار کر گیا ہے۔ بلکہ اکبری الحاد کا دور شروع ہو گیا ہے جس کا مجدد الفِ ثانی رح نے مقابلہ کیا تھا۔ ان کا خیال ہے کہ امام عادل اور مجتہد اور ولایتِ فقیہ (خمینی) کے اختیارات اسلامی قانون سے بالاتر ہیں۔ اور اس کا حکم سب پر فائق ہے اور ولایتِ فقیہ (خمینی) کسی چیز کا پابند نہیں۔ یہ بحث خامنہ ای اور خمینی کے درمیان چھڑ گئی ہے اور اس کے آئندہ خطرات سب پر روشن ہیں۔ کیونکہ جو چاہیں اپنے مذہب کی بنیاد پر کرتے رہیں گے اور لوگوں کو ان پر عمل درآمد کرنے پر

مجبور کریں گے۔ دوسری طرف انکی تبلیغات اور پروپیگنڈے اتنے عام ہو گئے ہیں
کہ ملک ایران سے باہر لوگوں کی زندگی تلخ ہو رہی ہے۔ ایران کی اکثر آمدنی انہی
انقلاب کی تعریف اور پروپیگنڈے میں خرچ ہوتی ہے۔ لیکن یہ کوئی تعجب کی
بات نہیں۔ کیونکہ جو شیعیت اور سبائیت کی تاریخ سے واقف ہے وہ خوب جانتا
ہے کہ یہ ایسی بدبخت قوم اور بے پرواہ جماعت ہے جو کہ آرام وراحت سے بیٹھنے کی
عادت ماں کے گود میں بھول گئی ہے اور اس کی خواہش ہے کہ دوسرے اقوام اور
ممالک بھی چین وسکون کے سانس نہ لیں بلکہ ہمیشہ بدامنی کے عالم میں زندگی گزاریں۔
اگر ایران سے باہر ان کی تبلیغات پر توجہ نہ کی جائے اور ایران کے اندر رائفلوں کی
طاقت لوگوں کی گردنوں سے ایک منٹ کے لئے ہٹ جائے تو ان کا وجود عنقا
ہو جائے گا۔

بہرحال اس مذہب و تحریک کا خطرہ جس نے پورے عالم اسلام میں ہلچل مچا دی ہے
روس اور امریکہ (جن کی اسلام دشمنی اظہر من الشمس) سے زیادہ ہے، اس لئے کہ
روس اور امریکہ شناخت شدہ ہیں اور اسلام کے نام لیوا نہیں اور سبائیت کے
تخم بد، اسلام کے شیدائی بلکہ خداوند کے سچے خلیفہ اور رسول اللہ کے برحق نائب اور
فقیروں غریبوں کے حامی و مددگار اور مستضعفین جہاں کے خیر خواہ کے لبادہ میں نظر
آتے ہیں۔ وہ لوگ جو اُن کے خبث باطن سے بے خبر ہیں اور ان کے شعار واہداف
ومقاصد سے واقف نہیں۔ ظاہری ٹیپ ٹاپ اور اسلام اسلام کے نعرے اور
ان کی خوش روئی اور منافقانہ دورُخی سے دھوکا کھا کر ان کے عنکبوتی جال میں
پھنس کر اپنا دین و دنیا لٹانے حاضر ہوتے ہیں۔

جنگ کی بدولت وہ سرسبز اور شاداب، خوش وخرم ایران جو چند سال
پہلے گلشن تھا اب روٹی پانی کا محتاج ہے۔ اور اشیاء کی قلت اور مہنگائی

نے ملتِ ایران کی کمر توڑ دی ہے۔ آپ خود اللہ تعالیٰ کو گواہ بنا کر انصاف کر کے دل
ا کھڑکیوں سے ایران کی حالتِ زار کی طرف جھانکتے ہوئے دیکھئے کہ ملتِ ایران پر
یا بیت رہی ہے۔ طاغوت (شاہ) کے زمانے میں اشیاء کی فراوانی اور بہترین
یز سستے داموں میں موجود تھیں اب خدا کا عذاب نام نہاد حکومتِ اسلامی کی
کل میں نازل ہو رہا ہے کہ کھانے پینے کی چیزیں نہیں ملتیں۔ طاغوت کے دورِ حکومت
ن ۵ کلو بناسپتی گھی کا ایک ڈبہ، ۵۰/۱۹ تومان میں عام تھا۔ اب خدا کی قسم ۶۵ تومان
لوگ خریدنے کے لئے ترس رہے ہیں اور گھی نہیں ملتا۔ ایک کلو قند (شکر) طاغوت
زمانے میں ۳/۲ تومان کا تھا، اب لوگ بازار میں ۸۰ تومان لئے گھومتے ہیں اور
ہیں ملتی۔ کپڑا دھونے کا بڑا اسرف کا پیکیٹ ۱۸ تومان میں عام تھا اب ملتِ اسلامی
ران ۲۳۰ تومان میں خریدنے کے لئے تیار ہیں۔ یہ تو صرف بے قیمت چیزوں کی مثال
نکہ ایران میں ان کی کچھ وقعت نہیں تھی، باقی اس گلستان سے آپ خود بہاروں کا
باس فرمائیں۔

سب سے بڑی اور اصل وجہ مہنگائی کی یہ ہے کہ حکومت نے پوری تجارت پر کنٹرول
رکھا ہے اور خارج سے مالِ تجارت پر پابندی ہے۔ کبھی بڑی بڑی رقوم تجار،
رائیوروں، زمین کے مالکان سے مختلف بہانے سے زبردستی سے وصول کرتے ہیں۔
رکبھی مالیات عوارض شہرداری، حق مالکانہ، حق سکنہ، کمک بہ جبہۂ جنگ، خمس،
زۃ وغیرہ عنوانات سے وصول کرتے ہیں، پٹرول، ڈیزل، مٹی کا تیل نرینہ اولاد
طرح محترم ہے۔ اور "کوپن" پر لوگوں کو راشن ملتا ہے۔ ایران کے ہر کونے میں رہگذر
رمسافر لوگوں کا ہجوم اور صفوں کی قطار نظر آتی ہے کہ سب کھانے پینے کی چیزیں حاصل
نے کے لئے صف باندھ کر کھڑے ہیں۔ لوگوں کا مشغلہ روزانہ صف باندھنا ہے شوہر
ٹی کی صف میں، بیگم صاحبہ مٹی کے تیل کی صف میں، صاحبزادہ سگریٹ کی صف میں،

صاحبزادی گھی کی صف میں کھڑے نظر آتے ہیں اور بسا اوقات شام کے وقت ناکام ہوکر خالی ہاتھ تھکے ہارے گھروں کو واپس ہوتے ہیں اور کل صبح سویرے صف باندھنے کی فکر میں کھو جاتے ہیں۔

اب ایران میں رشوت ستانی اور شفاعت و سفارش کی لعنت شروع ہوگئی ہے اور حکومت کے کارکن مختلف قسم کے بہانے سے لوگوں کی زندگی پر ڈاکے ڈالتے ہیں اور گھروں کی نجی اشیاء کی تفتیش کرتے ہیں۔ طاغوت کے زمانے میں ڈاکو اور نقب زن اور چوروں کی ہمت افزائی نہیں ہوتی تھی لیکن جمہوری اسلامی کے دور میں ڈاکوؤں کو حکومت کی یونیفارم اور اسلحے اور پشت پناہی سے نوازا جاتا ہے۔ اور پاسداران اسلام کے ناموں پر لوگوں کی ناموس اور اموال پر ڈاکا ڈالا جاتا ہے۔ حکومت والوں کی ستم ظریفی، بدعنوانیاں اور اشیاء کی کمیابی اور مہنگائی نے لوگوں کو نڈھال کردیا ہے۔

یہ سب حقائق ہیں لیکن جو صحافی، مسافر، مدعوئین تشریف لاتے ہیں کسی کو ان باتوں کا احساس نہیں ہوتا۔ اور اتنا متأثر ہوتے ہیں کہ باور کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے کہ یہ شیعہ حضرات اور ایران کے حکمراں قرآن کریم کے دشمن اور اسلام کے خلاف بات کرنے والے ہیں۔ لیکن کچھ دنوں عوام میں رہ کر اندر کی باتوں کا پتہ لگاتے تو یہ رازِ سربستہ کھل جاتا۔ لہٰذا میں دردمندانہ عرض کرتا ہوں کہ حکومتِ اسلامی کے پُرفریب اور مکّارانہ رویّہ سے کوئی دھوکا نہ کھائے ورنہ بعد میں پچھتانے کا موقع بھی میسر نہ ہوگا۔

اور نیز عرض گذار ہوں کہ ایرانی مسلمانوں کو شرعاً معذور سمجھ کر ان کو مداہن فی الدین کہیں کیونکہ ایران کی پُرتشدد فضا کا دیگر پُرامن اسلامی ممالک پر قیاس کرنا غلط ہے۔

اللہ تعالیٰ مسلمانانِ عالم کو کفر کے نرغہ سے نجات دے۔ آمین ثم آمین!

از :- مولانا سید شریف حسین ترمذی مرحوم - سابق ناظم مجلس علمیہ حیدرآباد

حضرت عارف باللہ مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی کے ایک شاگرد

مولانا سید مرتضیٰ علی دھلوی نگینوی

الحاج مولانا سید مرتضیٰ علی صاحبؒ حضرت کے آخری دور کے شاگردوں میں ہیں (آپ کے والد مولانا حافظ سید بہادر علی صاحبؒ دہلی کے رہنے والے صاحب نسبت بزرگ تھے) ۱۲۷۶ھ ۱۸۵۹ء میں دہلی ہی میں آپ کی ولادت ہوئی - ابتدائی تعلیم اپنے والد صاحب کے علاوہ دوسرے علماء دہلی سے حاصل کی - ۱۷، ۱۸ سال کی عمر میں اعلیٰ تعلیم کے لئے جامعہ اسلامیہ عربیہ دارالعلوم دیوبند میں داخل ہو گئے اور درس نظامی کی تکمیل بزرگ اساتذہ دارالعلوم سے کرتے ہوئے حدیث شریف کی سند و اجازت حضرت صدر مدرس صاحبؒ سے حاصل ہوئی۔ ۱۳۰۱ھ میں فارغ التحصیل ہوئے اس سال فارغ ہونے والے (۱۰) طلباء میں آپ کا نام مولوی مرتضیٰ دہلوی لکھا ہوا ہے۔

حسنِ اتفاق کہ اس سال کے فارغین میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ بھی ہیں۔ اس لئے حضرت حکیم الامتؒ سے برادرانہ تعلقات تھے ۔خط وکتابت اور آمد ورفت کا سلسلہ بھی تھا۔

استاذِ محترم کی رحلت کے بعد اپنے تزکیۂ نفس کے لئے آپ عارف باللہ حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مراد آبادیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے - کچھ عرصہ راہِ سلوک طے کرنے اور ذکر وشغل میں مصروف رکھنے کے بعد حضرتؒ نے اپنے سلسلۂ بیعت وارادت میں شامل کر لیا اور خرقۂ خلافت عطا فرمایا۔

۱۳۰۵ھ میں آپ نے نگینہ ضلع بجنور کے ایک مشہور بزرگ حضرت حافظ سید نجف علی صاحبؒ

(یانی حفاظ) کی صاحبزادی سے عقد فرمالیا۔ یہی بہانہ ہوا کہ آپ نے دہلی کی سکونت چھوڑ کر نگینہ کو اپنا وطن بنالیا۔ کچھ عرصہ بجنور میں اور بعض دیگر عربی مدارس میں درس و تدریس کی خدمت انجام دیتے رہے۔ پھر ایک مجذوب بزرگ کی نصیحت پر کہ "بلا معاوضہ خالصًا لوجہ اللہ اشاعت دین کی خدمت آزادرہ کر کرتے رہو۔ رزق خدا لئے بزرگ و برتر دے گا" ملازمت ترک کر دی اور متوکلانہ زندگی گذارنے لگے۔ یہاں تک کہ ۱۳۰۹ھ میں زادسفر کا انتظام کئے بغیر خَیْرَ الزَّادِ التَّقْوٰی پر عمل کرتے ہوئے حجازِ مقدس کی راہ لی۔ کئی ماہ مدینہ منورہ میں قیام کیا پنجوقتہ مسجد نبویؐ میں نماز، ذکر، اور روضۂ پاک پر درود وسلام پیش فرمانے کی سعادت حاصل کی وہاں کے بزرگوں سے ملاقات و استفادہ کو بھی فراموش نہیں کیا۔ ایام حج قریب آتے ہی مکہ معظمہ کی طرف رخت سفر باندھا۔ وہاں پہنچکر عارف باللہ حضرت اقدس حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کی دہلیز پر تکیہ لگادیا۔ حضرت رحٓ نے بھی حالات معلوم ہوتے ہی قریب سے قریب تر کر لیا یعنی جوہر شناس نے جوہر قابل کو پرکھ کر علوم و تصوف واحسان کے دروازے وا کر دیئے کیا فیض لیا اور کتنا شیخ نے عطا فرمایا اس کی تفصیل معلوم ہونا بالکل ممکن نہیں۔ بقول شاعر ؎

بلبل چہ گفت وگل چہ شنید وصبا چہ کرد
اکنوں کرا دماغ کہ پرسد زباغباں

مختصر یہ کہ حضرت شیخ سے خرقۂ خلافت حاصل ہوا اور حضرت شیخ کی ہدایت پر ہندوستان واپس آگئے۔ اندازہ ہے کہ آپ کا یہ سفر حج ایک سال کی مدت میں ختم ہوا اس زمانہ کی سفر حج کی مشکلات اور صعوبتوں کو دیکھتے ہوئے ایک سال کی مدت کچھ زیادہ نہیں کہی جاسکتی۔

ہندوستان واپس آکر حسب ہدایت تبلیغ اسلام، اصلاح عقائد واصلاح معاشرہ میں مشغول ہو گئے۔ اکثر امامت بھی فرماتے۔ نگینہ کے قیام کے زمانہ میں تو پابندی سے ایک مسجد میں امامت کرتے تھے لیکن امامت کا کبھی معاوضہ قبول نہیں کیا۔ البتہ عملیات بھی کر لیتے تھے آپ کے تعویذات کے لوگ بہت معتقد تھے۔ لیکن اس کی حیثیت "تقریب بہر ملاقات" کی سی تھی۔ حقیقت میں اس سے اسلام کی تبلیغ کا موقعہ ملتا تھا۔ آپ کے ہاتھوں پر سیکڑوں

بندگان خدا نے اسلام قبول کیا۔ اور ہزاروں کی اصلاح ہوئی۔ اب بھی ایسے اہل علم موجود ہیں جو کہتے ہیں کہ خصوصاً ضلع بجنور میں دیوبندیت یا صحیح عقائد آپ کی محنتوں کا ثمرہ ہیں ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشآء۔

۱۳۲۸ھ/۱۹۱۰ء میں دارالعلوم دیوبند کا عظیم الشان جلسہ دستاربندی ہوا تو قدیم فرزند دارالعلوم کی حیثیت سے آپ کو دستار فضیلت حاصل ہوئی جس پر دستار فضیلت مدرسہ اسلامیہ دیوبند ۱۳۲۸ھ" سنہری الفاظ میں لکھا ہوا ہے۔ آج بھی یہ دستار فضیلت خاندان میں بطور یادگار محفوظ چلی آرہی ہے۔

اولاد میں لڑکیوں کے علاوہ دو فرزند (مولانا سید حسین ترمذی، سید شریف حسین ترمذی) ہوئے جنھوں نے دارالعلوم دیوبند سے علی الترتیب ۱۳۴۲ھ اور ۱۳۵۲ھ میں فراغت حاصل کی۔ دونوں اپنی فراغت کے بعد حیدرآباد چلے آئے۔ یہاں پر مستقل سکونت اختیار کرلی۔ آپ ہمیشہ سنتِ رسول صلعم کے پابند رہے۔ اہل وعیال کو بھی اسی راستہ پر چلایا۔ سادگی مزاج میں ہمیشہ رہی اور دورِ خلافت سے کھادی پہننے کی جو عادت ڈالی تھی اس پر تاحیات قائم رہے۔ تمام علمائے کرام خصوصاً مجاہدینِ اسلام سے بہت محبت کرتے تھے۔ مجاہدِ جلیل حضرت اقدس شیخ الہند رح اور شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی رح کی تعریفیں کرتے تھکتے نہیں تھے۔

آخر دنیا کا سفر مکمل کرکے یہ چمکتا ہوا ستارہ ۵ شعبان ۱۳۵۲ھ (۲۴ نومبر ۱۹۳۳ء) کو غروب ہوکر دارالخلد کی طرف رخصت ہوا۔ بیہوشی میں اور قریب المرگ بھی قلب سے ذکر اللہ کی گنگناہٹ سنی جاتی رہی۔ نگینہ کے مغربی قبرستان میں دفن کیا گیا (نور اللہ مرقدہٗ)

شیخ المحدثین حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سے ہزاروں شخصیتوں نے استفادہ کیا اور ان کے شاگرد و تلامذہ بلاشبہ دنیا میں آفتاب و ماہتاب ہوکر چمکے اور تمام عالم کو اپنے علم کی کرنوں سے روشن کیا لیکن چراغِ رخِ زیبا لیکر بھی تلاش کیا جائے

تو میرے علم میں آج کوئی ایسی شخصیت زندہ موجود نہیں جس نے بلا واسطہ زانوئے ادب طے کیا ہو۔ کاشکہ ؎

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کئے

ہاں ان کے شاگرد اور شاگردوں کے شاگردوں کا سلسلہ الحمدللہ چل رہا ہے اور ثمرہ سے درخت کی خوبی کا پتہ چل سکتا ہے۔ انشاء اللہ یہ سلسلہ تا قیامت چلتا رہے گا۔

ان کے باکمال شاگردوں کے شاگردوں کو دیکھ کر ایک شاعر کی زبان میں کہنے کو دل چاہتا ہے کہ ؎

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہوگئیں

کُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ۔

مرزا قادیانی کا عقیدہ
خود اپنے ممدوحین کے خلاف

از مولانا حافظ محمد اقبال رنگونی (مانچسٹر انگلینڈ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حیاتِ مسیح کا عقیدہ کوئی اختلافی نہیں ہے، قرآن و حدیث اور اجماع امت سے ثابت ہے۔ مرزا غلام احمد قادیانی وہ واحد شخص ہے جس نے حیات مسیح کے عقیدہ کو اختلافی بنا کر امت مسلمہ میں انتشار و افتراق پیدا کرنے کی سعی لاحاصل کی، حالانکہ خود مرزا صاحب کا عقیدہ بھی وہی تھا جو تمام امت مسلمہ کا متفقہ عقیدہ ہے۔

(۱) یہ آیت جسمانی اور سیاست ملکی کے طور پر حضرت مسیح کے حق میں پیش گوئی ہے اور جس غلبہ کاملہ اور دین اسلام کا اس آیت میں وعدہ دیا گیا ہے وہ غلبہ مسیح کے ذریعہ ظہور میں آئے گا جب حضرت مسیح علیہ السلام دوبارہ اس دنیا میں تشریف لائیں گے، تو ان کے ہاتھ سے دین اسلام جمیع آفاق و اقطار میں پھیل جائیگا (براہین حصہ ۴ ص ۴۱۳)

(۲) یہ بات پوشیدہ نہیں کہ مسیح بن مریم کے آنے کی پیش گوئی ایک اول درجہ کی پیش گوئی ہے جس کو سب نے بالاتفاق قبول کر لیا ہے اور جس قدر صحاح میں پیش گوئیاں لکھی گئی ہیں کوئی پیش گوئی اسکے ہم پلہ و ہموزن ثابت نہیں ہوتی، تواتر کا اول درجہ اس کو حاصل ہے، انجیل بھی اس کی مصدق ہے، اب اس قدر ثبوت پر پانی پھیرنا اور یہ کہنا کہ یہ تمام حدیثیں موضوع ہیں درحقیقت ان لوگوں کا کام ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے بصیرت دینی اور حق شناسی میں سے کچھ بخرہ اور حصہ نہیں دیا (ازالہ اوہام ص ۵۵۷)

(۳) والنزول ایضاً حق نظراً علی تواتر الآثار وقد ثبت من طرق فی الاخبار
ونزول از روئے تواتر آثار ہم راست است چرا کہ از طرق متعددہ ثابت گشتہ (انجام آتھم ۱۵۸)
مسیح کا نزول آسمان سے ہوگا اس سلسلے میں نزول اور سماء کا لفظ ملاحظہ کیجئے
یا ایہا الناس ان نزول المسیح کان امرا غیبیاً الخ (آئینہ کمالات ۵۷۸) قد
اخبرنی من نزول المسیح (ص۴۰۵) ان المسیح ینزل من السماء بجمیع علومہ الخ
ص۴۰۹ وغیرہ وغیرہ۔

مگر بعد میں مرزا غلام قادیانی نے انگریز آقاؤں کی شہ پر اس عقیدہ سے کلیتہً انحراف کیا اور وفات مسیح کے عنوان پر اپنی طاغوتی زندگی صرف کردی مرزا غلام قادیانی اس سلسلے میں کیسی کیسی شاطرانہ چالیں چلیں یہ اس وقت کا موضوع نہیں، یہاں ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ مرزا قادیانی نے جن بزرگوں اور اکابر کا دم بھرا تھا ان کا کیا عقیدہ تھا اگر یہ ثابت ہوجائے کہ ان کا عقیدہ بھی حیات مسیح ہی کا ہے تو پھر قادیانی امت کو اپنے تمام عقائد سے فوراً توبہ کرکے اہل اسلام کے گروہ میں شامل ہوجانا چاہئے تاکہ عقبیٰ کی ذلت و رسوائی سے بچ سکیں۔

(۱) سیدنا حضرت عبداللہ ابن عباس رضؓ کے بارے میں مرزا غلام احمد قادیانی لکھتا ہے
حضرت ابن عباس قرآن کریم کے سمجھنے میں اول نمبر والوں میں سے ہیں اور اس بارہ میں ان کے حق میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک دعا بھی ہے (ازالۂ اوہام حصہ اول ص۲۲۵)
لیجئے سیدنا حضرت ابن عباس رضؓ کا عقیدہ ملاحظہ فرمائیے۔

عن ابی صالح عن ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال وان اللہ رفع بجسدہ وانہ حیی الآن وسیرجع الی الدنیا فیکون فیہا ملکا ثم یموت کما یموت الناس (طبقات کبریٰ جلد اول ص۲۶ مطبوعہ لندن)
معلوم ہوا کہ سیدنا حضرت ابن عباسؓ کا عقیدہ یہی تھا کہ سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام

کا رفع جسمانی ہوا اور آپ حیات سے ہیں اور دوبارہ نزول فرمائیں گے، پھر آپ پر موت طاری ہوگی ـــــ تبلایئے حضرت ابن عباسؓ قرآن کو اول نمبر سمجھنے والوں میں سے ہیں یا مرزا غلام احمد قادیانی ؟

(۲) سیدنا حضرت امام ابوحنیفہؒ (۱۵۰ھ) کے بارے میں مرزا غلام احمد قادیانی رقم طراز ہے :-

حقیقت یہ ہے کہ امام صاحب موصوف اپنی قوتِ اجتہادی اور اپنے علم اور درایت اور فہم و فراست میں ائمہ ثلاثہ باقیہ سے افضل و اعلیٰ تھے اور ان کی خداداد قوت فیصلہ ایسی بڑھی ہوئی تھی کہ وہ ثبوت عدم ثبوت میں بخوبی فرق کرنا جانتے تھے اور ان کی قدرت مدرکہ کو قرآن شریف کے سمجھنے میں ایک خاص دستگاہ تھی اور ان کی فطرت کو کلام الٰہی سے ایک خاص مناسبت تھی اور عرفان کے اعلیٰ درجے تک پہونچ چکے تھے اسی وجہ سے اجتہاد و استنباط میں ان کے لئے وہ درجہ علیا مسلم تھا جس تک پہنچنے سے دوسرے سب لوگ قاصر تھے (ازالۂ اوہام حصہ دوم ص۳۸۵)

مرزا صاحب کی اس عبارت سے معلوم ہوا کہ۔

۱:- امام اعظم درایت، اجتہاد فہم و فراست میں سب سے اعلیٰ تھے۔

۲:- کسی چیز کے ثابت ہونے اور نہ ہونے میں بخوبی فرق کر سکتے تھے۔

۳:- قرآن شریف کو سمجھنے میں ان کو خاص ملکہ حاصل تھا

۴:- کلام الٰہی سے ایک خاص مناسبت تھی

۵:- معرفت کے اعلیٰ درجہ تک پہنچے ہوئے تھے

۶:- جس مقام تک آپ پہنچے آپ کے بعد کوئی نہ پہنچا۔

اب دیکھئے حضرت امام ابوحنیفہؒ کا کیا عقیدہ تھا۔

وخروج الدجال ویاجوج وماجوج وطلوع الشمس من مغربها ونزول عيسىٰ

علیہ السلام من السماء وسائر علامات یوم القیامۃ علی ماوردت بہ الاخبار الصحیحۃ حق کائن (فقہ اکبر ص۱۶)

حضرت امام صاحبؒ کا عقیدہ یہی تھا کہ سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے نازل ہوں گے اور یہ عقیدہ برحق ہے ایسا ہونے والا ہے —— جبکہ مرزا صاحب نہ تو کہیں سے نازل ہوئے نہ خروج دجال ہوا۔

اب فرمایئے حضرت الامامؒ کا عقیدہ برحق تھا! یا مرزا غلام احمد قادیانی کا۔

(۳) سیدنا حضرت امام بخاریؒ کی "صحیح بخاری شریف" کے بارے میں مرزا غلام احمد قادیانی لکھتا ہے۔

صحیح بخاری کی وہ حدیثیں جن میں آخری زمانہ میں بعض خلیفوں کی نسبت خبر دی گئی ہے خاص کر وہ خلیفہ جس کی نسبت بخاری میں لکھا ہے کہ آسمان سے اسکی نسبت آواز آئے گی کہ ہذا خلیفۃ اللہ المہدی، اب سوچو کہ یہ حدیث کس پایہ اور مرتبہ کی ہے جو ایسی کتاب میں درج ہے جو اصح الکتب بعد کتاب اللہ ہے (شہادۃ القرآن ص۴۱ روحانی خزائن ص۳۳۷ ج۶)

ایک جگہ لکھا کہ: صحیح بخاری جو بعد کتاب اللہ اصح الکتب سمجھی گئی ہے (ازالۃ الاوہام حصہ دوم ص۵۱۱)

مرزا غلام احمد قادیانی کی اس عبارت سے معلوم ہوا کہ صحیح بخاری شریف اصح الکتب بعد کتاب اللہ ہے اس میں حضرت امام بخاریؒ نے جو عقیدہ بیان کیا ہے وہ ملاحظہ فرمایئے

باب نزول عیسیٰ بن مریم

پھر اس کے ضمن میں یہ حدیث نقل فرمائی ہے۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والذی نفسی بیدہ لیوشکن ان ینزل فیکم ابن مریم حکما عدلا فیکسر الصلیب ویقتل الخنزیر ویضع الحرب ویفیض المال حتی لا یقبلہ احد حتی تکون السجدۃ الواحدۃ خیر من الدنیا ومافیھا (الحدیث) (صحیح بخاری شریف جلد اول ص۴۹۰)

معلوم ہوا کہ امام بخاری کا عقیدہ بھی یہی تھا کہ سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام نزول فرمائیں گے جبھی تو باب نزول عیسیٰ ابن مریم قائم فرمایا، پھر اس کے ضمن میں وہی حدیث نقل فرمائی جس میں صراحۃً "ینزل" اور "ابن مریم" کا لفظ ہے، جبکہ مرزا صاحب نہ تو آسمان سے ٹپکے تھے نہ ہی ابن مریم تھے۔ مرزا تو قادیان میں جنت بی بی کے ساتھ نکلے تھے اور چراغ بی بی کے صاحبزادے تھے۔

فرمائیے امام بخاری کا عقیدہ صحیح ہے، ان کی صحیح اصح الکتاب بعد کتاب اللہ ہے یا مرزا صاحب کے ہفوات و خرافات۔

(نوٹ) مرزا صاحب نے شہادۃ القرآن کے مذکورہ بالا حوالہ میں بخاری شریف کی جس روایت کا حوالہ دیا ہے وہ صحیح بخاری میں ہرگز نہیں ہے ہم نے پہلے ایک مضمون میں اس پر گذارشات پیش کی تھیں جو قارئین نے پڑھی ہوں گی، اب بھی ہمارا چیلنج ہے کہ تمام قادیانی زعماء بخاری شریف سے یہ الفاظ۔ ھذا خلیفۃ اللہ المھدی" دکھادیں تو سو پونڈ انعام اور لندن تا ربوہ ہوائی جہاز کا ٹکٹ مفت، اور اخراجات الگ دیئے جائیں گے، ہے کوئی لینے والا۔؟

حضرت امام بخاریؒ کا عقیدہ یہی ہے کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام قرب قیامت نزول فرمائیں گے اور اپنے وقت مقرر پر انتقال فرمائیں گے، آپ کو سرورِ دو عالم حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات شیخین سیدنا ابو بکرؓ و سیدنا عمرؓ کے پاس دفن کیا جائے گا۔

اخرج البخاری فی تاریخہ عن عبد اللہ بن سلام قال یدفن عیسیٰ مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وابی بکر وعمر ویکون رابعا (بحوالہ درمنثور جلد دوم ص۲۴۵)

کیا مرزا صاحب کی قبر قادیان میں ہے یا مدینہ منورہ میں؟ جب ایک قادیانی سے پوچھا گیا تو اس نے بتایا دیکھنے میں تو قادیان ہی میں ہے مگر اندر ہی اندر سے چلے سمندر بھی پار کیا، کفن بھی بھیگ گیا تھا جب سعودی عرب کی سرحد میں داخل ہوئے تو کچھ گرمی آئی اور

کپڑے سکھانے کیلئے کچھ دیر بیٹھے ہیں! میں نے کہا کہ یہ مجنونانہ اور احمقانہ خیالات چھوڑ دو تمھاری اس احمقانہ باتوں سے صرف نظر کرتے ہوئے عرض کرتا ہوں کہ حرمین شریفین (زادہما اللہ شرفاً و کرامۃ) وہ مقدس مقامات ہیں جہاں باطل کا گذر نہیں، مرزا غلام احمد قادیانی تو از روئے حدیث تیس دجالوں میں سے ایک ہیں۔ اور دجال اکبر کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا کہ

لایدخل المدینۃ رعب المسیح (الدجال) لھا یومئذ سبعۃ ابواب علی کل باب ملکان۔	مدینہ میں مسیح دجال کا رعب داخل نہ ہوسکے گا اس دن مدینہ کے سات دروازے ہوں گے ہر دروازے پر دو فرشتے پہرہ دے رہے ہوں گے۔

(بخاری شریف ج ۱ ص ۲۵۲ مصر)

جب دجال اکبر کی اللہ کے فرشتے یہ درگت بنائیں گے تو پھر مرزا غلام احمد کی کیا درگت بنتی ہوگی اس کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

(۴) علامہ ابن جریر طبریؒ کے بارے میں مرزا غلام احمد قادیانی لکھتا ہے کہ:

اور ابن جریر بھی جو رئیس المفسرین ہے (آئینہ کمالات اسلام ص ۱۶۸)

ایک جگہ لکھا:

"یہ قصہ ابن جریر نے اپنی کتاب میں لکھا ہے جو نہایت معتبر اور ائمہ حدیث میں سے ہے (چشمۂ معرفت حصہ دوم ص ۲۶۱ حاشیہ)

مرزا صاحب کے بیان سے معلوم ہوا کہ علامہ ابن جریر، رئیس المفسرین اور ائمہ حدیث میں سے ہیں، آئیے ان کا عقیدہ بھی ملاحظہ کرتے ہیں۔ آپؒ توفّی کی بحث میں مختلف معانی نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ۔

واولی ھذہ الاقوال بالصحۃ عندنا قول من قال معنی ذلک انی قابضک من الارض ورافعک الیّ لتواتر الاخبار عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہ ینزل

عیسیٰ بن مریم فیقتل الدجال ثم یمکث فی الارض اربعین سنۃ ثم یموت یصلی علیہ المسلمون ویدفنونہ (تفسیر ابن جریر ج ۳ ص۲۹۱)

معلوم ہوا کہ علامہ ابن جریر طبریؒ کا عقیدہ بھی یہی تھا کہ سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام دوبارہ تشریف لائیں گے اور ان کے ہاتھوں دجال قتل کیا جائیگا۔

اب بتلایئے علامہ ابن جریر رئیس المفسرین اور معتبر ائمہ حدیث میں سے ہیں یا مرزا غلام احمد قادیانی؟ فیصلہ کریں۔

⑤ حضرت امام محمد باقرؒ (۱۱۴ھ) اور حضرت امام جعفر صادق (۱۴۸ھ) سے مرزا صاحب بڑی عقیدت رکھتے تھے، ان سے روایات لے کر اس پر اپنا کام چلاتے تھے، ایک جگہ لکھتے ہیں:

صحیح دارقطنی میں یہ ایک حدیث ہے کہ امام محمد باقر فرماتے ہیں (حقیقۃ الوحی ص۲۰۲)

مرزا صاحب کی حدیث دانی ملاحظہ کیجئے۔ دارقطنی کو "صحیح" کہتے ہیں

حضرت امام جعفر صادق رح کے بارے میں لکھتے ہیں

حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے اس اخلاص اور محبت اور شوق سے خدا کے کلام کو پڑھا کہ وہ الہامی رنگ میں میری زبان پر بھی جاری ہو گیا لیکن افسوس لوگ اس بات کو نہیں سمجھتے کہ مکالمات الہیہ کیا شئی ہیں (حقیقۃ الوحی ص۱۴۱)

اب آیئے حضرت امام محمد باقرؒ اور حضرت امام جعفر صادقؒ کا عقیدہ ملاحظہ فرمایئے آپ اپنے والد امام باقرؒ اور وہ اپنے والد ماجد حضرت علی بن حسین زین العابدین (۹۴ھ) سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں کہ

کیف تہلک امۃ انا اولہا والمہدی وسطہا والمسیح آخرہا (مشکوٰۃ ص۵۸۳)

معلوم ہوا کہ ان حضرات گرامی قدر کے عقیدے میں بھی سیدنا مہدی علیہ الرضوان اور ہیں، اور سیدنا حضرت مسیح علیہ السلام اور — اور مرزا صاحب کا عقیدہ تھا کہ نہیں دونوں ہی میں

ہوں ۔۔۔ فرمائیے امام جعفر صادق اور امام محمد باقر رح اور امام زین العابدین رح کا عقیدہ درست تھا یا مرزا غلام احمد قادیانی کا۔

⑤ سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی رح کے بارے میں مرزا غلام احمد قادیانی لکھتا ہے

اس کی تصدیق اکابر صوفیاء اسلام کر چکے ہیں جیسا کہ سید عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ نے بھی فتوح الغیب میں یہی لکھا ہے۔ (براہین احمدیہ حصہ پنجم ص۱۲۴)

معلوم ہوا کہ شیخ جیلانی رح اسلام کے جلیل القدر صوفیوں میں سے تھے ایک جگہ ان کی منقبت بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

اس روحانی حسن کی بنا پر بعض سید عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ کی نعت میں یہ شعر کہے ہیں اور ان کو ایک نہایت درجہ حسین اور خوبصورت قرار دیا ہے (براہین حصہ پنجم ص۲۲ حاشیہ پر رقم طراز ہے

میری روح اور سید عبدالقادر کی روح کو خمیر فطرت سے باہم مناسبت ہے (")

مرزا صاحب کا عقیدہ وفات مسیح کا ہے اور شیخ جیلانی رح کا عقیدہ حیات مسیح کا ہے تبلائیے کس طرح باہم مناسبت ہوگی، کیا کفر و ایمان میں بھی کچھ مناسبت ہے، کجا پاک و کجا ناپاک! مرزا صاحب ایک اور جگہ لکھتے ہیں

کما قال سیدی وحبیبی الشیخ عبد القادر الجیلانی رضی اللہ عنہ فی کتابہ الفتوح تعلیما للسالکین........ تو کلام السید الجلیل قطب الوقت امام الزمان رضی اللہ عنہ (تحفۂ بغداد ص۲۲ و ص۲۷)

آئیے دیکھیں کہ سیدنا شیخ جیلانی رح کا کیا عقیدہ تھا۔ آپ فرماتے ہیں

والتاسع: رفع اللہ عزوجل عیسی بن مریم الی السماء (غنیۃ الطالبین جلد دوم ص۴۸/۲۶)

مرزا صاحب کا عقیدہ کہ عیسیٰ علیہ السلام فوت ہوگئے اور حیات و رفع مسیح کا عقیدہ غلط در غلط بلکہ شرک! اور سیدنا شیخ عبدالقادر جو مرزا صاحب کے نزدیک امام الزماں، قطب الوقت

سید، جلیل، اور اکابر صوفیائے اسلام میں سے ہیں ان کا عقیدہ ملاحظہ فرمائیے۔

(۹) سیدنا حضرت امام فخرالدین رازی ؒ (۶۰۶ھ) کا مرزا غلام احمد قادیانی نے ایک قول نقل کیا اس پر لکھا کہ:

اس وقت امام رازی رحمہ اللہ کا یہ قول نہایت پیارا معلوم ہوتا ہے

(آئینہ کمالات اسلام ص۱۱۹ حاشیہ)

معلوم نہیں کہ مرزا صاحب اور ان کے حواریوں کو امام رازی کا مندرجہ ذیل قول کیوں پیارا معلوم نہیں ہوتا، آپ لکھتے ہیں۔

وقد ثبت الدليل انه حیّ وورد الخبر عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انه سینزل ویقتل الدجال ثم انه تعالیٰ یتوفاه بعد ذلك (تفسیر کبیر جلد۲ ص۴۸۹ تحت قوله تعالیٰ انی متوفیك الاٰیة)

اسی کے ذیل میں یہ بھی تحریر فرماتے ہیں۔

ولما علم اللہ ان من الناس من یخطر بباله ان الذی رفعه اللہ هو روحه لاجسده ذکر هذا الکلام لیدل انه علیه السلام رفع بتمامه الی السماء بروحه وجسده۔

مطلب یہ ہے کہ امام رازیؒ نزول عیسیٰؑ کے قائل ہیں، قتل دجال کا ان کے ہاتھ سے ہونا تسلیم کرتے ہیں، پھر انتقال ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں! اور سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے جسم اور روح کے ساتھ رفع ہونے کا عقیدہ رکھتے اور اسی کے قائل ہیں۔

وما قتلوه وما صلبوه الاٰیة کے ذیل میں لکھتے ہیں۔

المسئلة الثانية رفع عیسیٰ علیه السلام الی السماء ثابت بهذه الاٰیات قوله فی اٰل عمران انی متوفیك ورافعك الیّ (جلد۳ ص۵۰۴)

الحاصل تفسیر کبیر میں اس طرح کے دوسرے ارشادات بھی موجود ہیں، کیا قادیانیوں کو یہ اقوال پیارے اور حسین معلوم نہیں ہوتے؟

(۷) سیدنا حضرت شیخ محمد طاہر پٹنی کا مرزا غلام احمد قادیانی کی کتابوں میں بہت ذکر ملتا ہے اور اپنے دعویٰ کو ثابت کرنے کے لئے موصوف کی کتب میں طرح طرح کی تحریف کرتے ہیں مگر کہیں ان کی پوری عبارت پیش نہیں کرتے، تاہم مرزا صاحب شیخ موصوف کو ایک عالم ربانی اور نیک بزرگ سمجھتے ہیں، ایک جگہ بددعا کے واقعہ کو تفصیلی طور پر پیش کر کے لکھتے ہیں؛

"صاحب مجمع البحار کے زمانہ میں بعض ناپاک طبع لوگوں نے محض افترا کے طور پر مسیح اور مہدی ہونے کا دعویٰ کیا تھا اور چونکہ وہ ناراستی پر تھے اس لئے خدا تعالیٰ نے شیخ محمد طاہر کی دعا منظور کر کے ان کو محمد طاہر کی زندگی ہی میں ہلاک کر دیا (حقیقۃ الوحی ص۲۵۳)

مرزا صاحب ان لوگوں کی قول کی تردید کرتے ہیں جو کہتے ہیں کہ ہلاکت بددعا سے نہ تھی بلکہ اتفاقی تھی، مرزا صاحب کا کہنا ہے کہ یہ بزرگ تھے اور انھی کی بددعا تھی جس سے یہ لوگ ہلاک ہوئے، اپنے مخالف کا قول یوں نقل کرتے ہیں کہ

"شاید ہمارے مخالف اب یہ کہیں گے کہ وہ جھوٹا مسیح اور جھوٹا مہدی جو محمد طاہر کی بددعا سے مرگیا تھا وہ بھی ایک اتفاقی موت تھی محمد طاہر کی دعا کا اثر نہ تھا، پس ایسی باتوں کا ہم کہاں تک جواب دے سکتے ہیں چاہیں تو وہ دہریہ بن جائیں۔"

(حقیقۃ الوحی ص۳۵۵)

ایک جگہ لکھتا ہے۔

یہ سچ ہے کہ محمد طاہر کی بددعا سے جھوٹا مسیح ہلاک ہوگیا تھا (حقیقۃ الوحی ص۲۴۵)

خلاصہ کلام یہ کہ مرزا صاحب کے نزدیک بھی شیخ محمد طاہر اللہ والے اور بزرگ تھے، اب آیئے ان کا عقیدہ دیکھتے ہیں کیا تھا؟ آپ حضرت عائشہ صدیقہؓ کے ایک

ارشاد کی وضاحت کے سلسلہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

وھذا ناظر الی نزول عیسیٰ وھذا ایضا لاینا فی حدیث لانبی بعدہٗ

(مجمع البحار ص۸۵)

اس سے آپ کا عقیدہ واضح ہوگیا کہ سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نازل ہونا صحیح ہے، اسی طرح آپ حضرت امام مالکؒ کے قول کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

ویجئی فی اٰخر الزمان لتواتر خبر النزول۔

کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اخیر زمانہ میں تشریف لادیں گے جیسا کہ متواتر حدیثوں سے آپ کا نزول ثابت ہے۔

قادیانی لوگ جو شیخ موصوف کی عبارت سے لوگوں کو دھوکہ دینے کی ناکام کوشش کرتے ہیں انھیں چاہئے کہ مندرجہ بالا عقیدہ بھی ملاحظہ کریں، شیخ موصوف تو نزول عیسیٰؑ کی احادیث کو متواتر فرماتے ہیں اور آپ ہیں کہ ان پر اجرائے نبوت کے عقیدے کا الزام لگاتے چلے جاتے ہیں (کچھ تو شرمائیں)

الجھا ہے پاؤں یار کا زلف دراز میں

⑧ سیدنا حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ کے اشعار کی نسبت مرزا صاحب کا عقیدہ یہ تھا کہ

"بعض (اولیاء) کو مثنوی رومی کے اشعار بطور الہام منجانب اللہ دل میں ڈالے گئے ہیں (براہین پنجم ص۱۶۳)

بلکہ مرزا صاحب نے یہ بھی کہدیا کہ میرے زمانہ میں جو حالات پیش آئیں گے وہ رومی صاحب کہہ گئے ہیں

"تا وہ سب نشان ظاہر ہوجائیں جن کا وعدہ دیا گیا تھا، رومی صاحب نے بھی اسی بارہ میں فرمایا ہے (حقیقۃ الوحی ص۳۵۸)

ایک جگہ لکھتے ہیں

گویا رومی مولوی صاحب نے میرے لئے ہی یہ دو شعر بنائے تھے (حقیقۃ الوحی ص۵۹)

حضرت مولانا رومی رح بھی اسی عقیدہ کے حامل تھے جو امت مسلمہ کے تمام اکابر و عوام کا متفقہ تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں آپ پر رسالت ختم ہوگئی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا جسم خاکی آسمان پر گیا۔ ایک جگہ فرماتے ہیں

جسم خاک از عشق برافلاک (مثنوی اول ص۳۳)

شارحین مثنوی نے اس کے ضمن میں یہی لکھا ہے کہ:

بآیت کریمہ کہ در سورۃ النساء در شان عیسیٰ علیہ السلام بل رفعہ اللہ الیہ یعنی برداشت او خدا بسوئے خود (بحوالہ حیات عیسیٰ السلام ص۱۰۳)

عقیدہ ختم نبوت کے بارے میں آپ کا مشہور شعر ہے کہ

یا رسول اللہ رسالت را تمام ... تو نمودی ہمچو شمس بے غمام

(مثنوی دفتر پنجم ص۳۹۸ لکھنو. عقیدۃ الامۃ ص۱۱۴)

اے اللہ کے رسول آپ نے رسالت کو اس طرح شرف تمام بخشا جیسے بادل کے بغیر سورج چمک رہا ہو۔

ہو سکتا ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی ہی کی وجہ سے یہ اشعار کہہ گئے ہوں کیونکہ مرزا حیات مسیح کا منکر اور ختم نبوت کے عقیدہ پر ضرب لگانے والا تھا۔ اس لئے مرزا صاحب کو چاہیئے کہ اب یوں کہیں۔ گویا رومی مولوی صاحب نے میرے لئے ہی یہ دو شعر بنائے تھے تاکہ میرا راز فاش کریں۔

(باقی آئندہ)

دار العلوم دیوبند کا ترجمان

ماہنامہ

دار العلوم دیوبند

ماہ ذی الحجہ ۱۴۰۸ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۸۸ء

جلد نمبر ۷۲، شمارہ نمبر ۸

فی شمارہ چار روپے، سالانہ چالیس روپے

نگراں :-

حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند

مدیر :-

مولانا حبیب الرحمن صاحب قاسمی

سالانہ بدل اشتراک غیر ممالک سے

سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ =/160

پاکستان =/70

بنگلہ دیش (ہندوستانی) =/50

سرخ نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ کا زر تعاون ختم ہوگیا ہے

فہرست مضامین

ہندوستانی و پاکستانی خریداروں سے ضروری گذارش

۱۔ ہندوستانی خریداروں سے ضروری گذارش یہ ہے کہ ختم خریداری کی اطلاع پاکر اول فرصت میں اپنا چندہ نمبر خریداری کے حوالہ کے ساتھ منی آرڈر سے روانہ کریں۔

۲۔ پاکستانی خریدار اپنا چندہ مبلغ ۷۰/- روپے مولانا عبدالستار صاحب مہتمم جامعہ عربیہ محمودیہ داؤد والا براہ شجاع آباد ملتان، پاکستان کو بھیجدیں

۳۔ خریدار حضرات پتہ پر درج شدہ نمبر محفوظ فرمالیں، خط و کتابت کے وقت خریداری نمبر ضرور لکھیں۔

والسلام

منیجر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرفِ آغاز

مولانا حبیب الرحمن صاحب قاسمی

ایران کے سرکاری مجلہ "توحید" کے شمارہ مئی و جون ۱۹۸۸ء میں "شیعوں پر کفر کا الزام غیر شرعی جسارت ہے" کے عنوان سے ایک فتویٰ شائع ہوا ہے، جو غالبا دارالعلوم دیوبند کے اس فتوی کی تردید میں ہے جس میں خمینی اور ان کے ہم مذہب فرقہ اثنا عشریہ کی تکفیر کی گئی ہے ذیل کی سطروں میں اسی کا جائزہ لیا گیا ہے۔ تین صفحات پر مشتمل اس فتویٰ کا خلاصہ یہ ہے

(الف) روافض پر علی الاطلاق کفر کا فتوی لگانا غیر شرعی جسارت ہے

(ب) محدثین و فقہاء میں سے کسی نے بھی فرقہ شیعہ پر علی الاطلاق کفر کا فتویٰ نہیں لگایا

(ج) فقہاء نے تصریح کی ہے کہ جو ان ضروریات دین کا منکر ہو جو نصوص قطعیہ سے ثابت ہوں اس پر کفر کا فتویٰ لگایا جائے گا۔

(د) شرعی ضابطہ یہ ہے کہ اگر کسی کے کلام میں ننانوے احتمال کفر کے ہوں اور ایک احتمال اس کی نفی کا تو کفر کا فتویٰ نہیں لگانا چاہئے۔

(ھ) حدیث کی جو کتابیں صحاح ستہ کے نام سے موسوم ہیں ان میں اور خصوصاً خود بخاری شریف میں شیعوں کی روایت موجود ہے پس کس طرح کہدیا جائے کہ تمام شیعہ کافر ہیں۔

(و) دارالعلوم دیوبند کے اکابر علماء نے علی الاطلاق فرقہ شیعہ کو کافر کبھی نہیں کہا۔

خلاصہ میں اس فتوی کے الفاظ کی رعایت کی گئی ہے اپنی جانب سے کوئی لفظ استعمال نہیں کیا گیا ہے، نمبر ۱ میں دعویٰ ہے کہ تمام روافض پر مطلقاً کفر کا فتویٰ غیر شرعی جسارت ہے اور اس دعوے پر پانچ دلیلیں پیش کی گئی ہیں جو خلاصہ میں ۱ کے بعد مذکور ہیں

(ز) اور آخر میں بطور نتیجہ اور حاصل کلام کے فرمایا گیا ہے کہ "موجودہ وقت میں یہ جو کچھ ہے مفاد پرستوں اقتدار پرستوں کا ایک فتنہ ہے جو مسلمانوں کے ایک فرقہ پر کفر کا فتویٰ دیکر خونریزی اور فسادات کا ایک نیا دروازہ کھولنا ہے" (بلفظہ)

فتویٰ نویس نے اپنے دعویٰ پر جو پہلی دلیل پیش کی ہے وہ درست نہیں ہے کیونکہ دعویٰ اور دلیل میں مطابقت نہیں ہے دعوی تو یہ ہے کہ روافض کو علی الاطلاق کافر کہنا غیر شرعی جسارت ہے

اور اسکی دلیل یہ پیش کی گئی ہے کہ فرقہ شیعہ کو علی الاطلاق محدثین و فقہاء کافر نہیں کہتے جب کہ فرقہ شیعہ کا لفظ اپنے اندر عموم رکھتا ہے اور روافض شیعوں کے ایک خاص گروہ کو کہا جاتا ہے۔ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں التشیع محبۃ علی وتقدیمہ علی الصحابۃ۔ حضرت علی کی محبت اور انھیں صحابہ پر فضیلت دینا شیعیت ہے۔ اور روافض خاص ان شیعوں کو کہا جاتا ہے جن کا بنیادی عقیدہ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیزاری اور انھیں سب وشتم کرنا ہے[1]

ظاہر ہے تفضیل علی وجہ کفر نہیں ہے اس لئے علی الاطلاق شیعوں کی تکفیر نہیں کی جاسکتی لیکن علی الاطلاق شیعوں کی عدم تکفیر سے روافض کی عدم تکفیر پر استدلال کرنا یہ استدلال کی کون سی قسم ہے فتویٰ نویس صاحب ہی بتائیں گے، چونکہ دعویٰ غلط کیا گیا تھا اس لئے دلیل بھی غلط ہی لائی گئی۔

واقعہ یہ ہے کہ روافض (جملہ اثنا عشری جس کی وکالت میں یہ مضمون لکھا گیا ہے) کی تکفیر ہر دور کے محدثین و فقہاء کرتے چلے آئے ہیں کیونکہ یہ فرقہ صحابہ کرام بالخصوص حضرات شیخین کو نہ صرف سب وشتم کرتا ہے بلکہ انھیں کافر و منافق بھی کہتا ہے۔ چنانچہ رافضیوں کی مشہور کتاب ذوالفقار میں ہے کہ مسلک امامیہ دریں باب ایں است، اصحاب ثلثہ (ابوبکرؓ عمرؓ عثمانؓ) از اول امر از ایمان بہرہ نداشتند، اس باب میں امامیہ کا مسلک یہ ہے کہ ابوبکرؓ عمرؓ عثمانؓ یہ تینوں ساتھی ابتدا ہی سے ایمان سے خالی تھے۔

رافضیوں کی اصح الکتاب الکافی کے حصہ فروع الکافی میں ہے کان الناس اھل ردۃ بعد النبی صلی اللہ علیہ وسلم الا ثلثۃ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد تین کے علاوہ تمام صحابہ مرتد ہوگئے تھے۔ رافضیوں کے خاتم المحدثین باقر مجلسی کی تصانیف حق الیقین، حیات القلوب، زاد المعاد، بحار الانوار وغیرہ خلفائے ثلثہ اور دیگر صحابہ کی تفسیق و تکفیر کی روایتوں سے بھری ہیں، اسی لئے ہر دور کے محدثین و فقہاء ان دشمنان صحابہ کی تکفیر کرتے چلے آئے ہیں، الا یہ کہ کسی کو ان کے مسلک کا علم نہ ہو تو وہ معذور ہے، اور اس کے قول کا اعتبار نہیں ہوگا، ذیل میں رافضیوں کے متعلق فقہاء کے چند حوالے پیش کئے جارہے ہیں اسی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

(۱) سب الشیخین ولعنھما کفر (واقعات المفتین۔ ص ۱۲) شیخین کو برا

[1] منہاج السنہ ج ۲ ص ۱۰۵۔

بھلا کہنا اور لعنت بھیجنا کفر ہے۔ کبیری ص ۴۷۹ و ۴۸۰ میں اسباب تکفیر کا ذکر کرتے ہوئے درج ہے(۲) او ینکر صحبۃ الصدیق او خلافتہ او یسب الشیخین، صدیق اکبر کی صحابیت اور انکی خلافت کا منکر اور شیخین کو برا بھلا کہنے والا کافر ہے (۳) واما سب الشیخین فانہ کسب النبی صلی اللہ علیہ وسلم وقال الصدر الشہید من سب الشیخین او لعنھما یکفر۔ (عقود الدریہ ص ۱۰۲) شیخین کو برا بھلا کہنا نبی علیہ السلام کو برا بھلا کہنے کے حکم میں ہے اور صدر الشہید نے فرمایا جو شیخین کو برا بھلا کہے یا ان دونوں حضرات پر لعنت بھیجے اس کی تکفیر کی جائے گی۔

فقہاء کی انھیں تصریحات کے پیش نظر مولانا قطب الدین برکوئی لکھتے ہیں اکثر فقہاء و متکلمین مطلق رافضیوں کو کافر لکھتے ہیں، مولانا قطب الدین کی یہ عبارت "فیصلہ شرعی" ص ۶ پر دیکھی جاسکتی ہے۔ "فیصلہ شرعی" کو مطبع قاسمی سے حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب اور ان کے چھوٹے بھائی مولانا محمد طاہر قاسمی نے ۱۳۴۶ھ میں شائع کیا تھا، اب بھی دستیاب ہے۔

ج :۔ فقہاء نے تصریح کی ہے کہ جو ضروریات دین کا منکر ہو اس کی تکفیر کی جائیگی اسی ضابطہ کے تحت فقہاء کرام رافضیوں کی تکفیر کرتے ہیں اور مفتیان دارالعلوم نے بھی اسی اصول کی پیروی کی ہے، کیونکہ روافض ایک نہیں بلکہ متعدد ضروریات دین کے منکر ہیں مثلاً تحریف قرآن، قذف عائشہ، رجعت، تکفیر صحابہ، بداء، یہ وہ عقائد ہیں جن سے ضروریات دین کی نفی ہوتی ہے، اور تمام روافض ان عقائد کے پابند ہیں۔ لہٰذا فتویٰ نویس صاحب کی یہ دلیل بھی ان کے لئے کارآمد نہیں۔

(د) شرعی ضابطہ ہے کہ اگر کسی کے کلام میں ننانوے احتمال کفر کے ہوں اور ایک احتمال اس کی نفی کا تو کفر کا فتویٰ نہیں لگایا جائے گا۔ یہ ضابطہ بھی صحیح ہے لیکن اگر اس کے کلام سے قطعی اور یقینی طور پر کفر کا ثبوت ہو رہا ہو تو اسکے بارے میں فتویٰ نویس صاحب کا کیا ارشاد ہے۔ حضرت تھانوی اس ضابطہ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں اس مسئلہ کے معنی ہیں کہ اگر کوئی امر قولی یا فعلی ایسا ہو کہ محتمل

کفر اور عدم کفر دونوں کا ہو گو احتمال کفر غالب اور اکثر ہو تب بھی تکفیر نہ کریں گے نہ یہ کہ تکفیر قطعی پھر بھی تکفیر نہ کریں گے کیونکہ کفر کے یہ معنی نہیں کہ اس میں تمام وجوہ کفر جمع ہوں ورنہ جن کا کفر منصوص ہے وہ بھی کافر نہ ہوں گے (امداد الفتاوی جدید مبوب ج ۵ ص ۳۸۶) اس دلیل سے بھی انھیں کچھ فائدہ نہیں پہنچ سکتا کیونکہ روافض میں قطعی طور پر وجہ کفر پائی جاتی ہے۔

(۵) حدیث کی کتابیں جو صحاح ستہ کے نام سے موسوم ہیں الخ یہ استدلال بھی مغالطہ پر مبنی ہے، بخاری میں حسب تصریح حافظ ابن حجر تقریباً ۱۸ ریا ۱۹ رراوی ایسے ہیں جن پر تشیع کا الزام ہے، رافضی کوئی نہیں ہے، اس لئے بخاری وغیرہ میں اگر شیعہ کی روایت موجود ہے تو اس سے روافض کی پاکدامنی کیسے ثابت ہو سکتی ہے۔

صفحات کی عدم گنجائش کی بنا پر نہایت اختصار سے کام لیا گیا ہے تفصیل کے طالب حضرات ہماری کتاب "اثناعشری مسلمان کیوں نہیں؟" کا مطالعہ کریں۔

قسط ۳

مولانا حبیب الرحمن قاسمی

نکاح کے اسلامی قوانین

صحیح فاسد اور باطل نکاح

نکاح صحیح

۱۵ ــــــــ وہ نکاح جو شرع کے بالکل مطابق ہو اور جملہ ارکان و شرائط کی پابندی کے ساتھ بلا کسی شرعی مانع کے منعقد ہوا ہو نکاح صحیح کہلاتا ہے۔

نکاح صحیح کے اثرات

۱۶ ــــــــ نکاح صحیح سے زوجین کو حسب ذیل حقوق حاصل ہوں گے۔

(۱) دائمی رشتۂ زوجیت و حقوق حبس زوجہ (بیوی کو پابند بنانے کا حق) (الّا یہ کہ طلاق واقع ہو جائے یا کسی امر شرعی کی بنا پر تفریق واقع ہو یا کوئی فریق مر جائے)

(۲) حق مقاربت جنسی

(۳) حرمت مصاہرت

(۴) تولید نسل و ثبوت نسب اولاد

(۵) حق مہر زوجہ

(۶) حق نفقہ زوجہ، راحت و آسائش بقدر استطاعت۔

(۷) حق وراثت اولاد مابین زوجین،

(۸) دیگر استمتاع جس کی شرع نے اجازت دی ہو۔ (حاشیہ اگلے صفحہ پر)

تشریح:۔ زوجین کے حقوق وفرائض کے سلسلے میں خداوند تعالیٰ اور حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو واضح اصول اور ہدایات دی ہیں چنانچہ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے

ولہن مثل الذی علیہن بالمعروف (سورۂ نساء) یعنی مردوں پر عورتوں کا بھی ایسا ہی حق ہے جیسا کہ ان پر مردوں کا حق ہے موافق دستور کے۔

بالمعروف کی قید نے حقوق میں بڑی گنجائش اور وسعت پیدا کر دی ہے، نیز "الرجال قوامون علی النساء" کے ذریعہ عورتوں پر مرد کی برتری کے اصول کو بیان کر کے زوجہ پر شوہر کی فرماں برداری (بجز چند استثنائی صورتوں کے) واجب قرار دی گئی ہے جس کی تفصیل قرآن وحدیث اور کتب فقہ میں موجود ہے۔

نکاح فاسد ۱۷ —— نکاح فاسد وہ نکاح ہے جس میں نکاح صحیح کی کوئی شرط نہ ہو۔

نکاح فاسد کے اثرات ۱۸ —— (الف) اگر دخول نہ ہوا ہو تو نکاح فاسد نکاح باطل کے حکم میں ہوگا اور اس نکاح سے طرفین کو ایک دوسرے پر کوئی حق حاصل نہ ہوگا

(ب) دخول کی صورت میں نکاح فاسد کے حسب ذیل اثرات مرتب ہوں گے۔

(۱) مہر مسمّٰی یا مہر مثل دونوں میں سے جو کم ہو

(حاشیہ صفحہ گزشتہ) فحل استمتاع کل منہما بالآخر علی الوجہ الماذون فیہ شرعاً کذا فی فتح القدیر وملک الحبس وھو صیرورتہا ممنوعۃ عن الخروج والبروز ووجوب المہر والنفقۃ والکسوۃ علیہ وحرمۃ المصاہرۃ والارث من الجانبین ووجوب العدل بین النساء وحقوقہن ووجوب اطاعتہ علیہا اذا دعا الی الفراش، وولایۃ تادیبہا اذا لم تطعہ بان نشزت واستحباب معاشرتہا بالمعروف ھکذا فی البحر الرائق،
فتاویٰ عالمگیریہ ج ۱، ص ۲۰۰۔

(۲) اثبات نسب اولاد

(۳) حرمت مصاہرت

(۴) نفقہ اولاد[1]

(۵) وراثت اولاد

(۶) عدت بصورت تفریق یا وفات شوہر

(۷) عدم توارث بین الزوجین

ج ۳: نکاح فاسد کی صورت میں فساد ظاہر ہوجانے پر تفریق واجب ہوگی، اگر زوجین خود تفریق نہ کریں تو حاکم عدالت یا جماعت مسلمین پر واجب ہوگا کہ مجلس شرعی کے ذریعہ ان میں تفریق کرادے۔

مہر:-

تشریح نکاح فاسد میں اگر دخول سے پہلے تفریق ہوجائے تو مرد پر عورت کا مہر واجب نہ ہوگا اور نہ ہی عورت پر عدت واجب ہوگی، لیکن اگر دخول ہوگیا ہو تو عورت کو مہر مسمّیٰ یا مہر مثل میں سے جو کم ہوگا ملیگا بشرطیکہ اس نکاح میں مہر طے ہوا ہو اور اگر مہر طے نہ ہو تو عورت کو مہر مثل دیا جائیگا۔

نسب اولاد:-

اولاد کا نسب اپنی ماں سے بہرصورت خواہ وطی جائز ہو یا ناجائز ثابت ہوتا ہے لیکن باپ سے صرف چار صورتوں میں ثابت ہوتا ہے۔

---

[1] اذا وقع النکاح الفاسد افرق القاضی بین الزوج والمرأۃ فان لم یکن دخل بہا فلا مہر لہا ولا عدۃ وان کان قد دخل بہا فلہا الاقل مما سمی لہا ومن مہر مثلہا ان کان ثمۃ مسمی۔۔۔۔ ویثبت نسب الولد المولود فی النکاح الفاسد وتعتبر مدۃ النسب من وقت الدخول عند محمد وعلیہ الفتویٰ قالہ ابو اللیث کذا فی التبیین: فتاوی عالمگیری ج۱ ص ۳۳۰ وفی فتح القدیر ولا بام امرأتہ دخل بہا او لم یدخل اذا کان نکاح البنت صحیحاً اما بالفاسد فلا تحرم الام الا اذا وطی بنتہا ج ۳ ص ۱۱۸

(۱) نکاح صحیح کی صورت میں

(۲) نکاح فاسد کی صورت میں

(۳) وطی بالشبہ کی صورت میں

(۴) اقرار بالنسب کی صورت میں

حرمت مصاہرت:-

نکاح فاسد میں اگر دخول ہوگیا ہو تو حرمت مصاہرت قائم ہوجائے گی خواہ وہ دخول حرام ہی کیوں نہ ہو، اس کی بنیاد آیت کریمہ وربائبکم اللاتی فی حجورکم من نسائکم اللاتی دخلتم بھن فان لم تکونوا دخلتم بھن فلا جناح علیکم ہے اسی آیت پاک سے مستفاد یہ مشہور فقہی قاعدہ ہے۔ العقد علی البنات یحرم الامہات والدخول بالامہات یحرم البنات

نفقہ:-

نکاح صحیح ہو یا فاسد باپ پر اولاد کا نفقہ واجب ہوجاتا ہے، البتہ نکاح فاسد میں شوہر کے ذمہ بیوی کا نفقہ ہے کیونکہ فساد ظاہر ہوجانے پر جب مرد و عورت کے درمیان تفریق کرانے اور استمتاع کے حرام ہوجانے کا حکم ہے تو نفقہ کا سوال کیونکر پیدا ہوسکتا ہے[1]

وراثت اولاد:-

چونکہ نکاح میں شبہ کی بنیاد پر حد زنا ساقط ہوجاتی ہے اور اولاد ثابت النسب قرار پاتی ہے اس لئے وہ اپنے والدین کی جائز وارث ہوگی، اور شرع کے مطابق ترکہ میں حصہ دار ہوگی

عدت:- نکاح فاسد میں چونکہ صورتاً نکاح پایا جاتا ہے اسلئے

---

[1] النکاح الفاسد لا یوجب النفقۃ لا قبل الفرقۃ ولا بعدھا فی العدۃ فتاویٰ قاضی خان علی ھامش فتاوی عالمگیری ج ۱ ص ۴۲۷ —

عورت پر بصورت تفریق یا وفات شوہر عدت واجب ہوگی بشرطیکہ دخول ہوا ہو، تفریق کی صورت میں عدت وقت تفریق سے شمار ہوگی [1]

توارث بین الزوجین:

تمام ائمہ کے نزدیک یہ مسئلہ متفقہ ہے کہ نکاح فاسد کی صورت میں زوجین ایکدوسرے کے وارث نہیں ہوں گے۔

نکاح باطل

۱۹ ——— نکاح باطل وہ ہے جو فی نفسہ کالعدم ہو۔

نکاح باطل کے اثرات

۲۰ ——— نکاح باطل باعتبار نتیجہ بالکل بے اثر ہوتا ہے اس سے ابین فریقین کوئی ازدواجی وجوب پیدا نہیں ہوگا۔

تشریح:۔ نکاح باطل یا حرام ہونے کے اسباب یہ ہیں

(۱) قرابت

(۲) رضاعت

(۳) مصاہرت

(۴) اجتماع دو محرمات کا

(۵) ملک، دو کنیزوں کی جو آپس میں بہنیں ہوں ان سے جماع

(۶) شرک، مثلاً مشرکہ یا مشرک سے نکاح۔

(۷) تین طلاق، اپنی زوجہ کو

(۸) حق الغیر مثلاً منکوحہ غیر سے نکاح۔

---

[1] ولو کان النکاح فاسداً وفرق القاضی بینھما ان کانت الفرقة قبل الدخول لا تجب للعدة وکذا لو فرق بعد الخلوة وان فرق بعد الدخول کان علیھا الاعتداد من وقت الفرقة لا من وقت الوداع وکذا لو کانت الفرقة بغیر قضاء۔ فتاوی قاضی خان علی فتاوی عالمگیری ج ۱ ص ۵۴۹۔

ماؤں، بیٹیوں، بہنوں پھوپھیوں، خالاؤں بھتیجیوں اور بھانجیوں سے نکاح

۲۱ ــــــــ ماؤں، بیٹیوں، بہنوں، پھوپھیوں خالاؤں، بھتیجیوں اور بھانجیوں سے نکاح، خواہ وہ کتنے ہی پشت پہلے یا بعد کی ہوں، حرام و باطل ہے۔

تشریح:- ایام جاہلیت میں عام دستور تھا کہ باپ کی وفات کے بعد اس کی بیویاں بھی متروکہ شمار ہوتی تھیں اور متوفی کے بیٹے ان عورتوں سے زوجیت کے تعلقات قائم کر لیتے تھے اسلام نے اس قبیح رسم کا سختی سے قلع قمع کیا ہے چنانچہ آیت قرآنی "ولا تنکحوا ما نکح اٰباءکم من النساء الا ما قد سلف" کے ذریعہ ان تمام عورتوں سے جو آبار واجداد کے نکاح میں رہ چکی ہیں نکاح حرام قرار دیدیا۔

اسی طرح "حرمت علیکم امھٰتکم وبنٰتکم واخواتکم وعمّٰتکم وخالاتکم وبنات الاخ وبنات الاخت" فرما کر اللہ تعالیٰ نے بربنائے نسب (ماؤں بیٹیوں، بہنوں پھوپھیوں، خالاؤں، بھتیجیوں، بھانجیوں) آبار اجداد اور اولاد اور دوسرے سلسلہ کے حقیقی رشتہ داروں مثلاً بھائی بہن اور ان کی اولاد سے نیز چچا، ماموں، پھوپھی اور خالہ سے خواہ کسی بالائی یا زیریں درجہ کی ہوں نکاح مطلقاً حرام قرار دیدیا ہے۔

رضاعی ماؤں بہنوں سے نکاح

۲۲ ــــــــ رضاعی ماؤں اور بہنوں سے نکاح حرام ہے۔

تشریح:- اسلام میں قرابت کے ساتھ قرابت رضاعی کی بنا پر بھی نکاح حرام ہے چنانچہ آیت قرآنی حرمت علیکم .... امھاتکم اللتی ارضعنکم و اخواتکم من الرضاعۃ کے تحت رضاعی ماؤں اور بہنوں سے نکاح قطعی طور پر حرام کر دیا گیا ہے۔ عام اصول یہ ہے کہ جو عورتیں بربنائے قرابت نسب حرام ہوتی ہیں رضاعت سے بھی حرام ہو جاتی ہیں، لیکن رضاعت کے سبب حسب ذیل عورتوں سے

نکاح حرام نہیں ہے

(۱) حقیقی بہن کی رضاعی ماں سے

(۲) رضاعی بہن کی حقیقی ماں سے

اس ماں کی تین صورتیں ہیں

الف :- لڑکے کی حقیقی بہن کی رضاعی ماں جس کا دودھ لڑکے نے نہ پیا ہو

ب :- لڑکے کی رضاعی بہن کی نسبی ماں جس نے لڑکے کو دودھ نہ پلایا ہو

ج :- لڑکے کی رضاعی بہن کی دوسری رضاعی ماں۔

(۳) رضاعی بھائی کی حقیقی بہن سے

(۴) رضاعی بیٹے کی حقیقی بہن سے

شرائط رضاعت:

احناف کے نزدیک ایک دفعہ دودھ پینا رضاعت کے رشتہ کو قائم کردیتا ہے اور اپنے اثر کے لحاظ سے مانع نکاح ہے، البتہ شوافع کے نزدیک کم ازکم پانچ مرتبہ دودھ پینا شرط ہے[۱]

رضاعت کی حرمت ثابت ہونے کے لئے ضروری ہے کہ دودھ پینے کے وقت بچہ یا بچی کی عمر صاحبین کے نزدیک ۲ سال اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک ڈھائی سال تک ہو (مفتی بہ قول صاحبین کا ہے اسی پر عمل کیا جانا چاہیے) اگر اس سے زائد عمر کے بچے کو دودھ پلایا گیا تو حرمت قائم نہ ہوگی۔

ثبوت حرمت رضاعت کی دوسری شرط یہ ہے کہ دودھ پلانے والی کی عمر نو سال یا اس سے زائد ہو چنانچہ اگر کسی لڑکی کی عمر ۹ سال سے کم ہو اور اسے دودھ اتر آیا تو اس کے

---

[۱] قلیل الرضاع وکثیرہ سواء اذا حصل فی مدۃ الرضاع یتعلق بہ التحریم وقال الشافعیؒ لایثبت التحریم الا بخمس رضعات ا ھ ہدایہ ج ۲ ص ۳۳۰ -

پلانے سے حرمت رضاعت ثابت نہ ہوگی۔[1]

اگر عورت کا دودھ گائے، بھینس یا بکری کے دودھ میں ملا دیا، اگر عورت کے دودھ کا حصہ غالب ہے تو رضاعت ثابت ہوگی ورنہ نہیں۔[2]

لیکن اگر عورت کے دودھ کو کسی چیز میں ملا کر پکایا اور اسے بچے نے کھایا تو اس سے حرمت رضاعت ثابت نہ ہوگی کیونکہ وہ رضاعت (دودھ پلائی) نہیں ہے۔[3]

رضاعت کا اثر :-

اگر بلا علم ایسے مرد و عورت باہم نکاح کرلیں جن کا نکاح بسبب رضاعت حرام ہو تو جب اس کا علم ہوجائے ان پر تفریق واجب ہوگی اگر وہ بذات خود تفریق اختیار نہ کریں تو قاضی (یا اسکے قائم مقام) پر واجب ہے کہ ان میں تفریق کرائے۔

اگر یہ تفریق قبل دخول ہوتی ہے تو زوجہ کو کچھ نہ ملے گا لیکن اگر دخول کے بعد تفریق ہو تو زوجہ کو مہر مثل ملے گا اگر کوئی مہر مقرر نہ ہوا ہو، اور اگر مہر مقرر ہوا ہے تو مقررہ اور مہر مثل میں سے جو کم ہو وہ ملے گا، چونکہ نکاح فاسد تھا اس لئے مرد پر ایام عدت کا نفقہ واجب نہ ہوگا۔

ساس سے نکاح

۲۳ ——— کسی مرد کا اپنی ساس سے نکاح کرنا حرام ہے۔

---

[1] ولو ان صبیۃ لم تبلغ تسع سنین نزل لها اللبن فارضعت صبیا لم یتعلق به تحریم وانما یتعلق التحریم به اذا حصل من بنت تسع سنین فصاعدًا. کذا فی الجوهرة النیرة فتاوی عالمگیریہ ج ۱ ص ۳۴۴ -

[2] ولو خلط لبن الآدمی بلبن الشاة ولبن الآدمی غالب ثبت الحرمة - فتاوی قاضیخاں علی فتاوی عالمگیریہ ج ۱ ص ۴۱۸ -

[3] واذا جعل لبن المرأة فی طعام فاطعم صبیین ان طبخ الطعام بان طبخ لبنها ان لا تثبت الحرمة بینهما فی قولهم جمیعًا، فتاوی قاضی خاں ص ۴۱۸ -

تشریح:- مسئلہ کی بنیاد یہ ہے کہ بیوی یا شوہر کے اصول سے بوجہ ازدواج نکاح حرام ہوجاتا ہے، چنانچہ بیوی کی ماں، نانی، دادی خواہ سگی ہوں یا سوتیلی اور کتنے ہی اونچے درجے کی ہوں اس مرد پر حرام ہیں، اسی طرح بیوی کیلئے شوہر کے آباؤ اجداد سے نکاح حرام ہے، یہ حرمت مصاہرت نفس نکاح سے ثابت ہوجاتی ہے خواہ بیوی سے صحبت کی ہو یا نہ کی ہو[1]

سوتیلی بیٹیوں سے نکاح ۲۴ ——— کسی مرد کا اپنی سوتیلی بیٹی سے جو کہ اس کی بیوی کے بطن سے ہو نکاح حرام ہے۔

تشریح:- آیت قرآنی حرمت علیکم .... وربائبکم التی فی حجورکم من النساء التی دخلتم بھن الخ کے تحت ان سوتیلی بیٹیوں سے نکاح حرام ہے جو مدخولہ بیویوں کے بطن سے ہوں، چنانچہ اگر زوجہ سے صحبت نہ ہوئی ہو اور صحبت سے پہلے ہی طلاق ہوجائے تو اس کی بیٹی سے نکاح ممنوع نہ ہوگا، اس مسئلہ میں محض خلوت صحیحہ دخول کے مترادف نہیں ہوگا[2]

دراصل اصول یہ ہے کہ بیوی یا شوہر کے فروع سے نکاح حرام ہوجاتا ہے، چنانچہ بیوی کی بیٹی یا بیوی کے بیٹے کی بیٹی خواہ کتنے ہی نیچے درجے کی ہو یا بیوی کے نواسے یا پوتے کی بیٹی سے نکاح حرام ہوجاتا ہے اسی طرح شوہر کی اولاد سے خواہ وہ سگی ہو یا سوتیلی اور کتنے ہی نیچے درجہ کی ہو نکاح حرام ہوجاتا ہے بشرطیکہ عورت سے صحبت ہوچکی ہو اگر صحبت نہ ہوئی ہو تو حرمت مصاہرت قائم نہ ہوگی[3]

(باقی آئندہ)

---

[1] ولا (ای لا یحل للرجل ان یتزوج) بام امرأته التی دخل بابنتها اولم یدخل لقوله تعالیٰ وامھات نسائکم من غیر قید الدخول۔ الھدایۃ ج ۲ ص ۲۸۷۔

[2] بنات الزوجۃ وبنات اولادھا وان سفلن بشرط الدخول بالام کذا فی الحاوی القدسی سواء کانت الابنۃ فی حجرہ او لم تکن کذا فی شرح الجامع الصغیر لقاضی خان واصحابنا ما اقاموا الخلوۃ مقام الوطء فی حرمۃ البنات ھکذا فی الذخیرۃ فی نوع ما یستحق به جمیع المھر (فتاوی عالمگیریہ ج ۲ ص ۲۷۴۔

[3] فبنت الزوجۃ وبنات بناتھا وبنات بنیھا وان سفلن اما بنت الزوجۃ فتحرم علیه بنص الکتاب العزیز اذا کان دخل بزوجته فان لم یکن دخل بھا فلا تحرم لقوله وربائبکم اللاتی فی حجورکم من نسائکم اللاتی دخلتم بھن الاسواء کانت بنت زوجته فی حجرہ اولا عند عامۃ العلماء البدائع الصنائع ج ۲ ص ۲۵۹۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں کی اہمیت و افادیت

مولانا ذوالفقار احمد قاسمی دارالعلوم فلاح دارین ترکیسر

دعا کرنا انسان کا ایک فطری داعیہ ہے۔ انسان جس ذات کو تمام قوتوں اور قدرتوں کا سرچشمہ سمجھتا ہے اسی کے حضور اپنی بے بسی اور عاجزی اور کمزوریوں کا اظہار کرکے اپنے لئے خیر و بھلائی کا طالب ہوتا ہے اسی لئے دنیا کی کوئی مذہب پرست قوم ایسی نہیں ہے جس میں دعا کا تصور نہ رہا ہو ہر قوم نے جس کو بھی اپنا معبود گردانا اس کو اپنی دعاؤں اور آرزوؤں کا مرجع سمجھا ہے چنانچہ کوئی دیوی دیوتاؤں کے سامنے دست بدعا ہے تو کوئی آگ کے سامنے اپنا مدعا عرض کرتا ہے تو کوئی دریاؤں یا درختوں سے امداد کا طالب ہے، غرض ہر قوم اپنے اپنے عقیدہ کے مطابق دعا میں مصروف ہے مگر اسلام نے چونکہ اپنے پیغام میں توحید کو بنیادی درجہ دیا ہے اور معبود صرف ایک ہی ذات کو گردانا ہے لہذا انسان کی پیشانی کو نباتات، جمادات، حیوانات انسان، جنات تمام سے ہٹا کر ایک ہی خدا کے آگے جھکا دیا ہے، اس لئے ضروری تھا کہ دعا مانگنے کے اس فطری داعیہ کو وہ اسی ذات وحدہ لاشریک لہ کی طرف موڑ دے تاکہ اس بات کا مکمل ظہور ہو جائے کہ بندہ صرف خدا ہی کو اپنا کارساز حقیقی سمجھتا اور حاجت روا مانتا ہے اور اپنی تمام ضرورتوں میں اس کے ہاتھ اللہ کے سوا کسی کے سامنے نہیں اٹھتے، اگر توحید کے عقیدے کے ساتھ دعا کا حکم نہ دیا جاتا تو توحید کے قائل ہونے کا اظہار نہ ہوتا اسی لئے توحید کے بغیر دعا بھٹکتی پھرتی اس کو ایک جگہ قرار نہ ہوتا، اور دعا کے بغیر توحید کے عقیدہ کا

حتمی ثبوت نہ مل پاتا۔ چنانچہ قرآن مجید نے توحید کے عقیدے کے ساتھ دعا کرنے کے اقرار کو بھی ملا کر ذکر کیا ہے۔ مثلاً سورہ فاتحہ کے یہ الفاظ اس دعوے کے بیّن ثبوت ہیں اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ " کہ میں اے خدا سب کو چھوڑ کر صرف تیری ہی عبادت کرتا ہوں، اور اس کا ثبوت میری طرف سے یہ ہے کہ میں اپنی حاجتوں کو تیرے دروازے کے علاوہ کہیں نہیں لے جاتا بلکہ تجھی سے مدد کی دعا کر کے اپنی توحید پرستی کا ثبوت دیتا ہوں ـــ اس لئے کہ انسان کسی کو معبود ماننے کا ثبوت دو ہی طریقہ سے دیتا ہے اس کی عبادت کر کے دوسرے اس کے حضور اپنی حاجتیں لے جا کر۔ اسی لئے ان دونوں کا عہد بندہ سے اس دعا میں کرایا گیا ہے جو سورۂ فاتحہ کی شکل میں بندہ کو سکھلائی گئی ہے لہٰذا جو شخص اس اقرار کے بعد جتنا بھی ان دونوں باتوں میں اللہ کے علاوہ دوسرے کے لئے گنجائش نکالے گا اتنا ہی وہ اسلام کے اس بنیادی عقیدے یعنی توحید سے دور ہوتا چلا جائیگا۔ لہٰذا توحید اور دعا کے اس لزوم سے دعا کی اہمیت کا اندازہ بخوبی ہوجاتا ہے کہ دعا ہی ایک ایسا ذریعہ ہے جسکی وجہ سے مسلمان اپنی توحید پرستی کو محفوظ رکھ سکتا ہے۔ اس لئے کہ سراپا محتاج انسان اپنی ضروریات میں ضرور کسی نہ کسی سے مدد چاہے گا بس اگر وہ اپنی ان ضروریات کو خدا کے حضور پیش کرتا ہے تو موحد ہے اور اگر کسی دوسرے کو حاجت روا سمجھتا ہے تو مشرک ہے۔ معلوم ہوا کہ دعا ہی کے کلمات کسی شخص کے عقیدے کی صحت کو ناپنے کا وہ آلہ ہیں جن کے ذریعہ موحد اور مشرک کی زندگی کو پہچانا جاسکتا ہے اور دعا ہی مشرکانہ ذہنیت اور موحدانہ ذہنیت کے درمیان وہ خط امتیاز ہے جس سے دونوں کی زندگی کو علیحدہ کیا جاسکتا ہے مگر کیا دعا میں بھی کسی رہبری کی ضرورت تھی؟ سچ پوچھو تو انسان دعا کرنا بھی نہیں جانتا تھا، اس کو اپنی تمام ضرورتوں کا بھی پتہ نہیں تھا کہ کون کونسے فتنے اور خطرات اس کی زندگی میں پیش آنے والے ہیں اور آسکتے ہیں۔ اس کو علم نہ تھا کہ کن کن کلمات میں شرک چھپا ہوا ہے نیز وہ نہیں جانتا تھا کہ خدا کے حضور

کس وقت اور کس انداز میں اور کن کلمات کے ساتھ دعا کی جانی چاہیئے۔ اس لئے کہ وہ اس ذات
کی ان تمام شانوں سے ناواقف تھا جن کے مناسب اس کو دعا کرنی تھی۔ اور ظاہر ہے کہ کامل اور
اور برمحل دعائیہ کلمات وہی ہوسکتے تھے جو صفاتِ خداوندی سے واقف کار کی زبان سے نکلیں اور
صفات سے واقف وہی ذات ہوسکتی تھی جس کو حق تعالیٰ سے بے پناہ قرب حاصل ہو۔ اور ظاہر
ہے کہ مخلوقات میں حق تعالیٰ سے جتنا قرب نبیؐ کو حاصل ہے کسی اور کو حاصل نہیں۔ چنانچہ خود
ارشاد فرماتے ہیں لی مع اللہ وقت لایسعہ ملک مقرب ولا نبی مرسل" مجھے حق تعالیٰ
کے ساتھ قرب کے وہ درجات حاصل ہیں جن تک مقرب فرشتے کی رسائی ہوئی ہے اور نہ کسی نبی مرسل
کی۔ اور یہ بھی بدیہی بات ہے کہ جس کا قرب جتنا بڑھا ہوا ہوگا وہ شئون باری سے اتنا ہی واقف ہوگا
اور وہ ہی ان دعائیہ کلمات اور صیغوں کو زیادہ بتلا سکتا ہے جو اس ذاتِ اقدس کے مناسب شان ہوں
لہٰذا ہمیں اس سلسلہ میں آپؐ ہی کی طرف رجوع کرنا پڑیگا، تو آپ کی دربارِ خداوندی میں قرب کی مثال
ایسی سمجھو کہ ایک زبردست بادشاہ کا دربار ہو، جس میں وزراء اور امراء قرینے سے بیٹھے ہوں، لیکن
وزیر اعظم سب سے زیادہ قریب بالکل تخت شاہی کے پاس بیٹھا ہو اور بادشاہ کی تمام ادائیں بچشم خود
بہت قریب سے دیکھ رہا ہو۔ حتیٰ کہ چشم و ابرو پر مختلف احوال سے جو شکن پڑتی ہیں جن سے گویا بادشاہ
سب کچھ کہدیتا ہے وہ بھی وزیر اعظم دیکھ رہا ہو یعنی اور لوگ تو اپنی اپنی نشستوں سے جو تخت
شاہی سے مختلف فاصلوں پر ہیں صرف ذات شاہانہ کو دیکھ رہے ہیں مگر یہ مقرب بادشاہ
بادشاہ کی ذات کے ساتھ اس کی تمام اداؤں کو بھی دیکھ رہا ہے کہ یہ رنگ خوشی کا ہے اور
یہ غصہ کا، اور یہ جمال کا ہے اور یہ جلال کا، یہ ادا مہر کی ہے اور یہ قہر کی، اور یہ عطا کی ہے
اور یہ سلب کی، اور یہ مانگنے کا وقت ہے اور یہ دم بخود ہو جانیکا۔ پس وزیر اعظم انہیں
اداؤں کے مناسب بمقتضائے اوقات معاملات کرتا ہے۔ اگر بادشاہ مسکرا دیتا ہے تو وہ
فرطِ انبساط سے کھڑے ہوکر درخواست گذار دیتا ہے، اور جہاں یہ جبیں دیکھا تو ہاتھ جوڑ کر پناہ مانگنی شروع
کردیتا ہے۔ اگر پیشانی پر بل دیکھے تو سکوت و عجز اختیار کرلیا اور اگر شگفتگی کے آثار دیکھے تو
بڑھ کر حاجتیں پیش کرنی شروع کردیں۔ غرض بادشاہی احکام تو بجائے خود ہیں، یہ وزیر

شئون واشارات اور خاموش اداؤں کو دیکھ کر بھی سیکڑوں ہدایات حاصل کرلیتا ہے جو نطق وکلام سے بھی بلیغ انداز میں آتی ہیں اور انہیں کے تقاضوں کے مطابق وہ اپنی ادائیں بھی متوالیتا ہے۔ پس اور لوگ تو بادشاہ کے احکام شناس ہیں اور یہ مزاج شناس۔ بلا تشبیہ اسی طرح سمجھو کر دربار الٰہی کے تمام مقربان ملائکہ اور رسل اپنے اپنے مقام پر صف بستہ کھڑے ہیں مگر حضورؐ کی ذات اقدس بمنزلہ وزیر اعظم کے ہے جو ہر وقت عرش کا پایہ تھامے ہوئے ہے اور رب العرش کی ہر شان آپؐ کی نگاہ کے سامنے ہے ذاتِ الٰہی کو تو سب دیکھ رہے ہیں مگر جہاں سے آپؐ دیکھ رہے ہیں وہاں سے آپؐ کے سوا کوئی نہیں دیکھ رہا ہے۔ آپؐ جب شانِ جمال کو دیکھتے ہیں اور رحمت کی تجلیاں سامنے آتی ہیں تو دعا واستدعا، اور درخواستوں کی عبادت پیش کرتے ہیں۔ مثلاً اللھم اعنی علی ذکرك وشکرك وحسن عبادتك اور جب شان جلال جلوہ گر دیکھتے ہیں اور قہر وغضب کی تجلیات کا مشاہدہ ہوتا ہے تو پناہ جوئی اور تعوّذ کے کلمات ادا فرماتے ہیں۔ مثلاً اللھم انی اعوذ بك من غضبك وعقابك" شان مہر کے موقعہ پر حمد وثنا اور شان قہر کے موقعہ پر استغفار اور تقصیر کے صیغے وردِ زبان ہوتے ہیں تاکہ دریائے مغفرت امنڈ آئے مثلاً اللھم انك عفوٌّ کریمٌ تحب العفو فاعف عنا اور مثلاً لا الٰہ الا انت سبحانك انی کنت من الظالمین۔ سو کر بیدار ہوتے وقت شانِ احیاء کا ظہور ہوتا ہے تو اس انعام وبخشش پر حمد وشکر فرماتے ہیں مثلاً الحمد للہ الذی احیانا بعد ما اماتنا والیہ النشور" اور سوتے وقت شان امانت کا ظہور ہوتا ہے تو سلب حیات کی مصیبت پر صبر وتحفظ کی دعا فرماتے ہیں مثلاً باسمك ربی وضعت جنبی وبك ارفعہ ان امسکت نفسی فارحمھا وان ارسلتھا فاحفظھا بما تحفظ بہ عبادك الصالحین " اور کھانا کھاتے اور کپڑا پہنتے وقت چونکہ شانِ بسط وعطا کا ظہور ہوتا ہے تو منت وشکر کے صیغے استعمال

فرماتے ہیں مثلاً "الحمد للہ الذی اطعمنی وسقانی وجعلنی من المسلمین" اور "الحمد للہ الذی کسانی ما اواری بہ عورتی واتجمل بہ فی حیاتی" فقر وفاقہ کے وقت جبکہ قبض ومنع کا ظہور ہوتا ہے تو تسلیم ورضا اور صبر وتوکل کے صیغے استعمال فرماتے ہیں مثلاً افوض امری الی اللہ، توکلت علیہ والیہ انیب، حسبنا اللہ ونعم الوکیل۔

پھر ان احوال متواردہ اور اوقات مقررہ کے علاوہ تسبیح وتحلیل، ذکر وثنا، تنزیہ تقدس، قرأت وتلاوت سے کوئی لمحہ فارغ نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ مشاہدہ جلال وجمال سے بھی کوئی ساعت خالی نہیں پھر جیسے جمالِ حق لامحدود ہے تو آپ کے بیان حمد وثنا کے صیغے بھی بیحد حساب ہیں جو مختلف الوانِ ذوق وشوق، انس ومحبت کے جذبات سے نکلتے ہیں۔ کھانا پینا سونا، جاگنا، پہننا، اوڑھنا، چلنا پھرنا، عبادت، عادت، معاشرت ومعیشت، خلوت وجلوت انفراد واجتماع کی کوئی حالت ایسی نہیں ہے جس کے انعام ہونے پر آپ نے اسی حال کے مناسب حمد وثنا، اور دعا کے صیغے استعمال نہ فرمائے ہوں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی ہر موقعہ پر اتنی حمد کی کہ آپ کا نام ہی احمد ہوا جس کے معنیٰ بہت ہی حمد کرنے والا کے ہیں اور حمد وثنا سے آپ کو وہ نسبت حاصل ہوئی کہ قیامت میں مقام محمود بھی آپ ہی کو ملے گا۔ حتّٰی کہ جو جھنڈا آپ کو قیامت میں ملے گا اس کا نام بھی لِوا ءُ الحمد ہوگا۔ اور پھر چونکہ نبی کا اثر اس کی امت میں بھی آتا ہے لہٰذا قیامت میں آپ کی امت کا لقب حمّادون ہوگا۔ پھر اسی طرح جب صفاتِ جلال وغضب کا ظہور ہوتا ہے تو جتنی اس کی شانیں ہوتی ہیں اتنے ہی آپ کے استعاذے اور تعوذ کے پیرائے ہیں اور جبکہ وہاں جلال کی شانیں بے شمار ہیں تو آپ کے تعوّذ کے صیغے بھی بے پناہ ہیں۔ دجل وفریب کا ظہور ہوتا ہے تو آپ شیطان اور اس کے وساوس سے پناہ مانگتے ہیں۔ مثلاً "اللّٰھم انی اعوذ بک من ھمزات الشیاطین واعوذ بک رب ان یحضرون"

نفسانیت کا شیوع ہوتا ہے تو آپ نفس کے مکائد سے پناہ مانگتے ہیں۔ مثلاً

اللّٰھم اعذنا من شرور انفسنا، اللّٰھم لا تکلنا الی انفسنا طرفۃ عین۔

صفت اضلال کا ظہور ہوتا ہے تو آپ شبہات وشکوک سے پناہ مانگتے ہیں۔ کفر کا غلبہ ہوتا ہے تو کفر اور عذاب جہنم سے پناہ مانگتے ہیں۔ بہیمیت اور شہوت کا غلبہ دیکھتے ہیں تو غفلت اور قساوت سے پناہ مانگتے ہیں۔ غرض ناپاک ماحول، نافرمان اولاد، مضر علم، عذاب نار، فتنۂ قبر، فتنۂ دجال، غلبۂ دشمن، شماتت اعداء، فتنۂ محیا وممات اور جو جو آفات ظاہر و باطن میں بطور پاداش عمل یا تنبیہ واشباہ کے عالم دنیا وآخرت میں آسکتی تھیں ان سب سے پناہ مانگنے کے بلیغ سے بلیغ پیرائے اور رقت آمیز کلمات لسان نبوت سے ارشاد ہوئے جن میں جامع ترین تعوذ اور استعاذہ موجود ہے اس لئے دعا واستغفار میں بھی انسان نبیؐ کی رہبری کا سخت محتاج ہے ——— نبی سے منقول دعاؤں کو ایک عظیم خصوصیت یہ بھی حاصل ہے کہ آپؐ کے بہت سے اقوال وارشادات روایت بالمعنیٰ کے طور پر نقل کئے ہیں مگر ماثور دعاؤں کا تقریباً پورا ہی ذخیرہ روایت باللفظ نقل ہوا ہے۔ لہٰذا ہر موقعہ کیلئے وارد دعاؤں کے کلمات بعینہٖ وہ ہیں جو لسان نبوت سے ادا ہوئے ہیں اسی لئے ان کلمات کے ساتھ دعا کرنے کی جو تاثیر ہے وہ دوسرے کلمات کو کہاں نصیب ہو سکتی ہے؟ نیز غیر نبی پوری طرح یہ بھی نہیں سمجھ سکتا کہ نفس کے کس کس دھوکے اور شیطان کے کس کس فریب اور انسانی کس کس چال سے بچنے اور اس پر اللہ تعالیٰ کی پناہ لینے کی ضرورت ہے اس لئے بلاشبہ بندہ دعاؤں کے سلسلے میں بھی نبیؐ کی رہنمائی کا پوری طرح محتاج ہے اگرچہ یہ بات مسلم ہے کہ انسان اپنی مادری زبان میں جس طرح خشوع وخضوع اور الفاظ کی طرف التفات کئے بغیر اپنے دل کی بات سراپا احتیاج ہو کر اداؤں کے ساتھ ادا کر سکتا ہے وہ کسی دوسری زبان میں (جس کے الفاظ وہ رٹ کر اور تکلف کے ساتھ ادا کرتا ہے) نہیں کر سکتا۔ اسی لئے ہر زبان والے کو اپنی مادری زبان میں مولیٰ سے دعا مانگنے کی اجازت دی گئی ہے مگر اس صورت میں اس کا خطرہ بنا رہتا ہے کہ ناواقف لوگ کہیں ایسی دعائیں نہ کر بیٹھیں جو ممنوع یا پسند کیلئے نازیبا بلکہ بعض حالات میں نقصان کا باعث ہیں یا بعض کلمات خدا کے مرتبہ کے خلاف ہیں۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ دعا میں انہیں الفاظ کو استعمال کیا جائے جو آپ سے ثابت ہیں یا پھر انکے مفہوم کو اپنی مادری زبان میں ادا کیا جائے بہرحال ہماری تحریر کا حاصل یہ ہے کہ جیسے نبی کی زندگی انسان کے لئے اپنے اندر ہر موقعہ کے لئے رہنمائی کی جامع ہے وہیں آپ کی دعائیں بھی دعا کے باب میں انتہائی جامع اور قابل اتباع ہیں جن میں مقام معبود اور مقام عابد کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے

مولانا حافظ محمد اقبال صاحب مانچسٹر

چند روز پہلے برطانیہ کے چینل ۴۰ میں AFTER DARK کے نام سے ایک مذاکرہ نشر کیا گیا جس میں فلسطین، ایران، کردستان، انڈیا اور برطانیہ کے مختلف اخبارات کے ایڈیٹر اور رسائل و جرائد کے مصنفین نے حصہ لیا۔ مذاکرہ کا عنوان "کیا ایران عراق جنگ ایک مقدس جنگ ہے" تھا، اس مذاکرہ میں مختلف موضوعات زیر بحث آئے، ایران کے سیاسی حالات، بین الاقوامی تعلقات، اسرائیل کے ساتھ روابط ایران اور اسکی اسلامیت، علامہ خمینی اور شاہ ایران کا تقابل، عراق ایران جنگ، کردوں کے ساتھ تعلقات شیعہ سنی اختلافات اس پروگرام کا خاص موضوع تھا، پروگرام خاصا طویل اور دلچسپ تھا مگر افسوس کہ وقفہ وقفہ کے بعد جھڑپ کی صورت اختیار کرتا رہا۔

عراق ایران جنگ:- اس موضوع پر خاصا وقت لگا، فلسطین کے ایک رسالے کے مدیر اور دیگر حضرات نے پوری تفصیلات کے بعد اس بات پر زور دیا کہ عراق ایران جنگ اب بند ہو جانی چاہئے کیونکہ اب یہ جنگ فضول ہے اس کا فائدہ فریقین میں سے کسی کو نہیں پہنچ رہا ہے، فلسطینی نمائندہ کا کہنا تھا کہ ایران و عراق دونوں مل کر اسرائیل اور مسجد اقصیٰ کے بارے میں کوئی لائحہ عمل طے کریں

ایرانی نمائندہ مسٹر حامد ہوشانگی جو ایک رسالے کے صحافی اور اسلامک ری پبلکن نیوز ایجنسی کے سربراہ بھی تھے نے اس امر پر اصرار کیا کہ یہ جنگ چونکہ عراق نے شروع کی ہے اسلئے کبھی ختم نہیں ہوگی، اس جنگ کی وجہ سے بے شمار عورتیں بیوہ اور بچے یتیم ہو چکے ہیں!

نیز اس جنگ کا مقصد پوری دنیا میں اسلامی انقلاب اور روس و امریکہ کے چیلوں کو نیست و نابود کرنا ہے اسلئے جنگ بندی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جہاں تک عراق کے ساتھ تعلق ہے اسکے ختم ہونے کی ایک ہی صورت ہے وہ یہ کہ عراق کے صدر صدام حسین کو سخت ترین سزا (جوان کی اصطلاح میں سزائے موت ہے) دی جائے ......

قارئین کرام اس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ عراق و ایران کی یہ فضول جنگ تقریباً نویں سال کی سرحد میں قدم رکھ چکی ہے اگر آپ سے کوئی پوچھے کہ اس طویل جنگ میں ایران نے یا عراق نے کیا کھویا اور کیا پایا؟ اس کا جواب ہر شخص یہی دیگا کہ دونوں نے کھویا ہی ہی کھویا ہے پایا کچھ بھی نہیں، لاکھوں آدمی اس جنگ کی نذر ہو گئے، لاکھوں کا مالی نقصان ہوا، دونوں ملکوں میں معاشی اور اقتصادی بحران پیدا ہوا، ملکی قوت کو زبردست دھچکا لگا ہاں اگر کسی نے اس جنگ سے کچھ پایا ہے تو وہ اسلام دشمن طاقتیں ہیں انھوں نے ہی ایسے حالات پیدا کئے کہ لوگوں کی نظریں مسئلہ افغانستان، کشمیر، فلسطین اور مسجد اقصیٰ سے ہٹ جائے اور ساری قوت اسی جنگ پر صرف ہوتی رہے اس منصوبہ کو پایۂ تکمیل پہنچانے کے لئے تقریباً ہر اسلام دشمن طاقتوں نے بھرپور حصہ لیا، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج تک دونوں ایک دوسرے کا گریباں پکڑے ہوئے ہیں اور آگ و خون کی ہولی کھیل رہے ہیں

ایران و عراق جنگ پر تقریباً تمام اسلامی ممالک پریشان ہیں اور انھوں نے اپنے اپنے طریقے پر جنگ بندی کی ہر ممکن کوشش کی، پاکستان، بنگلہ دیش، سعودی عرب، اردن اور دیگر اسلامی ممالک کے سربراہوں نے جنگ بند کر دینے کی اپیلیں کیں مگر بے سود گئیں آخرکار اقوام متحدہ نے قرارداد کے ذریعہ اس جنگ کو بند کرنے کی اپیل کی، عراق کو رضامند کر لیا گیا مگر ایران کی طرف سے جنگ بندی کی تمام اپیلوں کو نہ صرف مسترد کر دیا بلکہ ان ممالک کے خلاف بھی غیظ و غضب کا اظہار کیا گیا اور انھیں بھی جنگ کی دھمکیاں دی جانے لگیں ا بھی ۲۱ مارچ کی ایک تازہ رپورٹ ملاحظہ فرمایئے ۔

ایران نے اردن کے دارالحکومت عمان میں منعقد ہونے والی اسلامی وزراء خارجہ کانفرنس
سے واک آوٹ کر دیا، ایرانی وفد نے یہ اقدام کانفرنس کی ان قراردادوں کے مسودوں
کے خلاف احتجاجاً کیا جس میں سعودی عرب اور عراق کی حمایت کی گئی ہے"

۵ قرارداد کیا تھی:

ایک قرارداد میں سعودی عرب کے ان اقدامات کی بھرپور حمایت کی گئی جو مکہ معظمہ
اور مدینہ منورہ میں عازمین حج اور مقامات مقدسہ کی حفاظت کیلئے کیے گئے،
دوسری قرارداد میں ایران پر زور دیا گیا کہ وہ عراق سے جنگ بندی کیلئے اقوام
متحدہ کی قرارداد تسلیم کرے (جنگ لندن ۲۵ر مارچ ۸۸ء)

محض اس بات پر واک آوٹ کرنا کہ سعودی عرب نے مقامات مقدسہ کے تحفظ کیلئے
اقدامات کیے! اور ایران اقوام متحدہ کی قرارداد تسلیم کر کے جنگ بند کردے" اس
بات کا اعلان کرنا ہے کہ ایران جنگ بند کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا بلکہ اس آگ بھڑکانے
اور اسے مزید وسیع کرنے کے درپے ہے

جہاں تک اس جنگ کے فضول اور بیکار ہونے کا تعلق ہے، دوسروں کے علاوہ
خود ایران کے بھرپور حامی اور گہرے دوست لیبیا کے معمر کرنل قذافی بی بی سی کو دیے گئے
ایک انٹرویو میں کہتے ہیں کہ۔

"ایران اور عراق کی جنگ فضول ہے جس سے دونوں ملکوں میں انقلاب
کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ (جنگ لندن ۳۱ر دسمبر ۸۷ء)

ایران اگر کسی کی نہیں تو کم از کم اپنے دوست ہی کی بات مان لے تاکہ آگ و خون کا یہ
خطرناک کھیل بند ہو جائے۔

جنگ بندی کی ایرانی شرائط

جنگ بندی کے سلسلے میں ایران کی یہ بنیادی شرط ہے
کہ صدر صدام حسین کو سخت ترین سزا دی جائے اس کا

(باقی ص ۴۴ پر ملاحظہ کیجئے)

قسط ۲

مولانا سعید الرحمٰن قاسمی مدیر ماہنامہ نصرۃ الاسلام کشمیر

اسلام کا نظام اخلاق

ایک اجمالی جائزہ

دور حاضر کا انتشار موجودہ پریشان حال دنیا جس طرح اخلاقی انحطاط، بے راہ روی انارکی، عریانیت، فحاشی اور تعصب و تنگ نظری کا شکار ہو کر اپنی زندگی اور مقصد حیات سے بڑی تیزی اور سرعت کے ساتھ ہٹتی جارہی ہے وہ سمجھدار لوگوں سے پوشیدہ نہیں ہے جس طرف نگاہ اٹھائی جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ اخلاقی بگاڑ اور بے راہ روی کا شکوہ ہر ایک زبان پر ہے اور اس عالمگیر انحطاط اور بگاڑ نے خاص اور دانشور طبقہ کو از حد تشویش میں مبتلا کر دیا ہے چنانچہ اس کے بھیانک نتائج میں قتل و غارتگری ظلم و سفاکی، غنڈہ گردی، دہشت پسندی، چوری ڈاکہ زنی، آبروریزی اور انسانیت شرافت اور اخلاق کی مٹی پلید کرنے کے وارادات میں تشویشناک حد تک روز بروز اضافہ ہو رہا ہے اور انسان کی زندگی اجیرن بن رہی ہے، یہ حقیقت ہے کہ موجود بگڑے ہوئے معاشرہ کی اصلاح صرف دین اسلام کے اصولوں کو اپنا کر ہی ہو سکتی ہے

موجودہ معاشرہ آج ہمارے معاشرہ میں اخلاقی زوال اور کردار کی گراوٹ کی انتہا ہو چکی ہے، ہر طرف سے مختلف قسم کی برائیوں کا ایک سیلاب اُمڈ پڑا ہے، معاشرتی اور تمدنی خرابیاں ہماری سوسائٹی اور سماج کا رستا ہوا ناسور بن چکی ہیں اور پانی سر سے اونچا ہو چکا ہے، اس وقت حال یہ ہے کہ پوری دنیا کے عقلا اور دانشور حیران

اور سرگرداں ہیں، موجودہ بگڑے ہوئے معاشرہ کی اصلاح کس طرح کی جائے؟ آیا ان خرابیوں کو دور کرنے کی کوئی سبیل ہو بھی سکتی ہے یا نہیں؟ یہ وقت کا ایک لاینحل مگر اہم ترین مسئلہ بن گیا ہے اور اس کا واحد علاج یہی نظر آتا ہے کہ اب پورے انسانی معاشرہ کو بلا تاخیر اسلامی نظام اخلاق اپنا لینا چاہئے اسی میں اس کی بہتری اور بقا ہے، اس وقت دنیا کو اسلام کے سوا کوئی بھی نظام نہیں بچا سکتا کیونکہ کسی میں اتنی صلاحیت و استعداد ہی نہیں ہے۔ اسلام انسانیت کے دکھوں کا مداوا اور اس کے دل کی دھڑکنوں کی آواز ہے (بحوالہ اسلام اور عصر حاضر ص۱۹۱)

یہاں یہ فیصلہ کن حقیقت ذہن نشین کر لینا بھی ضروری ہے کہ اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے جن خصائص اور خوبیوں کو محاسن اخلاق میں شمار کیا ہے دراصل وہی اخلاقی اصول ہیں، یہ اسلام کے نظام اخلاق کی ہمہ گیری اور جامعیت کا ہی کمال ہے کہ دور حاضر میں شاید ہی کوئی فرد یا جماعت ایسی ہو کہ جس نے شعوری یا غیر شعوری طور پر اسلام کے اخلاقی اصول میں سے کسی کو اپنایا نہ ہو۔ اسلئے کہ اسلام کے اخلاقی نظام کو اپنائے بغیر صحت مند انفرادی اور اجتماعی زندگی کا تصور ممکن نہیں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم جو رب العالمین کے آخری فرستادہ اور ہادی عالم ہیں اور جن کی ولادت اور بعثت سے کائنات انسانی میں دائمی بہار کی آمد ہوئی۔ خزاں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئی اپنی تشریف آوری اور بعثت کے مقاصد میں سے ایک اہم مقصد بلکہ بعثت کی غرض و غایت ہی بیان کرتے ہوئے ایک موقع سے ارشاد ہوا۔
"انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق ومحاسن الافعال" (ابن سعد بحوالہ سیرۃ النبی جلد ۶)
کہ میں صرف اچھے اخلاق اور بہترین افعال کی تکمیل کی خاطر بھیجا گیا ہوں۔

ایک اور موقعہ سے "اخلاقی محاسن" پر ہی دارومدار ایمان کا بتایا گیا، چنانچہ واضح کیا گیا۔ اکمل المؤمنین ایمانًا احسنھم خُلُقًا۔ سب سے زیادہ کامل ایمان اس کا ہے جو اخلاقی اعتبار سے سب سے زیادہ بہتر ہو۔

معاشرۂ انسانی کو تعلیم دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

احسنکم احسنکم اخلاقا۔ تم میں سب سے اچھا وہ ہے جس کے اخلاق اچھے ہیں

قرآن کریم اور معلم اخلاق

حرم نبوی حضرت عائشہ صدیقہ طاہرہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا گیا کہ رسول رحمت کی سیرت اور اخلاق کی تفصیل بتائیے؟ آپؓ نے حیرانگی کے عالم میں پوچھا کہ کیا تم قرآن نہیں پڑھتے؟ سائل نے عرض کیا کیوں نہیں؟ الحمد للہ تلاوت اور قرأت کی سعادت تو ہمیں روزانہ ملتی ہے۔

فرمایا، کان خلقہ القرآن کہ حضور کا اخلاق تو قرآن کریم ہی ہے، دراصل قرآن علمی اور معنوی انداز میں ہے جبکہ آپ کی زندگی اور سیرت قرآن کی عملی تفسیر اور تعبیر ہے۔

قرآن کریم نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی عظمت کے متعلق آسمانی اعلان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا، اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ (اے محمد) بیشک تم اخلاق کے بڑے درجہ پر قائم ہو (سورۂ النون)

اعلیٰ اخلاق کی تشریح کرتے ہوئے دوسرے مقام پر اعلان فرمایا۔

وما ارسلناك الا رحمة للعالمين (سورة الانبياء) (اے محمد) ہم نے تمھیں جہاں والوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

اعلیٰ اور بلند اخلاق کا کمال یہ ہے کہ آپ کی ذات گرامی تمام عالم کیلئے، تمام قوموں کیلئے اور تمام زندگی کے لئے رحمت و کرم ہے، زندگی کے ہر گوشہ کیلئے رحمت و مہر ہے اس مقام کی وضاحت کرتے ہوئے سورۂ آل عمران میں فرمایا گیا

فبما رحمة من الله لنت لهم	خدا تعالیٰ کے کرم سے اے رسول اکرم ان
ولو كنت فظا غليظ	لوگوں کیلئے نرم دل ہو اور اگر تم سخت
القلب لا انفضوا من	مزاج اور سخت دل ہوتے تو یہ لوگ تمھیں
حولك فاعف عنهم	چھوڑ کر بھاگ جاتے، پس ان کے ساتھ

استغفرلھم وشاورھم فی الامر (سورۃ آل عمران) — عفو و درگزر کا معاملہ کرو، ان کے لئے دعا کرو اور معاملات میں ان سے مشورہ کیا کرو

نرم مزاج اور نرم دل ہونا، لوگوں کے ساتھ معافی کا برتاؤ کرنا، لوگوں کے حق میں بھلائی کی دعا کرنا اور ان سے مشورہ کرکے ان کی حوصلہ افزائی کرنا اور عزت بڑھانا اخلاق حسنہ کی اصل روح ہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی مقام ،،رحمۃ للعالمین،، کی یہی تشریح ہے اور اسی صفت کو اعلیٰ اخلاق کی بنیاد کہا جاتا ہے (بحوالہ اخلاق رسول ﷺ)

اخلاق کے لفظی و لغوی معنیٰ

خُلق اور خَلق دو الفاظ ہیں، خُلق جس کی جمع اخلاق ہے اس کا مفہوم ہے اندرونی خوبی، کیفیت اور باطنی شائستگی و نرمی کو کہا جاتا ہے جبکہ خَلق کا مفہوم جسم کی ظاہری بناوٹ اور تراش خراش ہے

حسن اخلاق کی تعریف

حُسنِ اخلاق کی تعریف میں مشہور محدث و عالم حضرت عبداللہ ابن مبارک فرماتے ہیں

ھو طلاقۃ الوجہ وبذل المعروف وکف الاذی۔ — یعنی حسن اخلاق نام ہے خوش روئی کا، مال خرچ کرنے کا اور کسی کو تکلیف نہ دینے کا۔

غوث اعظم شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ ،،حسن خلق،، کی تعریف میں فرماتے ہیں ۔حُسن خُلق کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ایک قول دلیل ہے، جو اللہ تعالیٰ نے آنحضرتؐ کے بارے میں ارشاد فرمایا یعنی ،تیرا اخلاق بہت اچھا ہے۔

کہا گیا ہے کہ ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو معجزات، کرامات، اور بزرگی کے علاوہ حُسن خلق کے لئے مخصوص فرمایا گیا۔ جیسی تعریف آپ کے اخلاق کی بیان کی گئی ایسی کسی اور کے اخلاق کی بیان نہیں ہوئی، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے محمدؐ تو اپنے ستودہ اخلاق کے باعث بزرگ ہے، کہا گیا ہے کہ آنحضرتؐ کے اخلاق حمیدہ کے باعث ان کی تعریف کی گئی ہے آپ نے خلق خدا کو دونوں جہان کی نعمتوں سے نوازا اور خود ذات الٰہی پر اکتفا کیا۔ (بحوالہ غنیۃ الطالبین)

رسول رحمت نے اخلاق علیا کی فہرست مرتب فرمائی

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بعثت کے ساتھ ہی اخلاقیات کی فہرست مرتب کر کے اپنے قول وعمل سے دنیا والوں پر یہ ثابت کر دیا کہ آپ صرف گفتار کے ہی غازی نہیں بلکہ اخلاق اور کردار کے ہی اصل غازی ہیں

آپ نے اس فرض کو انجام دینا شروع کر دیا، ابھی آپ مکہ ہی میں کہ ابوذرؓ نے اپنے بھائی کو اس نئے پیغمبر کے حالات اور تعلیمات کی تحقیق کے لئے مکہ بھیجا، انھوں نے واپس آکر اس کی نسبت اپنے بھائی کو جن الفاظ میں اطلاع دی وہ یہ تھے۔

رأیتہٗ یامُرُ بمکارم الاخلاق (صحیح مسلم) میں نے اس کو دیکھا وہ لوگوں کو اخلاق حسنہ کی تعلیم دیتا ہے

حبشہ کی ـــ ہجرت کے زمانے میں نجاشی نے جب مسلمانوں کو بلوا کر اسلام کی نسبت تحقیقات کی اس وقت حضرت جعفر طیارؓ نے جو تقریر کی اس کے چند فقرے یہ ہیں:

اے بادشاہ ہم لوگ ایک جاہل قوم تھے، بتوں کو پوجتے تھے مردار کھاتے تھے بدکاریاں کرتے تھے، ہمسایوں کو ستاتے تھے بھائی بھائی پر ظلم کرتا تھا زبردست زیردست کو کھا جاتے تھے، اسی اثناء میں ایک شخص ہم میں پیدا ہوا .... اس نے ہم کو سکھایا کہ ہم پتھروں کو پوجنا چھوڑ دیں، سچ بولیں، خونریزی سے باز آئیں یتیموں کا مال نہ کھائیں ہمسایوں کو آرام دیں، عفیف عورتوں پر بدنامی کا داغ نہ لگائیں۔

اسی طرح قیصر روم کے دربار میں ابوسفیان نے جو ابھی تک کافر تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اصلاحی دعوت کا جو مختصر خاکہ کھینچا اس میں یہ تسلیم کیا کہ وہ خدائی توحید و عبادت کے ساتھ لوگوں کو یہ سکھاتے ہیں وہ پاکدامنی اختیار کریں، سچ بولیں اور قرابت کا حق ادا کریں (بحوالہ سیرۃ النبی ج ۲)

یہ حقیقت ہے کہ عقائد اسلام قبول کر لینے اور ارکان اسلام پر تہہ دل سے عمل کرنے سے انسان کے اخلاق و کردار میں ایک خوشگوار اور انقلاب انگیز تبدیلی پیدا ہونا ایک قدرتی فاضلہ ہے چنانچہ اخلاق کے دائرہ کو وسیع کرتے ہوئے رسول رحمت ﷺ نے بہترین انسان ہونے کی سند با اخلاق انسان کو عطا فرمائی

عن عبد اللہ بن عمرو بن العاص قال لم یکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاحشا و لا متفحشا . وکان یقول ان من خیارکم احسنکم اخلاقا (بخاری و مسلم)	حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ تو بے حیائی کی بات زبان سے نکالتے اور نہ بےحیائی کا کام کرتے اور نہ دوسروں کو برا بھلا کہتے اور حضورؐ فرماتے تھے کہ تم میں بہتر وہ لوگ ہیں جن کے اخلاق اچھے ہیں۔

ایک دوسری روایت میں ارشاد فرمایا۔ البرُّ حسن الخلق (مسلم شریف) کہ نیکی تو اچھے اخلاق ہی کا نام ہے ـــــ فرمایا جس بندے کے اخلاق اچھے ہیں اس کو دن کے روزے اور رات کے قیام کا ثواب ملتا ہے اگرچہ اس کے اعمال کم ہی کیوں نہ ہوں (ابوداؤد شریف)

ایک موقع سے کسی نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! سب سے بہتر انسان کو کیا چیز عطا ہوتی ہے۔ فرمایا، نیک اخلاق (بحوالہ ابن حبّان) ـــــ فرمایا حسن خلق موجب برکت ہے، بد خلقی نحوست ہے، نیکی سے عمر بڑھتی ہے اور صدقہ بری موت کو دور کرتا ہے (مسند احمد بن حنبلؒ) فرمایا، لوگو تمہارا مال تو سب انسانوں کے لئے کافی نہیں ہو سکتا لیکن خوش خلقی، کشادہ روئی انسانوں کیلئے کافی ہو سکتی ہے (بحوالہ ابو یعلیٰ) برے اخلاق سے پناہ مانگتے ہوئے حسب ذیل الفاظ لسان نبوت پر جاری رہتے۔ اَللّٰھُمَّ اَعُوْذُبِكَ مِنَ الشِّقَاقِ وَسُوْءِ الْاَخْلَاقِ (بحوالہ ابوداؤد شریف)

حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے ایک شاگرد

مولانا وجیہ الدین احمد خاں صاحب رامپوری

عہد اور علمی خدمات

۱۳۱۷ھ ۱۸۹۹ء ــــ ۱۴۰۷ھ ۱۹۸۷ء

.... (از ڈاکٹر ماجد علیخاں جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔

اللہ جل شانہ نے اس عالم میں موت وحیات کا رشتہ ایک ایسا رشتہ بنایا ہے جس سے ادنیٰ واعلیٰ کوئی بھی مستثنیٰ نہیں، چاہے وہ انبیاء جیسے مقرب بارگاہ ہوں یا فرعون، ہامان وشداد جیسے مغضوب وضال ہوں سب کو موت کی آغوش میں بالآخر جانا ہی ہوتا ہے اور اسکے ذائقہ کو چکھنا ہوتا ہے، جیسا کہ قرآن کریم فرماتا ہے۔ کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَۃُ الْمَوْتِ، (ہر نفس کو موت کا مزہ چکھنا ہے) باقی رہنے والی ذات صرف خداوند قدوس کی ذات ہے اسکے علاوہ ہر شئی پر ازل ہی سے فنا کے لفظ کو ثبت کر دیا گیا ہے کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ وَّیَبْقٰی وَجْہُ رَبِّکَ ذُوالْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ۔

اسکے باوجود کچھ اموات ایسی ہوتی ہیں جن کو اس فانی دنیا میں موت سمجھا جاتا ہے لیکن اللہ کے یہاں وہ حیات شمار کی جاتی ہیں وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْیَاءٌ وَّلٰکِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ (البقرہ ۲:۱۵۴)۔
ترجمہ: اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کر دیئے جاتے ہیں ان کی نسبت یوں بھی مت کہو کہ وہ (معمولی مردوں کی طرح) مُردے ہیں بلکہ وہ تو (ایک ممتاز حیات کے ساتھ) زندہ ہیں

لیکن تم (ان حواس سے اس حیات کا) ادراک نہیں کر سکتے۔ اسی مفہوم میں عربی کے ایک شاعر نے کہا ہے۔ موت التقی حیات لا نفاد لھا!

قد مات قوم وھم فی الناس احیاء

(ترجمہ) متقی اور پرہیزگار کی موت غیر فانی زندگی ہے، یہ لوگ بظاہر مر چکے ہیں حالانکہ عالم انسانیت میں دراصل زندہ ہی ہیں۔

حضرت مولانا وجیہ الدین احمد خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی ان ہی چند ہستیوں میں سے ایک تھے جو بظاہر تو اس عالم فانی سے گذر چکے ہیں لیکن ان کے کارنامے اب بھی زندہ و جاوید ہیں اور عالم انسانیت میں یہ ہمیشہ زندہ رہیں گے، آپ کی پیدائش رامپور میں ۴ ربیع الاول ۱۳۱۷ھ مطابق ۱۳ جولائی ۱۸۹۹ء ہوئی اور وفات ۲۷ شوال ۱۴۰۷ھ مطابق ۲۵ جون ۱۹۸۷ء بروز جمعرات ہوئی۔

حضرت مولانا کا تعلق پٹھان قوم سے تھا، حسن اتفاق کہئے یا قسمت کی ستم ظریفی کہ راقم الحروف کا تعلق بھی اسی قوم سے ہے، میرے ان دو متضاد الفاظ کے استعمال کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس قوم میں بعض خصائص متضاد ہوتے ہیں، جہاں پٹھان اپنی جرأت خودداری دلیری، بہادری، اعلیٰ ظرفی اور بات کی پختگی کے لئے مشہور رہیں! اور ان کے اندر یہ صفات ملتی ہیں وہاں اگر اس قوم کا جلاء نہ ہوا ہو اور اصلاح کی منازل تک اس کی رسائی نہ ہو سکے تو پھر یہ غضب اور شہوت میں ڈوب کر انسانی حدود کو پار کرنے میں بھی نہیں ہچکچاتی، جس کی مثال موجودہ دور میں کراچی کے پختون و مہاجر فسادات اور رام پور شہر میں آپسی قتل و غارت ہے اور ماضی میں پٹھان ریاستوں کے حکمرانوں و اُمراء کا ظلم و تشدد اور نادر شاہ کا دہلی میں قتل عام ہے۔ اسی وجہ سے ایک لطیفہ بہت مشہور ہے، ایک صاحب نے ایک پٹھان سے کہا "میاں پٹھانوں میں کوئی پیغمبر ہی نہیں ہوا"، پٹھان صاحب نے جلاّ کر جواب دیا "تم جھوٹ بولتے ہو کیا

(حضرت) عیسیٰ خاں اور (حضرت) موسیٰ خاں کا نام نہیں سنا"۔ دراصل یہ اسلام کی خوبی ہے کہ ان متضاد صفات کی حامل قوم بھی اس کے دامن سے وابستہ ہو کر حضرت سرورِ کائنات محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت عامہ اور فیض تامّہ سے مستفیض ہوئی

رامپور ایک ایسا شہر ہے جس کی گود میں سینکڑوں صاحب علم شخصیتوں، شعراء ادباء، صوفیاء اور علماء نے پرورش پائی اور اسکے آب وگل سے استفادہ کیا، اسی زمین کے بطن سے مولانا محمد علی اور شوکت علی جیسے جلیل القدر مجاہدین آزادی نکلے ہیں اگر رامپور کی تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے تو ایسی اعلیٰ شخصیتیں کم ہی ملیں گی جنھوں نے اس شہر کے دو تاریخی دوروں کو اچھی طرح دیکھا دیکھا، اور اپنی زندگی کے بڑے حصوں کو دونوں دوروں میں گذارہ ہو۔ ایسے علماء میں اگر حضرت مولانا امتیاز علی خاں صاحب عرشی کا نام لیا جائے تو بیجا نہ ہوگا، حضرت مولانا وجیہ الدین احمد خانصاحب کا شمار نہ صرف ایسے علماء میں کیا جاتا ہے بلکہ ایسے صوفیاء میں بھی جنھوں نے اپنی زندگی کے بڑے حصوں کو رامپور کے دو اہم تاریخی ادوار میں گذارہ ہو۔ میری مراد رامپور کے ایک اس دور سے ہے جو اس کا ریاستی دور تھا اور دوسرے اس دور سے ہے جو ۱۹۴۷ء کی آزادی ہند کے بعد کا۔ یا پھر یوں کہا جائے کہ ۱۹۵۰ء کے بعد کا دور ہے جب کہ ریاست کا خاتمہ ہوا اور رامپور ہندوستان کے نقشہ میں ایک ڈسٹرکٹ یا ضلع کی شکل میں ابھر کر سامنے آیا۔

حضرت مولانا کے علمی و دیگر کارناموں پر روشنی ڈالنے سے قبل میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اس شہر کے ان دو دوروں کے متعلق بھی سرسری طور پر کچھ نہ کچھ لکھ دیا جائے۔

رامپور کا ریاستی دور

رامپور کا ریاستی دور جہاں ایک طرف شاہی دبدبا در پٹھانی شان وشوکت کا دور تھا تو وہاں یہ دور درباری خوشامد و جی حضوری کا بھی دور تھا، ویسے عام طور

پھر رامپور کو ایسے حکمراں ملے جنھوں نے علماء اور مذہبی پیشواؤں کی قدر و منزلت کی، ریاست میں ایک اعلیٰ دینی ادارہ مدرسہ عالیہ بھی قائم کیا گیا جس کی شہرت اندرون ملک سے نکل کر بیرون ہند تک پھیل گئی، بڑے بڑے علماء اس کی مسند درس پر بیٹھنا اپنے لئے باعث عزت سمجھتے تھے، مدرسہ عالیہ کے تمام اخراجات ریاست کی طرف سے ہی پورے ہوتے تھے، ۱۸۵۷ء کے بعد رامپور میں کافی بڑی تعداد میں اہل علم و حرفہ آگئے تھے، یہاں کے نوابین ان کی امداد بڑی فراخدلی سے کرتے تھے، اس ریاست نے ایسے حکمرانوں کو جنم دیا جنھوں نے غالب، داغ، امیر مینائی جیسے شعراء اور حکیم اجمل خاں صاحب جیسے اطباء اور اہل علم کی مہمان نوازی کی۔ البتہ یہ دور جاگیردارانہ نظام پر قائم تھا، اگر اس دور میں نوابین کی نظر عنایت سے راتوں رات ایک غریب و بے آسرا شخص جاگیردار زمیندار یا مستاجر بن جاتا تھا تو ۲۴ گھنٹوں کے اندر اندر شہر کے بڑے بڑے اور چنیدہ مستاجروں سے گاؤں کو ضبط کر کے روٹیوں کا محتاج بھی کر دیا جاتا ہے، ایسے حالات میں جب کہ افراد کی ترقی و تنزلی حکمرانوں کی ابروئے چشم کی مرہون منت ہے اصلاحی و علمی اور ٹھوس کام کرنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ یہی وجہ تھی کہ بعض وہ علماء و ادباء اور اہل حرفہ جو ان باتوں کو جھیل نہ سکتے تھے، ریاستوں کو چھوڑ کر دوسرے علاقوں میں جا بسے تھے۔

رام پور کے ریاستی دور کی بعض اہم خصوصیات بھی ہیں جن کی مثال ملنا مشکل ہے، یہاں پر اس دور میں بے روزگاری عام طور پر نہیں تھی، لوگ نسبتاً خوش حال تھے، نوابین نے رامپور میں بہترین عمارتیں بنوا کر اس کو مغربی یوپی کا ایک منفرد شہر بنا دیا تھا، نواب حامد علی خان کا بنوایا ہوا قلعہ اور اس کے اندر کی حامد منزل نیز دوسری عمارات اسلامی تعمیر کا بہترین نمونہ ہیں، اسی طرح نواب رضا علی خاں صاحب کے دور میں بھی کثیر تعداد میں عمارتیں بنیں، سڑکیں چوڑی ہوئیں، شہر کی خوبصورتی

میں اضافہ ہوا، اس شہر کے باغات لکھنو کے باغات کے ہم پلہ تھے، خسرو باغ اور بے نظیر باغ کے درمیانی سڑک جس کو عام طور پر ٹھنڈی سڑک کہا جاتا تھا، کی مثال دور دور تک ملنا مشکل تھی، نواب رضا علی خاں صاحب نے آزادی ہند سے قبل رامپور میں اتنے کارخانے قائم کردا دیئے تھے کہ یہ شہر چھوٹا سا کانپور کہلایا جانے لگا، یہ انکی دور بینی کی اہم مثال ہے اگر وہ تمام کارخانے آج بھی اسی طرح قائم رہتے تو یہ شہر انڈسٹریز میں یوپی کے بہت سے صنعتی شہروں سے آگے ہوتا۔

اگر نواب حامد علی خاں صاحب رامپور کے اکبر تھے تو نواب رضا علی خاں صاحب کو رامپور کا شاہجہاں کہنا بیجا نہ ہوگا، ریاستی دور کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ رامپور میں فیملی سسٹم پوری طرح محفوظ تھا، گھر اور خاندان کے بڑوں کا چھوٹے ادب و احترام کرتے اور گھریلو و خاندانی روایات کو زندہ رکھتے، علماء کا عام طور پر احترام تھا اور صوفیاء کی توقیر و عزت کی جاتی۔

رامپور کا حال، آزادی کے بعد:

۱۹۴۷ء میں ملک کی آزادی کے چند سال بعد ریاستوں کا خاتمہ ہوا اور اس میں رامپور سرفہرست رہا، اب رامپور ریاست کے بجائے اترپردیش گورنمنٹ کا ایک ضلع بن گیا جس کا افسر اعلیٰ و منتظم ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ یا ضلع کلکٹر ہوگیا۔

ریاست کے خاتمہ پر سب سے برا اثر فوج اور پولیس کے ملازمین پر پڑا، ہزاروں کی تعداد میں ریاست کے دور کے فوجی اور پولیس والے ملازمت سے سبکدوش کردیئے گئے اس کے نتیجے میں بیروزگاری عام ہوگئی جو کسر رہ گئی تھی زمینداری کے خاتمہ نے اس کو بھی پورا کردیا، رامپور کے زمیندار پٹھان کاشتکاری کو عیب سمجھتے تھے، چنانچہ زمینداری جاگیرداری اور مستاجری کے خاتمہ سے بڑے بڑے صاحب حیثیت پٹھان روٹیوں کے محتاج ہوگئے غربت اور افلاس نے ان کے دروازوں پر دستک دینا شروع کردی تعلیمی اعتبار سے بھی

ان لوگوں کے پاس اعلیٰ ڈگریاں نہیں تھیں، لہٰذا ان میں سے بہت سے لوگوں نے معمولی ملازمتوں پر گذر اوقات کرنے پر قناعت کی، اس طرح اس چھوٹی سی ریاست کی خوشحالی پامال کر دی گئی، غربت کے نتیجے میں جرائم میں اضافہ ہوا۔

رامپور کے پٹھان مزاج کے اعتبار سے بہت گرم واقع ہوئے ہیں، جرائم کے اضافے میں مزاج کی اس گرمی کا بھی اثر کافی ہے اس کے علاوہ آزادی کے غلط تصور نے بھی لاقانونیت میں اضافہ کیا ہے۔ عام لوگ آزادی کو غیر ملکی حکومت سے آزادی کی جگہ آزادیٔ قانون (یعنی قانون سے چھٹی) تصور کرنے لگے ہیں چنانچہ عام طور پر قانون کا احترام دل سے اٹھ گیا ہے، پھر قانون نافذ کرنے والے ادارے بڑی حد تک خود قانون شکن بن بیٹھے ہیں، غرض ان تمام اسباب کی وجہ سے رامپور میں بالخصوص اور اس ملک میں بالعموم آزادی کے بعد لاقانونیت کا دور دورہ ہوا، اس شہر میں ایسی قتل و غارت کی جو فضا پیدا ہو گئی ہے یا پیدا کر دی گئی ہے اس کی مثال ہندوستان کے دوسرے شہروں میں مشکل سے ہی ملیگی معمولی معمولی بات پر پستول کی گولی یا چاقو کی نوک سینے کے اندر ہوتی ہے، مجھے خوب یاد ہے کہ بچپن میں ایک قتل محض ساڑھے دس آنے (موجودہ تقریباً ۶۵ پیسے) کے لین دین کی تکرار پر ہوا تھا

ریاست کے خاتمہ کے بعد اس شہر سے فیملی سسٹم کا بھی آہستہ آہستہ خاتمہ ہونا شروع ہو گیا، گھر اور خاندان کے بزرگوں کی عزت و احترام آہستہ آہستہ ختم ہونا شروع ہو گیا، البتہ اگر کسی کے خاندان میں کوئی شرابی جواری اور بدمعاش قسم کا آدمی ہے تو اس کا احترام محض عزت بچانے کے ڈر سے ضرور ہوتا رہا۔ فیملی سسٹم کے خاتمہ کی ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ عام لوگوں نے روزگار کی خاطر باہر کا سفر کرنا شروع کر دیا اور پھر تیل کی دولت کی وجہ سے خلیجی ممالک میں ملازمتوں کی بوچھار نے ان خاندان کے ذہنوں میں احساس برتری پیدا کر دی جو غربت و افلاس میں گرفتار تھے اور نودولتیہ

کا ایک جدید طبقہ وجود میں آگیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عزت اور احترام کی وجہ مال اور عہدہ بن گیا، رام پور کا مثالی معاشرہ تقریباً تباہ ہوگیا جو لوگ باہر نہ جاسکے انھوں نے مقامی طور پر غیر قانونی دھندے شروع کرکے دولت بٹورنے کی ریس میں شوق وذوق سے حصہ لینا شروع کردیا جسکی وجہ سے جوا سٹہ اور شراب بنانے دیکھنے جیسے مخرب اخلاق کاروبار غیر قانونی طور پر محلوں میں عام ہوگئے، پولیس کی بھی جیبیں گرم ہوئی اسکا نتیجہ سامنے ہے کہ عام اخلاقی سطح اور گر گئی۔

حضرت مولانا وجیہہ الدین صاحبؒ کی کرامت

یہ تھے وہ حالات جن کا سابقہ حضرت مولانا وجیہہ الدین احمد خانصاحبؒ کو کرنا پڑا، لیکن ان تمام حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے مولانا نے اپنے دینی علمی اور اصلاحی مشن کو جاری رکھا صوفیاء کے اندر ایک اصطلاح ہے "الاستقامۃ فوق الکرامۃ" (یعنی دین پر استقامت کرامت کے اوپر فوقیت رکھتی ہے)

حضرت مولانا نے رامپور کے ریاستی دور اور آزادی کے بعد کے دور دونوں دوروں میں جس بے مثال استقامت سے دین کی خدمت کی ہے وہ یقیناً حضرت مولانا کی ایک اہم کرامت ہے ان کی اس بے لوث خدمت کی وجہ سے دونوں ——— دوروں میں ان کی عزت اس شہر کے اشراف واشرار میں سے ہر فرد کے دل میں یکساں طور پر رہی، یہاں تک کہ علم وتقویٰ میں ان کا نام رامپور میں ضرب المثل بن گیا، گھروں اور خاندانوں میں ان کے نام کی مثالیں دی جانے لگیں۔ مجھے خود اپنا واقعہ یاد ہے کہ جب میں نے علی گڈھ میں دینیات کی تعلیمات شروع کیں تو والد صاحب مرحوم نے فرمایا کہ علی گڈھ میں دینیات پڑھ کر تم مولوی وجیہہ الدین صاحب تو بن نہیں جاؤگے، اگر کوئی شخص بہت زیادہ عبادت اور نماز روزہ کی طرف راغب ہوتا تو لوگ کہتے کہ وہ تو مولوی وجیہہ الدین صاحب بننے کی فکر میں ہے، واعظین اور خطیب

حضرات حضرت مولانا کے طرزِ وعظ و خطبہ کہنا اپنے لئے باعث فخر سمجھنے لگے، غرض حضرت مولانا وجیہہ الدین احمد خاں صاحب نے دونوں دوروں میں اپنی علمیت اور تقویٰ کا سکہ رامپور کے عوام کے دلوں پر بٹھا دیا اور اپنے وعظوں، علمی مجالس، جمعہ کے خطبوں اور درس و تدریس کے ذریعہ دونوں دوروں میں اس شہر کے مسلمانوں کی نیز ملک کے دور دراز علاقوں کے مسلمانوں کی اصلاح فرماتے رہے۔

شہر کے بڑے و چھوٹے، ہندو و مسلمان، امیر و غریب، حکمراں و رعایا، زمیندار و کاشتکار، سرمایہ دار اور مزدور سب کے سب مولانا کی یکساں طور پر عزت کرتے اور اور ان کی شخصیت کو رامپور کے لئے باعث فخر جانتے، میری کوتاہ نظر میں اس شہر کی مختصر تاریخ میں کوئی ایسی شخصیت بحیثیت عالم دین نہیں ابھری جس نے عوام و خواص دونوں کو اس طرح گردیدہ بنا لیا ہو جس طرح کہ حضرت مولانا کے لوگ گردیدہ تھے۔

رامپور کے اس دور میں جو کہ آزادی ہند کے بعد شروع ہوا مولانا نے جس طرح رامپور کے عوام و خواص کی دینی و اخلاقی رہنمائی کی اس کی مثال ملنا مشکل ہے، آپ نے اپنے مواعظ اور خطبات کے ذریعہ عوام کو احساس کمتری سے نکالا ان کے اندر خود اعتمادی پیدا کی اور برائیوں سے دور کرنے کی کوشش کی، جیسا کہ میں نے تحریر کیا ہے یہ وہ دور ہے جس میں فیملی سسٹم تک اثر انداز ہوا ہے، عام طور پر بڑوں کا احترام دلوں سے نکلتا جا رہا ہے اس پُر فتن دور میں جبکہ الیکشنوں میں مخالف امیدوار کی سات پیڑھیوں تک کے حالات اُگل دیئے جاتے ہیں جہاں بڑے بڑوں کی ٹوپیاں اچھالنا معمولی بات سمجھا جاتا ہے مولانا نے اپنے بے مثال عمل و کردار کے ذریعہ اہل رامپور کے دلوں کو جیت لیا۔

اخلاق:- جو لوگ حضرت مولانا سے ملتے رہے ہیں ان کو معلوم ہے کہ

مولانا رح کے مزاج میں ایسی شگفتگی تھی جس کا ان لوگوں کو اندازہ لگانا مشکل ہے جو مولانا کے قریب نہیں آئے تھے۔ اپنے ہم عمر لوگوں کی عزت اور چھوٹوں سے محبت حضرت مولانا کی مجلس کا ایک عام دستور تھا اس کی وجہ سے رامپور کے عوام مولانا کے گرویدہ بن گئے تھے چھوٹوں سے محبت کے ایک دو ذاتی واقعات ان سطور میں تحریر کرتا ہوں:

اپنی کسی ضرورت سے حضرت مولانا دہلی تشریف لائے۔ جمعہ کی نماز میں جامعہ ملیہ کی مسجد میں حضرت مولانا کو دیکھ کر راقم السطور بہت خوش ہوا اور بعد نماز غریب خانہ پر چلنے کی درخواست کی، حضرت مولانا نے بہت خندہ پیشانی سے درخواست کو شرف قبولیت بخشا، وہاں پر جامعہ کے کئی دوسرے حضرات بھی جمع ہو گئے، حضرت مولانا نے ان سے کہا: ڈاکٹر صاحب میرے محلہ دار بھی ہیں (یہ بات میرے لئے نئی تھی) پھر خود ہی اپنے مخصوص انداز میں تشریح کی اور فرمایا: ان کے دادا اور میرے والد پڑوسی تھے اور بچپن میں میں بھی ان کے دادا کے مکان کے قریب محلہ کٹرہ جلال الدین خاں کے اس حصہ میں رہتا تھا جو کہ اب قلعہ میں آچکا ہے، ہم لوگ صبح کو فجر کے بعد ٹہلنے نکل جاتے تھے، جب واپس آتے تو اکثر ان کے دادا مکان کے باہری حصے میں بیٹھے ہوئے ملتے تھے اور ہم سے پوچھتے تھے: بچوں چائے پیو گے، ہم لوگ ان کی چائے کو اس وجہ سے پسند کرتے تھے کہ وہ خالص دودھ میں پتی اور قند ڈال کر چائے بنواتے تھے اور ہمیں پلاتے تھے۔

رامپور میں جب قلعہ کی تعمیر ہوئی تو حضرت مولانا رح محلہ کٹرہ سے محلہ انگوری باغ منتقل ہو گئے اور ہمارا خاندان بذریا ملا ظریف لیکن وہاں بھی مولانا سے اس طرح نسبت رہی کہ محلہ بذریا ملا ظریف حضرت مولانا رح کے خاندان کے ہی ایک صاحب ملا ظریف خاں صاحب کے نام پر آباد تھا[1]

---

[1] مولانا سردار خاں، حالات مشائخ ص ۲۲۶ ؛ وجیہ الدین احمد خاں صاحب، فیوض نذیریہ ص ۵۰

چھوٹوں پر شفقت کے سلسلہ میں ایک دوسرا ذاتی واقعہ بھی نقل کرتا ہوں۔ راقم السطور کی ایک بھتیجی کا نکاح حضرت مولانا رہ نے ہی پڑھایا تھا راقم السطور اس کا وکیل کی حیثیت سے آیا، تو مولانا نے ازراہ شفقت فرمایا: آپ ہی نکاح پڑھا دیں (نوٹ:۔ عوام کی معلومات کیلئے عرض ہے کہ ولی کی طرح وکیل بھی خود نکاح پڑھا سکتا ہے) لیکن احقر نے بہت ہی ادب سے درخواست کی کہ مولانا نکاح تو آپ ہی پڑھائیں گے۔ اسکے بعد برصغیر ہند و پاک کی ایک جماعت کے سربراہ جو کہ اس وقت حیات تھے ان کی ایک تحریر کے بارے میں مولانا رہ فرمانے لگے دیکھئے انھوں نے یہ لکھا ہے حالانکہ یہ واقعہ کے خلاف ہے، یہ میں اس وجہ سے نقل کر رہا ہوں کہ حضرت مولانا جب کبھی بھی ان حضرات کے مسلک یا رائے کا ذکر کرتے جن کا مسلک یا رائے حضرت مولانا سے مختلف ہوتا تو ان لوگوں کے نام کو بہت مناسب الفاظ میں لیتے لیکن ساتھ ہی ساتھ اپنی رائے بھی پرزور الفاظ میں ذکر کر دیتے۔ میں نے مولانا کی زبان سے اپنے مخالفین کے لئے بھی سخت الفاظ نہیں سُنے۔

حضرت مولانا رہ کے اخلاق کے سلسلے میں ایک اور ذاتی واقعہ تحریر ہے۔ گو کہ یہ واقعات پرائیویٹ ہیں لیکن ان سے مولانا کے اخلاق و کردار پر روشنی پڑتی ہے اس وجہ سے ان کو نقل کر رہا ہوں۔ راقم السطور ویسٹ انڈیز ملازمت کے دوران ایک مرتبہ ویسٹ انڈیز سے چھٹیوں پر آیا ہوا تھا، بعد مغرب حضرت مولانا سے ملنے کی غرض سے مدرسہ فرقانیہ حاضر ہوا، مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس وقت حلقۂ ذکر ہوتا ہوگا، معمول کے مطابق اس وقت حلقۂ ذکر ہو رہا تھا اور اس جگہ بہت ہی ہلکی روشنی تھی یا اندھیرا تھا جس میں ایک دوسرے کو دیکھا نہ جا سکتا تھا میں ایک کونہ میں بیٹھ گیا لیکن حضرت مولانا رہ کو آہٹ محسوس ہوئی۔ فوراً دریافت کیا کون؟ میں نے عرض کیا: ماجد۔ فرمایا، کیا امجد خاں صاحب کے لڑکے، میں نے کہا: جی ہاں، یہ سنتے ہی حلقۂ ذکر

بند کروا دیا گیا، تیز روشنی کردائی اور چائے وغیرہ سے تواضع کی۔ اس طرح کے اور بھی متعدد ذاتی واقعات ہیں جن کو طول کی وجہ سے ذکر نہیں کر رہا ہوں۔

جب حضرت مولانا کے یہ اخلاق اپنے چھوٹوں کے ساتھ تھے تو دوسرے لوگوں کے ساتھ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے معاملات واخلاق کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے، اس ماحول میں ان اخلاق کا حامل وہی شخص ہوسکتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی ولایت کے لئے منتخب کیا ہو۔

راست گوئی وبیباکی:

مومن کی ایک پہچان اس کی راست گوئی اور صاف گوئی ہے جبکہ منافق کی ایک پہچان اس کی کذب بیانی ہے، حضرت مولانا وجیہ الدین صاحب رح اپنی راست گوئی اور صاف گوئی کے لئے مشہور تھے۔

آپ کی راست گوئی کا ایک واقعہ بہت مشہور ہے، حضرت مولانا شکار کے بہت شوقین تھے ایک مرتبہ شکار کو تشریف لے گئے، ساتھ میں اور صاحبان بھی تھے شیر کا شکار تھا، حضرت مولانا وقت پر شیر کی تاک میں بیٹھ گئے، اتفاق سے شکاریوں میں سے (یعنی ساتھیوں میں سے) ایک صاحب ایک جھاڑی میں کسی ضرورت سے گئے ہوئے تھے جھاڑیوں کی کھڑکھڑاہٹ سے حضرت مولانا سمجھے کہ جھاڑی میں شیر ہے چنانچہ بندوق داغ دی۔ گولی اس شخص کے لگ گئی اور وہ بعد میں انتقال کرگیا، یہ شکار نینی تال کے ترائی کے علاقہ میں کھیلنے گئے تھے، حضرت مولانا پر قتل کا مقدمہ قائم ہوگیا، بیان کے لئے جب پیشی ہوئی تو آپ نے صاف صاف فرمادیا کہ ہاں میری بندوق سے گولی ان کے لگی تھی البتہ میں نے ان کو مارنے کے ارادہ سے بندوق نہیں چلائی تھی بلکہ شکار کے ارادہ سے چلائی تھی، عدالت نے حضرت مولانا رح کو اس راست گوئی پر بری کردیا بعد میں حضرت مولانا نے ان صاحب کے خاندان کے لوگوں کو خوں بہا کے طور پر کھیتی کی زمینیں دیں۔

حضرت مولانا کی بیباکی کے سلسلہ میں "حالات مشائخ" میں تحریر کردہ ایک واقعہ قابل توجہ ہے جس کو یہاں ہو بہو نقل کیا جاتا ہے۔

۱۹۶۵ء میں جبکہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جنگ ہو رہی تھی رامپور کے قلعہ کے میدان میں ایک عظیم اجتماع ہوا جس میں شرکار کی تعداد پچاس ساٹھ ہزار بیان کی گئی ہے، واقعہ یہ ہے کہ اتنا بڑا عظیم اجتماع غالباً رامپور کی تاریخ میں کبھی نہیں ہوا ہوگا، اس جلسہ میں ریاست کے سابق نواب رضا علی خاں اور سابق چیف منسٹر رامپور بشیر حسین زیدی بھی شریک جلسہ تھے اس وقت ہندوستان کے مسلمانوں کو اس ملک کی ہندو اکثریت کے ساتھ حکومت وقت بھی مشکوک نظروں سے دیکھ رہی تھی، کیونکہ ہندوستان، پاکستان کے مسلمانوں کا جو آپس میں تعلق ہے وہ اسلام ہی کا نہیں بلکہ خون اور رشتے کا بھی ہے، اگر کسی کا باپ وہاں ہے تو کسی کا بیٹا، کسی کا بھائی تو کسی کی بہن (وغیرہ)

اب اگر ان حالات میں یہ کہا جائے کہ ہمارا پاکستان سے کوئی تعلق نہیں ہم اسکے دشمن ہیں تو یہ بات بھی غلط اور واقعہ کے خلاف اور منافقت بھی، اور پھر کوئی دل سے ماننے کو آمادہ بھی نہیں، اور اگر یہ کہا جائے کہ ہمارا پاکستان سے بہت گہرا تعلق ہے، ہم اسکے دوست وہمدرد ہیں تو ہم ملک کے باغی اور غدار قرار پائیں، ایسے نازک اور سنگین موقعہ پر آپ نے جو تقریر فرمائی بس وہ آپ ہی جیسے اولوالعزم حضرات کا کام ہے، مسلمانوں کی زبان سے تو بے ساختہ کلمات تحسین ادا ہو رہے تھے اور غیر مسلم بھی آپ کی حق گوئی اور قابلیت کے گن گا رہے تھے، آپ نے نہایت حق گوئی اور بے باکی کے ساتھ جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

ہم نہ باغی ہیں اور نہ غدار اور نہ منافق، اسلام منافقت کو پسند نہیں کرتا، وطن سے محبت کی اگر اہمیت ہے تو مسلمانوں کی اسلام اور

اہل اسلام سے بھی محبت بہت اہمیت رکھتی ہے، پاکستان کے رہنے والے مسلمان ہوں یا ترکی کے، انڈونیشیا کے ہوں یا ملیشیا کے، مراکش کے ہوں یا عراق کے، سعودی عرب کے ہوں یا مصر کے، شام کے ہوں یا الجزائر کے، تیونس کے ہوں یا اردن کے، ہم بحمداللہ تعالیٰ مسلمان ہیں اور مسلمانوں سے ہمارا تعلق صرف خون اور رشتہ کا یا نام کا نہیں بلکہ اسلامی ہے، سچا مسلمان کبھی منافقت کو پسند نہیں کرتا، ہم اسلام کے پیروکار ہیں اور اس کے حامی و مددگار، اسلام حقانیت کا علمبردار ہے، اگر وطن سے محبت اسلام اور اسلامیت میں خلل انداز نہ ہو تو اسلام ــــ وطن سے ایسی محبت کی مخالفت بھی نہیں کرتا ہے، ہندوستان و پاکستان ایشیا کے ممالک میں سے دو ملک ہیں پہلے یہ دونوں ایک تھے، جغرافیائی حیثیت سے اب یہ دو الگ الگ ملک ہیں، ان دونوں ملکوں کے سربراہوں کو چاہئے کہ لڑائی کے بجائے گفت و شنید کے ذریعے اپنے متنازعہ مسائل خود حل کریں، یورپ، روس اور امریکہ کے دست نگر اور محتاج نہ بنیں۔ قرآن عظیم میں ہے کہ وَالصُّلْحُ خَیْرٌ، صلح بہتر چیز ہے ــــ [1]

حضرت مولانا کی یہ بیباکانہ تقریر آج بھی اسی طرح مفید ہے جس طرح کہ ۱۹۶۵ء میں تھی۔

---

[1] مولانا سردار شاہ خاں، حالات مشائخ، رامپور، ص ۲۴۳، ۲۴۴

(ص۲۴ سے آگے) بقیہ ایران عراق جنگ۔

اقرار مسٹر حامد ہوشانگی نے بھی کیا اور ایران کی یہ بنیادی شرط بہت پرانی ہے، دو سال قبل ایرانی پارلیمنٹ کے اسپیکر مسٹر رفسنجانی نے اس بنیادی شرط کو بایں الفاظ بیان کیا تھا۔

> ایران عراق کے صدر صدام حسین کی حکومت کا تختہ الٹنے سے کم کسی چیز پر مطمئن نہیں ہوگا جنگ بندی کے لئے ایران کی بنیادی شرط ہے اور اسکے علاوہ وہ کسی بات پر جنگ بندی کیلئے رضامند نہیں ہوگا
>
> (روزنامہ وطن ۲۶ر جنوری ۸۵ء)

اس وقت ہم نے اس خبر پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ:

ایرانی انقلاب جو شروع میں اسلامی انقلاب کے بلند و بانگ دعوی کے ساتھ ایران پر قابض ہوا تھا اور اتحاد و اتفاق کا عظیم ترین علمبردار بنا پھرتا تھا اس کا اسلامی انقلاب کا نعرہ ایران عراق کی پانچ سالہ بے فائدہ جنگ کی شکل میں بالکل بے وزن ہو کر رہ گیا ہے اور ابھی تک اس میں مزید شدت پیدا ہوتی جا رہی ہے اس صورت حال کو دیکھ کر بہت سے اسلامی ممالک نے ثالثی و مصالحتی کردار ادا کرنے کی کوششیں بھی کیں اور اس سلسلے میں تجاویز بھی سامنے آئیں امید تھی کہ ان ممالک کی تجویز اور فیصلے کو تسلیم کرتے ہوئے فوراً جنگ بندی کا اعلان ہو جائیگا، عراق بزبان حال اسپر رضامندی ظاہر کر چکا تھا مگر افسوس کہ ایران کی ایک مضحکہ خیز اور نامعقول ضد نے بجائے جنگ بندی کے جنگ کو طول دیدیا ہے، ایران نے جنگ بندی کے بارے میں ایک بنیادی شرط یہ رکھدی کہ جب تک صدر صدام حسین کی حکومت کا تختہ نہیں الٹا جاتا یا صدر صدام کو ختم نہیں کیا جاتا یا صدر صدام خودکشی نہیں کر لیتے وہاں تک جنگ بندی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے کہ ایران کی یہ ضد سراسر غیر معقول ہے اور کسی طرح بھی لائق عمل نہیں

بالفرض اگر آج عراق ایران کی اس شرط کو تسلیم کرلیتا ہے اور عراق کے صدر اپنی کرسئ صدارت دوسروں کے حوالے کردیتے ہیں اور ایران اپنی مرضی کا کوئی آدمی وہاں متعین کردیتا ہے تو کل پھر یہی ایرانی حکومت دوسرے اسلامی ممالک کے ساتھ چھیڑ خانی کرے گی اور وہاں بھی یہ بنیادی شرط رکھدے گی کہ چونکہ یہ حکومت بھی سراسر غیر اسلامی بلکہ غیر شیعی ہے لہذا ہم اس وقت تک جنگ بند نہیں کریں گے جب تک اسکے سربراہ کو ختم نہ کیا جائے یا علیحدہ نہ کردیا جائے اور یوں سارے مسلم ممالک کے سربراہ ایرانی حکومت کے معیار پر پورے نہیں اتریں گے تو کیا ایرانی حکومت ان سب کے ساتھ جہاد کا نام نہاد اعلان کرکے اپنے نوجوانوں کو آگ و خون کی خندق میں دھکیلتی رہے گی۔

اگر حکومت ایران اپنے نعرۂ اسلام میں ذرہ بھر بھی صادق ہے تو اس کی اولین ذمہ داری ہے کہ اس طفلانہ ضد کو ترک کردے اور معقول شرائط پر فوراً جنگ بندی کا اعلان کرے (ماہنامہ الہلال فروری ۸۵ء)

مگر افسوس کہ ایران نے کسی کی بات نہ مانی اور جہاد کے عنوان سے اور شہادت کے نام پر اپنے عوام کو خوب بھڑکایا نتیجہ یہ نکلا کہ جنگ میں شدت کے ساتھ ساتھ اس کا دائرہ بھی وسیع ہوتا رہا، آیت اللہ خمینی کے اس تازہ بیان سے اس بات کو تقویت ملتی ہے کہ ایران جنگ بند کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا، علامہ خمینی کے ارادے ملاحظہ فرمایئے۔

ایران کے روحانی رہنما آیت اللہ خمینی نے ایک پیغام میں ایران کے عوام سے کہا کہ وہ ایک ہی وار سے مغربی ممالک کے منھ پر تھپڑ رسید کرنے اور مشرقی ممالک کو اندھا کردینے کیلئے عراق کے خلاف اپنے حملے تیز کردیں.... نیز کہا کہ یہ مزاحمت کا وقت ہے، صدام حسین، امریکہ اور دوسرے مغربی ممالک کے منھ پر ایسا تھپڑ ماریں کہ اس کا چمکارا مشرقی ملاک کو اندھا کردے..... عوام دنیاوی رشتے توڑ کر مزاحمت کیلئے ہتھیار اٹھالیں، محاذ جنگ کی جانب

دوڑ پڑیں اور منزل پر ضرب لگا کر دشمن کی طاقت کو ختم کر دیں (جنگ لندن ۱۵؍اپریل ۸۸ء)
علامہ خمینی کے اس طرح کے بیان شروع ہی سے سننے میں آرہے ہیں مگر آج تک ایرانی مجاہدین نے نہ تو امریکہ و روس کو اپنے حملے کا نشانہ بنایا، اور نہ ہی اسرائیل و برطانیہ و فرانس کو چھیڑا، بلکہ اس کے برخلاف سننے اور دیکھنے میں یہ آرہا ہے کہ عراق کی مخالفت میں امریکہ و اسرائیل سے ہتھیار لئے جارہے ہیں اور پھر سعودی عرب اور دیگر عرب ممالک کے منھ پر طمانچہ رسید کرنے کی اسکیمیں مرتب کی جارہی ہیں اس لحاظ سے اس بیان کو بھی اگر دیکھا جائے تو یہی معلوم ہوگا کہ علامہ خمینی کے نزدیک ان کی دشمنی سعودی عرب اور دیگر عرب ممالک سے ہے کسی اور سے نہیں اس لئے ان کی خواہش ہے کہ سب سے پہلے عراق کو ختم کیا جائے پھر کویت وغیرہ کے راستے سے حرمین شریفین پر قبضہ کیا جائے، انھوں نے اپنی اس خواہش کا بہت پہلے اظہار کر دیا تھا، ان کا اپنا بیان پڑھئے

دنیا کی اسلامی و غیر اسلامی طاقتوں میں ہماری قوت اس وقت تک تسلیم نہیں ہو سکتی جب تک مکہ اور مدینہ پر ہمارا قبضہ نہیں ہو جاتا چونکہ یہ علاقہ مہبط الوحی اور مرکز اسلام ہے اس لئے اس پر ہمارا غلبہ اور تسلط ضروری ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
میں جب فاتح بن کر مکہ اور مدینہ میں داخل ہوں گا تو سب سے پہلے میرا یہ کام ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اطہر میں پڑے ہوئے دو بتوں کو نکال باہر کروں (خطاب بہ نوجوانان بحوالہ خمینی اور اسلام ص۸) [۱]

(علامہ خمینی کا یہ خطاب ایک پمفلٹ میں بار بار شائع ہوتا رہا مگر آج تک اس کی تردید یا انکار

---

[۱] علامہ خمینی کے نزدیک ان بتوں سے مراد سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضؓ اور سیدنا حضرت عمر فاروق رضؓ ہیں، اور شیعہ عقیدے میں ان کا نام یہی ہے، شیعوں کا ایک مجتہد اور خمینی صاحب کے ملجا و ماوی ملا باقر مجلسی کا کہنا ہے کہ: وہ دو ملعون جو قریش کے بت تھے سب مسلمانوں نے ان کو امیر المومنین اور سب صحابہ سے افضل جانا (حیات القلوب جلد ۲ ص۳۷۵)

نہیں ہوا جس سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ علامہ خمینی کا منصوبہ اور اسکیم کیا ہے؟)
علامہ خمینی نے اپنے منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کیلئے مکۃ المکرمہ کو اپنا بہترین مقام منتخب کیا تاکہ سعودی عرب اندرونی خلفشار کا شکار ہوجائے چنانچہ گذشتہ سال حج بیت اللہ کے مبارک موقع پر یہ خطرناک پروگرام شروع ہوا۔
یہ ہرگز نہ سمجھئے کہ حادثہ حرمین شریفین ایک وقتی اور جذباتی حادثہ تھا جو اسی وقت شروع ہوگیا، نہیں نہیں ہرگز نہیں، شواہد و ثوابت اس امر کے شاہد عدل ہیں کہ یہ خطرناک منصوبہ باقاعدہ ترتیب دیا گیا، ایرانی مجاہدین کو اس کی ٹریننگ دی گئی، چھریوں چاقوؤں تیز دھار دار آلات اور بموں کے اجزاء سے مسلح کیا گیا تاکہ عین حج کے دوران یہ تماشا برپا کیا جائے، لندن سے شائع ہونے والا رسالہ "امپکٹ انٹرنیشنل" نے ایران کے سابق حج سپر وائزر موسوی صاحب کے ایک بیان کے حوالہ سے اس مخفی حقیقت کو آشکارا کردیا ہے، موسوی صاحب نے علامہ خمینی کی یہ ہدایت حاجیوں کو دی کہ:

> یہ حج ہنگامہ خیز ہونا چاہئے جس میں سپر پاور امریکہ اور روس کی خوب مذمت کی جائے ورنہ یہ کوئی حج نہیں ہوگا (۸/۱۴ ص۱۱)

علامہ خمینی کی اس ہدایت پر ایرانی حج کے عازمین نے واقعی عمل کیا اور اسے ہنگامہ خیز حج بنایا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پوری تاریخ میں خانہ کعبہ کا تقدس اسطرح پامال نہ ہوا ہوگا جس طرح گذشتہ سال ہوا، چار سو سے زائد لاشیں خاک و خون میں تڑپ کر رہ گئیں اور ایران نے اپنی فتح کا جشن مناتے ہوئے اعلان کردیا کہ:

> ایران اپنے عازمین حج کے قتل کا انتقام لینے کے لئے اپنے تمام تر وسائل کو بروئے کار لائے گا" (جنگ ۱۰ اگست ۸۸ء)

ایرانی پارلیمنٹ کے اسپیکر کا یہ بیان بھی قابل غور ہے!

ہم ...... سعودی حکمرانوں کا خاتمہ کرکے ان شہیدوں کے انتقام لینے کا عہد کرتے ہیں (حوالۂ بالا)

ان تمام شواہد کو سامنے رکھ کر فیصلہ کیجئے تو یہی بات سامنے آجاتی ہے کہ ایرانی حکومت اور علامہ خمینی کا منصوبہ سعودی حکمرانوں کو ختم کرکے حرمین شریفین پر جابرانہ تسلط ہے تاکہ پوری دنیا کے عوام کو علامہ خمینی کے اشاروں پر نچوایا جائے، علامہ خمینی خود بھی یہی چاہتے ہیں کہ ان کی عظمت کا سکہ ساری کائنات پر بیٹھ جائے اور اسکے لئے وہ حرمین شریفین کے تقدس کو بھی پامال کرنے سے دریغ نہیں کریں گے، علامہ خمینی کے ایک گہرے قدیمی دوست ڈاکٹر موسیٰ الموسوی کہتے ہیں کہ

هذا الرجل مريض بجنون العظمة وانه يضحي العالم وما فيه في سبيل حبه لنفسه وانانيته (الاستاذ والخميني في الميزان ص۴۲)

یہ شخص (یعنی علامہ خمینی) جاہ کے جنون کا شکار ہے اور اپنی انانیت کی راہ میں دنیا و مافیہا کو بھی قربان کرسکتا ہے۔

عظمت و کبریائی کے جنون کا یہ مریض ایران کے داخلی انتشار سے پریشان ہے عراق پر فتح پانے میں ناکام ہے اس لئے اب سیدھے خانہ کعبہ اور مدینہ منورہ پر حملہ کی تیاری کا ارادہ کرچکا ہے، ابھی چند روز پہلے حاجیوں کا مسئلہ زیر بحث رہا، نتیجہ دونوں ملکوں کے سفارتی تعلقات کے اختتام پر نکلا، ان سب کے باوجود تلخیاں بڑھ رہی ہیں اعلان جنگ کا بگل بجایا جارہا ہے، حرمین شریفین پر قابض ہونے کے ارادہ کی تکمیل پر غور کیا جارہا ہے، اللہ تعالیٰ حرمین شریفین کو ہر قسم کے شر و فتن سے محفوظ رکھے آمین۔

(نوٹ) یہ مقالہ اسوقت لکھا گیا تھا جبکہ ایران اپنی ضد پر قائم تھا لیکن اب اخبارات کی اطلاع کے مطابق اپنی مسلسل شکستوں سے گھبرا کر اس نے بلا شرط جنگ بندی پر آمادگی ظاہر کردی ہے۔

دار العلوم
دیوبند

ماہ محرم الحرام ۱۴۰۹ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۸۸ء

جلد ۷۳ — سالانہ ۴۶/ روپے

شمارہ ۹ — فی شمارہ = ۴/

نگران

حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند

مُدیر :- مولانا حبیب الرحمٰن صاحب قاسمی

سالانہ بدل اشتراک غیر ممالک سے

سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ سے	175/..
پاکستان سے	80/..
بنگلہ دیش سے (ہندوستانی)	60/..

✿ سُرخ نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ کا زرِ تعاون ختم ہو گیا ہے۔

فہرست

ہندوستانی و پاکستانی خریداروں سے ضروری گذارش

۱۔ ہندوستانی خریداروں سے ضروری گذارش یہ ہے کہ ختم خریداری کی اطلاع پاکر اول فرصت میں اپنا چندہ نمبر خریداری کے حوالہ کے ساتھ منی آرڈر سے روانہ کریں

۲۔ پاکستانی خریدار اپنا چندہ مبلغ ۔/۷ روپے مولانا عبدالستار صاحب مہتمم جامعہ عربیہ محمودیہ داؤد والا براہ شجاع آباد ملتان۔ پاکستان۔ کو بھیجدیں

۳۔ خریدار حضرات پتہ پر درج شدہ نمبر محفوظ فرمالیں خط و کتابت کے وقت خریداری نمبر ضرور لکھیں۔

والسلام

منیجر

حرف آغاز

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم
ہو گئے خاک انتہا یہ ہے

جنرل ضیاء الحق مرحوم ایک پُرامن فوجی انقلاب کے ذریعہ پاکستان کے سیاسی افق پر نمودار ہوئے اور گیارہ سال تک اپنی ضیا پاشیوں سے ارض پاکستان کو تابناک بنانے میں مصروف رہے، شہید ضیاء کی نشو ونما اور ساخت و پرداخت اگرچہ فوجی ماحول میں ہوئی اور ان کی زندگی کا بیشتر حصہ فوجی سرگرمیوں میں ہی گزرا لیکن اس کے باوجود سیاست کے پیچ وخم اور سیاسی گتھیوں کے سلجھانے کی صلاحیت ان کے اندر کسی چابک دست سیاستدان سے کم نہیں تھی، روس نے جس وقت افغانستان میں اپنی فوجی اتار دیں اس وقت تقریباً ہر سیاستدان کی زبان پر یہی جملہ تھا کہ اب پاکستان کی خیر نہیں، لیکن دنیا نے دیکھ لیا کہ اس فوجی جنرل نے اپنی سیاسی حکمت عملیوں کے ذریعہ اس انتہائی سنگین صورت حال کو اس طرح اپنے حق میں بنالیا کہ روس جیسی عظیم سیاسی طاقت بھی متحیر ہو کر رہ گئی اور اس فوجی مہم کے پورے دور میں روس کا رویہ پاکستان کے ساتھ زبانی حد تک ہی مصالحانہ رہا۔

مرحوم ضیاء الحق نے زمام اقتدار ایسے نازک حالات میں سنبھالی تھی کہ پاکستان اپنی خارجہ پالیسی میں مسلسل ناکامیوں کی وجہ سے دنیا کی نگاہوں میں اپنا اعتبار کھو چکا تھا، لیکن ملک پاکستان کے اس جانباز سپوت نے اپنی خداداد فہم وفراست سے پاکستان کی خارجہ پالیسی اس طرح سے مرتب کی کہ بین الاقوامی دنیا میں نہ صرف اس کا کھویا ہوا وقار بحال ہو گیا بلکہ پاکستان کو اس بلند مقام پر پہنچا دیا جو اسے اپنے ابتدائے قیام سے اب تک نصیب نہیں ہوا تھا۔

بنگلہ دیش کی جنگ میں تاریخی ناکامی نے پاکستانی فوج کے حوصلے بالکل پست کر دیئے تھے

اور دنیا میں بھی اس کی ساکھ یکسر ختم ہوگئی تھی مگر اس جواں ہمت سپاہی نے اسے نیا حوصلہ، نئی امنگ عطا کی اور جدید اسلحوں سے اسے مسلح کرکے دنیا کی بہترین فوجوں کی صف میں لا کھڑا کر دیا۔

یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ دنیا کے نقشے میں پاکستان کا اضافہ اسلام کے نام اور خالص اسلام پر ہوا تھا، اسی طرح یہ بات بھی ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ آج تک پاکستان کے کسی جمہوری سربراہ یا فوجی حکمراں نے اسے اسلامی اسٹیٹ بنانے اور وہاں اسلامی قوانین نافذ کرنے کا نام بھولے سے بھی نہیں لیا، مگر اس مرد حق کوش نے پاکستانی سیاست دانوں کے علی الرغم اور دنیا پرست دین بیزار طاقتوں کی مخالفت کی پرواکئے بغیر نفاذ شریعت کا اعلان کر دیا، اگرچہ اپنی جگہ یہ بات درست ہے کہ اس سلسلے میں ان کی پیش رفت بہت سست تھی جس کی بنا پر بہت سے لوگ انھیں اس معاملہ میں مخلص نہیں مانتے تھے، اور ان کے اس نعرہ کو ایک سیاسی حربہ سے زیادہ اہمیت دینے کیلئے تیار نہیں تھے، لیکن وہاں کے بگڑے ہوئے ماحول اور مغرب زدہ معاشرے پر صحیح نظر رکھنے والے اچھی طرح سمجھتے تھے کہ پاکستان کے موجودہ حالات میں نفاذ شریعت کے نازک واہم ترین کام کو مرحلے وار اور تدریجاً ہی آگے بڑھایا جا سکتا تھا، اور حکمت و مصلحت کا تقاضا ہی تھا کہ جوش کے بجائے ہوش کے ساتھ قدم آہستہ آہستہ آگے بڑھایا جائے۔ اس نقطۂ نظر کے تحت یہ دعویٰ بیجا نہ ہوگا کہ مرحوم اپنے اس اقدام میں مخلص تھے، مگر پاکستان کے حالات نے انھیں اپنے منصوبے کو پورے طور پر بروئے کار لانے نہیں دیا، اس ظاہری ناکامی کے باوجود ضیاء مرحوم کو اپنے مقصد میں ناکام بھی نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ انھوں نے اسلامی نظام کے نعروں سے پاکستان کو اس طرح پرشور کر دیا ہے کہ اب اس آواز کو کسی طرح بھی دبایا نہیں جا سکتا ہے، اور پاکستان کا کوئی حکمراں بھی اس نعرے کے بغیر اپنی حکومت کو پائیدار اور مستحکم نہیں بنا سکتا ضیاء مرحوم

کا یہ ایک ایسا عظیم کارنامہ ہے جسے پاکستان کی تاریخ سے مٹایا نہیں جاسکتا۔

جنرل ضیاء الحق مرحوم اپنی ذاتی و نجی زندگی کے اعتبار سے بھی ایک قابل قدر شخصیت کے مالک تھے انھوں نے اپنے سیاسی اقتدار کو ذاتی منفعت کے حصول کا ذریعہ نہیں بنایا، ان کے بڑے سے بڑے سیاسی مخالف بھی اس بارے میں کوئی الزام عائد نہیں کرسکے، فوجی ماحول میں تربیت پانے کے باوجود ان کے اندر کبر و نخوت نام کی کوئی چیز نہیں تھی، نماز اور روزہ کے انتہائی پابند تھے، بلکہ بیان کرنے والے تو یہاں تک بیان کرتے ہیں کہ وہ پابند تہجد تھے اور جب کبھی کوئی سیاسی الجھن پیش آجاتی تو پوری پوری رات نماز اور دعا میں گذار دیتے تھے، حج و عمرہ کے موقع پر مسجد نبوی میں جماعت کی پابندی اور پھر ریاض الجنۃ میں گھنٹوں ذکر و تلاوت میں مصروف رہتے ہوئے عام طور پر لوگوں نے انھیں دیکھا ہے، عام خطابات اور تقریروں میں اسلامی اصطلاحات کو بے تکلف استعمال کرتے تھے، پاکستان میں ہی نہیں بلکہ اقوام متحدہ کی مجلسوں میں بھی تقریر کا آغاز حمد و صلوۃ سے کرتے تھے، مرحوم کی انھیں اسلامی اداؤں کی بنا پر بین الاقوامی دنیا میں انھیں لوگ اسلام کا نمائندہ و ترجمان کہتے اور سمجھتے تھے، اور عالم اسلام انھیں بڑی وقعت و محبت کی نگاہوں سے دیکھتا، اسلامی نشاۃ ثانیہ کے داعیوں کی ان سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں، یہی وجہ ہے کہ ان کے حادثۂ وفات پر عالم اسلام نے جس طرح اظہار غم کیا ہے، شاہ فیصل مرحوم کے بعد اس طرح کا سوگ کسی اور سربراہ کے لئے نہیں منایا گیا، اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان کی اس مقبولیت میں ایک حد تک اس غیر متوقع اور انتہائی کرب ناک فضائی حادثہ کا بھی حصہ ہے جس کے وہ شکار ہوئے

حقیقت یہ ہے کہ اپنے عقائد و اعمال، اخلاق اور دیگر بہت سے اوصاف وخصائل کے اعتبار سے شہید ضیاء قابل قدر شخصیت کے مالک تھے۔ پاکستان کے سابق سربراہوں میں کوئی بھی ان محامد ومحاسن میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

مالک کائنات سے دعا ہے کہ انھیں تمام مسلمانوں کی جانب سے جزائے خیر عطا فرمائے، اور ان کے مدارج کو بلند سے بلند تر کرے، نیز پاکستان کو ان کا نعم البدل مرحمت فرمائے تاکہ نفاذ شریعت کا جو اہم ترین اور ضروری کام انھوں نے شروع کیا تھا وہ پایۂ تکمیل تک پہنچ جائے۔
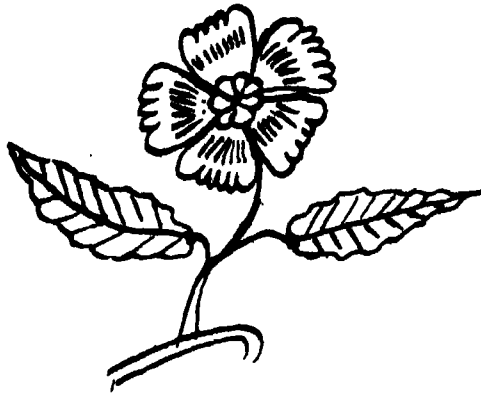
المنتقی خلاصہ منہاج السنۃ ابن تیمیہ

مولانا ڈاکٹر مصطفی حسن علوی پروفیسر لکھنؤ یونیورسٹی

تقی الدین ابوالعباس احمد ابن عبدالحلیم، یہ دراصل پورا نام اور کنیت ہے، اس متعارف شخصیت کی جسے اکثر صرف ابن تیمیہؒ لکھتے اور پڑھتے ہیں، لقب شیخ الاسلام ہے، ابن تیمیہؒ کے مؤلفات اور رسائل کی صحیح اور حقیقی تحدید اور تعدید اب تک نہ ہوسکی اور پھر جن تک اہل ذوق اور علم کی رسائی ہوسکی یا جو زیور طبع سے آراستہ ہوئیں، یا قلمی شکل میں موجود ہیں ان کا شمار بھی چنداں آسان نہیں، کہتے ہیں کہ اپنی وہبی قوت حافظہ اور خداداد انتقال ذہنی سرعت فکر اور وجدان سلیم کی وساطت سے قرآن، حدیث، فقہ، تاریخ سب پر اتنا انھیں عبور حاصل تھا کہ کتابوں پر کتابیں اور رسائل پر رسائل لکھتے چلے جاتے اہل ذوق تلامذہ ہاتھوں ہاتھ لیتے اور اکناف و اطراف عالم اسلام میں پھیلا دیتے، شیخ الاسلام کی یہ ایک ممتاز خصوصیت ہے کہ اپنی مؤلفات اور کتب کا خود نام نہ رکھتے بلکہ ان کے پڑھنے والے اپنے ذوق کے مطابق نام رکھ لیتے اور شاید یہی وجہ ہے کہ شیخ الاسلام کی بعض مؤلفات کے کئی کئی نام پڑ گئے، چنانچہ منہاج السنۃ شیخ کی مشہور و معروف کتاب ہے، اس کا پورا نام "منہاج السنۃ النبویۃ فی نقض کلام الشیعۃ والقدریۃ" ہے اسی کو منہاج الاعتدال فی نقض کلام الرفض والاعتزال" سے موسوم کیا جاتا ہے،

مجھے اس کتاب کے مطالعہ کا من اولہ الی آخرہ اک شوق مفرط دامنگیر رہا، اسے علوم قرآنیہ کا بے پایاں سمندر، معارفِ حدیث کا بحر بیکراں، مباحث علمی اور ثقافت کا ایک دریائے ناپیدا کنار کہنا بجا ہے، ۱۳۲۱ھ میں مطبع بولاق نے اسے چار جلدوں میں شائع کیا ہے، میں نے

کتب خانوں سے مستعار لے کے اس کی جلدیں رکھیں لیکن وقتی مسائل کے مباحث دیکھ دیکھ کے ان سے استفادہ کرکے واپس کر دینا پڑیں۔

اب سے کوئی چھ مہینے پہلے کی بات ہے کہ مکہ معظمہ کا مجلہ آج زیر نظر تھا کہ المنتقیٰ نامی ایک کتاب کا اشتہار یا مختصر ریویو آنکھوں کے سامنے آیا، پچھلے دنوں مجلس شوریٰ کے جلسوں میں شرکت کی غرض سے دیوبند جانا ہوا ایک زمیل معاصر کے بستر پہ کتاب رکھی پائی، پتہ لگایا تو معلوم ہوا کہ عزیز القدر صاحبزادہ محمد اسعد ابن شیخ الہند مولانا حسین احمد سلمہا اللہ سے ان کو ملی ہے، میں بدل متشکر ہوں کہ عزیز موصوف نے میری ادنیٰ استدعا پر اپنی موروثی سخاوت کا مظاہرہ کیا، اور چند دنوں کیا بلکہ کئی مہینوں کے لئے مجھے مستعار دے دی عزیز موصوف کو شیخ محمد نصیف نے ہدیۃً دی تھی جبکہ وہ والی حجاز کی معیت میں سیاحت کے لئے ہندا بھی موسم سرما میں تشریف لائے تھے،

المنتقیٰ منہاج السنۃ کی تمام مباحث کا خلاصہ ہے جو حافظ ابو عبداللہ محمد ابن عثمان ذہبیؒ نے ۷۴۳ھ اور ۷۴۸ھ میں کیا، علامہ ذہبیؒ شیخ الاسلام کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں شیخ الاسلام کی حیات ہی میں یہ خلاصہ ہو گیا تھا، اس وقت سے اب تک کن کن ہاتھوں میں رہا، یا کن کن کتب خانوں کے لئے باعث زینت بنا، کس کس نے اس سے استفادہ کیا، خدا ہی کو معلوم، اگر کتب مابعد میں کہیں کہیں اس خلاصے کے حوالے ملے اور تلاش و جستجو کی گئی تو مضمون یہی ہوا کہ کتاب مفقود ہو چکی لا عین لہ ولا اثر

یہ سعادت مقدر تھی جدہ کے ایک رئیس اور علم پرور شیخ محمد نصیف کیلئے کہ وہ سیر و سیاحت کی غرض سے شام تشریف لے جاتے تھے اور حلب کے دار المکتبات الاوقاف الاسلامیہ کے اس حصہ میں جہاں مکتبہ عثمانیہ کے مخطوطات محفوظ ہیں اس خلاصے کو محفوظ پاتے ہیں عثمان باشا الدورکی الاصل الحلبی المولد فی بارہویں صدی ہجری کے وسط میں اپنا کتب خانہ فی سبیل اللہ وقف کر دیا تھا جو کچھ زمانہ کے بعد حلب کے مشہور مکتبہ

موقوفہ مذکورہ کے ساتھ ضم کردیا گیا۔ المنتقیٰ کا نمبر سلسلہ ۹،۵ ہے یہ ایک قدیم تر نسخہ ہے جو حافظ ذہبیؒ کی وفات کے کوئی ۶۔۷ سال بعد اواخر جمادی الاولیٰ ۸۲۴ھ میں یوسف شافعی کے ہاتھوں نقل ہوا، دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ تو یہ نقل بالکل مطابق اصل لیکن ناقل عربیت اور علوم سے چنداں نابلد ہے، اگر خطیب محب الدین مصری جیسے عالم کے سپرد اس کی نگرانی اور تصحیح نہ ہوتی تو اغلاط پر متنبہ ہونا اور صحیح مفہوم اخذ کرنا ہی ایک امر دشوار تھا، خطیب محب الدین جزاہ اللہ احسن الجزاء نے واقعہ یہ ہے کہ حق تصحیح پورا پورا ادا کیا، مغلق جملوں اور کلموں کی توضیح کی الفاظ مشکلہ کا حل کیا اور فٹ نوٹ میں وہ وہ ذی قیمت اشارات اور معلومات فراہم کئے کہ پڑھنے والا داد دیئے اور ان کے حق میں دعا کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ خطیب کا اس موضوع پر کما حقہ حاوی ہونا، نظر کی گہرائی، وسعت معلومات سب ہی قابل تحسین ہیں اور بعض بعض ایسے ایسے افادات کے انبار لگا دیئے ہیں کہ اس موضوع سے دلچسپی لینے والے بھی ان باتوں کا کتب متداولہ میں سراغ نہیں پاتے۔ کتاب کے شروع میں اصل کتاب المنتقیٰ کے ایک صفحہ کا عکسی فوٹو بھی دیدیا ہے کتاب کے شروع میں خطیب ممدوح کا پُراز معارف مقدمہ بھی لائق صد ستائش ہے۔

اصل کتاب المنتقیٰ کے شروع میں حافظ ذہبیؒ نے چند صفحات بطور مقدمہ شامل کئے ہیں، اس ضمن میں لکھتے ہیں۔

اما بعد فهذه فوائد ونفائس	اما بعد! یہ چند فائدے کی باتیں اور نفیس
اختر تها من كتاب منهاج الاعتدال	نفیس چیزیں ہیں جن کو میں نے میزان
فی نقض كلام اهل الرفض والاعتزال	الاعتدال سے منتخب کر کے لکھا ہے۔

منہاج السنۃ شیخ الاسلام نے حسن ابن یوسف ابن علی ابن المطہر الحلی کی کتاب منہاج الکرامۃ فی معرفۃ الامامت کے رد میں قلم برداشتہ لکھی تھی، حلی نے منہاج الکرامۃ شاہ وقت خدا بندہ کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے مرتب کی تھی، یہ خدا بندہ

شاہان ایل خان کا آٹھواں اور چنگیزی نسل کا چھٹا بادشاہ تھا، اس کا اصل نام آبی تو ہے جو ہلاکو کا پڑپوتا ہوتا ہے، خدابندہ کا باپ ارغون آتش پرست تھا، یہ خدابندہ سیاسی مصالح کی بنیاد پر مسلمان ہوا، اس کا بھائی غازان بیرداہل سنت والجماعت تھا، بھائی کے مرنے کے بعد زمام اختیار خدا بندہ کے ہاتھ آئی، اسکے حاشیہ برداروں میں کچھ شیعہ پروپیگنڈسٹ اور مبلغ تھے جو موقع محل کے منتظر تھے اتفاق وقت کہ خدا بندہ نے اپنی منکوحہ بی بی کو تین طلاقیں دیدیں، بی بی کو غیر معمولی چاہتا تھا، اس نے چاہا کہ اس کو نکاح میں دوبارہ واپس لائے، فقہائے اہل سنت نے فتویٰ دیا کہ رجعت ممکن نہیں حتیٰ تنکح زوجاً غیرہ۔ مبلغ شیعی کے اشارے پر کسی شیعی مفتی کو بلا کر فتویٰ لیا جائے، حلہ مقام سے ابن مطہر کو بلایا گیا مسئلہ سامنے رکھا گیا، ابن مطہر نے بادشاہ سے سوال کیا کہ آپ نے یہ طلاقیں دو عادل گواہوں کی موجودگی میں دی تھیں یا بوقت طلاق کوئی نہ تھا، بادشاہ نے جواب دیا کہ کوئی اس وقت موجود نہ تھا، ابن مطہر نے فتویٰ دیا، کہ "چونکہ طلاق کی شرائط متحقق نہیں ہوئیں اسلئے طلاق ہی واقع نہیں ہوئی حسب سابق بی بی پر پورے اختیارات صرف کرسکتا ہے" خدا بندہ بے حد مسرور ہوا، اور ابن مطہر کو اپنا مقرب اور رموزداں بنالیا ابن مطہر نے پہلے تو یہ پٹی پڑھائی کہ "فرمان کے ذریعہ اکناف واطراف بلاد میں اثنا عشری ائمہ کے نام خطبوں میں لئے جائیں، مسکوکات میں ان کے نام لکھے جائیں اور مساجد کے درودیوار پران کے نام نقش کئے جائیں" دولت خراسان وایران پر شیعیت کا یہ پہلا اقدام تھا کچھ صدیوں بعد دولت صفویہ کے قیام نے چار چاند لگادیئے۔

اس کتاب میں حلی نے عقلی اور نقلی دونوں طرح کے دلائل سے کام لیا ہے لیکن حافظ ذہبی لکھتے ہیں

والقوم من اکذب الناس فی النقلیات	روافض نقلیات میں تو اکذب الناس ہیں اور
واجهل الناس فی العقلیات ولهذا	عقلیات میں اجہل یہی وجہ ہے کہ علماء اس
کانوا عند العلماء اجهل الطوائف	گروہ کو جاہل تر سمجھتے ہیں انھوں نے دین

وقد دخل منهم على الدين من الفساد ما لا يحصيه الا رب العٰلمين

اسلام کو وہ وہ نقصان پہنچائے جن کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

اس مصنف نے خبث غلو، جہل سب سے اپنے اپنے محل پر کام لیا ہے بالکل اسی طرح جیسے اسکے سلف میں ابن سعید کراجکی مرتضی اور رضی کام لیتے رہے، مرتضی اور رضی کے کارہائے نمایاں میں سب سے بڑا کام یہ ہے کہ امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ کے خطبات میں اضافے در اضافے کر کرکے بالکل شکل وصورت ہی بدل دی اور آج حضرت علی کرم اللہ وجہہ وجہہ کے خطبات کا مجموعہ نہج البلاغۃ کے نام سے شائع ذائع ہے، اور یہ فرقہ اس کی تعظیم و توقیر کلام مجید سے زائد کرتا ہے، انھیں میں طوسی بھی ہے جو ابن العلقمی اور ابن الحدید کا دست راست بنا رہا، بغداد کی تباہی، مسلمانوں کا قتل عام اور کشت ار ہیب کا ذمہ دار یہ بھی ہے یہ طوسی اخلاقیات کی مشہور کتاب اخلاق ناصری کا مؤلف بھی ہے۔ اگر اس کی اور اس کے ساتھیوں کی اسلام دشمنی اور تسویل وتحریض ہلاکو کے اوامر واحکام کے تحت نہ ہوتی تو شاید دجلہ وفرات کا یہ حال نہ ہوتا کہ بقول مؤرخین

الفواعشرات الملائين من الكتب الاسلامية المخطوطة في نهر دجلة حتى كان مائه يجري اسود ايامًا

لاکھوں اسلامی قلمی کتابیں دجلہ میں پھینک دیں، کہ کئی دنوں تک دریائے دجلہ میں پانی سیاہ سیاہ بہتا رہا۔

اور بقول مرزا محمد قزوینی

بقول علامہ ذہبی یہ قوم معقول اور منقول دونوں کی صحیح معرفت سے نابلد ہے، انکے مذہبی ادلہ کی زائد تر بنیاد روایات تاریخی پر ہے بس۔

دائما عمدتهم على تواريخ منقطعة الاسناد

ان کا دارومدار بے سند تاریخوں پر ہے

یا ان واقعات پر ہے جو ابی مخنف یا ہشام کلبی جیسے مؤرخین افسانہ نویس لکھ گئے، ابی مخنف کے متعلق علامہ ذہبی میزان الاعتدال میں لکھتے ہیں

اخباری تالف لا یوثق بہ　　　ناقابل بھروسہ ہے بنا بنا کے خبریں لکھتا ہے

ہشام کلبی کے متعلق امام احمد کا قول کافی وافی ہے "کان صاحب سمر و نسب وظننت ان احداً یحدث عنہ فھو مرجع فی الاخبار والانساب التی لااصلۃ لھا بالدین"

اس فرقہ کے متعلق امام مالکؒ کے شاگردوں میں سے اشہب ابن عبدالعزیز قیسی کے یہ ریمارکس ہیں.

سئل مالک رضی اللہ عنہ عن الرافضۃ فقال" لا یکلمھم ولا تروعنھم فانھم یکذبون"　　　امام مالکؒ سے روافض کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا" ان کا ذکر مت کرو نہ ان سے کوئی روایت لو یہ سب جھوٹے ہیں۔

امام شافعیؒ کے شاگرد حرملہ ابن یحییٰ فرماتے ہیں

سمعت الشافعی رضی اللہ عنہ یقول "لم ار احداً اشھد بالزور من الرافضۃ"　　　میں نے امام شافعیؒ سے سنا کہ" روافض سے زائد جھوٹ روایت کرنے والا کسی کو نہیں پایا۔

مومل ابن اہاب جو ابو داؤد اور نسائی کے راویوں میں سے ہیں، فرماتے ہیں

یکتب عن کل مبتدع اذا لم یکن داعیہ - الا الرافضۃ فانھم یکذبون　　　ہر بدعتی سے روایت لی جاسکتی ہے بشرطیکہ کوئی داعیہ نہ ہو ہاں روافض سے ہرگز نہ لی جائے جھوٹے ہوتے ہیں۔

حافظ ذہبیؒ ان روافض سے پھر خوارج کو بہتر سمجھتے ہیں۔

والخوارج مع مروقھم من الدین فھو من اصدق الناس۔　　　خارجی گو دین سے خارج ہیں، تاہم ان سے سچے ہیں۔

عنوان بدل جائے لیکن حقیقت مخفی نہیں رہتی، روافض اپنے جھوٹ بولنے، جھوٹ کہنے کے خود ہی معترف ہیں

والرافضۃ یقرون بالکذب — رافضی گویا جھوٹ کا خود اعتراف کرتے ہیں
حیث یقولون : دیننا التقیۃ — جو یہ کہتے ہیں کہ ہمارا دین تو تقیہ پر ہے تقیہ
وھذا ھو النفاق۔ — اور نفاق ایک ہی چیز ہیں "

جہاں تک عقلیات کا تعلق ہے روافض کا طرز استدلال بالکل معتزلیوں جیسا ہے قضا اور قدر اور سلب صفات میں ان کا بالکل توافق مسلک ہے لیکن بایں ہمہ معتزلہ شیخین پر طعن روا نہیں رکھتے بلکہ جمہور معتزلہ ان کی فضیلت کے قائل ہیں اور توقیر و تعظیم میں بھی کمی نہیں کرتے۔

ابن مطہر حلی نے اپنی کتاب کا موضوع زیر بیان لاتے ہوئے لکھا ہے۔

فھذہ رسالۃ شریفۃ ومقالۃ لطیفۃ اشتملت علی اھم المطالب فی احکام الدین واشرف مسائل المسلمین وھی مسئلۃ الامامۃ التی یحصل بسبب ادراکھا نیل درجۃ الکرامۃ وھی احد ارکان الایمان "

ذہبی تعجب کرتے ہیں کہ مسئلہ امامت اہم مطالب دین کس طرح ہو سکتا ہے سب سے زائد اہم تو ایمان ہے، عہد نبوی میں جب کوئی کافر مسلمان ہوتا تو احکام اسلام کی اس کو تعلیم دی جاتی، امامت کی اہمیت اور اس کی تعلیم پر توجہ نہ کی جاتی، بارہویں امام غائب کی امامت پہ ایمان لانا جن کو سامرا کے غار میں غائب ہوئے صدیاں گذر گئیں زائد اہم ہے یا ایمان باللہ، ایمان بالملئکہ اور ایمان بالکتب وغیرہ ؟ اچھا جو دین کا حصہ تمہارے پاس ہے وہ کافی ہے یا ناکافی، اگر کافی ہے تو امام منتظر کی کیا ضرورت، اور ناکافی ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ دین ہی ناقص ہے، زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ امام غائب کی نوعیت وہی ہے جو صالحین زہاد غوث قطب ابدال پر ہمارے نزدیک ایمان لانے کی ہے، تو جواب یہ ہے کہ ان ہستیوں کے وجود پر ایمان لانا ہمارے نزدیک واجبات دین میں سے نہیں ہے اگر کوئی اس کا قائل ہے تو قول مسموع نہیں، آنحضرتؐ سے ان کے وجود کی تصدیق

مشروع نہیں، نہ ہی ان اسمار کی اصلیت کا کسی ضعیف یا صحیح حدیث سے پتہ چلتا ہے۔
باختلاف اقوال کہا جاتا ہے کہ دو سے لیکر پانچ تک کسی عمر میں یہ امام غار میں غائب ہو گئے حکم شریعت کے مطابق ان کی حضانت اور ان کے مال کی حفاظت اہل ارض کے ذمہ تھی سات برس کی عمر ہوئی نماز کیلئے مامور ہوئے پھر کہاں وضو کیا ہوگا اور کہاں نماز پڑھی ہوگی۔

آل ابی طالب کے مشائخ کے سردار کا بیان مورخ طبری نے نقل کیا ہے کہ حسن عسکری کی کوئی پسماندگان میں سے اولاد نہ تھی یہ بیان قوی تر ہے، اس بیان کے مقابلہ میں کہ جس میں کہا جاتا ہے کہ حسن عسکری کی ایک باندی نرگس نامی سے ایک بچہ پیدا ہوا تھا، حالانکہ حسن عسکری کے بھائی جعفر ابن علی ابن موسیٰ نے حسن کی وفات کے بعد ان کے ترکہ پر قبضہ کر لیا تھا اور اُن کی باندیوں پر اُس وقت تک کنٹرول اور نگرانی رکھی جب تک یہ بات منقح نہ ہو گئی کہ کوئی باندی حاملہ نہیں ہے۔ کتب تاریخ اور انساب کسی ایسی شخصیت سے خالی ہیں جو بحیثیت اولادِ حسن ابن عسکری کی طرف منسوب کی جا سکے یہ سب کچھ افراد خاندانی کے سامنے اور علویوں کے مواجہ میں ہوتا رہا۔ ان علویوں میں وہ شخصیتیں بھی تھیں جن کے پاس نوتی اور پیدائشی رجسٹر محفوظ رہتے تھے اور ان میں باقاعدہ اندراج ہوتا تھا دراصل اس عقیدہ کو اختراع کرنے میں ان غلاۃ کا ہاتھ تھا جو ائمہ اہل بیت کی صحبتوں میں برابر اُٹھتے بیٹھتے اور جھوٹی جھوٹی روایتوں کو بنا بنا کر اُن کی طرف منسوب کرتے رہتے ہیں اور ان سے ان کی اسلام دشمنی کو تقویت پہنچتی۔

حسن عسکری کی لاولدی نے اس سلسلہ کو منقطع کر دیا، بڑے غور و فکر کے بعد یہ سوجھی کہ ایک امام غائب کا دعویٰ کیا جائے کہ حسن عسکری کے ایک بچہ وفات سے پانچ سال قبل پیدا ہوا تھا، محمد ابن نصیر جو حسن عسکری کا نہایت مقرب تھا اس اختراع اور اختلاق کا سہرا اسکے سر ہے، یہ فرقہ اس شخص کو اپنی اصطلاح میں باب کہتا ہے

گویا کہ اسی کے ذریعہ اس خیال کا دروازہ ان کے لئے کھل گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ عثمان ابن سعید نامی ایک شخص تھا جو گھی اور تیل کا کاروبار کرتا تھا، حسن عسکری کے مکان سے متصل اس کی دوکان تھی یہ اور اس کا بیٹا محمد ابن عثمان حسن عسکری کی خدمت میں لگے رہتے، محمد ابن نصیر کے معاصرین نے ازراہ مصلحت کہ بجائے کسی نئے شخص کو باب بنانے کے اگر اسی سمان (گھی فروش) کو بنا دیا جائے تو زیادہ اولیٰ اور انسب ہے، ہاں محمد ابن نصیر کے ذریعہ اس مقصد کو عام کرنے کے لئے فنڈ جمع کیا جائے اور خزانچی اسی زیات اور اسکے بیٹے کو بنایا جائے لیکن یہ تجویز محمد ابن نصیر کو ایک آن نہ بھائی اور اپنے آپ کو باب بنانے پر مصر رہا، اختلاف پیدا ہو گیا، محمد ابن نصیر نے اس جماعت سے قطع تعلق کر کے نئے فرقے کی بنیاد ڈالی جو نصیریہ فرقے کے نام سے موسوم ہے، شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے عہد تک ان کے عقائد اور خیالات میں نئی نئی تبدیلیاں ہوتی رہیں، اس کا خیال ہے کہ حضرت علیؓ کو ربوبیت کا درجہ حاصل تھا محمد ان کے حاجب اور سلمان فارسی باب تھے حضرت علی نے ہی آسمان اور زمین پیدا کئے، یہ عالم کی قدامت کے قائل تھے تناسخ ارواح کے مدعی، بعثت کے منکر ان کے نزدیک جنت و دوزخ بے حقیقت خیالات ہیں۔

پانچ نمازیں یہی پانچ علی، حسن، حسین، محسن فاطمہ کے نام ہیں ان کے نام لے لینا غسل جنابت، وضو، ادائے صوم وصلوٰۃ و دیگر واجبات سے بے نیاز کر دیتے ہیں، انکے نزدیک شراب محرمات میں سے نہیں ہے، ان کے عقیدے میں (نعوذ باللہ) حضرت عمرؓ ابلیسوں کے سردار تھے اور اسی ابلیسیت کے ساتھ العیاذ باللہ حضرت ابو بکرؓ اور عثمانؓ کو اتصال قریبی حاصل ہے۔

کتاب منہاج السنۃ کئی فصول میں منقسم ہے، پہلی فصل کا عنوان امامیت کا رد ہے یہ عنوان نہ منہاج السنۃ میں ہے نہ حافظ ذہبیؒ کی مختصر کا لیکن ناشر کتاب خطیب محب الدین

نے مواد سامنے رکھتے ہوئے یہ عنوان انتزاع کیا ہے، شیخ الاسلام نے "قال المؤلف الرافضی" لکھ کر اس کے مقولات نقل کئے ہیں پھر علی الترتیب ان کا رد کیا ہے مثلاً ابن مطہر نے اہل سنت والجماعت کی طرف یہ عقیدہ منسوب کیا ہے کہ ان کے نزدیک ایک مطیع مستحق ثواب نہیں اور نہ عاصی مستحق عذاب ہے، اللہ تعالیٰ نبی کو عذاب دے سکتا ہے اور ابلیس کو معاف کرسکتا ہے۔ شیخ الاسلام کہتے ہیں کہ یہ اہل سنت پر ایک اتہام ہے اہل سنت یہ بے شک کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مذنب کو معاف کر دے اور اہلِ کبائر کو دوزخ سے نکال کر جنت میں داخل کر دے تو یہ روا ہے، کسی موحد کو اللہ تعالیٰ ہمیشہ کے لئے دوزخ میں ڈالے نہ رکھیگا، جہاں تک استحقاق کا تعلق ہے اہل سنت کا عقیدہ یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے آپ کو بارگاہِ خداوندی میں مستحق نہ سمجھے لیکن خدا تعالیٰ کا خود وعدہ ہے کہ مطیع کو ثواب دے گا اور کیا ہوا وعدہ پورا کرے گا، ہاں اللہ تعالیٰ کے ذمہ عقلاً اس کا وجوب ما بہ النزاع ہے لیکن اگر کسی کو عذاب دیدے تو کوئی مانع نہیں ہے" قل فمن یملك من اللہ شیئا ان اراد ان یھلك المسیح ابن مریم وامه ومن فی الارض جمیعا، ابن مطہر کہتا ہے کہ انبیاء معصوم نہیں حالانکہ یہ امر باطل ہے امور تبلیغیہ میں سب معصوم ہیں ورنہ مقصود رسالت کا فوت لازم آجائیگا۔ شیخ الاسلام کا کہنا ہے کہ روافض اپنے غلو فی الدین اور شرک کے باب میں بالکل یہود اور نصاریٰ سے ملتے جلتے ہیں، روافض رسالت میں غلو کرتے ہیں اور امامت کے باب میں تو اس حد تک کہ خود امام کو خدا ہی بنا دیا اور ان نصوص قطعیہ کا بھی انکار کر بیٹھے جن سے انبیاء اور رسل کی توبہ اور استغفار مترشح ہوتی ہے جمعہ اور جماعت کی ان کے نزدیک کوئی قدر نہیں مشاہد اور قبور ائمہ کی تعظیم و تکریم میں اس حد تک غلو ہے کہ ان کی زیارت گویا ان کے نزدیک حج کے مرادف ہے بلکہ حج بیت اللہ کا مرتبہ ان کے نزدیک کم ہے۔ ان مشاہد، مقابر اور زیارت گاہوں کے آداب و مراسم کے متعلق علاوہ شیخ مفید کے دوسروں نے بڑی بڑی کتابیں تالیف

(باقی ص ۲۵ پر)

ضرورت، اہمیت اور افادیت

مولانا سعید الرحمن شمس۔ مدیر نصرۃ الاسلام کشمیر

دورِ حاضر میں اس بات کا پروپیگنڈہ بڑی قوت و شدت سے کیا جارہا ہے کہ تہذیب جدید نے مذہب کو فرسودہ اور غیر ضروری ثابت کر دیا ہے، جدید تعلیم یافتہ مغربی ذہن و فکر سے متاثر ایک طبقہ میں مذہب بیزاری کا رجحان بڑی تیزی سے پھیلتا جارہا ہے، اور جدید سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی اور حیرت انگیز کامیابیوں نے اہل مغرب، جدت پسند افراد کو کچھ اس طرح مسحور اور مدہوش کر دیا ہے کہ اب ان میں یہ خیالِ خام جڑ پکڑتا جارہا ہے کہ سائنس نے مذہب کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے پسپا کر دیا ہے کیونکہ سائنس اور ٹکنالوجی کے اس ترقی یافتہ دور میں دنیا اتنی برق رفتاری کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے کہ اب مذہب کی افادیت صرف کم ہی نہیں ہوئی بلکہ ختم ہو چکی ہے مثال کے طور پر مشہور یورپی ماہر نفسیات فرائڈ (FRAID) نے احیائے دین کی کوششوں کا مذاق اڑاتے ہوئے لکھا ہے کہ۔

"انسانی زندگی تین واضح نفسیاتی ادوار میں سے گذرتی ہے، دورِ وحشت دورِ مذہب، اور دورِ سائنس۔ اب چونکہ سائنس کا دور ہے، لہٰذا مذہب کی باتوں میں اب کوئی معنویت نہیں، وہ فرسودہ ہو چکا اور اپنی تمام قدر و قیمت کھو چکا ہے۔"

مغربی تہذیب اور جدید سائنس نے آج کے انسان کو کیا کچھ دیا ہے۔ دورِ حاضر کے مشہور اسلامی مفکر اور دانشور کے الفاظ میں۔

" وہ ہیں جدید طرز کی سواریاں، نئے طرز کے مکانات، نئے قسم کے ذرائع مواصلات نئے قسم کے لباس، مختصر یہ کہ دنیا میں زندگی گذارنے کیلئے نئے سازوسامان، جو پچھلے سامانوں کے مقابلے میں زیادہ آرام دہ زیادہ خوش نما اور زیادہ سریع الحمل ہیں "

سوال یہ ہے کہ اس قسم کے سامانوں کا خدا اور مذہب پر عقیدہ رکھنے یا نہ رکھنے کے مسئلہ سے کیا تعلق، کیا کسی کے پاس جدید طرز کی رہائش گاہ اور موٹر کار ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کیلئے خدا کا وجود بے معنی ہو گیا؟ کیا تار اور ٹیلیفون کی ذریعے خبر رسانی سے وحی والہام کے عقیدے کی تردید ہو جاتی ہے، کیا ہوائی جہاز اور راکٹ کے ذریعہ فضا میں اڑنے کا مطلب یہ ہے کہ آخرت کا اس کائنات میں کوئی وجود نہیں ہے، کیا لذیذ کھانے، خوش نما لباس اور اعلیٰ فرنیچر کے وجود میں آنے کے بعد جنت و دوزخ کو ماننے کی ضرورت باقی نہیں رہتی، کیا جدید عورتوں کے اندر یہ صلاحیت کہ وہ ٹائپ رائٹر کے بورڈ پر انگلیاں تیزی سے چلا سکتی ہیں یہ ثابت کرتا ہے کہ "الرجال قوامون علی النساء" کی آیت منسوخ ہو گئی، کیا اسمبلی اور پارلیامنٹ کی شاندار عمارتوں میں بیٹھ کر کچھ لوگوں کا قانون سازی کرنا یہ ثابت کرتا ہے کہ شریعت کا قانون بے معنی ہو گیا ہے نئے سازوسامان اور نئے ذرائع ووسائل کی اہمیت وافادیت کو تسلیم کرتے ہوئے ہم یہ کہنے سے قاصر ہیں کہ ان کا مذہب کی صداقتوں کی تائید یا تردید سے کیا تعلق ہے؟

مذہب کا تعلق قدروں (VALUES) سے ہے نہ کہ تمدنی مظاہر سے، تمدنی مظاہر بدلتے رہتے ہیں مگر زندگی کی قدروں میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔ جدید طرز کی تیز رفتار سواریوں نے قدیم طرز کی سست رفتار گاڑیوں کو فرسودہ قرار دیدیا ہے مگر اس مسئلہ کی اہمیت بدستور اپنی جگہ قائم ہے کہ آدمی سواریوں کو بنانے اور استعمال کرنے میں کن اخلاقی اصولوں کا لحاظ کرے۔ جدید مواصلاتی ذرائع نے قدیم طرز کے پیغام رسانی کے طریقوں کو بے فائدہ ثابت کر دیا ہے مگر اس

سوال کی اہمیت میں اب بھی کوئی فرق نہیں ہوا کہ ان مواصلات کو جھوٹ کی اشاعت کیلئے استعمال کیا جائے یا سچ کی اشاعت کے لئے پارلیامنٹ کے ممبران خواہ پیدل چل کر پارلیامنٹ ہاؤس پہونچیں یا ہوائی جہازوں پر اڑکر آئیں اس اصول کی اہمیت بدستور باقی رہے گی کہ ان کی قانون سازی کا کام اسی خدائی قانون کے مطابق ہونا چاہیئے جس پر ساری کائنات کا نظام چل رہا ہے۔ عدالت کے دفاتر خواہ چھپر میں ہوں یا کسی عالیشان عمارت میں، یہ معیار یکساں طور پر باقی رہے گا کہ عدالتوں کو اسطرح کام کرنا چاہیئے کہ کوئی شخص اپنا جائز حق لینے سے محروم نہ رہے اور نہ کوئی شخص اپنے جرم کی سزا پائے۔ (بحوالہ الرّسالہ جون ۱۹۸۱ء)

لیکن یہ عجیب بات ہے کہ تمدّنی مظاہر اور سائنسی ایجادات واختراعات کو مذہب سے متصادم قرار دیئے جانیکی جان توڑ کوششیں کی جا رہی ہیں اور اس فکری گمراہی کی بنیاد پر ذہنی ارتداد کی فضا ہموار کی جا رہی ہے۔ حالانکہ اہل نظر خوب سمجھتے اور جن کی نظر یورپ کی تاریخ پر گہری ہے وہ جانتے ہیں کہ اصل میں مذہب کے متعلق یورپی منکرین اور سائنس دانوں کے مخالفانہ بلکہ جارحانہ طرزعمل کی وجہ وہ کشمکش ہے جو یورپی کلیسا کے خلاف ان کو پیش آئی تھی چنانچہ اس کشمکش میں اہل کلیسا کا مجموعی طور پر جو رول رہا اسے دیکھکر لوگ بجا طور پہ سمجھنے لگے کہ مذہب رجعت پسندی ترقی معکوس، تاریک خیالی، اور لایعنی افکار ونظریات کا مجموعہ ہے اس لئے بہتر یہی ہے کہ اس قصّہ کو ہمیشہ کیلئے تمام کر دیا جائے اور سائنس کے ہاتھ مضبوط کر کے اسے آگے بڑھا کر اس کے ذریعے انسانیت کی رہنمائی اور تہذیب وتمدّن کا ارتقاء جاری رکھا جائے۔ یہ تاریخی پس منظر ہے، یورپ کے سائنس دانوں اور منکرین کا مذہب سے بیزاری اور مخاصمت کا۔

بدقسمتی سے ہم چونکہ مغربی تہذیب کے صرف نقّال ہیں اس میں خیر اور تعمیر کے جو بعض پہلو ہیں اسے اپنی تساہل پسندی اور کم ہمتی سے اپنانیکی جرأت نہیں کر سکتے۔ البتہ اس

تہذیب کی غلاظت اور برائیوں کو بڑی خوش دلی بلکہ دریا دلی سے قبول کر لیتے ہیں ہمیں مجموعی طور
پر اس کمزوری کا اعتراف کر لینا چاہیئے کہ اہل مغرب کی طرح ہم میں نہ احساس ذمہ داری
ہے اور نہ احساس فرض شناسی، اور نہ آئین و قانون اور نہ اجتماعی زندگی کے ضابطوں
کا احترام اور نہ اپنے کام و مقصد کے ساتھ گہری لگن اور دلچسپی۔ ہم نے اگر وہاں سے
کچھ لیا بھی ہے تو عریانی، بے حیائی۔ فحاشی، شراب خوری، تنگ و چست لباس، اخلاق سوز
فلمیں، اور مخرب اخلاق ادب۔ خاص طور پر ہمارے ترقی پسند اصحاب اور آج کی اصطلاح
میں دانشور اور روشن خیال طبقے نے مغرب سے جو کچھ لیا ہے اس میں بجز ذہنی عیاشی،
اخلاقی آوارگی، غیر ذمہ دارانہ طرز عمل، ہنگامہ آرائی، شورش پسندی، اور "مذہب"
کے خلاف جارحیت، محاذ آرائی اور بغاوت کے کوئی مثبت اور تعمیری جذبہ نظر نہیں آتا
یہ حضرات اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں کہ "مذہب دشمنی" کے متعلق یورپ
علماء کا بھی کبھی اتفاق نہیں رہا، بلکہ محض چوٹی کے علماء اور دانشور جو الحادی تہذیب
سے بیزار ہیں اس حقیقت کو تسلیم کر کے اس کا برملا اظہار کرتے ہیں کہ مذہب انسانی
کی ناگزیر نفسیاتی اور عقلی ضرورت ہے۔

علماء یورپ کی شہادت

ان علماء میں ممتاز ترین نام مشہور ماہر فلکیات جیمز جینز JAMES JEENS کا ہے۔
جیمز نے زندگی کا آغاز ایک ملحد اور تشکیک زدہ نوجوان کی حیثیت سے کیا مگر اپنی
سائنسی تحقیقات کے بعد وہ بالآخر اس نتیجہ پر پہونچا کہ مذہب انسانی زندگی کی
ناگزیر ضرورت ہے، کیونکہ خدا پر ایمان لائے بغیر سائنس کے بنیادی مسائل
حل ہی نہیں کیئے جا سکتے!

مشہور ماہر عمرانیات JEENS BRIDQE تو مذہب کی حمایت میں اس
قدر آگے بڑھ گئے کہ انہوں نے مادیت اور روحانیت کے امتزاج سے عقیدہ

وعمل کے ایک متوازن نظام کی تشکیل پر دل کھول کر اسلام کی تعریف کی، انگلستان کے مشہور ادیب سمرسٹ ماتھم SAMARSAT MATHAM نے مذہب کے بارے میں جدید یورپ کے منفی رویّے کو ان الفاظ میں بیان کیا «یورپ نے اپنے لئے ایک نیا خدا سائنس دریافت کرلیا ہے اور پرانے خدا سے منہ موڑ لیا ہے۔

(بحوالہ اسلام اور جدید ذہن کے شبہات)

یہ ایک واضح حقیقت اور انسانی فطرت ہے کہ کائنات کے وجود کے بعد ہی سے انسانی نسل اپنے سے بالاتر ہستی کے سامنے عاجزانہ طور جھکتی آرہی ہے کسی ایسی ہستی اور ذات کو قدرت اور طاقت کا سرچشمہ اور اقتدار اعلیٰ کا مالک کل ضرور سمجھتی آرہی ہے جو نظام کائنات کو پورے نظم و ضبط اور اعتدال و توازن کے ساتھ چلاتی آرہی ہے۔

خدا کا تصور مذہب اسلام کے علاوہ دنیا کے تمام الہامی اور دنیوی مذاہب اور فلسفہ میں بہرحال پایا جاتا ہے۔ خدا کے تصور کے بعد ایک ایسے نظام زندگی کا قدرتاً انسان محتاج ہوتا ہے جس کی روشنی میں وہ نیک وبد، بھلے بُرے، روشنی وظلمت اور حق و باطل میں تمیز حاصل کرسکے ما سے حق اور ناحق کا شعور حاصل ہو اور اپنی زندگی کو ان مقاصد کے حصول کے لئے صرف کرے جس کے لئے درحقیقت اسے وجود بخشا گیا ہے۔ مذہب کی ضرورت عقلاً اس لئے بھی ہے کہ انسان پہلے اپنے آپ کو خود پہچانے اپنے حقوق و فرائض سے آگاہ اور خبردار ہوکر اس کے ذمہ دوسروں کے جو حقوق ہیں اسے ادا کرے اور اس طرح اپنی انفرادی اور اجتماعی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوسکے خدا اور بندہ کے باہمی ربط اور تعلق کے نتیجہ اور بنیاد پر ہی انسان اپنی ظاہری اور باطنی زندگی کو سنوار سکتا ہے ان اعلیٰ اخلاقی وروحانی اقدار اور روایات کا حامل ہوسکتا ہے جو بنی نوع انسان کے لئے سرمایۂ

فخر و مباہات ہیں۔

مذہب انسان کو اپنے لئے جینے کے بجائے دوسروں کیلئے جینا سکھاتا ہے اسے ایک ایسا پاکیزہ نصب العین عطا کرتا ہے جس کی روشنی میں وہ اپنے آپ کو ڈھال کر زندگی کے گوناگوں اور متنوع مسائل کا حل ڈھونڈتا ہے۔ اگر انسان مذہب کے بخشے ہوئے یقین و ایمان سے محروم ہو جائے تو پھر وہ اپنی ذات کے سوا کسی اور طرف دیکھ ہی نہیں سکتا اس کی نظر محدود، اس کا فکر مفلوج ہو جاتا ہے۔ اس کی زندگی خود غرضی، خود پسندی اور خود پرستی کا مرقع بن جاتی ہے اس میں اور وحشی درندوں میں کوئی قابلِ ذکر فرق باقی نہیں رہتا۔

بلاشبہ یہ مذہب ہی کی طاقت اور اس کی اخلاقی قوّت ہے جو انسان کو بیشمار چھوٹی بڑی برائیوں سے باز رکھتی ہے۔ مذہب کی تعلیمات ہی اسے ظلم و زیادتی، لوٹ کھسوٹ، فتنہ و فساد، قتل و غارتگری انارکی اور درندگی، عیاشی، سرکشی، بغاوت، رشوت، استحصال، بددیانتی، دھوکہ، فریب اور بے ایمانی سے روکتی ہے اور اس میں سچائی دیانت، دوسروں کے حقوق کا پاس و لحاظ، فرائض کی ادائیگی، چھوٹے بڑے کی تمیز، شرم و حیا، باہمی اعتماد، حسن ظن، اطمینان، ہمدردی، غمگساری، عدل و انصاف رحم و دلسوزی جیسے انسانی اخلاق و اوصاف پیدا کرتی اور پروان چڑھاتی ہے۔

غور کیا جائے! یہ مذہب ہی کی تو تعلیم ہے اور اس کے داعیوں، مبلّغین اور اس کے پیروکاروں ہی کا فیضان و احسان ہے جو دنیا میں انسانیت، شرافت اخلاق، آداب، مروّت، رواداری باہمی احترام اور دیانت و صداقت کی قندیلیں روشن نظر آتی ہیں۔ مذہب بتاتا ہے کہ اللہ جلّ شانہٗ نے انسان کو جو دھڑکتا ہو دل عطا فرمایا ہے یہ "دل" اگر غریبوں کے دکھ اور درد کو دیکھ کر کراہتا نہیں

اس میں بے چینی اور تڑپ پیدا نہیں ہوتی تو وہ انسان کا دل نہیں بلکہ پتھر کی سل ہے
اللہ تعالیٰ نے انسان کو ہاتھ دیئے ہیں تاکہ ان ہاتھوں سے کمزوروں اور زیر دستوں
کی مدد کرے ظالم کو کیفر کردار تک پہونچائے جو ہاتھ مظلوم کی دادرسی اور حمایت میں
بلند نہ ہوں تو اس سے بہرحال شیر کے پنجے اچھے ہیں جو جنگل کا بادشاہ کہلاتا ہے
مگر اپنی نسل اور خاندان کی تباہی کا سبب نہیں بنتا۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیر
دیئے ہیں اگر یہ پیر اللہ کے کمزور بندوں اور ضعیف لوگوں کی مدد اور نصرت کیلئے
نہیں اٹھتے تو اس سے ہاتھی کے وزنی اور بھاری بھرکم پیر اچھے ہیں جو کسی جاندار
کو خواہ مخواہ گزند نہیں پہونچاتے۔

مولوی امام عادل معینیؔ۔ مدرس دار العلوم دیوبند

معارف قاسمیہ

حجۃ الاسلام حضرت قاسم العلوم والخیرات مولانا محمد قاسم النانوتوی یکے از بانیٔ دار العلوم دیوبند کی ذات گرامی ماضی قریب کی وہ عہد ساز شخصیت تھی جن کا وجود دنیا کے لئے سراپا خیر تھا آپ نے امت کے سامنے جدید، پاکیزہ اور عقل ونقل سے قریب تر علم کلام پیش فرمایا، بہت سے ایسے پیچیدہ مسائل کو نہایت سلجھے ہوئے انداز میں حل کیا، جس میں امت ایک عرصہ سے الجھی ہوئی تھی اور کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں برآمد ہو رہا تھا ــــــ میں چاہتا ہوں کہ حضرت قاسم العلوم کے ان چند نکات پر روشنی ڈالوں جو علوم قاسمیہ میں نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔

مطلق ومقید کی بحث سلف سے لیکر خلف تک پیچیدہ بنی ہوئی ہے مطلق کا مطلب یہ ہے کہ جس میں کسی قسم کی کوئی قید وبندش نہ ہو بلکہ آزادانہ طور پر کسی بھی نوعیت سے اس چیز کا ادا کرنا ضروری ہو اور مقید کا مطلب یہ ہے کہ جس میں کچھ قیود وآداب ملحوظ رکھے گئے ہوں، قدم قدم پر بندشیں ہوں جو آزادیٔ عمل اور حریت فکر دونوں پر اپنے مخصوص دائرے میں پابندیاں عائد کرتی ہوں۔

مذہب اسلام جو ایک خاص نظام حیات کا نام ہے اس نے جس چیز کا مطلق مطالبہ کیا ہے اس کا واضح ترین مطلب یہ ہے کہ اللہ اور رسول کی طرف سے اس مقصد کی ادائگی کیلئے کچھ حدود مقرر نہیں کئے گئے ہیں اور انسان کسی خاص شکل وصورت کا پابند نہیں کیا گیا ہے بلکہ وہ حدود وقیود سے آزاد ہو کر جس طرح بھی انھیں ادا کریگا وہ اپنی ذمہ داری ــــ سے

سبکدوش ہوجائے گا ــــــ اسی طرح اسلام نے جس چیز کا مقید طور پر مطالبہ کیا ہے اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ جب تک اس کے حدود و قیود شکلوں اور نوعیتوں کی رعایت کے ساتھ وہ مطلوبہ چیز ادا نہیں کی جائیگی اس وقت تک اس کی ذمہ داری مکلف پر موجود رہے گی۔

اس گفتگو سے یہ بات واضح طور پر سامنے آگئی کہ اسلام نے جس چیز کا مطلق طور پر مطالبہ کیا ہے اس میں اپنی طرف سے قیود اور بندشوں کا اضافہ کرنا اسلام کے منشا کے خلاف ہے، جو یقیناً قابلِ گرفت جرم ہے اسی طرح جس چیز کا اس نے قیود و نوعیتوں کی رعایت کے ساتھ مطالبہ کیا ہے، اس کی قیدوں کو اپنی رائے سے حذف کر دینا، اور اس کی بندشوں کا خیال نہ کرکے آزادانہ اس پر عمل کرنا بھی، اسلام کے منشار کے ساتھ مذاق و استہزار ہے اسی طرح مطلق کو مقید کرنا اور مقید کو مطلق کرنا دونوں سخت گناہ ہیں ــــــ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ من احدث فی امرنا ھذا ما لیس منہ فھو ردّ (الحدیث) جو من مانی طور پر ہمارے پیش کردہ احکام میں کچھ اضافہ کرتا ہے وہ رد کر دینے کے قابل اور غیر معتبر ہے۔

ایک دوسرے مقام پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کل محدثۃ بدعۃ وکل بدعۃ ضلالۃ (الحدیث) مذہب کے طور پر ہر نو ایجاد کردہ چیز بدعت ہے اور ایسی ہر بدعت گمراہی اور تباہی ہے۔

یہ دونوں روایتیں کھلی ہوئی دلیل ہیں کہ اسلام کے مطلق میں نہ اپنی طرف سے کوئی قید بڑھائی جاسکتی ہے اور نہ اسکے مقید سے کوئی قید اڑائی جاسکتی ہے، اگر کوئی ایسی حرکت کرتا ہے تو وہ مذکورہ بالا دونوں روایات کی روشنی میں مردود اور گمراہ ہے۔

بعض غیر فقیہ ذہنیت اس غلط فہمی کی شکار ہوجاتی ہے کہ مقید کو بے قید کرنا، اور قیود و حدود سے آزاد رکھنا تو یقیناً درست نہیں لیکن مطلق کو مقید کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے

حالانکہ یہ بہت بڑا خیالی فریب اور ذہنی سطحیت ہے ـــــــ اسلئے کہ اگر عقل وفکر کی قندیل، بالکل گل نہ ہوگئی ہو تو اولاً مذکورہ دونوں روایات میں بدعت کا مفہوم سمجھئے، پھر مطلق کو مقید کرنیکی حقیقت پر غور کیجئے۔

حدیث پاک کے اندر بدعت اسکا نام رکھا گیا ہے، جو دین کے اندر نئی ایجاد کرلی گئی ہیں، مختصر لفظوں میں بدعت درحقیقت وجودی چیز ہوتی ہے جو نئی چیزیں، نئی بندشیں، نئی قیدیں، نئے رسوم وخرافات اور نئی شکلیں وصورتیں وجود میں آگئی ہیں، وہ بدعت کے حقیقی اور صحیح مصداق ہیں، ـــــــ بدعت کا تعلق وجودی چیز سے براہِ راست ہے، اور عدمی سے براہِ راست نہیں ہے، یعنی جو چیز دین کے اندر موجود ہے اس کو ساقط کردینا بھی بہت بڑا گناہ اور بدعت ہے، اور اس پر تمام اہل شرع اور عقل کا اتفاق ہے، لیکن بدعت کا تعلق اس عدمی شئے سے براہِ راست نہیں ہے، بلکہ اس طور پر ہے کہ جب بھی کوئی وجود ختم ہوتا ہے اور اس کی جگہ عدم آتا ہے، تو عدم ایک عکس اور سایہ کی شکل میں نمودار ہوتا ہے، مثلاً روشنی جو بالیقین وجودی شئی ہے، یہ جب ختم ہوجاتی ہے، تو ظلمت وتاریکی وہاں پھیل جاتی ہے تو تاریکی روشنی نہ ہونیکا نام ہے، جو عدمی ہے، لیکن ایک عکس اور سایہ کی شکل میں نمودار ہوتی ہے، جس کی وجہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا تاریکی بھی وجودی چیز ہے، بالکل یہی حال تمام عدمیات کا ہے، کہ وہ اپنے اندر خاص محسوسیت اور عکس رکھتے ہیں، جس سے وجود کا دھوکہ ہوتا ہے، ـــــــ اس نہج پر غور کیا جائے، تو بدعت کا عدمی امور سے تعلق اسی معنیٰ میں ہے، جس کا واسطہ بھی وجودی ہی ہے، پھر نتیجہ وہی برآمد ہوگا کہ بدعت کا تعلق وجودی امور سے براہِ راست ہے نہ کہ عدمی سے۔

بدعت کا صحیح مفہوم ذہن نشین کرنیکے بعد مطلق کو مقید کرنیکی حقیقت پر غور کیجئے، کہ مطلق جسمیں کوئی قید، اور کسی خاص صورت ونوعیت کی پابندی نہیں ہے، اس غیر مقید حقیقت میں اپنی طرف سے قیود اور بندشوں کا اضافہ کرنا، اور اس کو خاص شکل وصورت کا پابند بنادینا یقیناً نوایجاد امور ہیں، ان پر بدعت کا اطلاق حقیقی معنیٰ میں، اور براہِ راست ہوگا، ـــــــ اس کے برخلاف اسلام کے مقید مطلوبہ سے کسی قید کا حذف کردینا، ایک عدمی اور سلبی جرم ہے، جس پر بدعت کا اطلاق براہِ راست

نہیں بلکہ بالواسطہ ہے، ـــــــ اس بحث سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آگئی، کہ کسی مطلق حقیقت کو مقید کرنا اس سے بڑھ کر بدعت اور گمراہی ہے جو کسی مقید حقیقت سے قیود کو ساقط کر دینے میں ہے۔

اسلام کے اس منشا کی طرف اہل سنت والجماعت کی سب سے پہلے اور سب سے گہری نگاہ گئی، اور اسی لئے اہل سنت والجماعت کے مسلک کے مطابق وہ تمام جماعتیں اور طبقے گمراہی اور ضلالت کے آتش فشاں کی نذر ہو گئے، جنہوں نے یا تو اپنی طرف سے کچھ امور ایجاد کر لئے، یا اسلام کی حدود و بندشوں سے نکل گئے، اس عظیم مقصود کا سب سے زیادہ خیال حنفیہ نے رکھا ہے۔ اسی لئے انہوں نے کفارۂ یمین، اور کفارۂ ظہار کے غلام کے لئے مومن ہونے کی شرط نہیں لگائی، اس لئے کہ ان دونوں کے احکامات کی تفصیل جن آیات میں آئی ہے وہاں رقبہ مطلق استعمال ہوا ہے۔ اس لئے اس کو مقید نہیں کیا جا سکتا، دوسرے حضرات نے کفارۂ قتل پر قیاس کر کے ان دونوں کفارات میں بھی غلام کے مومن ہونے کی قید لگائی ہے جس میں مطلق کو مقید کرنا لازم آتا ہے، اس قسم کی بہت سی مثالیں اصول کی کتابوں میں موجود ہیں۔

نکاح بھی ایک مطلق حکم الٰہی ہے کہ فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ، الآیہ اور النکاح من سنتی الحدیث شریعت مطہرہ نے اسکی کوئی خاص شکل متعین نہیں کی ہے۔ اور نہ اس کے اندر کسی طرح کے رسوم و طریقے مقرر کیے ہیں۔ بلکہ علی سبیل الاطلاق امت کو یہ ادا کرنا ہے ـــــ اس کے بعد اسمیں اپنی طرف سے شادیانے رسوم و خرافات کا ایجاد کر لینا مطلق کو مقید کرنا ہے جو بدعت ضلال اور تباہی و ہلاکت کا تحت الثریٰ ہے۔

لیکن جتنا نکاح کو مطلق اور بے قید رکھا گیا تھا، اس زمانے میں اتنا ہی رسوم و خرافات کی بندشوں میں اسے جکڑ لیا گیا ہے، اور یہ رسوم اپنی حد سے اتنے آگے بڑھ چکے ہیں کہ یہ ایک سیل رواں، اور عالمی طوفان کی شکل میں اختیار کر چکے ہیں، جس کی زد میں امیر و غریب، دانشور و غیر دانشور، جاہل و عالم، سیاسی و غیر سیاسی، اور متمدن و غیر متمدن ہر طرح کے لوگ بہے جا رہے ہیں، اور اس سے ناواقف ہیں کہ رسوم و خرافات کا یہ سیلاب، بربادی کے کتنے گہرے اور ناپید اکنار سمندر میں

ان کو جا پھینکے کا جہاں سے محفوظ آنیکا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، اور وہ یہ نہیں سوچتے کہ رسوم وخرافات کی لعنتوں کے زیر اثر کتنی غریب لڑکیاں زندگی بھر کنوارپن کا سوگ کرتی رہ گئیں اور کتنی شادی شدہ لڑکیاں خودکشی کی سرحد کو پار کر گئیں، ۔

اسی طرح کی ایک اور بھی مطلق حقیقت ہے جس کو لوگوں نے رسوم وقیود سے بھر کر بدعت کے مرگھٹ تک پہونچا دیا ہے، وہ ہے محفل میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم، ـــــ یقیناً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر پاک آپکی ولادت کی تفصیل اور آپ کی سیرت مقدسہ کی یاد آوری، کار خیر ہے، اور امت اس کی مامور ہے، کہ وہ اپنی زندگی کے ہر موڑ پر اپنے محسن کو یاد رکھے اور انکی سیرت مقدسہ کی روشنی میں اپنی منزل حیات طے کرے، اور یہ حکم مطلق طور پر دیا گیا ہے۔ کہ ذکر پاک جس طرح بھی کرو، مقصود ذکر پاک ہے، اسمیں نہ کوئی قید و بندش ہے اور نہ کسی رسم و رواج کی پابندی ہے، ـــــ لیکن اس زمانے میں کچھ لوگوں نے مفاد پرستی کے جنون میں، اور کچھ نے اپنی جہالت و نادانی میں اس ذکر نبی کو رسوم وخرافات کی ان خاردار گھاٹیوں سے گزار دیا ہے جہاں پر بدعت کی جہنم بھڑک رہی ہے، یہ مطلق کو مقید کرنا جرم عظیم ہے، جس کی طرف سے لوگ غافل ہیں، کاش مطلق کو مقید کرنے کی حقیقت، اور اس جرم کی شدت پر وہ غور کرتے، اور محسن انسانیت کی محفل ذکر کو بدعات وخرافات سے پاک کر کے پوری انسانیت پر احسان کرتے، (آمین)

علماء دیوبند نے انہی قیود کی بناء پر مروجہ محفل میلاد کو بدعت قرار دیا ہے، اے کاش کوئی اس حقیقت کو سمجھتا، اور علماء دیوبند کی عقل رسا، اور فکر مستقیم کی داد دیتا،

موت بھی ایک یقینی اور مطلق حقیقت ہے، موت کے بعد غم کرنا بھی اسلام میں ثابت ہے، میت کے لئے ایصال ثواب کا بھی حکم دیا گیا ہے، لیکن یہ تمام احکام، قیدوں اور رسموں سے پاک ہیں انکا مطالبہ مطلق طور پر کیا گیا ہے مگر ہمارے زمانے میں موت جیسی غم انگیز اور ماتم خیز حقیقت کو بھی رسوم وخرافات کی چمک دمک میں ایک ڈرامہ بنا دیا گیا ہے، دہم سیوم دہم چہلم اور نہیں معلوم کتنے قیود اور کتنے رسم اسمیں اضافہ کر دیئے گئے، جن کے بدعت ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ (جاری)

حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے ایک شاگرد (قسط ۲)

مولانا وجیہ الدین احمد خاں صاحب رامپوری

عہد اور علمی خدمات

۱۳۱۷ھ م ۱۸۹۹ء ——— ۱۴۰۷ھ م ۱۹۸۷ء

ڈاکٹر ماجد علی خاں جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

علمی مقام مولانا ایک بلند پایہ محدث، مفسر اور فقیہ تھے، علم حدیث میں آپ نہ صرف ایک بڑے محدث، اور علامۃ العصر حضرت مولانا انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے بلکہ خود بھی اونچے درجہ کے محدث تھے آپنے شوال ۱۳۳۹ھ میں دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور ۲ ررجب ۱۳۴۰ھ مطابق ۱۹۲۲ء میں حدیث شریف کی تعلیم حاصل کرکے سند فراغت حاصل کی[1] یہ سند بہت مشہور ہے۔ رامپور میں بھی آپ نے کتب حدیث کی تعلیم مقامی علماء سے حاصل کی تھی چنانچہ آپ کو حضرت حافظ شاہ وزیر احمد صاحب محدث رامپوریؒ اور ان کے شیخ حضرت مولانا شاہ وزیر محمد خانصاحبؒ سے بھی اجازت حدیث حاصل ہے[2]۔ حضرت مولانا اپنے تلامذہ کو حضرت مولانا شاہ حافظ وزیر احمد صاحبؒ محدث رامپوری کے توسط سے مندرجہ ذیل سند بھی رحمت فرماتے تھے۔

حضرت مولانا حافظ شاہ وجیہ الدین احمد خاں صاحب = عن حضرت مولانا حافظ شاہ وزیر احمد صاحب محدث رامپوریؒ، عن حضرت مولانا سید محمد شاہ صاحب محدث رامپوری

---

[1] مولانا سردار شاہ خانصاحب قادری وجیہی، حالات مشائخ رامپور ص ۲۳۰ ـ [2] ایضاً ص ۲۲۴

عن حضرت مولانا سید حسن شاہ صاحب محدث رامپوری عن حضرت مولانا شاہ سید عالم صاحب نگینوی محدث مرادآبادی عن حضرت مولانا شاہ محمد اسحٰق صاحب محدث دہلوی عن حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی عن سراج المحدثین حضرت مولانا شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی سے یہ سلسلۂ حدیث سرورِ کائنات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک منتہی ہوتا ہے۔

حضرت مولانا وجیہ الدین احمد خاں صاحب نے طویل عرصہ تک مختلف مدارس میں درسِ حدیث دیا۔ ایک مرتبہ راقم السطور سے خود فرمایا کہ میں نے ساٹھ سال سے زیادہ درسِ حدیث دیا ہے۔ یہ مدت قمری (ہجری) سنہ کے اعتبار سے فرمائی تھی۔ "کتاب حالاتِ مشائخ" سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے ریاست دادوں ضلع علی گڑھ کے مدرسہ حافظیہ سعیدیہ سے ہی مسلم شریف پڑھانا شروع کردی تھی[۶] یہ ملازمت غالباً ۱۳۴۴ھ سے شروع کی تھی اس طرح ساٹھ سال کی مدت ۱۴۰۴ھ میں مکمل ہوجاتی ہے۔ حضرت مولانا نے مجھ سے مندرجہ بالا مدت ۱۴۰۴ھ کے بعد ہی کسی تاریخ میں بتائی ہے۔ مولانا کا درسِ بخاری ایک خاص انداز کا ہوتا تھا جسمیں آپ اکابر محدث کے طرز پر احادیث کی شرح کے ساتھ ساتھ ضرورت پڑنے پر حنفی نقطۂ نظر کی بھی وضاحت کرتے جاتے تھے۔ راقم السطور کو اتفاقاً کئی بار مدرسہ فرقانیہ میں مولانا کے درسِ بخاری میں شرکت کرنیکی سعادت حاصل ہوئی ہے۔

اصول حدیث پر ایک کتاب "حدیثی اصول" مولانا کی اس فن میں گہری بصیرت کی آئینہ دار ہے۔ اردو میں اصول حدیث پر یہ کتاب ایک منفرد حیثیت کی مالک ہے جس میں جگہ جگہ مولانا نے اصول حدیث کے سلسلہ میں ائمہ کے اختلافات سے بھی بحث کی ہے۔ مثلاً حدیث مرسل کے مقبول و ناقابل قبول ہونے کے سلسلہ میں تحریر فرماتے ہیں

---

[۵] ایضاً، ص ۲۳۰ [۶] ایضاً، ص ۲۳۵۔

"اگر مرسل کی عادت ثقات اور غیر ثقات کل کے حذف کرنیکی ہے تو
باتفاق ائمہ مجتہدین قابل قبول نہیں، اور اگر محض ثقات راوی کو حذف
کرتا ہے، تب بھی جمہور محدثین توقف کے قائل ہیں۔ اسلئے احتمال ہے
کہ شاید محذوف راوی ضعیف ہو۔ اور یہی امام احمدؒ کا ایک قول ہے۔
شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ "کہ اگر حدیث مرسل کی تائید کسی دوسری
حدیث سے ہو جائے خواہ وہ ضعیف ہی کیوں نہ ہو تو مرسل مانی جائیگی، ورنہ
توقف کیا جائیگا" لیکن امام احمدؒ کا قول ثانی اور امام مالکؒ اور امام اعظمؒ
بلکہ جملہ کوفیین کا مذہب یہ ہے کہ بغیر کسی تائید کے بھی مرسل قابل قبول
ہے۔ یہی مذہب اشبہ بالحق ہے چونکہ جمہور کا یہ احتمال کہ ممکن ہے محذوف
راوی ضعیف ہو، اسوقت قابل اعتماد ہو سکتا ہے کہ ہم ثقہ راوی کی مرسل
میں قید نہ لگاتے ہوں۔ ظاہر ہے کہ ثقہ وہی ہوگا جو غیر ثقہ کو نہ چھپائے۔
مرسل کی ثقاہت خود محذوف کی ثقاہت کی دلیل ہے"[1]

حدیث میں ناسخ و منسوخ کی بحث کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں۔
"........ یہ تفصیل تعارض سے متعلق مذہب شافعیؒ کی بنا ر
پر تھی۔ اب ہم حنفیہ کے مطابق تفصیل بیان کرتے ہیں۔ حنفیہ کا قول ہے
کہ اوّل نسخ ہے پھر ترجیح پھر توفیق پھر توقف۔
اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ حنفیہ نے توفیق کو مذہب شافعی کے
مطابق کیوں مقدم نہیں کیا، اسلئے توفیق کی صورت میں دونوں حدیثوں
پر عمل ہو جائیگا، اور نسخ کی صورت میں صرف ایک پر۔
حضرت استاذی مولانا شاہ محمد انور صاحب مدظلہ العالی نے

---

[1] مولانا وجیہ الدین احمد خاں، حدیثی اصول، رامپور، ص ۳۰، ۳۱۔

اس طرح جواب دیا ہے کہ : "ہمارے امام کا قول حق ہے، اس لئے کہ نسخ سے مراد وہ نسخ ہے جو بطریقۂ نقل ثابت ہوا اور جہاں ہم کو نقل مجبور کرتی ہے کہ ایک حدیث ناسخ ہے اور دوسری منسوخ، پھر بھی توفیق کی طرف رجوع کرنا تو ایسا ہے کہ جیسے ہم کو معلوم ہو چکا ہے کہ درحقیقت اسلام یہودیت اور نصرانیت کا ناسخ ہے پھر بھی ہم توفیق کے طالب بن کر فروعات میں اتحاد تلاش کریں"۔ [8]

اصح الاسانید پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"بعض اسانید کے متعلق اصح الاسانید ہونے کا قول کہا گیا ہے۔ احمد بن حنبلؒ اور اسحاق بن راہویہؒ سند۔ "زہری عن سالم بن عبداللہ بن عمر عن ابیہ"، کو اصح الاسانید کہتے ہیں علی المدینیؒ سند۔ "محمد بن سیرین عن عبیدۃ بن عمر عن علی"، کو اصح کہتے ہیں یحییٰ بن معین اور امام النسائیؒ سند۔ "ابراہیم النخعی عن علقمہ عن ابن مسعود"، کو اصح کہتے ہیں بخاریؒ سند۔ "مالک عن نافع عن ابن عمر" کو اصح کہتے ہیں۔ ابوبکر بن شیبہ سند۔ "زہری عن علی بن الحسن عن ابیہ عن علی"، کو اصح کہتے ہیں۔

لیکن قول مختار یہ ہے کہ کسی خاص سند پر مطلقاً اصحیت کا اطلاق کرنا اور جملہ اسانید کو ہر طرح اسکو کم کر دینا مناسب نہیں۔ اور یہ جس کی تفصیل ائمہ کرام مذکورین سے بعض اسانید کی اصحیت کے متعلق نقل کر چکے ہیں، بعض امورات کو مدنظر رکھ کر اصحیت جزئیہ کا حکم لگایا گیا ہے۔ ہاں جسکی اصحیت کے متعلق ائمہ سے صراحت آچکی ہے وہ ضرور......... ان طرق سے اعلیٰ ہیں جن پر کسی نے آج تک اصحیت کی بالخصوص تصریح نہیں کی......" [9]

---

[8] ایضاً، ص ۵۲۔ [9] ایضاً، ص ۷۹، ۸۰۔

اس طرح اس کتاب میں مولاناؒ نے بڑی خوبی سے اصول حدیث میں اختلاف ائمہ کو بھی جمع کر دیا ہے، یہ کتاب غالباً ۱۳۲۴ھ میں لکھی گئی تھی کیونکہ مولانا محبوب علی صاحب (پرنسپل جامع العلوم فرقانیہ، رامپور) کے مطابق یہ کتاب تصنیف کرنے کے تقریباً ۵۸ سال بعد[نله] پہلی بار ذی قعدہ ۱۴۰۲ھ مطابق ستمبر ۱۹۸۲ء میں طبع ہوئی، کتاب کا یہی ایڈیشن اس وقت ہمارے پاس ہے۔

مولانا وجیہ الدین احمد خانصاحبؒ نہ صرف ایک بلند پایہ محدث تھے بلکہ ایک مفسر بھی تھے اپنے مواعظ و تقاریر میں قرآنی آیات کی ایسی چبھتی ہوئی تفسیر فرماتے تھے جس سے آپ کی جلالت علم کا اندازہ ہو سکتا تھا، جس زمانے میں آپ کا ریاست دادوں ضلع علی گڑھ میں قیام تھا اور وہاں پر مدرسہ حافظیہ سعیدیہ میں مسند نشین درس تھے تو اس زمانہ میں رئیس اعظم دادوں نواب ابوبکر خان صاحب نے ایک روز آپ سے آیت کریمہ وَفِيْ أَنْفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُوْنَ کی تشریح کرنے کی درخواست کی آپ نے اس پر کافی دیر تک تقریر فرمائی، دوسرے روز نواب صاحب موصوف نے پھر یہی آیت کریمہ پیش کی، آپ نے پھر اس موضوع پر بڑی طولانی تقریر کی، تیسرے روز پھر نواب صاحب نے اسی آیت کریمہ کو تقریر کا موضوع قرار دیا آپ نے تیسرے روز ایسی جامع اور بصیرت افروز تقریر فرمائی جس سے نواب صاحب کا قلب مطمئن ہو گیا[لله]

اصول تفسیر کے موضوع پر مولانا کی ایک تصنیف "مقدمۃ القرآن یعنی تفسیری اصول" کے نام سے ہے، اس میں مولانا نے فہم قرآن، تفسیر قرآن کے طریقے، اسرائیلیات اور قرآن، ترتیب سور اور سائنس اور قرآن جیسے مضامین سے بحث کی ہے فہم قرآن کے سلسلے میں مولانا تحریر فرماتے ہیں

نله ملاحظہ ہو، تعارف، کتاب ہذا، ص ۲ ۔ لله مولانا وجیہ الدین احمد خاں، مقدمۃ القرآن یعنی تفسیر اصول رامپور، ص ۲، ۳ ۔

"قرآن عظیم کو چند مقامات پر "کتاب مبین" یعنی کھلی ہوئی کتاب کہا گیا ہے اس لفظ سے بعض لوگوں کو یہ دھوکا ہوا کہ "قرآن کو ہر شخص سمجھ سکتا ہے اور اس میں کسی دوسرے کی اعانت درکار نہیں ہے" اس غلط فہمی سے بہت سے نتائج بد پیدا ہوئے ہیں اور ہو رہے ہیں ہم بھی اس بات کے قائل ہیں کہ فی الواقع قرآن کھلی ہوئی کتاب ہے، لیکن اس کے مراتب ہیں جو شخص علوم عربیہ اور لسان عرب سے واقف نہیں وہ کسی ایک جملہ کا مطلب بھی نہیں سمجھ سکتا، کیا کوئی صاحب عقل یہ کہہ سکتا ہے کہ غیر عربی داں "الحمد للہ رب العالمین" کا ترجمہ سمجھ سکتا ہے؟ اگر نہیں سمجھ سکتا اور یقیناً نہیں سمجھ سکتا تو اس کے حق میں قرآن کھلی ہوئی کتاب کہاں ہوئی؟ اس لئے مجبوراً یہ کہنا پڑیگا کہ عربی زبان سے جو واقف ہے اسکے لئے قرآن عظیم کھلی ہوئی کتاب ہے اور جو اس سے واقف نہیں ہے اس کیلئے کھلی ہوئی کتاب نہیں، اگر کوئی شخص عربی زبان سے واقف ہے لیکن تاریخ اسلامی اسکے پیش نظر نہیں تو تاریخی واقعات میں اس کا فیصلہ کرنا کہ فلاں بیان واقعہ کی ابتدا ہے یا انتہا، یا درمیان اسکے لئے ناممکن ہے[۳۵]"

مفسر کے لئے عربی زبان کے علاوہ دیگر علوم میں مہارت کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے مولانا تحریر فرماتے ہیں۔

"............ اگر کسی نے ظاہری عربی دانی کی بنا پر کسی سورۃ کی ایک تفسیر کر دی لیکن قوی حدیث اسکے خلاف ہے تو کیا صحیح حدیث مفید رہے گی یا اس کی ذاتی رائے؟ بعض مقامات پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی روایت دستیاب نہیں ہوئی ہے لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے آیات

---

[۳۵] مولانا وجیہ الدین احمد خاں، مقدمۃ القرآن یعنی تفسیری اصول، رامپور: ص ۲۷

قرآنیہ کی تفسیریں منقول ہوئی ہیں ایسے مقامات پر اقوال صحابہؓ اور اعمال صحابہ سے مدد لینے کی ضرورت ہوتی ہے، بعض مقامات پر صحابہؓ علیہم الرضوان کے اقوال مختلف ہوتے ہیں وہاں ایک قول کو ترجیح دینے کے لئے قوت اجتہاد اور ملکۂ استنباط کی ضرورت ہوتی ہے جو ہر مسلمان میں نہیں ہوتا بلکہ ہر عالم میں بھی نہیں ہوتا اس لئے اہم ضرورت ہے کہ مفسر اصول تفسیر سے واقف ہو یا کسی کا مقلد ہو .... ۱۳؎

اسرائیلیات اور قرآن کے موضوع پر بحث کرتے ہوئے مولانا تحریر کیا ہے۔

"........ ہاں بنی اسرائیل میں سے ارباب علم جب اسلام میں داخل ہوگئے اور ان کی بات قابل پذیرائی ہوگئی تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا، حدثوا عن بنی اسرائیل ولا حرج بنی اسرائیل سے واقعات نقل کرو اور اس میں کوئی حرج نہیں ہے — ان امور کے پیش نظر رکھتے ہوئے علماء اہل اسلام کا فیصلہ یہ قرار پایا کہ پہلے قرآن وحدیث اور مسلّمہ کلیات واصول پر نظر کی جائے اور اس کے بعد اسرائیلیات پر نظر کی جائے اگر سابقہ یقینیات کے خلاف نہ ہوں تو مان لیا جائے ورنہ نظر انداز کر دینا ضروری ہے"۔ ۱۴؎

مولانا دیگر مستند اور جید مفسرین کی طرح اسرائیلیات میں سے ہر قسم کی روایات نقل کرنے کے مخالف تھے البتہ وہ قابل اعتبار روایات جو کسی قرآنی واقعہ کی تاریخی تشریح کرتی ہیں بشرطیکہ شریعت کے اصول کے منافی نہ ہوں قبول کر لینے میں مضائقہ محسوس نہیں کرتے تھے چنانچہ اس سلسلہ میں مزید تحریر کرتے ہیں:۔

"........ الغرض اسرائیلیات سے مفر بھی نہیں اور ہر چیز کو معتبر سمجھ لینا بھی درست نہیں، اس امتیاز کے لئے استعداد علمی اور فراہمی معلومات

۱۳؎ ایضاً ص ۴۸ ۱۴؎ ایضاً ص ۵۰۔

دینیہ کی بے حد ضرورت ہے"[۵۱]

سائنس اور قرآن کے موضوع پر مولانا نے اپنی کتاب میں اچھی بحث کی ہے فلسفیانہ خیالات اور سائنسی تحقیقات کو اسی حد تک گوارہ کیا جاسکتا ہے جب تک کہ وہ شریعت کے تحت ہوں چونکہ انسانی تحقیقات بدلتی رہتی ہیں اسلئے اگر کوئی تحقیق شریعت سے متضاد ہوگی وہ اسلام میں قابل قبول نہیں ہوگی، اس ضمن میں مولانا تحریر فرماتے ہیں:۔

"دوسری بات اسلام میں یہ ضروری ہے کہ علمی تحقیقات کو قطعی اور یقینی عقائد پر ترجیح نہ دی جائے۔ طریقۂ سلامتی یہ ہے کہ جہاں عقل پورا فیصلہ نہ کر سکے اور پورا علم نہ ہوسکے وہاں خاموشی اختیار کرکے یہ کہہ دے کہ "اللہ جانے" حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے

من العلم ان تقول لما لاتعلم "اللہ اعلم" — یہ علم کی بات ہے کہ جو نہ جانتا ہو اسکے متعلق یہ کہدے کہ "واللہ اعلم"

بڑے بڑے اکابر اسلام نے اسی حدیث پر نظر کرتے ہوئے اپنی لاعلمی کا اقرار کیا ہے حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رح سے سوال کیا گیا کہ "دہر کیا چیز ہے؟" آپ نے جواب میں فرمایا کہ "لاادری" (میں نہیں جانتا) حضرت امام مالک سے چالیس مسئلے دریافت کئے گئے، چار کا جواب دیا اور ۳۶ میں لاعلمی کا اظہار کیا یہ حضرات اپنے زمانے میں دین کے ایسے چراغ تھے جن کی روشنی اب تک باقی ہے، کیا ایسے حالات میں اس وقت کے کم مایہ مسلمان کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ ہر چیز کے فیصلہ کے لئے تیار ہو اور بعض اوقات قطعی اور یقینی امور کا اس لئے انکار کردے کہ ماحول اور وقت اسکے خلاف ہے ؎

زمانہ باتو نہ سازد تو با زمانہ ستیز

---

[۵۱] ایضاً ص ۵۲

الغرض مدعا یہ ہے کہ عوام تو سنی سنائی باتوں کے لئے ہوتے ہیں، پڑھے لکھے فلسفی تحقیقات پر قربان ہونے کے لئے تیار ہوجاتے ہیں، مسلمان کو غور کرنا چاہیئے کہ فلسفہ قدیم ہو یا جدید ہمارے یقینی مسائل کی کس قدر موافقت کرتا ہے اور کہاں کہاں مخالفت، موافق ہونے کی صورت میں تو "چشم مار وشن ودل ماشاد" مخالفت کی صورت میں یہ کہنا ضروری ہے کہ انسانی علم بہت محدود ہے اور عقل کو ہر مقام پر دوڑانا عاقل کا کام نہیں،

نہ ہر جائے مرکب تواں تاختن

کہ جاہا سپر باید انداختن[٤٦]

مولانا وجیہ الدین احمد خان صاحب اور تصوف

حضرت مولاناؒ سلسلۂ قادریہ نقشبندیہ مجددیہ میں ایک صاحب نسبت شیخ تھے ویسے تو مولاناؒ کو توسل حضرت مجدد الف ثانی سلاسل اربعہ یعنی چشتیہ، سہروردیہ قادریہ اور نقشبندیہ میں اجازت حاصل تھی لیکن آپ ذکرو اشغال میں مجددیہ ادریہ سلسلہ پر عمل پیرا تھے، اس سلسلہ میں حضرت مجدد الف ثانی تک حضرت مولاناؒ کا شجرہ اس طرح ہے ـــــ حضرت مولانا وجیہ الدین احمد خان صاحب از شاہ ممتاز حسینؒ از مولانا شاہ وزیر محمد خان صاحبؒ، از شاہ خواجہ محمد خان صاحبؒ از شاہ احمد علی خان صاحبؒ از شاہ سلطان امام الدین خان صاحبؒ، از شاہ درگاہی محبوب النبیؒ از حافظ شاہ سید جمال اللہ صاحبؒ از شاہ قطب الدین سید محمد شرف حیدر حسینؒ، از خواجہ محمد زبیر مجددی سرہندیؒ، از خواجہ محمد نقشبندی مجددی سرہندیؒ، از خواجہ محمد معصوم مجددی سرہندیؒ، از امام ربانی مجدد الف ثانی شیخ احمد

---

[٤٦] ایضاً ص ۵۷

فاروقی سرہندیؒ ۱۷ (نوٹ :- حضرت مجدد الف ثانیؒ سے اوپر اس سلسلہ و دیگر سلاسل کے شجرے معروف ہیں وہ کسی بھی ایسی کتاب سے دیکھے جاسکتے ہیں جس میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کے سلاسل کی تفصیل ہو۔ حضرت مولانا وجیہ الدین احمد خاں صاحبؒ نے بھی اپنی تصنیف "فیوضات وزیریہ" میں یہ تفاصیل لکھی ہیں ملاحظہ ہو ص ۲۷۹ تا ص ۳۰۴)

تصوف کے موضوع پر حضرت مولاناؒ کی ایک کتاب "فیوضات وزیریہ" ہے اس میں آپ نے تصوف کی اصطلاحات و دیگر امور بہت سہل انداز میں سمجھائے ہیں، بیعت کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر کرتے ہیں :-

"ایک بیعت "علی الاسلام" ہے، غیر مسلم نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک اور مقدس ہاتھوں پر یا کسی اور بزرگ کے ہاتھ پر بیعت کی کہ میں اسلام قبول کرتا ہوں۔

دوسری "بیعت علی الہجرت" ہے جو انصار نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر کی تھی، کہ ہم اپنے شہر مدینہ میں آپ کو لے جاکر آرام سے رکھیں گے اور جس طرح اپنے بیوی بچوں کی حفاظت کرتے ہیں اسی طریقہ سے آپ کی بھی حفاظت کریں گے اور جو مہاجرین جائیں گے ان کی جانی و مالی خدمت سے دریغ نہیں کریں گے

تیسری "بیعت علی الجہاد" ہے مختلف مواقع پر جب غزوات اور جہاد کی ضرورت پیش آتی تھی تو حضور سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے بیعت لیا کرتے تھے کہ ہم مر جائیں گے مگر راہِ فرار اختیار نہیں کریں گے۔

چوتھی "بیعت علی الخلافت" ہے جو حضور سید الاولین والآخرین رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال شریف کے بعد حضرات خلفائے راشدین رضی اللہ

تعالیٰ عنہم یعنی سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ، سیدنا فاروق اعظم حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ، سیدنا حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے مبارک ہاتھوں پر بیعتیں کی گئیں اور اسی طرح دوسرے حق پرست خلفاء کے ہاتھوں پر بھی بیعتیں ہوتی رہیں۔

پانچویں "بیعت علی الخیر" ہے مسلم شریف میں حدیث مبارک ہے کہ حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین نے فرمایا، نہ جہاد تھا، نہ ہجرت تھی، نہ اسلام میں داخلی تھی لیکن حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے بیعت لی اور ارشاد فرمایا" کہو ہم خیر کے کام کریں گے "۔ مشائخ کرام میں جو بیعت رائج ہے وہ یہی "بیعت علی الخیر" ہے بیعت ایک معاہدہ ہے بندہ اور خدائے تعالیٰ کے درمیان ....

حضرات صوفیہ "بیعت علی الخیر" لے کر اپنے متوسلین کو انھیں اوراد و وظائف کی تلقین فرماتے ہیں جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف مقامات پر حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو تلقین فرمائے تھے ...."[۱]

اپنی اس کتاب میں حضرت مولانا نے گاہ بگاہ متقدمین مشائخ کے کلام کو بطور سند پیش کیا ہے، سلوک اور اسکی اہمیت نیز سیر و سلوک کی قسموں پر بحث کرتے ہوئے حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی کی تحریر بطور تائید پیش کی ہے؛

"......... اور سیر آفاقی کے تمام ہونے کے بعد سیر انفسی میں جس سے مراد سفر در وطن ہے آرام دیتے ہیں۔

هَنِيئاً لِاَربابِ النعيم نعيمها

---

[۱] مولانا وجیہ الدین احمد خاں، فیوضات وزیریہ، رامپور، ص ۹۹ ۔ ۱۰۰ ۔ ۱۰۱ ۔

اس دولت عظمیٰ تک پہنچنا سیدالاولین والآخرین صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع سے وابستہ ہے جب تک اپنے آپ کو پورے طور پر شریعت میں گم نہ کردیں اور اوامر کے بجالانے اور نواہی کے رک جانے سے آراستہ نہ ہوجائیں اس دولت کی بوجان ودماغ میں نہیں پہنچتی باوجود شریعت کی مخالفت کے اگرچہ بال برابر ہی ہو، اگر بالفرض احوال ومواجید حاصل ہوجائیں وہ سب استدراج میں داخل ہیں، آخر اس کو رسوا وخوار کریں گے۔

محبوب رب العالمین حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تابعداری کے بغیر خلاصی ممکن نہیں۔" (مکتوب ۷۸ دفتر اول حصہ اول)[۱۵]

مولاناؒ نے تصوف کے دقیق مسائل کو بھی بڑے سہل انداز میں بیان فرمایا ہے جس سے ایک عام فہم مسلمان بھی استفادہ کرسکتا ہے، لطائف کی تشریح کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

"لطائف خمسہ کی اصلاح کیلئے حضرات نقشبندیہ تدریجی طور پر ہر ایک لطیفہ کا ذکر اور اس کی اصلاح کراتے ہیں۔

غوث زماں قطب عالم مروج شریعت مصطفےٰ قیم طریقہ مجتبیٰ سلطان الاولیاء قطب الارشاد حضرت حافظ شاہ جمال اللہ قدس سرہ الاقدس کے یہاں لطیفۂ قلب کی اصلاح کے ساتھ باقی تمام لطائف کی اصلاح ہوجاتی ہے یعنی لطیفۂ قلب کی اصلاح سے پانچوں لطائف کی اصلاح ہوجاتی ہے اور یہی حدیث شریف کے مطابق ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے۔

---

[۱۵] مولانا وجیہ الدین احمد خاں۔ ایضاً، ص ۱۱۸-۱۱۹-

" إنَّ فِي الجسد لمضغةً اذا اصلحت صلح الجسد كلّه واذا فسدت فسد الجسد كلّه الا وهي القلب" فرمان گرامی کا مطلب یہ ہے کہ جسم میں ایک ٹکڑا ہے اگر وہ درست ہوجائے تو پورا جسم درست ہوجائے اور اگر وہ بگڑ جائے تو پورا جسم بگڑ جائے۔ آگاہ ہوجاؤ وہ دل ہے"۔ . . . . [۱۹]

موضوع سماع پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"کسی شخص کا اشعار کا سننا جس سے ذوق وشوق میں اضافہ ہو سماع کہلاتا ہے، اشعار پڑھنے کے طریقے کبھی متعدد ہوتے ہیں، اور کبھی ایک، کبھی یہ پڑھنے والے مزامیر کا استعمال کرتے ہیں اور کبھی بلا مزامیر ——— عام طور پر متعدد افراد مع مزامیر یہ کام کرتے ہیں (اور) اسی کو سماع اور قوالی کہتے ہیں۔ ایک شخص اچھی آواز اور اچھے ترنم سے اشعار پڑھے اور وہ پوری طرح باشرع ہو، اشعار بھی لغو اور بیہودہ نہ ہوں، نیز اس کے ساتھ مزامیر بھی نہ ہوں تو اس میں کسی کے نزدیک کوئی حرج نہیں۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سیدنا حسان بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اشعار مسجد میں پڑھوائے ہیں۔ بلکہ ان کے لئے منبر بھی بچھوایا ہے، خود بھی حضورؐ نے سنے ہیں اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی سنوائے ہیں، حضرت سیدنا حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے اشعار میں ثنائے باری تعالیٰ نعت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، تعریف اسلام اور مدح قرآن ہوتی تھی . . . .

ہاں ایک یا چند افراد مزامیر کے ساتھ اشعار پڑھیں تو جمہور علمائے کرام رح کے نزدیک یہ ممنوع ہے . . . . حنفیہ کا مذہب ہے کہ وہ جمہور احناف رح کا قول دیکھیں، جمہور احناف رحؒ نے مزامیر کے ساتھ اشعار پڑھنے کی اجازت نہیں دی ہے۔

---

[۱] ایضاً ص ۱۲۳

حضرات صوفیہ کرام میں بھی اختلاف ہے حضرات چشتیہ اسکے جواز کی طرف عموماً رجحان رکھتے ہیں، لیکن جواز کیلئے جو شرائط مشائخ چشت کی کتابوں میں مذکور ہیں وہ اس زمانے میں عموماً مفقود ہیں ـــــــ اس لئے تصوف اور چشتیت کی آڑ لیکر قوالی کے نام کے ساتھ گانا سننا مزامیر کے ساتھ کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ [۲۰]

"وحدۃ الوجود" اور "وحدۃ الشہود" تصوف کے دقیق ترین مسائل میں سے ہیں عوام تو عوام بعض علماء کی بھی رسائی ان تک نہیں ہو پاتی، اس لئے اکابر صوفیاء کا مسلک یہ ہے کہ ان مسائل کی تفصیلات میں عقل نہیں لڑائی جائے بلکہ سالک اگر کسی واصل باللہ شیخ کی رہنمائی میں سلوک طے کر رہا ہے تو اس حال پر پہنچنے پر اس کو خود بخود اس کی حقیقت کھل جائے گی، حضرت مولانا وجیہ الدین احمد خانصاحبؒ بھی اسی مسلک پر تھے چنانچہ "وحدۃ الوجود" اور "وحدۃ الشہود" پر مختصراً تعارفی سطور تحریر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:-

"ہم لوگ حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی قدس سرہٗ کے مبارک سلسلہ سے تعلق رکھتے ہیں، حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی آخری تحقیق اس مسئلہ میں یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ اور اس کی مخلوق میں تباین ہے، بندہ خدارسیدہ ہوسکتا ہے، حقیقۃً خدا نہیں ہوسکتا اور یہی قول جمہور حضرات علماء کرام کا بھی ہے، عام طور پر حضرات علماء کرام رحمۃ اللہ علیہم اجمعین فرماتے ہیں کہ بندہ نہ ذات خداوند قدوس کے ساتھ متحد ہے، اور نہ اس کا وجود اللہ تعالیٰ کے وجود سے متحد ہے بلکہ اس کی حقیقت اور وجود اللہ تعالیٰ کے قریب ہوجاتے ہیں اس لئے ہمارے حضرات مرشدین طریقہ عالیہ رحمۃ اللہ علیہ علیہم فرماتے ہیں کہ جب کسی پر حال طاری ہوگا تو وہ خود سمجھ لیگا اور حال طاری نہ ہو تو بندہ کو ہمیشہ

---

[۲۰] ایضاً ص ۱۳۰ تا ۱۳۲

یہی اقرار کرنا چاہئے کہ میں بندہ عاجز ہوں اور اللہ تعالیٰ قادر مطلق، میں جاہل ہوں اور اللہ تعالیٰ عَالِمُ الغَیْبِ وَالشَّہَادَۃ، میں فانی ہوں اور اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے باقی ہے اور ہمیشہ باقی رہے گا، میری ابتدا بھی ہے اور انتہا بھی، اللہ تعالیٰ کی نہ ابتدا ہے نہ انتہا، اللہ تعالیٰ ازلی ہے اور ابدی۔ کسی چیز میں کسی وقت بھی کسی کا اللہ تعالیٰ محتاج نہیں اور ہم بندگان قدم قدم پر ہر وقت اور ہر چیز میں اسکے محتاج ہیں۔

اور جو شخص عاجزی اور انکساری اختیار کریگا اور تواضع سے کام لیگا تو اللہ تعالیٰ جل شانہ وعم نوالہٗ اسے عروج اور بلندیاں مرحمت فرمائیگا، دنیا کی بلندیاں کسی شکل میں بھی ہوں پانی کی ہبوے کی طرح ہیں، ان کا کوئی اعتبار نہیں — لہٰذا اہل سلسلہ اس مسئلہ میں جو کہ انتہائی دقیق وعمیق مسئلہ ہے ہرگز نہ الجھیں، اور نہ بحث ومباحثہ کریں ورنہ ایمان کا خطرہ ہے[۲۱]

مولاناؒ نے اس کتاب میں تصوف اور صوفیاء کے متعلق اکابر شیخ کے اقوال اور خیالات نقل کئے ہیں بعد میں بطور محاکمہ اپنی رائے درج کرتے ہیں۔

"ان الفاظ کی تشریح وتوضیح میں تفاوت بظاہر معلوم ہوتا ہے مگر یہ واضح رہے کہ مقصد ومدعا سب حضرات صوفیہ رحمۃ اللہ علیہم کا ایک ہی ہے یعنی تصوف نام ہے قولاً، فعلاً، حالاً ہر حال میں اتباع رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا، اور اسی پر ہمیشہ کاربند رہنے کا، جب حضرات صوفیہ برحق رحمۃ اللہ علیہم کے نفوس مقدس ومنور ہو جاتے ہیں، حجابات دور ہو جاتے ہیں اور ہر چیز میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ اتباع کرنے لگتے ہیں تو ایسی حالت میں اللہ جل شانہ وعم نوالہٗ کا ان پر خاص

---

[۲۱] ایضاً ص ۱۳۴-۱۳۵

کرم ہوتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے محبوب بندے بن جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ (اے رسول) کہدیجئے کہ اگر خدا کو دوست رکھوگے تو میری اتباع کرو، خدا تم سے محبت کرنے لگے گا۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت حقیقت میں محبت الٰہی ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کا صلہ ہی محبت خداوندی قرار دیا گیا ہے۔

حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی قدس سرہ نے فرمایا ہے

فاوفرالناس حظا من متابعة	(ترجمہ) پس جو شخص جتنا زائد متبع رسول
الرسول اوفرهم حظا من	صلی اللہ علیہ وسلم ہے اسی قدر زائد وہ محبت
محبة الله تعالیٰ والصوفية	الٰہی کا بھی حصہ دار ہے اور تمام اسلامی گروہوں
من بين طوائف الاسلام	میں صوفیہ ہی نے سب سے زیادہ اتباع رسول
ظفروا بحسن المتابعة	صلی اللہ علیہ وسلم کیا ہے۔ (عوارف المعارف ج۲) ۳۶

اس طرح حضرت مولانا وجیہ الدین احمد خاں صاحبؒ نے اپنی کتاب "فیوضات وزیریہ" میں اکابر مشائخ وصوفیاء کے طرز پر تصوف اور اسکے متعلقات کی وضاحت کی ہے اور اسی تصوف کو رائج قرار دیا ہے جو شریعت کی پابندی کے ساتھ اور شریعت کے تحت ہو، غیر شرعی امور کو تصوف سے خارج قرار دیا ہے۔

حضرت مولانا وجیہ الدین احمد خانصاحب نے زیادہ تصانیف نہیں چھوڑی ہیں کیونکہ انھوں نے اپنا وقت درس وتدریس اور وعظ ونصیحت میں زیادہ گزارا اگر حضرت مولانا تصنیف و تالیف کی طرف زیادہ توجہ دیتے تو یقیناً اس دور کے ایک بڑے مصنف ہوتے۔

مندرجہ بالا سطور سے مولانا کی عظمت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے اسمیں کوئی شک نہیں کہ مولاناؒ نے اس دور میں رامپور کے مسلمانوں کی بالخصوص اور عامۃ المسلمین کی بالعموم جس طرح خدمت کی اور دینی امور میں رہنمائی کی وہ ہمیشہ یاد رکھی جائے گی۔

۳۶۔ ایضاً ص ۱۵۰، ۱۵۱

بقیہ ص ۱۹ (المنتقی خلاصہ منہاج السنۃ ابن تیمیہؒ)

کی ہیں اور ان کے عوام ان کی اسی طرح توقیر کرتے ہیں جس طرح کتاب آسمانی کی بلکہ ان کے مشاہد اور ضریح کے مرتبے مکہ معظمہ بیت اللہ اور ہفت آسمان سے بھی بڑھ چڑھ کر ہیں، خطیب محب الدین کا بیان ہے کہ انھوں نے بچشم خود ۱۱ر محرم ۱۳۶۶ھ کے اخبار پرچم اسلام میں جو ایران سے شائع ہوتا ہے اور جس کی ادارت کے فرائض عبدالکریم فقیہی شیرازی کو مفوض ہیں، فارسی اشعار کے بین السطور میں چند اشعار عربی درج دیکھے ہیں جن کا مطلع یہ ہے ۔

هي الطفوف فطف سبعا بمعناها
فما لمكة معنى مثل معناها
ارض ولكنما السبع الشداد لها
دانت وطأئ اعلاها لادناها

اشعار بالا میں طفوف سے مراد ارض کربلا ہے جہاں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی فرضی قبر بنا کر لکھوکھا اور ملیون رقوم صرف کی گئی ہیں گویا کہ یہ شاعر سامعین اور قارئین کو اس قبر کے گرد سات طواف کرنے کی ترغیب دے رہا ہے، اور کس شدت کے کہتا ہے کہ مکہ میں خانۂ خدا کو وہ مرتبت حاصل نہیں جو اس قبر کی وجہ سے کربلا کی سرزمین کو حاصل ہو گئی، قرینے سے معلوم ہوتا ہے سبع شداد سے کنایہ عرش الٰہی کی طرف ہوگا ۔

ابن مطہر کہتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خلافت اور امامت منصوص نہیں ہے، شیخ الاسلام کہتے ہیں کہ علماء کی اکثریت اس کے منصوص ہونے کی قائل ہے، جبیرؓ ابن مطعم سے امام بخاریؒ روایت کرتے ہیں کہ ایک عورت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتی ہے اور کچھ دریافت کرتی

ہے، آپ واپس جانے کا حکم دیتے ہیں کہ پھر آنا، وہ عورت کہتی ہے۔

ارأیت ان جئت ولم	یعنی وہ عورت کہتی ہے کہ میں دوبارہ آؤں
اجدک کانھا تریدالموت، قال ان لم	اور آپ نہ ملیں (گویا اس کا مقصد یہ ہے کہ آنحضرت ؐ کا وصال ہو چکا ہو) آپ نے فرمایا،
تجدینی فاتی ابوبکر۔	اگر ایسا ہوا تو ابوبکرؓ کے پاس آجانا"۔

اسکے علاوہ شیخ الاسلام نے بڑے بڑے دلائل سکتہ حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کے منصوص ہونے پر پیش کیے ہیں جمہور امت نے آپ کو خلیفہ رسول اللہ کا نام دیا، لغوی طور پر خلیفہ ایسے شخص کو کہتے ہیں جس کو کوئی اپنا قائم مقام بنا دے نہ اس کو جو خود سے بن گیا ہو۔

علاوہ ازیں دوران مرض الموت کی ایک روایت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے منقول ہے

لقد هممت ان ابعث الی	"میں نے ارادہ کیا کہ کسی کو تمھارے
ابیك واخیك واكتب كتابا	باپ اور بھائی کے پاس بھیجوں اور ایک
واعهد عهدا لكيلا يقول قائل	تحریر لکھ دوں اور پکی بات کر دوں تاکہ
انا احق اويتمنى متمن ويابى	کوئی اپنے کو زائد حقدار نہ کہنے لگے اور
الله والمومنون الا ابابکر	کوئی تمنا نہ کرنے لگے، اللہ اور اس کا رسول
* * * *	ابوبکرؓ کے سوا کسی کو خلافت کیلئے پسند نہیں کرتے"۔

کیا اس سے قوی تر فرقہ راوندیہ کے پاس کوئی نص موجود ہے جن کا دعویٰ یہ ہے کہ حضرت عباسؓ کو آپ خلیفہ بنا گئے تھے، اسی طرح روافض کے پاس حضرت علیؓ کی امامت کے متعلق کون سی قوی نص جلی موجود ہے؟ فرقہ راوندیہ والے تو یہاں تک کہتے ہیں کہ حضرت عباسؓ کو فقط خلیفہ بنایا ہی نہیں بلکہ اس کا اعلان بھی فرمایا تھا۔

ابن مطہر کا یہ کہنا کہ " حضرت عمرؓ اور ان کی تائید میں صرف دو چار کا حضرت ابوبکرؓ کی خلافت پر بیعت کر لینا کوئی خاص وزن نہیں رکھتا" شیخ الاسلام فرماتے ہیں کہ صرف چار نے ہی بیعت نہیں کی بلکہ سعدؓ کے سوا جمیع امت محمدیہ موجودہ نے بیعت کی تھی حضرت علیؓ کے ہاتھ پر بیعت سے انکار کرنے والے صحابہ اور تابعین کی تعداد اتنی ہے کہ جس کا صحیح علم سوائے خدا کے کسی کو نہیں۔

ابن مطہر کا یہ کہنا کہ حضرت عثمانؓ کو خلافت کیلئے صرف چند اشخاص نے منتخب کیا تھا، سرتاسر باطل ہے۔

شیخ الاسلام کہتے ہیں جمہور کی رائے ان کے موافق تھی حتیٰ کہ اس رائے سے کسی نے تخلف بھی نہیں کیا پھر احمد ابن حنبل کا قول نقل کیا ہے۔

ما کان فی القوم اوکد بیعتا من عثمان کانت باجماعھم۔ حضرت عثمانؓ کی بیعت سے زائد مضبوط اور کون چیز ہوگی جو اجماع سے ہوئی۔

ابن مطہر کا یہ دعویٰ کہ حضرت علیؓ کی بیعت پر خلق کی خلق اُمنڈ آئی، سراسر باطل ہے، حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد جو دلوں کی کیفیت تھی وہ الم نشرح ہے حضرت طلحہؓ جیسی شخصیت نے بیعت کی بھی تو اس طرح کہ بیان کیا جاتا ہے کہ ان پر اکراہ کیا گیا اور مجبور کئے گئے، حضرت عبداللہ ابن عمرؓ جیسے اکثر صحابہ نے ہاتھ روک لیا پھر جنہوں نے بیعت کی بھی تو بعد کو علیحدہ ہوگئے، اہل شام نے بیعت کی شرط یہ قرار دی کہ جب تک حضرت عثمانؓ کا قصاص نہ لے لیا جائے گا بیعت نہ کریں گے، صورت حالات جب یہ ہو تو خلق خدا کا اُمنڈ آنا بیان کرنا کیا وزن رکھتا ہے۔

(باقی باقی)

علماء عظام اور طلبہ کرام کی سہولت کیلئے ہندوستان میں سب سے پہلی بار بنگلہ اسلامک اکیڈمی کی جانب سے ایک عظیم پیشکش

اشاعۃ الاسلام اسکیم

علماء اور طلبہ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ "بنگلہ اسلامک اکیڈمی" کی جانب سے مذکورہ اسکیم کے تحت گرانقدر اور نایاب کتابیں تھوک قیمت پر دی جارہی ہیں

ضروری وضاحت اور ضوابط: جو حضرات اکیڈمی کی جانب سے شائع کردہ کتابیں "رعایتی" قیمت پر حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ اکیڈمی کی جانب سے فراہم کردہ فارم یا فارم دستیاب نہ ہونے کی صورت میں پسندیدہ کتابوں کے نام کے ساتھ اپنے پتے جلی حروف میں ذیل کے پتہ پر لکھ بھیجیں اور اکیڈمی کے باضابطہ ممبر بنیں۔

بنگلہ اسلامک اکیڈمی، مدنی مسجد، دیوبند، یوپی ۲۴۷۵۵۴

اکیڈمی کی جانب سے شائع شدہ کتابیں جو ۵۰٪ کمیشن سے حاصل کی جاسکتی ہیں

(۱) مرقاۃ شرح مشکوۃ ، عمدہ جلد سنہری ڈائی	۸۰۰/=	۱۱ جلدوں میں
(۲) معارف السنن شرح ترمذی ، عمدہ جلد سنہری ڈائی	۳۵۰/=	۶ جلدوں میں
(۳) المنجد (عربی اردو) عمدہ جلد سنہری ڈائی	۱۲۰/=	
(۴) درس ترمذی شرح ترمذی عمدہ جلد سنہری ڈائی	۱۰۰/=	۲ جلدوں میں
(۵) تنظیم الاشتات شرح مشکوۃ عمدہ جلد سنہری ڈائی	۱۲۰/=	۴ جلدوں میں
(۶) تاریخ اسلام ، اکبر خاں عمدہ جلد سنہری ڈائی	۱۳۰/=	۳ جلدوں میں
(۷) سیرۃ المصطفی عمدہ جلد سنہری ڈائی	۱۱۰/=	۴ جلدوں میں
(۸) اصح السیر عمدہ جلد سنہری ڈائی	۵۵/=	
(۹) خصائل نبوی عمدہ جلد سنہری ڈائی	۳۰/=	
(۱۰) ہدایۃ المقتدی شرح ترمذی	۳۰/=	

آئندہ شائع کیجانیوالی کتابیں جو ممبر بننے پر ۵۰٪ سے زائد کمیشن سے حاصل کیجاسکتی ہیں

(۱) فتح الملہم شرح مسلم (۲) عین الہدایہ شرح ہدایہ
(۳) فتاویٰ شامی (۴) الاتقان فی علوم القرآن (اردو)
(۵) معارف القرآن (اردو) (۶) مشکوۃ شریف
(۷) جلالین شریف (۸) ہدایہ اولین و آخرین

(نوٹ) بذریعہ ڈاک کتابیں منگوانے والے حضرات اصل قیمت کی دس فیصد رقم پیشگی روانہ فرمائیں

دار العلوم دیوبند کا ترجمان

دار العلوم
دیوبند

ماہ صفر المظفر ۱۴۰۹ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۸۸ء

جلد ۷۳ شمارہ ۱۰ | سالانہ ۴۰/- روپے فی شمارہ ۴/-

نگران:۔ حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند

مدیر:۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب قاسمی

سالانہ بدلِ اشتراک غیر ممالک سے

سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ سے	175/-
پاکستان سے	80/-
بنگلہ دیش سے (ہندوستانی)	65/-

◇ سُرخ نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ کا زرِ تعاون ختم ہو گیا ہے۔

فہرست

ہندوستانی و پاکستانی خریداروں سے ضروری گذارش

۱۔ ہندوستانی خریداروں سے ضروری گذارش یہ ہے کہ ختم خریداری کی اطلاع پاکر اول فرصت میں اپنا چندہ نمبر خریداری کے حوالہ کے ساتھ منی آرڈر روانہ کریں۔

۲۔ پاکستانی خریدار اپنا چندہ مبلغ ۷۰/- روپے مولانا عبدالستار صاحب مہتمم جامعہ عربیہ محمودیہ داؤد والا براہ شجاع آباد ملتان، پاکستان، کو بھیجدیں۔

۳۔ خریدار حضرات پتہ پر درج شدہ نمبر محفوظ فرمالیں۔ خط و کتابت کے وقت خریداری نمبر ضرور لکھیں۔

والسلام

منیجر

حرفِ آغاز

حبیب الرحمٰن قاسمی

نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا پاک ارشاد ہے" اِنَّ اللّٰہَ لا یقبض العلم انتزاعًا ینتزعہ من العباد ولکن یقبض العلم بقبض العلماء "(متفق علیہ کمافی المشکوٰۃ) اللہ تعالیٰ علم کو واپس نہیں لے گا کہ لوگوں کے ہاتھوں سے قبض کرے بلکہ علماء کو وفات دیکر علم کو واپس لے لیگا۔

اس حدیث کا ظہور آج کل جس کثرت و شدت سے ہو رہا ہے اس کی مثال اگلے زمانے میں نہیں ملتی۔ علمائے حق جس تیزی کے ساتھ اٹھتے جا رہے ہیں اُسے دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ چل چلاؤ کا یہ سلسلہ اسی رفتار کے ساتھ جاری رہا تو علمی مجلسیں بالکل سونی ہو جائیں گی۔ دور کیوں جائیے اپنے پڑوسی ملک پاکستان پر ہی ایک نظر ڈال لیجئے۔ ابھی ماضی قریب میں وہاں کی علمی محفلیں مولانا محمد ادریس کاندھلوی، مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی، مولانا ظفر احمد تھانوی، مولانا مفتی محمود صاحب، مولانا سید محمد یوسف بنوری محدث، مولانا شمس الحق افغانی، مولانا عبید اللہ انور، مولانا سید حامد میاں وغیرہ جیسے اساطینِ علم و ماہرینِ فن کی حسنات و برکات سے پُر رونق تھیں، مگر دیکھتے دیکھتے یہ سارے بزرگ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اور المیہ یہ ہے کہ انکی خالی جگہیں اب تک پُر نہیں ہو سکیں اور نہ اس کی کوئی اُمید ہی ہے۔

اسی قافلۂ فضل و کمال کے ایک فردِ فرید شیخ الحدیث حضرت مولانا عبد الحق صاحب بانی و مہتمم دار العلوم اکوڑہ خٹک بھی تھے جن کے دم قدم سے وہاں کی مجالسِ علمیہ کا

وقار بڑی حد تک قائم تھا. اور ان پیش رو بزرگوں کے بعد طالبانِ علم کیلئے ان کا وجود وجہ سکون دباعث تسلی تھا. مگر افسوس کہ اکابر واسلاف کی یہ آخری نشانی بھی ۷ ستمبر کو ہماری نگاہوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اوجھل ہو گئی.

مولانا مرحوم علم وفضل، زہد وتقویٰ، اخلاص واستقامت، جرأت وشجاعت اور تواضع وانکسار کے مجسّم نمونہ تھے. ان کی ذات میں علم وعمل کا اس طرح امتزاج تھا کہ ایک کو دوسرے سے علاحدہ نہیں کیا جا سکتا تھا اس قحط الرجال کے دور میں مرحوم کی ذات اصلاح وارشاد اور علم ومعرفت کا مرکز ومحور تھی.

۷ محرم ۱۳۲۷ھ مطابق جنوری ۱۹۱۰ء کو اپنے آبائی وطن اکوڑہ خٹک ضلع پشاور میں آپ کی ولادت ہوئی. ابتدائی تعلیم اپنے علاقہ ہی میں حاصل کی. پھر آگے کی تعلیم کے لئے ملتان پہنچے اور وہاں مولانا عنایت اللہ اور مولانا عبد الجلیل وغیرہ سے ملا حسن تک کی تعلیم مکمل کر لینے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے ہندوستان کے لئے رختِ سفر باندھا. اور میرٹھ دامروہہ کے مدارس میں تحصیلِ علم کے بعد ۱۳۴۷ھ میں ام المدارس دار العلوم دیوبند میں داخل ہو گئے. اور پانچ سال یہاں رہ کر ۱۳۵۲ھ میں حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہٗ سے دورۂ حدیث پڑھ کر سندِ فراغ حاصل کی. حضرت شیخ الاسلام قدس سرہٗ کے علاوہ آپکے اساتذۂ دار العلوم میں حضرت مولانا رسول خاں ہزاروی اور حضرت علامہ محمد ابراہیم بلیاوی رحمہما اللہ بھی شامل ہیں. ۱۳۶۲ھ میں مادر علمی دار العلوم دیوبند ہی میں استاذ مقرر ہو گئے، جس کا سلسلہ ۱۳۶۶ھ تک قائم رہا. چونکہ اسی سال تقسیم ملک کا حادثہ پیش آگیا. اس لئے شعبان کی رخصت کے بعد گھر سے دار العلوم نہ جا سکے. اور مجبوراً یہاں کی تدریس کا سلسلہ منقطع ہو گیا. اسی زمانہ میں پشاور ہی کے ایک اور عالم مولانا عبد الحق نافع گل بھی دار العلوم میں تدریسی خدمات

انجام دے رہے تھے. اسی لئے دونوں حضرات کے درمیان امتیاز کرنے کیلئے مولانا مرحوم کو عبدالحق انفع کہا جاتا تھا. مولانا کا درس نہایت کامیاب تھا. اور تین چار سال کی مختصر سی مدت میں طلبہ آپ کی اعلیٰ صلاحیتوں کے معترف و معتقد ہوگئے تھے.

دارالعلوم دیوبند سے رسمی تعلق منقطع ہوجانے کے بعد دارالعلوم ہی کے طرز پر اپنے آبائی وطن اکوڑہ خٹک میں ایک درسگاہ قائم کی. جو مولانا مرحوم کے جہدِ عمل اور ایثار و اخلاص کی بدولت تھوڑے ہی عرصہ میں علوم دینیہ کا ایک عظیم مرکز بن گیا. اور اس وقت سے ہر سال سیکڑوں تشنگانِ علوم شریعت اس کے چشمہ صافی سے سیراب ہوکر (فارغ التحصیل) تبلیغ دین اور اشاعت علم میں مصروف ہیں.

مولانا مرحوم کے درس کی یہ خصوصیت تھی کہ وہ اپنے تلامذہ کو ذوقِ جہاد اور دین پر مرمٹنے کے جذبہ سے سرشار کردیتے تھے. چنانچہ جہاد افغانستان میں یہاں کے فضلاء و طلبہ نے جس طرح سے فداکارانہ حصہ لیا ہے اس کی نظیر پاکستان کے دیگر مدارس کے طلبہ میں نہیں پائی جاتی.

حضرت مولانا عبدالحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا یہی ایک کارنامہ نہیں ہے بلکہ علوم دین کی اشاعت و تبلیغ کے ساتھ انھوں نے دین کے خلاف اٹھنے والے ہر فتنہ کا مقابلہ بھی کیا. اور ملکی سیاست میں بھی حصہ لیا حتیٰ کہ اسمبلی تک پہنچے اور ایوانِ حکومت میں بھی حق کی آواز بلند کی. پاکستان کے خودسر اور دین بیزار حکمرانوں کے سامنے کلمۂ حق بلند کرکے افضلُ الجہاد کا فریضہ ادا کیا.

۱۹۷۴ء میں جب فتنۂ قادیانیت کے خلاف تحریکِ ختم نبوت چلی تو حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری اور حضرت مولانا مفتی محمود رحمہما اللہ کے شانہ بشانہ مولانا مرحوم نے بھی کام کیا.

مولانا مرحوم کو دارالعلوم اور اکابرِ دارالعلوم بالخصوص حضرت شیخ الاسلامؒ

سے غایت درجہ تعلق اور محبت تھی۔ آپ کی مجلسیں دارالعلوم اور اس کے اکابر کے تذکرے سے معمور رہتی تھیں اور اپنے استاذ حدیث اور پیر و مرشد حضرت شیخ الاسلامؒ کا تذکرہ بڑے والہانہ انداز میں کرتے تھے۔

مولانا مرحوم اگرچہ اصالتاً ایک مدرس تھے، تصنیف و تالیف کے لئے نہ انھیں فرصت تھی اور نہ ہی طبیعت کا اس جانب رجحان تھا۔ پھر بھی تبلیغِ دین کے لیے بعض رسائل اور کتابیں تحریر کیں۔ علاوہ ازیں اسمبلی میں آپ نے جو تقریریں کی تھیں انھیں ہی ان کے صاحبزادے مولانا سمیع الحق صاحب نے مرتب کرکے شائع کر دیا۔ اس طرح سے آپ کے علمی افادات کتابی شکل میں محفوظ ہو گئے ہیں، جن میں تقریر ترمذی مرتبہ مولانا عبدالقیوم حقانی، دعوات حق حصہ اوّل و دوم۔ مقام صحابہ، مسئلہ خلافت و سیادت، ناموس رسولؐ نہایت اہم ہیں اور علمی حلقوں میں وقعت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے اور ان کے لگائے ہوئے گلستانِ علم کو سدا بہار رکھے۔

ربیع الاوّل کا پیغام

مولانا امام علی دانش

مختصر سیرت نبوی ؐ

تمام رسولوں کے سردار نبوت و رسالت کے تاجدار حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ربیع الاوّل کی ۸ یا ۹ یا ۱۲ تاریخ کو پیدا ہوئے اور حیاتِ طیبہ کے تریسٹھ سال پورے کر کے اسی مہینہ کی ۱۲ تاریخ کو پیر کے دن چاشت کے وقت چودہ دن بیمار رہکر اس عالم ظاہر سے رحلت فرمائی اور رفیقِ اعلیٰ کے جوار رحمت میں سکونت اختیار فرمائی۔ آپ کی زندگی کے چالیس سال اس حالت میں گذرے کہ مکہ مکرمہ کے تمام رہنے والے آپکی خوش اخلاقی، نیک کرداری اور صداقت و دیانت سے بے حد متأثر تھے۔ آپکا ادب و احترام کرتے تھے۔ الصادق والامین کے القاب سے پکارتے تھے۔ جب عمر شریف کے چالیس سال گزر گئے تو پیر کے دن ۱۷ رمضان کو وہ بڑی دولت عطا ہوئی جو ازل ہی سے آپکے لئے مقدر تھی۔ جس کیلئے حضرت ابراہیم خلیل اللہ نے دعا مانگی جس کی بشارت عیسیٰ ابن مریمؑ نے سنائی یعنی اللہ تعالیٰ نے آپکے پاس غارِ حرا میں حضرت جبرئیلؑ کو بھیجا اور تمام عالم کے لئے مبعوث ہونے کا پیغام آپ تک پہنچایا۔ بالفاظِ دیگر وحی کے نزول کا سلسلہ شروع ہوا۔ حکم خداوندی کے مطابق پہلے آپ نے خفیہ تبلیغ فرمائی۔ پھر پیغام حق علانیہ طور پر پیش فرمایا۔ توحید و رسالت کا پیغام سنکر اپنے پرائے ہو گئے جو آجتک سچا اور امانت دار کہتے تھے وہ شاعر، ساحر

اور کاہن کہہ کر مطعون کرنے لگے۔ آپ کو اور آپ پر ایمان لانے والوں کو ہر طریقے سے پریشان کیا جانے لگا۔ پورے تیئیس ۲۳ سال تک آپنے بڑی شفقت، بڑی راحت، بڑی جاں فشانی، بڑی جفاکشی کے ساتھ رسالت کی ذمہ داریوں کو ادا فرمایا۔ ایمان لانے والوں کی تعداد برابر بڑھتی رہی، شمعِ رسالت کی روشنی برابر پھیلتی رہی اور عاشقانِ رسول دین کیلئے برابر قربانیاں پیش کرتے رہے۔ دین کیلئے وطن چھوڑنے کا حکم آگیا پہلے اہلِ ایمان نے حبشہ کی طرف ہجرت کی پھر جب مدینہ منورہ میں اسلام کی دعوت پھیلنی شروع ہوئی، مسلمانوں نے مدینہ طیبہ کی طرف کوچ کرنا شروع کیا۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو تیرہ سال مکہ معظمہ میں تبلیغ فرماتے ہوئے گزر گئے آپ کو بھی مدینہ منورہ تشریف لے جانے کی اجازت حاصل ہو گئی۔ ایک رات جب دشمنانِ دین نے آپ کی قیام گاہ کا محاصرہ کر لیا اور نعوذ باللہ چراغِ نبوت گل کرنے کے عزم سے تلواریں نیام سے نکال کر کھڑے ہو گئے۔ ایسی حالت میں حکمِ خداوندی آپنے حضرت علی رضؓ کو اپنے بستر پر سونے کا حکم دیا اور تاکید کر دی کہ میرے پاس جو امانتیں رکھی ہیں اُن کو واپس کر کے تم بھی مدینہ چلے آنا۔ اللہ اللہ کیا امانتداری کا خیال ہے۔ خون کے پیاسوں کی امانتیں ادا کرنیکا حکم دیکر تشریف لئے جارہے ہیں آپ سورۂ یٰسین شریف کی تلاوت فرماتے ہوئے قیام گاہ سے باہر تشریف لے گئے۔ دشمنوں کو پتہ بھی نہ چل سکا۔ سچے پکے مخلص دوست اور خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر صدیقؓ اکبر کو ساتھ لیکر سرکار نے ہجرت فرمائی۔ غارِ ثور میں تین دن یہ آفتاب و ماہتاب جلوہ فرما رہے اس کے بعد مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔ وہاں پہنچکر چند یوم حضرت ابو ایوب انصاریؓ کے مکان پر قدرت کے اشارے سے قیام فرمایا۔ پھر ایک زمین خرید کر اس پر مسجد نبوی تعمیر کی اور اپنے رہنے کے لئے مستقل حجرے بھی بنوائے۔ دس برس مدینہ طیبہ میں قیام رہا۔ اُنیس لڑائیاں بھی اس مدت میں دشمنانِ دین کی شرارت

کے نتیجہ میں آپ کو لڑنی پڑیں، جن میں غزوات بدر و اُحد و احزاب و خیبر زیادہ مشہور ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ تعداد اور سامان کی کمی کے باوجود فتح و کامرانی نصیب فرمائی۔ آپ نے صلح حدیبیہ کے بعد دُنیا کے اہم بادشاہوں اور حاکموں کے پاس اسلام کی تبلیغ کے دعوت نامے بھی روانہ کئے۔ دین پھیلانے کے لئے وفود بھی بھیجے۔ پیغام حق پھیلانے کی تمام ممکنہ کوششیں فرماتے رہے۔ دین کے دشمنوں نے ہر قسم کی سازش کی۔ قتل کرنے، زہر دینے، جنگوں میں محصور کرکے نعوذ باللہ مٹا ڈالنے کی کوششیں مخالفین کرتے رہے۔ اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا تھا کہ آپ کا کوئی کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ آپ ہماری حفاظت میں ہیں۔ وعدۂ خداوندی پورا ہوا۔ مکہ معظمہ پر مسلمانوں کو غلبہ حاصل ہوگیا، جس کے بعد یدخلون فی دین اللہ افواجا یعنی لوگوں کے فوج در فوج دین میں داخل ہونے کا منظر سامنے تھا۔ جزیرۃ العرب میں اسلامی پرچم لہرانے لگا۔ آخری حج میں ہجرت کے دسویں سال عرفات کے میدان میں جہاں ایک لاکھ چوبیس ہزار صحابہ کرام رضہ ایک قول کے مطابق جمع تھے، آپ نے بہت جامع آخری نصیحتیں فرمائیں۔

حجۃ الوداع کا خطبۂ نبوی

سب سے پہلے تین مرتبہ فرمایا اللہ اکبر اللہ اکبر اللہ اکبر پھر ارشاد ہوا۔

"ایک اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اس نے اپنا وعدہ پورا کیا، اپنے بندوں کو کامیاب کیا، وہی حمد کا مستحق ہے، ہم اُسی کی حمد کرتے ہیں، اُسی سے مدد چاہتے ہیں، اُسی سے مغفرت طلب کرتے ہیں اور گواہی دیتے ہیں کہ اُس ایک معبود کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور محمد اس کے بندے اور رسول ہیں۔"

اس کے بعد مجمع کو مخاطب کرکے فرمایا "لوگو! میں تمہیں خدا سے ڈرنے کی وصیت کرتا ہوں۔ دیکھو یہ چار چیزیں ہیں۔ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنانا،

کسی کی ناحق جان مت لینا، زنا نہ کرنا، چوری سے بچنا۔ اے لوگو! میرے بعد کوئی نبی نہیں اور تمہارے بعد کوئی نئی اُمّت نہیں۔ کیا تم سُنتے نہیں لوگو! سنو اپنے رب کی عبادت کرو، پانچوں نمازیں ادا کرو، رمضان کے روزے رکھو، زکوٰۃ ادا کرو۔ اور جس کو تم نے ذمہ دار امیر بنایا ہے اس کی فرمانبرداری کرو اور اپنے رب کی جنّت میں خوشی خوشی داخل ہو جاؤ۔

لوگو! میری سنو! اس کے بعد شاید تم مجھے نہ دیکھو گے۔ اپنی عورتوں پر تمہارا حق ہے اور ان کا تم پر حق ہے۔ تمہارا حق عورتوں پر یہ ہے کہ وہ تمہاری آبرو کی حفاظت کریں، کوئی بدکاری عمل میں نہ لائیں۔ عورتوں کا حق تم پر یہ ہے کہ خوش دلی سے کھانا کپڑا دو، عورت اپنے گھر سے شوہر کے مال میں سے اس کی اجازت کے بغیر کچھ خرچ نہ کرے۔ عورتوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو وہ خدا کی بندیاں ہیں۔ خدا نے تم کو بڑائی دی ہے عورتوں کے معاملہ میں خوفِ خدا سے کام لو ——— اے لوگو! سنو اللہ کے راستہ میں جہاد کرنے میں ایک شام یا ایک صبح چلنا بھی دنیا اور دنیا کی سب دولتوں سے بڑھ کر ہے۔ اے لوگو! میری سنو! کامیاب زندگی پاؤ خبردار ظلم نہ کرنا خبردار ظلم نہ کرنا، خبردار ظلم نہ کرنا۔ کسی کا مال اسکی رضامندی کے بغیر لینا جائز نہیں خبردار خبردار میرے بعد گمراہ اور کافر مت ہو جانا کہ آپس میں ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو خوب سمجھو اور یاد رکھو ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ سب مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ دیکھو کسی پر ظلم مت کرنا، کسی کی آبروریزی نہ ہو۔ میں تم میں دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں، انھیں مضبوطی سے پکڑے رہو گے تو کبھی گمراہ نہ ہو گے (۱) کتاب اللہ (۲) اپنی سُنّت۔

اے لوگو! بتاؤ میں نے خدا کے احکام پہنچا دیے۔ جب تم سے میری بابت سوال ہوگا تو کیا کہو گے۔ سب نے جواب دیا ہم گواہی دیں گے کہ آپ نے پیغام پوری طرح پہنچا دیا

امانت ادا کر دی، نصیحت میں کوئی بھی کوتاہی نہیں کی۔ اس پر آپ نے فرمایا:۔ اے خدا گواہ رہ اے خدا گواہ رہ اے خدا گواہ رہ۔ پھر صحابہ کرام سے مخاطب کر کے فرمایا۔ **دیکھو جو یہاں موجود ہیں وہ یہ باتیں ان سب کو پہنچا دیں جو یہاں نہیں ہیں۔"**

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تکمیلِ دین کی بشارت دیکر اور دینِ حق مکمل طور پر صحابہ کرامؓ کے سپرد فرما کر آخرت کی طرف سفر فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کا ازلی فیصلہ یہی تھا کہ آپ کے ذریعہ دین صحابہ کرام تک پہنچے گا۔ اور صحابہ کرام کے ذریعہ دین تمام دنیا میں پھیلے گا، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

صحابہ کرامؓ نے بعثتِ نبوی کے مقاصد کو سمجھا اور آپ کے پیغام کو پوری دنیا میں پیش کرنے کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

بعثتِ نبوی کے مقاصد

بعثتِ نبوی کے خاص طور پر یہ مقاصد تھے جو کلامِ ربانی میں بیان ہوئے ہیں

ارشاد ہوتا ہے:

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ إِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ أَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ج وَإِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝

(آل عمران)

حقیقت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر احسان کیا جب کہ ان میں ان ہی کی جنس سے ایک ایسے پیغمبر کو بھیجا کہ وہ ان لوگوں کو اللہ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں اور ان کا تزکیہ کرتے ہیں اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتے ہیں اور یقینی طور سے اس سے قبل یہ لوگ صریح گمراہی میں تھے۔

اس آیتِ کریمہ میں رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے چار مقاصد بیان

ہوئے ہیں۔ (۱) تلاوتِ آیات یعنی اللہ تعالیٰ کی آیتیں پڑھ کر سُنانا جن کے ظاہری معنیٰ اہلِ عرب خود ہی اہلِ زبان ہونے کے سبب سمجھ لیتے تھے اور اُن پر عمل کرتے تھے۔

(۲) تزکیہ نفوس یعنی نفسانی آلائشوں بُرے عقیدوں اور بداخلاقیوں اور تمام اقسامِ شرک و معصیت سے پاک کرنا اور دلوں کو صاف کرکے روشن کر دینا، یہ چیز آیاتِ خداوندی پر عمل کرنے سے اور حضور کی توجہ اور فیضِ صحبت سے باذنِ اللہ حاصل ہوتی رہی۔

(۳) تعلیم کتاب یعنی کتاب اللہ کی مراد بتانا (۴) تعلیم حکمت یعنی دین کی گہری باتیں سکھانا۔ قرآن کے اسرار و حکم پر مطلع کرنا رموزِ شریعت سے آگاہ کرنا۔

صحابہ کرام کی جامعیت اور اُمتِ مُسلمہ کی ذمہ داری

صحابہ کرام رض میں تعلیم و صحبتِ نبوی کی برکت سے جامعیت پیدا ہوگئی تھی وہ بعثتِ نبوی کے مقاصد کے حامل امانتدار تھے۔ ان حضرات نے اگر کسی جگہ فاتح و حکمراں کی حیثیت سے قیام کیا وہاں اسلام کے عادلانہ نظام کو قائم کرکے اسلام پھیلایا۔ اور جہاں تاجروں کی حیثیت سے پہنچے وہاں صداقت و دیانت کے جوہر دکھا کر اسلام کی طرف لوگوں کو راغب کیا اور جہاں درویش بن کر جلوہ فرما ہوئے وہاں اپنی کرامات سے اسلام کی دعوت کو غلبہ دلایا۔ غرضیکہ وہ حضرات پیغامِ نبوی کے امین و حامل اور پاسبان و مبلغ تھے اُن کے ذریعہ تمام دُنیا میں دین کی دعوت کا آوازہ بلند ہوا۔

صحابہ کرام کے بعد تابعین و تبع تابعین کے دور میں درجہ بدرجہ پیغامِ حق کی دعوت و تبلیغ، کتاب و سُنّت کی تعلیم و اشاعت اور تزکیہ نفوس کا سلسلہ جاری رہا۔ جامع الصفات ہستیوں کے رخصت ہونے پر ایک ایک جماعت نے ایک ایک کام کو سنبھال لیا اور بفضل اللہ دین کی روشنی برابر پھیلتی رہی اور سعادتمند دلوں میں اسلام

کی دعوت کو قبول کر کے فلاحِ دارین کی دولت کماتی رہیں. آج بھی اُمّتِ مسلمہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے دین میں کسی کمی اور زیادتی کے بغیر پورے اسلام کا پیغام بندوں تک پہنچانے کی ذمہ داری اپنے اپنے منصب و مقام کے لحاظ سے ادا کر کے سرخروئی حاصل کریں.

عید میلادُ النبی کی حیثیت اور محبتِ نبوی کا تقاضہ

ربیع الاول کا مہینہ آتے ہی محبت و عقیدتِ نبوی کے نام پر ذکر ولادت باسعادت کی محفلیں اور سیرت کے جلسے منعقد کرنیکا رواج بڑھتا جارہا ہے. بعض مقامات پر عید میلاد النبی بڑے جوش وخروش سے منائی جاتی ہے جلوس نکالے جاتے ہیں، سبز پرچم لہرائے جاتے ہیں، چراغاں کیا جاتا ہے. جبکہ حقیقت یہ ہے کہ جشن میلاد النبی کی یہ تقریبات صحابہ کرام اور تابعین و تبع تابعین کے خیر و برکت والے زمانہ میں قطعی منعقد نہیں ہوتی تھیں، جو حضرات اس قسم کی نمائشی رسمی ورواجی تقریبات کے پُرجوش حامی ہیں وہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ یہ رسمی سلسلے اسلام کی ابتدائی صدیوں میں موجود نہ تھے بلکہ عیسائیوں کی دیکھا دیکھی عید میلادُ النبی منانے کا سلسلہ شروع ہوا ہے. سیرۃ شامی میں ابن جزری متوفی ۸۳۳ھ کا قول نقل کیا ہے، جس میں عیسائیوں کی مشابہت کا اعتراف موجود ہے. لکھتے ہیں:

اذا کان اھل الصلیب اتخذ ولیلۃ مولود بینھم عیداً اکبر فاھل الاسلام اولیٰ بالتکریم واجدر

یعنی جب صلیبی عیسائیوں نے اپنے نبی کی ولادت کی رات کو عید اکبر بنایا ہے تو اہلِ اسلام زیادہ حقدار ہیں کہ عزت و اکرام کے طور پر اپنے نبی کی ولادت کو عید اکبر بنائیں.

انوار ساطعہ ص۱۶۱ پر مولوی عبدالسمیع رامپوری نے اعتراف کیا ہے کہ:

"اور بادشاہوں میں اول بادشاہ ابو سعید مظفر نے مولود شریف تخصیص و تعین کے ساتھ ربیع الاول میں کیا"

مجلسِ مولود کے موجد عمر ابن محمد موصلی غیر مقلد ہیں اور اس کو اوّل رواج دینے والے اربل کے بادشاہ مظفر الدین ابو سعید ہیں جو غیر مقلد تھے۔ اور مولود کی پہلی کتاب عمر ابن حسن ابن دحیہ کلبی اندلسی نے لکھی جو غیر ثقہ شخص تھے۔ قیام کی ابتدا علامہ سبکی رح کی طرف منسوب ہے۔ جبکہ سبکی مرحوم نے ایک قصیدہ نعتیہ دورانِ تدریس سُن کر غلبۂ حال میں قیام کیا تھا جس کا مروّجہ قیام سے کوئی تعلق و ربط نہیں ہے۔

بہرحال ربیع الاوّل کی مروّجہ تقریبات و رسومات سے محبت و عقیدتِ نبوی کا حق ادا نہیں ہوسکتا۔ سب سے زیادہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت صحابہ کرام کو تھی۔ ان کے بعد تابعین کو پھر تبع تابعین کو، پھر درجہ بدرجہ مشائخ ربانی اور علمائے حقانی کو محبتِ نبوی کی دولت حاصل ہوتی رہی ہے۔

دورِ حاضر کا تقاضہ یہ ہے اور یہی کتاب و سُنّت کا بنیادی مطالبہ ہے اور اسی میں نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام و اسلاف امت کی اتباع و خوشنودی ہے کہ ہم کتاب و حکمت کی تعلیم اور آیاتِ ربّانی کی تلاوت اور تزکیۂ نفوس کی خدمت میں مشغول ہوکر دین کے حامل بنے رہیں اور خود بھی رضائے خداوندی حاصل کریں۔ اور دوسروں تک بھی وہ امانت پہنچائیں جس کی حامل اُمّتِ مسلمہ بنائی گئی ہے۔ یہی تعلیمی و دعوتی خدمت ربیع الاوّل کا پیغام ہے۔ اللہ تعالیٰ توفیق بخشے اور قبول فرمائے۔ آمین!

قسط ۲

مولوی اختر امام عادل قاسمی معین المدرس دارالعلوم دیوبند

سُنّت کی بحث

دوسرا اصول جو حضرت قاسم العلوم کے علوم میں انتہائی اہم ہے، وہ ہے سنت کی بحث،

سنّت کا عام مفہوم کتابوں میں اور لوگوں کی زبانوں پر صرف اتنا ہے کہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقۂ زندگی تھا، وہ سنتِ نبوی ہے، اور اس پر عمل کرنا اور آپ کے نقوشِ قدم پر چلنا اللہ کے نزدیک پسندیدہ ہے۔

مگر حضرت حجۃ الاسلام نے اپنی مخصوص مجتہدانہ ومفکرانہ صلاحیت اور علوم اسلامیہ کے وسیع مطالعہ کی بنیاد پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کو چار حصّوں میں تقسیم کیا ہے۔

ان قسموں کو سمجھنے سے قبل ایک بنیادی بات کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ ہر چیز کی ایک ظاہری شکل وصورت ہوتی ہے، جس کو قالب اور جسم کہتے ہیں، اور دوسری اس کی حقیقت و ماہیت جسے علمی اصطلاح میں روح کہا جاتا ہے، جبتک کسی چیز میں یہ دونوں امور جمع نہ ہوجائیں، اس وقت تک وہ وجود پذیر نہیں ہوسکتی، بدیہیات اور محسوسات میں اس کی بہت سی مثالیں ہیں۔ ایک انسان اس وقت تک زندہ نہیں رہ سکتا، جبتک کہ اس کیلئے جسم اور روح دونوں

جمع نہ ہوجائیں۔ صرف روح ہو یا صرف جسم ان دونوں صورتوں میں انسانوں کا وجود ناممکن ہے۔

غیر مادی امور اور مذہبی احکام میں بھی یہی دستور الٰہی جاری ہے۔ کہ جبتک ان کیلئے جسم و روح دونوں کا اجتماع نہ ہو جائے، وہ وجود پذیر نہیں ہو سکتے۔ اب یہ انسان کے تتبع اور تلاش پر موقوف ہے کہ کس غیر مادی امر اور حکم میں روح کیا ہے؟ اور جسم کیا ہے؟ پھر ان دونوں کے درمیان کیسا ربط ہے؟ اگر ان دونوں کے درمیان جدائی ہو جائے، تو کیا اس کا وجود ممکن ہے؟ یا ایک جسم کو چھوڑ کر دوسرے جسم کا لبادہ چڑھا دیا جائے، تو روح کی روحانیت اور حقیقت پر کچھ فرق تو نہیں پڑیگا؟ یہ تفصیلات اپنی جگہ پر ہیں، لیکن بہرحال یہ مسلّم ہے کہ بدیہیات کی طرح روحانیات اور احکام الٰہی میں بھی جسم و روح دونوں ضروری ہیں ——— اس بات کو ذہن نشین کرنے کے بعد اگلی باتیں سُنئے۔

سُنّتِ نبوی ایک غیر مادی چیز ہے، اور اللہ پاک کا مطلوبہ امر ہے، اس کیلئے بھی جسم اور روح ضروری ہیں۔ البتہ جسم اور روح کے باہمی رشتے کی نوعیت کی بنیاد پر حکم میں فرق ہو سکتا ہے۔

جسم و روح کے اسی تعلق کے اعتبار سے سُنّت کی چار قسمیں ہو جاتی ہیں۔

(۱) پہلی قسم۔ نمبر اول پر وہ سُنّت ہے، جس کی روح اور جسم دونوں خدائے پاک کو مطلوب ہوں۔ یعنی جبتک انسان اس سُنّت کے جسم و روح دونوں خدا کی درگاہِ بے نیاز میں پیش نہیں کر دے گا اس وقت تک وہ اپنے فریضہ سے سبکدوش نہیں سمجھا جائے گا ——— مثال کے طور پر نماز، روزہ وغیرہ احکام جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عملی طور پر اُمّت کے سامنے پیش کیے، اور ان کی صورتوں اور شکلوں کا تعین کیا، اُن کے لئے ظاہری حدود قائم کیے، ان کے ہر چہار جانب

کچھ خطوط اور زاویے بنائے، جس میں اس کی وضاحت مقصود تھی، کہ انکی حدود سے تجاوز یا اپنی طرف سے صورتوں اور شکلوں کا تعین کسی کے لئے جائز نہیں ہے۔
دوسری طرف اس کی روحانیت اور حقیقت کی نشان دہی کی گئی کہ جبتک اس حقیقت اور روح کی رعایت نہیں کی جائے گی، سارے ارکان و آداب بے جان اور لاحاصل ہیں ——— نماز کے لئے ظاہری جسم کی حیثیت سے کچھ ارکان و شرائط، مستحبات و آداب مقرر فرمائے گئے، اور اس کی روح یہ بتائی گئی کہ نماز کے اندر ذکرِ باری، خشوع خضوع عبدیت و نیازمندی، گریہ وزاری، خدا کی نسبت احساسِ کبریائی، اور اپنی طرف احساسِ بندگی و نیستی، جبتک موجود نہ ہوں، نماز بے روح اور بے جان ہے، اور اس مُردے لاشے کی طرح ہے جو کندھوں کے سہارے تو ضرور چل سکتا ہے، لیکن اپنے سہارے اس کے اندر ایک قدم آگے بڑھنے کی طاقت نہیں ہے۔
اسی طرح روزہ کیلئے بھی حدود ارکان متعین کئے گئے، اور اس کی شکل وصورت قائم کی گئی، پھر اس کی روح یہ بتائی گئی کہ محبت الٰہی خدا کی راہ میں مرمٹنے کا جذبہ، عشقِ الٰہی میں تڑپنے اور تڑپتے رہنے کا شوق اور خدا کی مطلوبات کے بالمقابل اپنی تمام تر نفسانی خواہشات کو تج دینے کا بے تاب ذوق نہ ہو، وہ روزہ صرف بھوکا، پیاسا رہنا تو ضرور ہو سکتا ہے، لیکن خدا کے مطلوبہ معیار کے مطابق اللہ کے یہاں پہنچ نہیں سکتا۔
غرض یہ سنتیں ایسی ہیں، جس میں روح اور جسم دونوں مطلوب ہیں۔ یعنی جو جسم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے مقرر کیا گیا ہے اور جس روح کی نشاندہی دربارِ نبوت سے ہو چکی ہے، انہی دونوں کی رعایت لازمی ہے، کوئی نیا جسم ہرگز کافی نہیں ہے، ان کے روح اور جسم کے درمیان لزوم کا تعلق ہے جس طرح روشنی آفتاب سے

اور خوشبو پھول سے الگ نہیں ہوسکتی، اسی طرح مطلوبہ روح، مطلوبہ جسم سے الگ نہیں ہوسکتی۔ وہ روح پیدا ہوسکتی ہے تو اسی جسم کے اندر جو شریعت نے مقرر کی ہے، کسی اور جسم کے اندر اس روح کو تلاش کرنا حماقت و جہالت ہے ـــــــ وہ لوگ جھوٹے ہیں جو نماز کی ظاہری ہیئت وصورت کو ضروری قرار دیئے بغیر محض ذکرِ الٰہی کو فریضۂ صلوٰۃ کی طرف سے کافی سمجھتے ہیں۔ وہ صرف ذکرِ باری کرکے فریضۂ نماز سے کبھی سبکدوش نہیں ہوسکتے۔ اسی طرح وہ لوگ بھی سخت دھوکے اور جہالت میں ہیں، جو نماز کی ظاہری شکل وصورت اور اس کے ارکان و شرائط کو ٹریننگ کورس سے تعبیر کرتے ہیں، کہ مقصد اور روح اس نماز کی احیاءِ دین ہے۔ گویا اس مقصد کے حاصل ہوجانے کے بعد اس کی ظاہری ہیئت غیر ضروری ہوجاتی ہے۔ یہ دین کی غلط تعبیر ہے، کیونکہ نماز کی روح اور جسم دونوں یکساں طور پر اللہ کو مطلوب ہیں۔ ورنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر ذاکر و شاغل اور احیاءِ دین کے جذبے سے سرشار کون ہوسکتا ہے۔ مگر پوری تاریخ میں کبھی یہ ثابت نہیں کیا جاسکتا کہ صرف ذکر پر، یا کسی جہادی و جنگی صورت میں احیاءِ دین پر اکتفا کرکے آپ نے نماز ترک کردی ہو۔ بلکہ تاریخ کی روشنی میں تو یہ دکھائی دیتا ہے کہ ایک طرف میدانِ جہاد کی سرگرمیاں اور تیغ و تفنگ کی آزمائشیں ہیں تو دوسری طرف اسی میدانِ جہاد میں نمازیوں کی صف بستہ قطاریں ہیں۔ ـــــــ یہ واضح دلیل ہے کہ اللہ اور رسول کو نماز کی روح کے ساتھ اس کی صورت بھی مطلوب ہے۔ اور ان دونوں کے درمیان اسی طرح کا رشتہ ہے جس طرح کہ آفتاب کی کرنوں کو آفتاب کے ساتھ ہے، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ہے۔

(۲) **دوسری قسم:** نمبر دو پردہ سُنّت ہے، جس کی صرف خصوصیات اور ظاہری جسم مطلوب ہیں، مگر جسم کا مطالبہ اور خصوصیات کی مانگ اس پر موقوف ہے کہ

بندہ کو اس جسم کی روح، اور ان خصوصیات کے مبادی کا بھی علم ہو، اگر روح کا علم نہ ہو تو جسم کی ضرورت ہی کیا ہے، اور جسم بغیر روح کے کس کام ہی کا ہے، اسلئے سُنّت کی اس قسم کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کے مبادی اور روحانیت کا علم ہو. ورنہ بندہ اس کا مکلّف نہیں ہو سکتا۔

مثال کے طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی جو خصوصیات ہیں اور خصوصی طور پر آپ سے جو مطالبے کئے گئے ہیں یا آپ نے مختلف اوقات و مقامات پر مختلف دعائیں مانگی ہیں اور ذکر و اذکار کئے ہیں. یہ سب ظاہری صورتیں اور شکلیں اس پر موقوف ہیں کہ ان کے مبادی اور اس کی حقیقت و روحانیت کا علم بندے کو ہو جائے. سرکارِ دو جہاں صلے اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر خدا کا مقبول و مقرب کوئی نہیں ہے، آپ کو بے حجابانہ قرب کا جو مقام حاصل تھا، وہ مخلوقات میں کسی کو حاصل نہیں ہے، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اللہ پاک کے مختلف شئون و صفات جو کل یوم ھو فی شان میں بیان کئے گئے ہیں، یہ جس قدر آپ پر منکشف ہو سکتے ہیں وہ دوسروں پر نہیں ہو سکتے، اور اللہ پاک کی انہی مختلف شانوں اور صفات کے مطابق رسولِ پاک صلے اللہ علیہ وسلم نے موقعہ و محل کی مناسبت سے جو مختلف دعائیں مانگی اور مختلف انداز کے اذکار کئے ہیں یہ عام امتیوں پر لازم نہیں جبتک کہ خود ان کو ان شئون باری، صفاتِ خداوندی اور تجلّیاتِ ربّانی کا مشاہدہ نصیب نہ ہو جائے۔

یہیں سے وہ اختلافی مسئلہ بھی حل ہو گیا کہ نماز کسوف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تعددِ رکوع کی روایات منقول ہیں کہ آپ نے اس میں ایک رکوع پر اکتفاء نہ کیا، بلکہ ہر رکعت میں کئی رکوع کئے. اور بعض روایات میں ایک رکوع کا بھی تذکرہ ہے. اس اختلاف کے وقت اگر واقعہ کا تعدّد تسلیم کر لیا جائے تو

اس مقام پر یہ کہنے میں کوئی جھجک نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ کبھی ایک بار رکوع کرنا اور کبھی متعدد بار رکوع کرنا بھی ان مشاہدات و انکشافات کی بنا پر تھا جو اس وقت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو تجلیاتِ ربانی اور شئونِ الٰہی کے نصیب ہوئے تھے، جس وقت خدا کی شان نے تعددِ رکوع کا تقاضا کیا، وہاں آپ نے ایک سے زائد رکوع کیے۔ اور جس وقت اس قسم کی شان وصفت کا ظہور نہیں ہوا وہاں عام دستور کے مطابق صرف ایک رکوع پر اکتفا کیا ——— اب دیکھئے کہ عام دستور تو ایک رکوع کا ہے، جو اصل ہے۔ اور رہا تعددِ رکوع تو وہ شئون وصفات کے مشاہدے اور انکشاف پر موقوف ہے، جو اس تعدد کی روح اور مبادی ہیں۔ جب تک یہ مبادی کسی انسان کو میسر نہ آجائیں، اس کے بغیر تعددِ رکوع کا مطالبہ نہیں کیا جا سکتا، اور نہ اس کی اجازت دی جا سکتی ہے، اس لئے کہ جسم بغیر روح کے مُردہ ہوتا ہے جو سراسر مہمل ہے۔ اس وقت غور کیجئے کہ دوسرے ائمہ کا نمازِ کسوف میں تعددِ رکوع کا قائل ہونا، حقیقت و اعتدال کے کس درجہ میں ہے اس کو سمجھنا کوئی مشکل نہیں۔

(۳) **تیسری قسم**: نمبر تین پر وہ سُنّت ہے جس کی ظاہری شکل وصورت اور ظاہری آداب وارکان شارع کو مطلوب نہیں ہیں، بلکہ اس کے ظاہری جسم میں جو روح اور حقیقت کارفرما ہے صرف وہی مطلوب ہے۔ یعنی اس سنّت کی ادائیگی صرف اس پر موقوف ہے کہ وہ روح حاصل ہو جائے، اگرچہ وہ ظاہری شکل وصورت جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیاتِ طیبہ میں وقتی مصلحت کے پیشِ نظر متعین فرمائی تھیں وہ حاصل نہ ہو سکیں۔ اس سنّت کے جسم و روح کے درمیان ایسا لزوم نہیں ہے کہ بغیر مقررہ جسم کے وہ روح حاصل ہی نہ ہو سکے، بلکہ یہاں صرف اس سُنّت کی روحانیت مطلوب ہے، خواہ وہ کسی صورت وشکل میں حاصل ہو۔ اسی

صورت وشکل میں ہو، جو سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں تھی یا کسی دوسری صورت وشکل میں، جو اس وقت کی مصلحت اور ضرورت کا تقاضا ہو۔ ادائیگی کی دونوں صورتیں کافی ہیں۔ یہاں جسم کیلئے کوئی ضابطہ اور قید نہیں ہے۔ ضابطہ اور حد بندی ہے تو صرف روح کے بارے میں ہے۔ روح میں ذرا بھی تبدیلی نہیں ہونی چاہیئے، اگرچہ اس کی ظاہری صورت بدل جائے۔

مثال کے طور پر عہدِ نبوی میں مجاہدین کی جو تعداد رکھی گئی تھی، یا سامانِ جہاد کی جو مقدار مقرر کی گئی تھی، یا آلاتِ جہاد کی جو نوعیتیں تھیں، ان کا مقصد صرف اتنا تھا کہ اللہ کے کلمہ کو بلندی اور فتح حاصل ہو جائے اور کفر کا جھنڈا سرنگوں ہو جائے۔ ان تمام صورتوں اور قالبوں کے اندر روح تھی تو صرف یہ تھی کہ اعلاءِ کلمۃ الحق اور احیاءِ دین حاصل ہو جائے۔ یہ ظاہری آداب وشرائط، صورتیں اور نوعیتیں ہرگز مطلوب نہیں ہیں۔ احیاءِ دین کا مقصد جنگ کی جس صورت اور جہاد کے جس نظام سے بھی حاصل ہو جائے، بندہ اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جائے گا۔ یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ عہدِ نبوی میں اگر تیغ وتفنگ اور نیزوں وانیوں کا استعمال ہوا تھا تو اس زمانے میں بھی انہی کا استعمال ہو، ان کی جگہ توپوں، ٹینکوں، بندوقوں اور آتشی گولہ باریوں کا استعمال نہ کیا جائے، یا عہدِ نبوت میں سواری کی جگہ پر گھوڑوں، گدھوں اور اونٹوں کا استعمال ہوا تھا، تو اس زمانے میں بھی میدانِ جنگ کے اندر انہی سواریوں کا استعمال ہو، انکی جگہ جنگی مشینوں اور موٹروں اور جنگی طیاروں کا استعمال ممنوع ہو بلکہ وقت کی ضرورت اور تقاضا کے مطابق جو بھی صورتِ حال جنگ کی کامیابی کے مناسب ہو اس کا اختیار کرنا مسلمانوں کا فریضہ ہے۔ اس موقعہ پر وقت کی ضرورت کے خلاف عہدِ نبوی کی تقلید باوجود امکان کے دُنیا وآخرت دونوں میں تباہی وبربادی کا باعث ہے ——— یہیں سے یہ نتیجہ بھی نکل آیا کہ جہاد کے لیے

حرب وضرب، بے نیام شمشیریں، چمکتے ہوئے نیزے اور میدانِ جنگ کی مشینی سرگرمیاں ہی ضروری نہیں ہیں، بلکہ وقت کا تقاضا اگر اس کے خلاف ہو تو اس سے گریز کرنا چاہیے۔ مثلاً ایک شخص اپنی زبان کی تلوار سے اسلام اور اس کی تعلیمات کی کاٹ کر رہا ہے اور آپ اس کے مقابلے کے لئے تلوار و مشین گن لے کر نکل رہے ہیں، یا ایک شخص اپنے زورِ قلم سے اسلام پر مسلسل یلغار کر رہا ہے اور آپ اس کے بالمقابل میدانِ جنگ ہموار کر رہے ہیں اور مسلح فوجوں کی صف درست کر رہے ہیں، تو یہ رویہ ہرگز دانشمندی اور مبنی بر مصلحت نہیں کہا جا سکتا۔ اور نہ یہ اسلام کے لئے جنگ کہی جا سکتی ہے۔ آپ اپنے توپوں اور تلواروں سے زیادہ سے زیادہ اس شخص اور اس کے حاشیہ نشینوں کا خاتمہ کر سکتے ہیں۔ لیکن اس نے جو اپنی زبان و قلم کے زور سے ہزاروں اور لاکھوں اذہان میں اسلام کی طرف سے بغاوت و نفرت کا بیج بو دیا ہے اور ذہنی انقلاب برپا کر دیا اس کا خاتمہ کیسے کر سکتے ہیں؟ ایک ہزار ایسے افراد کا آپ خاتمہ کرتے ہیں تو دوسرے ہزار پھر اسی ذہنیت کے ساتھ نمودار ہو جائیں گے۔ غرضیکہ اس موقعہ پر آپ کی تلوار و توپ، ٹینک و مشین گن ہرگز جہاد کے لئے کافی نہیں ہیں۔ اس وقت ضرورت اس کی ہے کہ ان فتنوں کے مقابلے میں آپ بھی قلم و زبان کا ہتھیار لے کر میدان میں نکلیں۔ اسلام کے جس شعبہ پر وہ یلغار کر رہا ہے، آپ اس کا دفاع کریں اور اسی انداز کو اختیار کریں، جس انداز سے وہ لوگوں کے اذہان متاثر کر رہا ہے۔ اگر آپ نے اس سے کوئی مختلف انداز و اسلوب اختیار کیا، تو تجربہ یہ ہے کہ آپ کی ساری کوششیں رائگاں ہو جائیں گی، وہ نہایت مہذب ادبی اسلوب میں اسلام پر یلغار کر رہا ہے۔ اور آپ اس کے مقابلے میں فرسودہ اندازِ بیان اختیار

فرمارہے ہیں، تو آپ کی باتوں پر کون دھیان دے گا؟ اور کون آپ کے کلام کی معنویت پر جائے گا۔

(۴) **چوتھی قسم:** چوتھے نمبر پر وہ سُنّت ہے، جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے بطورِ عادت اور بتقاضائے بشری صادر ہوئی ہو جس کو اصطلاح میں سننِ زائد کہا گیا ہے۔ مثلاً رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اوقاتِ بول و براز، حالتِ سفر میں آپ کے قیام کی منزلیں یا رہائشی اور خانگی طریقِ زندگی۔ یہ سنّت وہ ہے جس کی نہ روح مطلوب ہے اور نہ جسم یعنی انسان پر یہ لازم نہیں ہے کہ ان چیزوں میں سرکارؐ کی اتباع ہی کرے ہاں اگر وہ اقتدار کی نیت سے ان چیزوں پر عمل کرتا ہے، تو وہ اللہ کے یہاں بہت بہت ثواب کا مستحق ہو گا۔ اللہ پاک کا محکم ارشاد ہے لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ کہ رسول اللہ تمہاری پوری زندگی کے لیئے بہترین نمونہ اور معیار ہیں۔ تم اپنی زندگی کے ہر مسئلے اور اپنی حیات کی ہر پیچیدگی کو رسولِ خدا کی زندگی اور اصول زندگی پر حل کرو۔ اس طرح سنت کی اس قسمِ رابع میں بھی ثواب کی امید ہے، مگر بندوں پر لازم نہیں ہے۔ (جاری)

مذہب

ضرورت، اہمیت اور افادیت

مولانا سعیدالرحمٰن شمس۔ مدیر نصرۃ الاسلام کشمیر

ظاہر ہے یہ فکر و نظریہ مذاق و مزاج اور ذہنی رجحان اس وقت پیدا ہوگا، یہ جذبات صالح اس وقت فروغ پائیں گے جب انسان "مذہب" کو دل سے مانے اور اس کے اصول و ضوابط کی پابندی کرے۔

مذہب کی ضرورت اور اہمیت جیسا کہ بتایا گیا کہ فطری اور لازمی شی ہے اور انسان خالی الذہن ہوکر سوچے تو اس سے فرار اور انکار کی مجال نہیں۔ حال ہی میں ایک یورپی پروفیسر کا جو فکر و نظر کے لحاظ سے اعلیٰ درجہ کا ملحد اور دہریہ تھا، واقعہ اخبارات میں نظروں سے گذرا۔ وہ ایک رات موصوف جب اپنے معمولات سے فارغ ہوکر اپنے بستر پر آئے تو فوراً ہی آنکھ لگ گئی۔ پہلو میں اہلیہ اور دوسرے کمرے میں بچے بھی لیٹے ہوئے تھے، صبح جب پروفیسر موصوف کی آنکھ کھلی تو گھر کے سارے افراد مقتول اور مُردہ تھے۔ اس غیر متوقع روح فرسا، دلدوز واقعہ کو دیکھ کر آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور کلیجہ شق ہوگیا۔ اور اس حادثہ نے اس طرح ذہنی اور نفسیاتی طور پر اثر ڈالا کہ پروفیسر صاحب نیم پاگل ہوگئے اچانک ایک مذہبی رہنما ادھر سے گذر رہے تھے، انھوں نے پروفیسر موصوف کی

تعزیت کی اور انھیں یقین دلایا کہ یہ تو ممکن ہے کہ دنیا اور دنیوی قانون کی نظروں سے قاتل بچ کر نکل جائے، اور بظاہر نکل بھی گیا ہے، لیکن مذہب بتاتا ہے کہ اس قاتل کو اس کے کئے کی سزا ضرور ملے گی۔ اسے اپنے ظلم درندگی اور سفاکی کا مزہ ضرور چکھنا ہوگا۔ وہ کسی قیمت پر احکم الحاکمین کی گرفت اور پکڑ سے بچ نہیں سکتا۔ یہ خوشخبری اور تسلی کے دو بول سن کر پروفیسر کی آنکھیں اطمینان اور مسرت سے چمکنے لگیں، ایک لازوال یقین اور غیر متزلزل عقیدہ نے اسے بقیہ زندگی ذہنی سکون اور آرام کے ساتھ گذارنے کی راہ ہموار کردی۔

مذہب کے بغیر

عالم اسلام کے مشہور مفکر سید قطب شہیدؒ مذہب کی اہمیت و ضرورت اور عقیدۂ آخرت پر اس کے دوررس اثرات کے ذیل میں گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"مذہب کے بغیر زندگی میں کوئی معنویت سرے سے باقی ہی نہیں رہتی۔ مذہب کی بنیادی خصوصیت آخرت کا عقیدہ ہے۔ اس عقیدہ کے بعد کرۂ ارض پر انسان کی زندگی نئی وسعتوں کا دامن چھونے لگتی ہے اور انسان کے سامنے امکانات کے نئے نئے افق ابھرنے لگتے ہیں کہ اگر وہ نہ ہوں تو انسان ہیچ مپرگی کے اذیت ناک احساس کا شکار ہو جائے۔ حیات بعد الموت سے انکار کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی مجموعی عمر میں ایک معتدبہ حصہ حذف کردیا جائے اور اُسے اپنی اندھی بہری خواہشات اور توہمات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے۔ اس کے بعد انسان اپنی خواہشات نفس کی آسودگی میں گم ہو جاتا ہے اور اس کی کوششوں کا مصرف صرف یہ بات رہ جاتی ہے کہ جتنی مسرتیں وہ سمیٹ سکتا ہے سمیٹ لے اور کسی کو ان میں شریک کرے۔ یہیں سے رقابتیں اور وحشیانہ جنگیں جنم لیتی ہیں کیونکہ خواہشات کے بندوں کی اس دنیا میں یہی ہوس ہوتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ فائدہ کم وقت

میں خود سمیٹ لے اس کے دل میں کسی بالاتر ہستی کا خوف اور تصور نہیں ہوتا.
کیونکہ اس دنیا کا نہ کوئی خدا ہوتا ہے اور نہ کوئی نظامِ عدل و انتقام؟
(بحوالہ اسلام اور جدید ذہن کے شبہات)

دورِ حاضر میں دنیا میں مختلف مذاہب وادیان اور طرح طرح کے افکار و نظریات موجود ہیں اور ہر انسان کو اس بات کی آزادی بھی حاصل ہے کہ وہ اپنے لئے جونسا نظریۂ حیات اور نظامِ زندگی چاہے پسند کرلے اور اسی کے مطابق اپنی زندگی گذارے. دین و مذہب اور فکر و عقیدہ کی آزادی اور حقِ شہریت میں مساوات اور برابری، یہ وہ بنیادی اور انسانی حقوق ہیں جو اس کے فطری شرف کا خاصہ ہیں اور جنھیں ہر دور میں تسلیم کیا جاتا رہا ہے.

دائمی اور عالمگیر مذہب

لیکن دین و مذہب کی پُر ہجوم دُنیا میں اسلام ہی ایک مکمل دین اور مستقل مذہب ہے اور تاریخِ ادیان میں یہی تنہا دین و مذہب ہے جو آفاقی ہے اور دائمی بھی، اس میں فطری ہم آہنگی اور جہاں بانی کی پوری پوری شان پائی جاتی ہے اور سب سے بڑھ کر اس کا یہ دعویٰ جو حق و صداقت پر مبنی ہے کہ یہ الٰہی دین اور ربانی نظامِ حیات ہے.

اسلام کا ایک عظیم کارنامہ

یہ حقیقت ہے کہ دنیا میں اسلام ہی تنہا وہ واحد نظامِ حیات ہے جس نے دین و دنیا میں کوئی تفریق روا نہیں رکھی. اسلام کے بے شمار احسانات اور کارناموں میں ایک اہم احسان اور کارنامہ یہ بھی ہے کہ ظہورِ اسلام سے قبل دُنیا جن کاموں کو غیر مذہبی سمجھتی تھی. ان کو اس نے معمولی حذف و ترمیم کے بعد فطرتِ انسانی سے کرکے اور انھیں اخلاقی حدود کا پابند بنا کر ان کے اندر روحانیت و شرافت کا نور بھر کر انھیں مذہبی حیثیت عطا کردی.. یہی وجہ ہے کہ اسلام کا آفاقی پیغام،

اس کی انقلابی اور حیات بخش تعلیمات ہر دور کے لوگوں کے لئے بلا استثنا اپنے اندر معنویت، افادیت اور کشش رکھتی ہے. چنانچہ موجودہ وقت میں شاید ہی کوئی فرد یا جماعت ایسی ہو جس نے شعوری یا غیر شعوری طور پر اسلام کے کسی نہ کسی اصول کو اپنایا نہ ہو. جس کی زندگی کے تمام گوشے اسلامی تعلیمات اور اذکار سے خالی ہوں. اس لئے کہ اسلامی تعلیمات و اقدار اتنے فطری، اتنے ہمہ گیر اور انقلاب انگیز ہیں کہ ان کے اکثر و بیشتر حصوں کو اپنائے بغیر صحت مند انفرادی اور اجتماعی زندگی کا تصور ممکن نہیں. آج اسلام اپنی پرکشش اور انقلاب انگیز آفاقی تعلیمات اور نظریہ کے سبب خود بخود بڑے بڑے علم و دانش کے دعویدار اور مفکرین کے ذہن و دماغ کو اپیل کر رہا ہے اور اس تعلق سے غیروں اور منکرین اسلام کی اتنی شہادتیں اور بیانات جمع کی جاسکتی ہیں کہ ایک مستقل کتاب بن جائے. تاہم بطور شہادت مغرب کے مشہور مفکر جارج برنا شاہ (۱۸۵۶ـ۱۹۵۰) کا اسلام کے مطالعہ کے بعد جو تبصرہ ہے وہ کچھ یوں ہے:

IF ANY RELIGION HAS THE CHANCE OF RULING OVER E GLAND, NAY EUROP, WITHIN THE NEXT HUNDRED YEARS. IT CAN ONLY BE ISLAM. I HAVE ALWAYS HELD THE RELIGION OF MOHAMMAD IN HIGH ESTIMATION BECAUSE OF ITS WONDERFUL VITALITY. IT IS THE ONLY RELIGION WHICH APPEARS. TO METO POSSESS

THE ASSIMILATIONG CAPABILITY TO THE CHANGING FACE OF EXISTANCE, WHICH CAN MAKE ITS APEAL TO EVERY AGE.

"اگر کوئی مذہب اگلے سو سال میں انگلستان پر حکومت کرے، نہیں بلکہ سارے یورپ پر حکومت کرے تو وہ صرف اسلام ہوگا۔ میں نے محمدؐ کے مذہب کو بڑی قدر کی نظر سے دیکھا ہے، کیونکہ اس کے اندر حیرت انگیز طاقت ہے۔ یہ واحد مذہب ہے جس کے متعلق میرا خیال ہے کہ اس کے اندر یہ صلاحیت ہے کہ وہ بدلتی ہوئی دنیا کو اپنے اندر جذب کر سکے جس کے اندر ہر دور کی اپیل ہے۔"

بلاشبہ اسلام ہی وہ واحد اُمید ہے دنیا کی بھی اور خود مسلمانوں کی بھی، دنیا ترقی کے نصف النہار پر پہنچنے کے باوجود مالک کائنات کی سچی رہنمائی کی تلاش میں بے چین اور سرگرداں ہے۔ اور مذہب اسلام سے وابستگی کے بغیر موجودہ دنیا کے متنوع مسائل کا کوئی حل نظر نہیں آتا۔ اس کا حل رب کائنات اس کے پیغام اور اس کے فرستادہ احکامات کی اطاعت اور تابعداری میں مُضمر اور منحصر ہے۔

حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری رح اور بارگاہِ رسالت

قسط ۱

از: مولانا حافظ محمد اقبال رنگونی (مانچسٹر)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شیخ المحدثین قدوۃ الاولیاء والمتقین حضرت اقدس مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری
مہاجر مدنی رح کی ذات گرامی برصغیر ہند و پاک اور بیرونِ برصغیر کے علماء، فقہاء، صلحاء
اور مشائخ کے لئے محتاجِ تعارف نہیں۔ آپ اپنی مؤقر تصنیف بذل المجہود شرح
ابی داؤد (عربی) کی محدثانہ اہمیت اور جامعہ مظاہر علوم سہارنپور جیسی عظیم دینی درسگاہ
کی صدارت تدریس اور حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی مہاجر مدنی رح
جیسی عظیم المرتبت شخصیت کے پیر و مرشد ہونے کی حیثیت سے علمی و دینی حلقوں میں
آفاقی شہرت کے حامل ہیں۔

حضرت اقدس سہارنپوری رح کا سلسلۂ نسب صحابیٔ رسول سیدنا ابو ایوب انصاری رض
سے ملتا ہے۔ صفر ۱۲۶۹ھ میں اپنے ننھیال قصبہ نانوتہ ضلع سہارنپور میں آپ
پیدا ہوئے۔ ابھی عمر کی تیسری منزل میں قدم رکھا تھا کہ خود آپ کے نانا حضرت مولانا
مملوک علی صاحب رح نے آپ کی بسم اللہ کرائی۔ چونکہ قدرت نے آپ کو ذکاوت و

ذہانت سے وافر حصہ عطا کیا تھا اس لئے قرآن کریم جلدی مکمل کر لیا۔ پھر آہستہ آہستہ دینی علوم کے زینے پر ترقی کرتے رہے کہ دارالعلوم کے قیام کی خبر سنی۔ آپ کا شوق علم دین جوش میں آگیا اور گھر والوں سے اجازت لیکر دارالعلوم دیوبند تشریف لے آئے اور درس میں شریک ہو گئے۔ پھر چھ ماہ کے بعد مظاہر علوم سہارنپور کا قیام عمل میں آیا۔ آپ اپنے ماموں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی کی اجازت سے مظاہر علوم سہارنپور تشریف لے آئے اور یہیں سے آپ دنیائے علم و عرفان کے آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے اور علم حدیث کے نور سے دنیائے اسلام کو منور کر دیا۔

اس کے باوجود کہ آپ علوم دینیہ کی تکمیل فرما چکے تھے مگر آپ کی فطرت سلیمہ اس معرفت الٰہیہ کی جستجو میں تھی جو قال کو حال اور علم کو سرتاپا عمل بنا دیتی ہے۔

قال را بگذار مرد حال شو ÷ پیش مردے کاملے پامال شو ۔ (مولانا رومؒ)

اس مقصد کے حصول کیلئے آپ کی نظر انتخاب اپنے وقت کے قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہٗ پر پڑی اور آپ آستانۂ رشیدیہ پر حاضر ہو کر بیعت ہوئے۔ چنانچہ اس کے بعد آپ اوقات درس و تدریس کے علاوہ ذکر و اوراد اپنے مالک و خالق کے ساتھ راز و نیاز میں مشغول رہا کرتے۔ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں کہ آپ نے راہ سلوک کس طرح طے فرمائی۔ آپ فرماتے تھے کہ بس ایک حالت ہے جو گذر رہی ہے۔ جب آپ دوسرے حج کے لئے بلد اللہ الامین روانہ ہوئے وہاں آپ نے شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحؒ سے ملاقات کی۔ اسی سفر میں آپ کو حضرت حاجی صاحبؒ نے خلافت و اجازت مرحمت فرمائی۔ اور محرم الحرام (۱۲۹۷ھ) میں خلافت نامہ اپنی مہر کے ساتھ مزین فرما کر عطا فرمایا۔ اور کمال مسرت کے ساتھ اپنی دستار مبارک اتار کر آپ کے سر پر رکھدی۔ جب آپ واپس ہوئے تو یہ دونوں عطیے حضرت قطب الارشادؒ کی خدمت میں لاکر پیش کر دیئے حضرتؒ نے فرمایا کہ "مبارک ہو یہ تو اعلیٰحضرتؒ

کا عطیہ ہے"۔ اس کے بعد آپ نے بھی خلافت نامہ پر دستخط فرما کر خلافت و اجازت سے سرفراز کیا۔

حضرت اقدس سہارنپوریؒ کو احادیث کریمہ کے ساتھ جس قدر قلبی لگاؤ تھا، اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ حتیٰ کہ عمر کا بیشتر حصہ احادیث پاک کی خدمت ہی میں گذرا۔ انتقال سے صرف پانچ روز پہلے بھی آپ نے علماء مدینہ منورہ کے اصرار پر ابوداؤد شریف کا درس دیا۔ حدیث پاک سے اس قلبی شغف اور تعلق کی ایک زندہ جاوید مثال " بذل المجہود شرح ابی داؤد" ہے، جسے عرب و عجم و شام و مصر اور دیگر بلاد اسلامیہ کے علماء و محدثین نے بیحد سراہا ہے۔ مؤلف "اکابر علماء دیوبند" لکھتے ہیں کہ:

" بذل المجہود کے سلسلہ میں یہ عرض کر دینا بھی ضروری ہے کہ ابوداؤد شریف کی شرح "منہل" جو مصر کے ایک مشہور عالم علامہ الازہر ابو محمد محمودؒ کی شہرہ آفاق ہے اور مصر میں طبع ہوئی ہے۔ یہی نہیں کہ بذل المجہود سے ماخوذ ہے بلکہ اکثر و بیشتر نصف صفحہ کی پوری پوری عبارتیں بغیر تبدیلی الفاظ نقل کی گئی ہیں اور پوری کتاب میں صرف ایک جگہ ہی بذل المجہود کا حوالہ دیا گیا ہے"۔

حضرت اقدس سہارنپوری نے شوال ۱۳۴۴ھ کو مدرسہ مظاہر العلوم سے ڈیڑھ سال کی رخصت لے کر مدینہ منورہ حاضر ہوئے تھے اور پھر وہیں کے ہو گئے۔ اس زمانہ میں بذل المجہود کی تالیف کا سلسلہ آخری مرحلہ میں پہنچ گیا تھا۔ چنانچہ اس اہم ترین تصنیف کی تکمیل کے ساتھ ٹھیک سات ماہ اور ۲۴ دن بعد آپ اپنے مالک حقیقی سے جا ملے اور علم و عرفان کا یہ آفتاب ماہتاب ۱۵ ربیع الثانی ۱۳۴۶ھ کو جنۃ البقیع میں روپوش ہو گیا۔ رحمۃ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔ آمین!

" بذل المجہود" کے علاوہ بھی بعض تصانیف کسی خاص واقعات سے متأثر ہو کر تحریر فرمائی ہیں۔ مثلاً ہدایات الرشید الی افحام العنید (ردِ روافض) براہین قاطعہ (ردِ بدعت) مطرقۃ الکرامۃ علیٰ مرأۃ الامامۃ (ردِ روافض)

المہند علی المفند (ردِّ بدعت) اور تنشیط الاذان فی تحقیق محل الاذان۔ اتمام النعم تبویب الحکم (تصوف) وغیرہ وغیرہ۔

حضرت اقدس سہارنپوری رہ کی تصانیفِ عالیہ سے چند ہی ارشادات و واقعات سپرد قلم کئے جاتے ہیں جن سے اندازہ ہوگا کہ آپ کو خاتم الانبیاء والمرسلین صلی اللہ علیہ وسلم سے کس قدر عقیدت و محبت تھی۔ مزید تفصیل کے لئے تذکرۃ الخلیل، خوانِ خلیل، حیاتِ خلیل، تاریخ مشائخ چشت کا مطالعہ کیا جائے۔

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

حضرت اقدس سہارنپوریؒ لکھتے ہیں کہ:

"میرا اور میرے مشائخ کا عقیدہ یہ ہے کہ سیدنا و مولانا و حبیبنا و شفیعنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام مخلوق سے افضل اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے بہتر ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے قرب و منزلت میں کوئی شخص آپ کے برابر تو کیا، قریب بھی نہیں ہو سکتا۔ آپ جملہ انبیاء و رسل کے سردار اور سارے برگزیدہ انبیاء و رسل کے خاتم ہیں۔ جیسا کہ نصوص سے ثابت ہے اور یہی ہمارا عقیدہ ہے۔ یہی دین و ایمان ہے اس کی تصریح ہمارے مشائخ بہترین تصانیف میں کر چکے ہیں۔ (المہند ص ۳۸)

ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ:

پس کوئی ادنیٰ مسلم بھی فخر عالم علیہ الصلاۃ کے تقرب و شرفِ کمالات میں کسی کو مماثل آپ کا نہیں جانتا۔ (براہین قاطعہ ص ۵)

دیکھئے حضرت اقدسؒ کتنی صراحت سے رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے افضل فرما رہے ہیں۔ اور اسی کو اپنا دین و ایمان قرار دے رہے ہیں۔ اس کے باوجود یہ افواہ پھیلانا کہ علماءِ دیوبند حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت کے قائل نہیں، کس قدر جھوٹ اور بہتان ہے۔

علوم النبی صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت اقدس سہارنپوریؒ تحریر فرماتے ہیں کہ:

”اس امر کے ہم زبان سے قائل اور قلب سے معتقد ہیں کہ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام مخلوقات سے زیادہ علوم دیئے گئے ہیں جن کو ذات وصفات اور تشریعات یعنی احکام عملیہ اور حکم نظریہ اور حقیقت ہائے حقہ اور اسرار مخفیہ وغیرہ سے تعلق ہے کہ مخلوق میں سے کوئی بھی ان کے پاس تک نہیں پہنچ سکتا، نہ مقرب فرشتہ نہ اور نبی ورسول (علیہم السلام) بے شک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اولین وآخرین کا علم اللہ تعالیٰ پہنچاتے رہے ہیں اور آپ پر حق تعالیٰ کا فضل عظیم ہے۔ اس لئے جو شخص یہ کہے کہ فلاں شخص نبی کریم علیہ السلام سے اعلم ہے وہ کافر و مرتد اور ملعون ہے اور ہمارے مشائخ اس کے کافر ہونے کا فتویٰ دے چکے ہیں (المہند ص۲۴)

ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں کہ:

”مجھ کو تو مدت العمر اس کا وسوسہ بھی نہیں ہوا کہ شیطان تو کیا ولی اور فرشتہ بھی آپ کے علوم عالیہ کی برابری کر سکے۔ چہ جائے کہ علم میں زیادہ ہو“
(فتاویٰ دارالعلوم جلد۲ ص۲۴)

دیکھئے حضرت اقدسؒ کتنی وضاحت سے اپنا عقیدہ بیان کر رہے ہیں۔ جو لوگ علماء دیوبند پر اس سلسلے میں الزام واتہام باندھتے ہیں، انھیں اس تصریح کے بعد اپنے الزام سے توبہ کرنی چاہیے۔ شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے فوائد القرآن میں اور حضرت مولانا بدر عالم صاحب مہاجر مدنیؒ نے تو ترجمان السنہ میں علم النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا عنوان باندھ کر اس مسئلے کو نہایت وضاحت سے تحریر فرمادیا ہے۔ اس کے باوجود بھی علماء دیوبند کو مورد الزام ٹھہرانا امت میں

تفرقہ پیدا کرنے کے سوا اور کچھ نہیں۔

ذکر النبی صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت اقدس سہارنپوری رحمہ تحریر فرماتے ہیں کہ:

"وہ جملہ حالات جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ذرا سا بھی تعلق ہے ان کا ذکر ہمارے نزدیک نہایت پسندیدہ اور اعلیٰ ترین درجہ کا مستحب ہے خواہ ذکر ولادت شریفہ ہو یا آپ کے بول و براز، نشست و برخاست اور بیداری و خواب کا تذکرہ ہو، جیسا کہ میرے رسالہ براہین قاطعہ میں متعدد جگہ بصراحت مذکور ہے۔" (المہند ص۶۵)

براہین قاطعہ میں ایک جگہ صاف لکھا ہے:

"نفس ذکر میلاد فخر عالم علیہ السلام کو کوئی منع نہیں کرتا بلکہ ذکر ولادت آپ کا مثل ذکر دیگر سیر و حالات کے مندوب ہے۔" (براہین قاطعہ ص۸)

حضرت اقدسؒ کی مندرجہ بالا عبارت کو مکرر پڑھیں۔ اور ان لوگوں کے اس الزام کو بھی دیکھیں جو کہتے ہیں کہ علماء دیوبند رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ذکر کے قائل نہیں (معاذ اللہ) حضرت اقدسؒ تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بول و براز کے ذکر کو بھی نہایت پسندیدہ اور اعلیٰ ترین درجہ کا مستحب فرماتے ہیں۔ معلوم نہیں یہ لوگ اولیاء اللہ پر بیجا الزامات سے کیوں اپنی آخرت برباد کر رہے ہیں۔

جناب حماد الرحمٰن رشیدی ــــــ بھیونڈی

خلافت و ملوکیت

پر

ایک نظر

مولانا مودودی صاحب کے نزدیک خلافت کے ملوکیت میں بدلنے کی بنیادی وجہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی اقربا پروری والی پالیسی تھی۔ اس پالیسی نے عام ناراضگی پھیلائی۔ اس پالیسی کا سہارا لے کر باغیوں نے جناب والا کے خلاف صحابیوں اور صحابی زادوں تک کو اپنا ہم نوا بنالیا۔ یہاں تک باغیوں کے ہاتھوں حضرت عثمانؓ کا سفاکانہ قتل ہوا۔ اور پھر رفتہ رفتہ خلافت، ملوکیت میں بدل گئی۔

مولانا کے نزدیک یہ حضرت عثمانؓ کی فاش غلطی تھی۔ چنانچہ وہ تحریر فرماتے ہیں:

"حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی پالیسی کا یہ پہلو بلا شبہ غلط تھا۔ اور غلط کام بہرحال غلط ہے۔ خواہ وہ کسی نے کیا ہو۔ اس کو خواہ مخواہ کی سخن سازیوں سے صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرنا نہ عقل و انصاف کا تقاضہ ہے اور نہ

دین ہی کا مطالبہ ہے کہ کسی صحابی کی غلطی کو غلطی نہ مانا جائے" (خلافت و ملوکیت ۱۰)

حیرت اس بات پر ہے کہ "مسئلہ جبر و قدر" کا مصنف ایسی فاش غلطی کیوں کر بیٹھا؟ مولانا کو خلافت و ملوکیت میں اوّل تا آخر حضرت عثمان رض کی غلطی یاد رہی لیکن وہ تقدیر الٰہی کو یکسر فراموش کر بیٹھے۔ حالانکہ جو کچھ بھی ہوا اُسے تقدیر الٰہی یا مشیتِ الٰہی کہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ کیونکہ حضرت عثمان رض نے جو پالیسی اختیار کی تھی اُس کو اختیار کرنے کا جو ارادہ موجب ہوا تھا کیا اسکے خالق حضرت عثمان رض خود ہی تھے؟ اگر اس کے ارادہ کے خالق حضرت عثمان رض نہیں تھے اور یقیناً نہیں تھے بلکہ اُس ارادہ کا خالق اللہ تعالیٰ تھا تو اُس ارادے اور اس کو عملاً اختیار کرنے پر جو نتائج برآمد ہوئے دونوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا جاسکتا ہے۔ لیکن مولانا مودودی نے پوری کتاب میں اس حقیقت کی طرف ہلکا سا بھی اشارہ نہیں کیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں انھوں نے اس علت کی یکسر نفی کردی ہے۔ اُن کا یہ طرزِ عمل خود انہی کی تحریروں کے آئینے میں غلط نظر آتا ہے۔ مثلاً اُن کی یہ تحریر ملاحظہ فرمائیں:

> "انسانی افعال کو اُن کی علتوں کی طرف نسبت دینے کی صحیح صورت بجز اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ اجمالی طور پر اُن کو یا تو بیک وقت تمام علتوں کی طرف منسوب کیا جائے یا کبھی ایک علت کی جانب اور کبھی دوسری کی جانب۔ اور اگر کوئی شخص غلط فہمی سے اُن کو صرف ایک علت کی طرف نسبت دے کر دوسری علتوں کی نفی کرتا ہو تو اس کی تردید کردی جائے۔"
>
> (مسئلہ جبر و قدر ص ۹۳)

اس کے باوجود انھوں نے خلافت و ملوکیت میں پورے زور شور کے ساتھ مستند تاریخی حوالوں کی روشنی میں صرف اور صرف یہی بات ثابت کی ہے کہ

"فتنے کے آغاز" کی اصل وجہ وہ بے اطمینانی ہی تھی جو اپنے اقربار کے معاملے میں حضرت عثمان رضؓ کے طرز عمل کی وجہ سے عوام اور خواص میں پیدا ہو گئی تھی۔ اور یہی بے اطمینانی اُن کے خلاف سازش کرنے والے فتنہ پرداز گروہ کے لئے مددگار بن گئی"۔ (خلافت وملوکیت ص۳۵۶)

اس طرح مولانا نے صاف صاف دوسری علتوں (خدا اور شیطان) کی نفی کرتے ہوئے تمام نتائج کی ذمہ داری کو صرف ایک ہی علّت (حضرت عثمانؓ کی پالیسی) کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ اب خود مولانا کے بیان کردہ قاعدہ کلیہ کی روشنی میں اس کے سوا اور چارہ ہی کیا ہے کہ اُن کی اس بنیاد کی تردید کر دی جائے جس پر انھوں نے ملوکیت کے تمام شر کی عمارت کھڑی کی ہے۔ دراصل دیکھا جائے تو جس دو علتوں کی مولانا نے نفی کی ہے تمام نتائج میں اُنھی کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ ذیل کی سطروں سے یہ بات بالکل واضح ہو جائے گی۔

اگر ہم شہادتِ حضرت عثمان رضؓ اور اُن کے بعد کے بڑے بڑے اہم واقعات سے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئیاں نظر میں رکھیں تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ جو بھی حالات رونما ہوئے وہ عین مشیتِ الٰہی کے تحت ہوئے۔ کیونکہ پیشین گوئیوں کا صاف مطلب یہی ہے کہ وہ عین منشاءِ الٰہی ہیں اور اُن کو پیش آنا ہی تھا۔ اس دعوے کے لئے یہی دلیل کافی ہے کہ زبانِ رسالت نے جو جو پیشین گوئیاں ارشاد فرمائی۔ وہ آجتک جوں کی توں صحیح ثابت ہوتی آئی ہیں۔ حالانکہ ان کے تدارک کیلئے ہر ممکن کوششیں کی گئی تھیں اور آج بھی کی جا رہی ہے۔ یہ چیز انسان کے بس میں ہے ہی نہیں کہ جس واقعہ کا ظہور پذیر ہونا مقدر ہو چکا ہے اُسے وہ روک سکے۔

خیر یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا۔ آمدم برسرِ مطلب۔ حضرت عثمان رضؓ کی شہادت سے متعلق کئی پیشین گوئیاں رسول اللہ ؐ سے ثابت ہیں مثلاً ایک بار آپ نے حضرت عثمانؓ

سے اس طرح فرمایا تھا کہ" اللہ تم کو ایک خلعت عطا کرے گا۔ اور کچھ لوگ وہ خلعت تم سے چھین لینا چاہیں گے لیکن تم ہرگز ایسا ہونے نہ دینا یہانتک کہ مجھ سے آملو۔"

باغیوں کے مجمع کو خطاب کرتے ہوئے خود سیدنا حضرت عثمان رضؓ نے یہ حدیث بیان فرمائی تھی کہ ایک دفعہ آنحضرتؐ حرا پہاڑ پر چڑھے تو پہاڑ ہلنے لگا۔ آپؐ نے پہاڑ کو پاؤں سے ٹھوکر مار کر فرمایا" اے حرا، ٹھہر جا کہ تیری پیٹھ پر اس وقت ایک نبی، ایک صدیق اور ایک شہید ہے"۔ اور اُس وقت حضرت عثمان رضؓ آنحضورؐ کے ساتھ تھے۔ (خلفائے راشدین، از مولوی معین الدین صاحب ندوی ص۲۴۲)

جنگِ جمل سے متعلق بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی پیشین گوئیاں ارشاد فرمائی تھیں۔ مثلاً حضرت زبیر رضؓ سے فرمایا تھا کہ" تم علی رضؓ سے ناحق لڑوگے"۔ (تاریخ اسلام از مفتی شوکت علی فہمی ص۳۳۳) اُمّ المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا تھا کہ" میری ایک بیوی جب ناحق پر ہوگی تو حواب کے کتے اُس پر بھونکیں گے۔ تم اُن میں سے نہ ہونا۔ (ایضاً ص۳۳۷) جنگِ صفین سے متعلق صریح اشارہ اُس پیشین گوئی میں ملتا ہے، جو مولانا مودودی نے خود بھی نقل کی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمار رضؓ کے متعلق ارشاد فرمایا تھا کہ" تم کو ایک باغی گروہ قتل کرے گا"۔ (خلافت و ملوکیت ص۱۲۷)

خلافت کے خاتمے اور بادشاہت کے آغاز سے متعلق بھی رسول اللہؐ نے پیشین گوئی فرمائی تھی کہ" میرے بعد خلافت تیس سال رہے گی پھر بادشاہی ہوگی۔ (ایضاً ص۱۳۹)

یہ تمام پیشین گوئیاں جوں کی توں پیش آئیں۔ حالانکہ ان کے تدارک کی ہر ممکن کوشش کی گئی۔ ایسی صورت میں اُس کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ جو کچھ بھی ہوا وہ مشیتِ الٰہی تھی۔ پہلے سے لکھی ہوئی چیز تھی۔

مَا أَصَابَ مِنْ مُّصِيبَةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي أَنفُسِكُمْ إِلَّا فِي كِتَابٍ مِّن قَبْلِ أَن نَّبْرَأَهَا۔ (حدید ۲۲)

کوئی مصیبت زمین میں یا تمہارے اپنے نفوس میں نہیں پہنچتی مگر یہ کہ وہ ایک نوشتے میں لکھی ہوئی ہوتی ہے قبل اس کے کہ ہم اُسے ظہور میں لائیں۔

باغیوں کے طرزِ عمل نے خلافت کو ملوکیت میں بدل دیا۔

فکرِ سلیم سے کام لیا جائے تو یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت عثمانؓ کی پالیسی نے نہیں بلکہ باغیوں کے طرزِ عمل نے خلافت کو ملوکیت میں بدلا اور یہ کہ حضرت عثمان رضؓ غلطی پر نہیں تھے بلکہ کئی پہلوؤں سے یہ سراسر باغیوں کی غلطی تھی، جس نے ایسی خطرناک صورت اختیار کرلی۔

(۱) باغیوں نے اپنے اولی الامر کی اطاعت نہیں کی تھی حالانکہ اولی الامر کی اطاعت فرض ہے۔

یا ایہا الذین اٰمنوا اطیعوا اللّٰہ وَاطیعوا الرّسولَ وَاُولی الاَمر منکم (النساء ۵۹)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول اور اُن لوگوں کی جو تم میں سے اولی الامر ہوں۔

رسول اللہؐ کا ارشاد ہے۔ " ایک مسلمان پر اپنے امیر کی سمع وطاعت فرض ہے خواہ اس کا حکم اُسے پسند ہو یا ناپسند، تا وقتیکہ اُسے معصیت کا حکم نہ دیا جائے اور جب معصیت کا حکم دیا جائے تو پھر کوئی سمع وطاعت نہیں (خلافت وملوکیت)

چونکہ حضرت عثمان رضؓ نے کوئی بھی کام قرآن اور سُنّت سے ہٹ کر نہیں کیا تھا۔ اس لئے اُن کی اطاعت بلاشک وشبہ فرض تھی۔ لیکن باغیوں نے اُن کی اطاعت نہیں کی۔ اور امیر المومنین کی اسی نافرمانی نے آگے ہونے والے تمام فتنہ وفساد اور خون خرابوں کی بُنیاد ڈالی۔ جیسا کہ آگے کی سطروں سے واضح طور پر ثابت ہو جائے گا۔

(۲) خود سیدنا حضرت عثمان رضؓ نے ہر طرح سے باغیوں کو مطمئن کرنے کی بلیغ کوشش فرمائی تھی۔ جس مؤثر اور دلنشیں انداز میں حضرت عثمانؓ نے

باغیوں کو فہمائش کی تھی اگر اُن میں ذرا بھی خوفِ خدا اور پاسِ رسول ہوتا تو وہ اپنی ریشہ دوانیوں سے باز آجاتے۔ مثال کے طور پر یہ تحریریں ملاحظہ فرمائیں

"کاشانہ خلافت کا محاصرہ کرنے والے باغیوں کو متعدد دفعہ حضرت عثمان رضؓ نے سمجھانے کی کوشش کی، ان کے سامنے مؤثر تقریریں کیں۔ حضرت ابی بن کعبؓ نے تقریر کی، مگر لوگوں پر کسی چیز کا اثر نہ ہوا۔ حضرت عثمان رضؓ نے چھت کے اوپر سے مجمع کو خطاب کرکے فرمایا کہ کیا تمہیں معلوم ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ آئے تو یہ مسجد تنگ تھی۔ آپ نے فرمایا کون اس زمین کو خرید کر وقف کرے گا؟ اس صلے میں اُس کو اس سے بہتر جگہ جنت میں ملے گی۔ تو میں نے آپ کے حکم کی تعمیل کی۔ کیا اسی مسجد میں تم مجھے نماز نہیں پڑھنے دیتے؟ تم کو خدا کی قسم دیتا ہوں بتاؤ کیا تم جانتے ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے تو یہاں رومہ کے سوا میٹھے پانی کا کوئی کنواں نہ تھا۔ آپ نے فرمایا کہ اس کو کون خرید کر عام مسلمانوں پر وقف کرتا ہے؟ اور اس سے بہتر اس کو جنت میں ملے گا۔ تو میں نے ہی اُس کی تعمیل کی۔ تو کیا اس کے پانی سے مجھے محروم کررہے ہو؟ کیا تم نہیں جانتے کہ عسرت کے لشکر کو میں نے ہی ساز و سامان سے آراستہ کیا تھا؟ سب نے جواب دیا تھا۔ "خداوندا یہ سچ ہے، یہ سب باتیں سچ ہیں" مگر سن کر لوگوں پر اس کا اثر نہ ہوا۔

آخر میں باغی یہ دیکھ کر کہ حج کا موسم چند روز میں ختم ہوجائے گا۔ اور اس کے ختم ہوتے ہی لوگ مدینے کا رُخ کریں گے پھر ہاتھ سے موقع نکل جائے گا۔ آپؓ کے قتل کے مشورے کرنے لگے جس کو خود حضرت عثمانؓ

نے اپنے کانوں سے سنا اور مجمع کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا، لوگو! آخر کس جرم پر میرے خون کے پیاسے ہو؟ اسلامی شریعت میں کسی کے قتل کی صرف تین ہی صورتیں ہیں، یا اس نے بدکاری کی ہو تو اس کو سنگسار کیا جائے یا اس نے بالارادہ کسی کو قتل کیا ہو تو وہ قصاص میں مارا جائے گا، یا وہ مرتد ہو گیا ہو تو قتل کیا جائے گا۔ میں نے نہ تو جاہلیت میں اور نہ اسلام میں بدکاری کی، نہ کسی کو قتل کیا اور نہ اسلام کے بعد مرتد ہوا، اب بھی گواہی دیتا ہوں کہ خدا ایک ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اسکے بندے اور رسول ہیں لیکن باغیوں پر ان میں سے کوئی تقریر کارگر نہ ہوئی" (خلفائے راشدین ۲۴۳-۲۴۲)

یہ تقریریں بلاشبہ ایسی ہیں کہ ہر قلب سلیم کو مطمئن کرنے کیلئے کافی ہیں۔ لیکن اسکے باوجود وہ شیطانی گروہ مطمئن نہ ہوا اور اس نے حضرت عثمانؓ جیسے پیکر حلم و بردباری کو شہید کر دیا۔ کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ درحقیقت فاش غلطی کس کی تھی؟ اگر باغی حضرت عثمانؓ کو شہید نہ کرتے تو صرف اُن کی اقربا پروری والی پالیسی کی وجہ سے خلافت کو ملوکیت میں بدلنے کا بہانہ نہیں ملتا۔ کیوں کہ اُس وقت ان کی اس پالیسی سے غیر مطمئن ہونے کے باوجود عام مسلمان بہرحال اپنے امیر کے ساتھ تھے یہی بات مولانا مودودی نے بھی لکھی ہے:

"اُن کی پالیسی کے اُس خاص پہلو سے غیر مطمئن ہونے کے باوجود عام مسلمان پوری مملکت میں کسی جگہ بھی اُن کے خلاف بغاوت کا خیال تک دل میں لانے کیلئے تیار نہ تھے۔ ایکمرتبہ بصرہ میں اُن کے گورنر سعید بن العاص کے طرز عمل سے ناراض ہو کر کچھ لوگوں نے بغاوت برپا کرنے کی کوشش بھی کی تو عوام نے اُن کا ساتھ نہ دیا۔ اور حضرت عثمانؓ کیطرف سے جب ابوموسیٰ اشعری نے لوگوں کو بیعت کی تجدید کیلئے پکارا تو لوگ بغاوت کے علمبرداروں کو چھوڑ کر بیعت کے لیئے ٹوٹ پڑے۔ یہی وجہ ہے کہ جو مختصر سا گروہ اُن کے خلاف شورش برپا کرنے اُٹھا اُس نے بغاوت کی دعوتِ عام دینے کے بجائے سازش کا راستہ اختیار کیا"　(خلافت و ملوکیت ص۱۰۰ و ص۱۰۱)

اگر باغی حضرت عثمانؓ کے خلاف سازشیں نہ کرتے اور انھیں بے رحمی سے قتل نہ کرتے بلکہ اُنکی تقریروں سے مطمئن ہو کر اپنی راہ لیتے تو کیا اس بات میں کسی شک کی گنجائش رہ جاتی ہے کہ خلافت بدستور جاری رہتی؟ نہ خونِ عثمان کے قصاص کیلئے جنگِ جمل چھڑتی نہ حضرت معاویہؓ سے جنگ صفین کی نوبت آتی۔ اور جب یہ سب کچھ نہ ہوتا تو خلافت کے ملوکیت میں بدلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ حضرت عثمان غنیؓ کی وفات کے بعد حسبِ معمول صلاح ومشورہ سے خلیفہ کا انتخاب کرلیتے اور نظامِ حکومت بدستور جاری رہتا۔

اگر یہاں کوئی اعتراض کرے کہ باغی حضرت علی رضؓ کے سمجھانے پر واپس چلے گئے تھے لیکن مروان کے اشتعال انگیز خط نے ان کو دوبارہ انتقام پر آمادہ کیا پھر بھی حضرت عثمانؓ نے مروان کو معزول نہیں کیا بلکہ اس کے ساتھ عفو و درگذر کا معاملہ کیا۔ اس لئے یہ تو حضرت عثمانؓ کی کھلی ہوئی غلطی تھی۔ لیکن ذرا غور سے کام لیا جائے تو یہ حقیقت بھی واضح ہو جائے گی کہ یہاں بھی باغی ہی غلطی پر تھے نہ کہ حضرت عثمانؓ۔ مروان نے بلاشبہ زیادتی کی تھی کہ حضرت عثمان کے علم میں لائے بغیر ایک اشتعال انگیز خط لکھدیا تھا۔

اگر حضرت عثمانؓ اس کی اس زیادتی پر سزا دیتے تو یہ بھی عین قرآنِ حکیم کے مطابق تھا۔ اور اگر سزا نہ دی بلکہ اُس کی حرکت پر صبر فرمایا تو یہ بھی عین قرآنِ حکیم کے مطابق تھا۔

وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُم بِهٖ وَلَئِن صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصَّابِرِينَ۔ (النحل: ۱۲۶)	اور اگر بدلہ لو تو اتنا ہی لو جتنا تمہیں ستایا گیا ہے۔ اور اگر صبر کرو تو وہ بہتر ہے صبر کرنے والوں کے لئے۔

اسی لئے قرآنی تعلیمات سے کما حقہٗ آشنا جماعت صحابہ نے اس بار بھی حضرت عثمانؓ کا ساتھ دیا۔ لیکن اس کے باوجود بھی باغیوں نے صحابہ کرام کی جماعت کا ساتھ نہ دیا۔ بلکہ حضرت عثمانؓ کے گھر کا محاصرہ کرلیا اور اُن کو بے دردی سے قتل کر ڈالا۔ جس جماعت نے صحابہ کرام کی جماعت کا ساتھ نہ دیا اُن کے طریق پر نہ چلی وہ جماعت ہی دراصل غلطی پر ہے۔

[نا]حق پر ہے کیونکہ رسول اللہ صلعم نے اُسی جماعت کو حق پر ہونے کی اور جنت کی بشارت دی ہے جو آپؐ کے اور آپؐ کے صحابہ کے طریق پر ہوگی۔ اس لئے اس امر میں کسی شک کی گنجائش نہیں رہتی کہ باغی ہی غلطی پر تھے نہ کہ حضرت عثمانؓ۔

اگر باغی اپنے امیر حضرت عثمان کی اطاعت کرتے جو کہ اُن کا فرض تھا اور آپ کو قتل نہ کرتے جو کہ حرام تھا تو خونِ عثمان کے قصاص کیلئے نہ جنگِ جمل چھڑتی نہ حضرت امیر معاویہ سے جنگِ صفین کی نوبت آتی، نہ تحکیم کا مسئلہ پیش آتا۔ نہ حضرت علی شہید کئے جاتے۔ نہ حضرت امیر معاویہؓ کے ہاتھوں میں پوری مملکتِ اسلامی کی باگ ڈور آتی اور نہ یزید کی ولی عہدی سے ملوکیت کا نظام باقاعدہ جاری ہوتا۔ پس ثابت ہوا کہ سارے فساد کی جڑ باغیوں کی نافرمانی اور اُن کے ہاتھوں حضرت عثمانؓ جیسے بے خطا انسان کا ظالمانہ اور بہیمانہ قتل تھا۔ چنانچہ صحیح بخاری کتاب الفتن میں اس کا اشارہ ہے کہ جو خون آشام تلوار حضرت عثمان رضا پر بے نیام ہوگی وہ قیامت تک بے نیام رہے گی اور فتنہ و فساد کا جو دروازہ کھلے گا وہ حشر تک کھلا رہے گا۔ (بحوالہ خلفائے راشدین ص ۲۳۵)

اس اصولی بحث کے بعد چند ادر نکات کی تشریح کرنے کو جی چاہتا ہے۔

۱۔ ایک روایت کے مطابق اگر کوئی شخص کوئی برائی ایجاد کرتا ہے تو اُس بُرائی کے کرنے کا گناہ تو اس پر آتا ہی ہے لیکن اُس بُرائی کے ارتکاب میں جتنے بھی لوگ ملوث ہونگے تمام کے مجموعی گناہوں کا وبال بھی اسی ایجاد کرنیوالے کے سر پر ہوگا۔ اس طرح گویا بُرائی کا موجد عذاب کے اتھاہ سمندر میں غرق ہو جاتا ہے۔

مولانا مودودی نے جیسا کہ اُن کی تحریروں سے ثابت ہوتا ہے۔ حضرت عثمانؓ کی اقربا نوازی والی پالیسی کو ہی ملوکیت کے تمام شر ور کی بنیاد قرار دیا ہے۔ اس طرح گویا [ملو]کیت آجانے پر جتنے بھی ظلم و ستم ہوئے، جتنا بھی ناحق خون خرابہ ہوا، حدود اللہ [تو]ڑے گئے، شریعت کی حدیں پھلانگی گئیں، عورتوں کی عصمت دری کی گئی،

تمام گناہوں کا وبال حضرت عثمانؓ پر آجاتا ہے۔ کیونکہ نہ وہ ایسی پالیسی اپناتے اور نہ یہ سب خرابیاں پیدا ہوتیں۔ اس طرح مولانا مولانا مودودی نے ایک ایسی سخت اور گھناؤنی بات اُس صحابی کی طرف منسوب کردی ہے جو عشرہ مبشرہ میں سے ہے۔ ارباب عقل ذرا انصاف سے فیصلہ کریں کہ ملوکیت کی تمام برائیوں کو ایک جلیل القدر صحابی سے منسوب کردینا جس کی زندگی میں بلاشبہ خیر اور نیکی کا پہلو غالب تھا کیا عقل و انصاف یا دین و شریعت کے تقاضے کے مطابق ہے؟

۲۔ مولانا مودودی نے تمام جلیل القدر صحابہ مثلاً حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت طلحہ، حضرت زبیرؓ، حضرت عمروؓ بن العاص، حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ وغیرہ کی غلطیاں طشت ازبام کی ہیں یہاں تک کہ اُمت کی ماں حضرت عائشہؓ کو بھی نہیں بخشا ہے۔ حالانکہ مولانا خود اس حقیقت کا اقرار کرتے ہیں کہ ان صحابہ کی زندگیوں میں خیر کا پہلو غالب تھا۔ وہ اس بات کے بھی معترف ہیں کہ اسلاف کی خوبیوں کو ہی مثال بنانا چاہیئے اور کمزوریوں سے صرف نظر کرنا چاہیئے۔ اُن کے نزدیک یہی طرز عمل پوری قوم کے لئے مفید ہے۔ چنانچہ "سیارہ" کے "اقبال نمبر" مئی ۱۹۶۳ء کے لئے انھوں نے جو انٹرویو دیا تھا اُس میں انہی خیالات کا اظہار کیا تھا۔ (ملاحظہ ہو "شخصیات" ص ۲۲۹)

لیکن کس قدر افسوس کی بات ہیکہ وہ خود اپنا معیار اور کسوٹی برقرار نہ رکھ سکے اور صحابہ کرامؓ پر ایسی کڑی تنقید کی کہ خدا کی پناہ۔ کیا عقل و انصاف کا یہی تقاضہ ہیکہ خیر سے لبریز زندگی میں اگر دوچار کمزوریاں نظر آجائیں تو انھیں اتنا اچھالا جائے اتنا پھیلایا جائے کہ تمام خیر چھپ جائے۔

۳۔ شریعت بھی اس تنقید کو روا نہیں رکھتی۔ چنانچہ تاکید ہے کہ اپنے مُردوں کو بھلائی کے ساتھ یاد کرو۔ کہا گیا ہے کہ تم دوسروں کی عیب پوشی کروگے تو خدا تمہاری عیب پوشی کریگا لیکن اس فرمان نبوی کو نظر انداز کر کے مولانا مودودی نے صحابہ کرام کی غلطیوں کو ڈنکے کی چوٹ پر طشت ازبام کیا۔ انکے اس رویہ کو کسی طرح مناسب نہیں کہا جاسکتا۔

مطبوعاتِ جدیدہ

تعارف و تبصرہ کے لئے کتاب کے دو نسخے ضروری ہیں۔

(۱) نام کتاب:۔ فیض المنعم شرح اردو مقدمہ مسلم۔
تشریح و ترتیب:۔ مولانا مفتی سعید احمد پالن پوری استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند
ضخامت:۔ ۱۷۶ صفحات، سائز متوسط، کتابت وطباعت معیاری، کاغذ عمدہ،
دیدہ زیب ٹائیٹل۔ ناشر مکتبہ حجاز دیوبند۔ قیمت بیس روپئے۔

مولانا سعید احمد پالن پوری صاحب کثرتِ مطالعہ اور وسعتِ معلومات میں اپنے ہم عصر علماء میں امتیازی شان کے مالک ہیں۔ موصوف ایک کامیاب مدرس ہونے کے ساتھ بہترین مصنف بھی ہیں۔ اب تک ایک درجن سے زائد کتابیں تصنیف کرچکے ہیں جو شائع ہوکر مقبول عام ہوچکی ہیں۔ زیرِ تبصرہ کتاب فیض المنعم مولانا کی جدید تالیف ہے۔

اہلِ علم بالخصوص حدیث پاک سے شغف رکھنے والوں پر یہ بات مخفی نہیں ہے کہ امیر المومنین فی الحدیث الامام مسلم بن الحجاج القشیری المتوفی سنہ ۲۶۱ھ ۸۷۵ء کا مقدمہ مسلم اپنی گوناگوں خصوصیات اور گرانقدر معلومات کی بناء پر ہر دور کے علماء و محدثین کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ اور بہت سے محقق اور صاحب نظر علماء نے اس کی توضیح و تشریح کی خدمت انجام دی ہے جس کا سلسلہ تاہنوز جاری ہے۔ "فیض المنعم" بھی اسی سلسلہ کی ایک زرّیں کڑی ہے۔

یہ شرح اگرچہ طلبہ حدیث کی استعداد و صلاحیت کو سامنے رکھ کر مرتب کی گئی ہے مگر اپنی افادیت کے لحاظ سے علماء و فضلاء کیلئے بھی ایک خاصے کی چیز ہے۔ کتاب کی

خصوصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے خود مؤلف موصوف رقمطراز ہیں :-

"میں نے شرح لکھتے وقت اس بات کا التزام کیا ہے کہ بات صرف کتاب کی حد تک موقوف رکھی جائے۔ دیگر مفید مضامین سے تعرض نہ کیا جائے۔ اور معالم طریق یعنی عناوین کا اضافہ کیا جائے کیونکہ اس سے کتاب سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اور سب سے اہم چیز عبارت کا حل تھی جس کیلئے عبارت کی تحلیل وترکیب ضروری تھی چنانچہ شرح اس طرح مرتب کی گئی ہے کہ پہلے عنوان قائم کیا گیا ہے۔ عنوان کے تحت اپنے الفاظ میں امام مسلم رح کا مدعیٰ تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ پھر امام مسلم رح کی عبارت لکھی گئی ہے اسکے بعد درسی ترجمہ ہے۔ پھر حلِّ لغات اور آخر میں ترکیب دی گئی ہے۔"

اصل شرح سے پہلے آٹھ صفحات پر مشتمل مؤلف ہی کے قلم سے ایک نہایت وقیع وجامع مقدمہ ہے جس میں امام مسلم، صحیح مسلم اور مقدمہ مسلم سے متعلق ضروری اور اہم معلومات کو بڑے اچھے انداز سے جمع کردیا گیا ہے۔ بہر حال "فیض المنعم شرح مقدمہ مسلم" اپنی حُسنِ ترتیب، مفید مضامین اور دیگر خصوصیات کی بنا پر مقدمہ مسلم کی اب تک لکھی گئی اردو شرحوں میں سب پر فوقیت رکھتی ہے۔ اسلئے بجا طور پر یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ طالبانِ حدیث اس خوانِ نعمت سے پورا پورا استفادہ کریں گے۔

(۲) نام کتاب :- حیاتِ پاک (برزخی) رحمۃ للعالمین

مرتبہ :- حافظ نذیر احمد نقشبندی مجددی۔ ضخامت ۱۱۷ صفحات، سائز خرد کتابت و طباعت اعلیٰ، کاغذ نہایت عمدہ، مجلد مع رنگین کور، ناشر :- انجمن نصرۃ القرآن مدنی محلہ گوجرانوالہ پاکستان۔ قیمت درج نہیں۔

حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی حیات بعد از وفات کا عقیدہ نصوصِ شرعیہ اور اجماعِ اُمت سے ثابت ہے۔ اس سلسلے میں اگر کسی نے اختلاف کیا ہے تو وہ کیفیتِ حیات سے متعلق ہے نفسِ حیات پر پوری اُمت متفق ہے۔ آثارِ صحابہ، اقوالِ تابعین اور ائمہ متبوعین کے مسلک پر لکھی گئی کتابوں کی تصریحات سے واضح ہوتا ہے کہ حضراتِ انبیاء کی یہ حیات اپنے اپنے اجسامِ عنصریہ کے ساتھ ہے۔ بعد از وفات روح اور جسم عنصری کے اسی ربط وتعلق کی

بنا پر انکے اموال میں وراثت جاری نہیں ہوتی، انکی ازواج مطہرات سے نکاح حرام ہے اور مٹی انکے اجسام کو کھا کر فنا نہیں کرتی۔ چنانچہ جمہور اہل سنت والجماعت کا عقیدہ یہی ہیکہ حضرات انبیاء کرام وفات کے بعد روح وجسم عنصری کے ساتھ اپنی قبروں میں زندہ ہیں۔ جمہور کے اسی عقیدہ کی تائید و تصویب میں یہ مبارک رسالہ مرتب کیا ہے۔ لقامت کہتر و بقیمت بہتر کا بہترین مصداق ہے۔ مؤلف موصوف نے دلائل وشواہد سے اس مسئلہ کو اس طرح منقح و مبرہن کر دیا ہے کہ اس سلسلے میں کسی رد و قدح کی گنجائش باقی نہیں چھوڑی ہے۔ طبقۂ اہل سنت والجماعت بالخصوص علمائے دیوبند کی جانب سے حافظ نذیر صاحب اس کامیاب رسالہ کی ترتیب پر مستحق مبارکباد ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی اس کوشش کو قبولیت سے نوازے۔ اور امت کو اس سے استفادہ کی توفیق مرحمت فرمائے۔

(۳) نام کتاب :۔ آداب اذان و اقامت

مؤلف :۔ مولانا محمد امین صاحب پالنپوری استاذ دارالعلوم دیوبند۔ ضخامت ۱۶۰ صفحات۔ سائز متوسط، کتابت بہتر، طباعت آفسیٹ، کاغذ درمیانی، ناشر گجرات بکڈپو محلہ قلعہ دیوبند۔ قیمت درج نہیں۔

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس کتاب کا موضوع اذان و اقامت کے مسائل و فضائل ہیں۔ کتاب کے مرکزی عنوانات حسب ذیل ہیں :۔ اذان و اقامت کی تاریخ، اذان و اقامت کے احکام، مؤذن کے آداب و احکام، اجابت اذان و اقامت، اذان و اقامت کے دیگر مواقع، اذان و اقامت سے متعلق بدعات و رسوم، چند ضروری مسائل، ان جلی اور مرکزی عنوانوں کے تحت ایک صد سے زائد ذیلی عنوانات قائم کئے گئے ہیں جس سے کتاب کی افادیت بہت بڑھ گئی ہے۔ اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اپنے موضوع پر نہایت مکمل و مفصل ہونے کے ساتھ کوئی بات مستند حوالوں کے بغیر نہیں لکھی گئی ہے۔ اور مختلف فیہ مسائل میں مسلکی جنبہ داری کے بجائے اعتدال پسندی کا رویہ اختیار کیا گیا ہے۔ امید ہے کہ پڑھے لکھے دیندار حلقوں میں یہ کتاب پسندیدگی کی نظر سے دیکھی جائے گی۔

دارالعلوم دیوبند کا ترجمان

دارالعلوم
دیوبند

ماہ ربیع الاول ۱۴۰۹ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۸۸ء

جلد ۷۳ — سالانہ ۴۰/- روپے

شمارہ ۱۱ — فی شمارہ ۴/- روپے

نگران

حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند

مدیر: مولانا حبیب الرحمٰن صاحب قاسمی

سالانہ بدل اشتراک غیر ممالک سے

سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ	175/-
پاکستان سے	80/-
بنگلہ دیش سے (ہندوستانی)	60/-

⁂ سرخ نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ کا زرِ تعاون ختم ہوگیا ہے۔

فہرست مضامین

ہندوستانی و پاکستانی خریداروں سے ضروری گذارش

۱۔ ہندوستانی خریداروں سے ضروری گذارش یہ ہے کہ ختم خریداری کی اطلاع پاکر اول فرصت میں اپنا چندہ نمبر خریداری کے حوالہ کے ساتھ منی آرڈر سے روانہ کریں۔

۲۔ پاکستانی خریدار اپنا چندہ مبلغ -/۸۰ روپے مولانا عبدالستار صاحب مہتمم جامعہ عربیہ محمودیہ داؤد والا براہ شجاع آباد ملتان، پاکستان، کو بھیجدیں۔

۳۔ خریدار حضرات پتہ پر درج شدہ نمبر محفوظ فرمالیں، خط وکتابت کے وقت خریداری نمبر ضرور لکھیں۔

والسّلام

منیجر

دسویں صدی ہجری کے آخر اور گیارہویں صدی ہجری کے شروع کا زمانہ ہندوستان میں اسلام اور حامیان اسلام کے لئے انتہائی نازک شمار کیا جاتا ہے جبکہ مغل تاجدار جلال الدین اکبر (۹۶۳ - ۱۰۱۴) نے شہنشاہیت کی ترنگ اور عقلیت کے نشہ میں عقل و ہوش سے بے نیاز ہو کر" دین اسلام کے متوازی" دینِ الٰہیہ" کے نام سے ایک جدید مذہب کی تحریک چلائی۔

دربار اکبری سے منسلک ایک ثقہ عالم اور مستند مورخ " ملا عبدالقادر بدایونی"، اس جدید مذہب کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں" اکبر کا حال یہ تھا کہ جب اس کے سامنے کسی معاملہ سے متعلق شرعی ثبوت پیش کئے جاتے تو برہم ہو کر یہ کہتا تھا کہ یہ سب ملاؤں کی باتیں ہیں مجھ سے تو عقل وحکمت ہی کی باتیں بیان اور دریافت کی جائیں (منتخب التواریخ ص۳۰۸) اس عقلیت پرستی کے دور میں عام طور پر یہ بات مشہور کر دی گئی تھی کہ دین کا مدار عقل پر ہے نقل پر نہیں۔ (م ص۲۱۱) مورخ بدایونی نے اس سے بھی خطرناک روش کی اطلاع دی ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ یہ بزعم خود غلط مجتہد اور امام وحی الٰہی کو محال قرار دیتا، غیب اور عالم غیب سے متعلق ارشادات نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی برملا تکذیب کرتا اور فرشتوں، جنات، معجزات، بعث بعد الموت، حساب و کتاب اور ثواب و عذاب کا کھلے لفظوں انکار کرتا تھا (م ص۲۷۳) اس الحاد و زندقہ میں صرف اکبر ہی نہیں گرفتار تھا بلکہ اسکے ارد گرد رہنے والوں میں سے اکثر لوگوں کا حال یہی تھا، معجزات نبوی کے ساتھ استہزاء کی کیفیت کو ملا بدایونی نے یوں بیان کیا ہے کہ" بھرے دربار میں ایک

پیر پر کھڑے ہو کر معراج رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا مذاق اڑاتا اور کہتا کہ جب میں اپنا دوسرا پیر اٹھا کر کھڑا نہیں رہ سکتا تو راتوں رات ایک شخص آسمان سے اوپر کیسے پہنچ گیا پھر خدا سے باتیں بھی کیں اور جب واپس ہوا تو بستر تک گرم تھا، اس کے بعد لکھتے ہیں کہ مذاق واستہزاء کا یہی معاملہ شق القمر اور دیگر معجزات کے ساتھ بھی تھا (ص ۳۱۷) اکبر کے اس سطحی طریق استدلال سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مدعیانِ عقل کی عقل وفہم کو کس طرح زائل فرما دیتے ہیں۔

ائمہ دین اور مجتہدینِ اسلام کی توہین وتحقیر برسرعام کی جاتی تھی اور انھیں فقیہ کور رجعت پسند، رفتار زمانہ سے ناواقف، خشک ملا اور متعصب جیسے اہانت آمیز الفاظ سے یاد کیا جاتا تھا، دربار اکبری کا ممتاز محقق، دین الٰہیہ کا مرتب ابوالفضل فقہاء کرام کے فیصلوں کو یہ کہہ کر رد کر دیا کرتا تھا کہ ان مٹھائی فروخت کرنے والوں، جوتا گانٹھنے والوں اور چمڑا فروشوں کی بات کیسے مان لوں (ص ۲۰۰) یہ ائمہ فقہ شمس الدین عبدالعزیز بن احمد الحلوائی متوفی ۴۹۸ھ اور شیخ احمد بن عمر خصاف متوفی ۲۶۱ھ کی نسبتوں کی طرف تعریض ہے)

دین اسلام کی بیخ کنی کی ان عملی کوششوں کے ساتھ علمی طور پر اسلامی عقائد و اعمال کے اندر شکوک وشبہات پیدا کرنے کی غرض سے آج کل کی اصطلاح میں اسلام کا آزاد سائنٹفک مطالعہ کے لئے قانون ساز کونسلیں قائم کی گئیں اس کمیٹی میں اسلامی عقائد اور مسلمات کے متعلق عقل کی روشنی میں فیصلے کئے جاتے اور اسلامی معتقدات کا مذاق اڑایا جاتا اگر کسی ممبر کی ایمانی غیرت بیدار ہو جاتی اور وہ ان فیصلوں پر اختلافی نوٹ لکھنا چاہتا تو اسے روک دیا جاتا تھا ص ۳۱۷۔

غرضیکہ ایک عظیم تحریک تھی جو ایک مطلق العنان خود سر بادشاہ کی سرپرستی میں دین اسلام کے خلاف چلائی جا رہی تھی، اور مظلوم اسلام انتہائی کس مپرسی کے ساتھ اس کی مخالفانہ اور معاندانہ یورشوں کو برداشت کر رہا تھا، لیکن وہ اسلام جو دنیا میں سربلندی

کے لئے برپا کیا گیا تھا آخر کب تک اس کس مپرسی اور بیچارگی کی حالت میں رہتا، مجدد الف ثانی کے، اس محرف اعظم کی دین اسلام میں تحریفات دیکھ کر، سرہند میں آباد خانوادہ فاروقی کے ایک فرزند رشید شیخ احمد فاروقی کی رگ فاروقیت پھڑک اٹھی اور وہ اپنی تمامتر بے سروسامانی کے باوجود برصغیر کی اس سب سے بڑی طاقت سے ٹکرا گئے ابتدا میں اگرچہ چندے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں لیکن آخر میں دنیا نے دیکھ لیا کہ محرف الف ثانی کے مقابلہ میں فتح و کامرانی مجدد الف ثانی ہی کے حصہ میں آئی اور جس گھر سے اسلام کو بیخ و بن سے اکھاڑ دینے کی تحریک چلی تھی اسی گھر میں اورنگ زیب عالمگیر جیسا اسلام دوست اور شاہی میں فقیری اداؤں کا رمز شناس بادشاہ پیدا ہوا جس نے اسلامی حمیت کا قابل ستائش مظاہرہ کرتے ہوئے ببانگ دہل اعلان کیا کہ "جدما اکفر بود"۔

مجدد الف ثانیؒ کی مخلصانہ جد و جہد سے محرف الف ثانی (اکبر) کا فتنہ اگرچہ اپنی موت آپ مرگیا لیکن اسلام اور مسلمانوں کے خلاف معاندین اسلام کی ریشہ دوانیوں کا سلسلہ بدستور جاری ہے بالخصوص عصر جدید کی ذہنی آوارگی اور فکری تمرد نے اس مجرمانہ فکر کو ایک فن بنا دیا ہے اور اظہار رائے کی آزادی کے پردے میں اسلامی تعلیمات اور اسلامی شخصیتوں پر کھل کر نازیبا حملے کئے جاتے ہیں، بدقسمتی سے قلم ایسے افراد کے ہاتھوں میں پہنچ گیا ہے جو شائستگی و سلامت روی تو دور کی بات ہے انسانیت کو بھی اہمیت نہیں دیتے، یہ انسان نما شیاطین ادب و ثقافت کا نام لیکر اپنے قلم کی تیغ سے اسلامی اور انسانی اقدار کو مجروح کرنے ہی کو کمال فن سمجھتے ہیں اس کی تازہ ترین مثال سلمان رشدی کی بدبختانہ ناول "شیطانی آیات" ہے جو اس کی فکری ضلالت اور ذہنی شیطنت کا ایک شاہکار ہے، یہ بدبخت اور ننگ خاندان پیدا تو مسلمان گھرانے میں ہوا لیکن اس کی تعلیم و تربیت یورپ میں یہودیوں اور نصرانیوں کے زیر سایہ ہوئی ہے

اور بدقسمتی سے ایک عیسائی عورت سے ازدواجی رشتہ قائم کرلیا جس نے رہی سہی کسر پوری کردی، اب وہ دین و مذہب، اخلاق و شرافت اور رواداری وسلامت روی کو پس پشت ڈال کر محض روپے کمانے اور دولت جمع کرنے کی ہوس میں اہم اور ممتاز شخصیتوں پر گندے اور گھناؤنے ناول لکھا کرتا ہے اسی ناروا اخلاق سوز سلسلے کی ایک انتہائی خبث آمیز کڑی اس کی تازہ ترین ناول "شیطانی آیات ہے جس میں اس بدباطن نے عفت مآب امہات المومنین اور سید المرسلین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں ایسے نازیبا اور گستاخانہ کلمات لکھے ہیں جسے کوئی بھی شریف الطبع انسان برداشت نہیں کرسکتا، اس لئے اس شیطانی کتاب کے خلاف مسلمانوں کا احتجاج ایک فطری امر ہے مسلمان عمل میں چاہے کتنا ہی کوتاہ کیوں نہ ہو لیکن وہ اپنے مذہب اور مذہبی شخصیات کے بالخصوص رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں انتہائی جذباتی واقع ہوا ہے، وہ مال و دولت، جاہ و عزت حتی کہ جانِ عزیز تک کے زیاں کو برداشت کرلیتا ہے لیکن اپنے پیغمبر اور ہادی کے بارے میں ادنی کسر شان کو برداشت نہیں کرسکتا اور پوری دنیا کے سامنے اس کا یہ اعلان ہے کہ ؎

جو جان مانگو تو جان دیں گے جو مال مانگو تو مال دیں گے
مگر یہ ہم سے نہ ہو سکے گا نبی کا جاہ و جلال دیں گے

ہمیں حیرت ہے کہ جس ملک میں یہ ناول لکھا گیا ہے اس ملک کے ارباب حکومت نے اس کے شائع کرنے کی اجازت کیسے دیدی کیا دنیا میں بسنے والے کروڑوں مسلمانوں کے جذبات کا اسے بالکل پاس نہیں ہے، کیا ان کا احساس مردہ ہوگیا ہے، ہمیں خوشی ہے کہ حکومت ہند نے اس ناپاک کتاب پر پابندی عائد کرکے نہ صرف مسلمانوں کے جذبات کا احترام کیا ہے بلکہ انسانی قدروں کی عزت افزائی کی ہے جس پر وہ بجا طور پر مستحق مبارک باد ہے، لیکن بعض وہ عناصر جنھیں اسلام اور مسلمانوں کے نام سے الرجی ہے جو

(باقی ص۴۲ پر)

مولانا نسیم احمد مظفر پوری
فاضل دارالعلوم دیوبند

ایک مجلس میں تین طلاق کا شرعی حکم

مذہب اسلام کی جامعیت دینِ اسلام ایک کامل و مکمل دین ہے جس کی جامعیت کا اعتراف غیر مسلم مؤرخوں نے بھی کیا ہے، مذہب اسلام میں انسان کی زندگی کے مختلف اور متنوع و متضاد گوشوں پر مکمل ہدایات موجود ہیں، انسانی زندگی کا کوئی ایسا شعبہ اور گوشہ نہیں ہے جس میں مذہب اسلام کی رہنمائی و ہدایت نہ ملتی ہو، دوسرے مذاہب و ادیان کی طرح اسلام نے اپنے حلقہ بگوشوں کو شتر بے مہار کی طرح آزاد نہیں چھوڑا کہ جس طرح وہ چاہیں خواہشات داہوار کی تلاطم خیز موجوں سے ٹکراتے رہیں اور حدودِ خداوندی اور محارم الٰہی کے تھپیڑوں سے کھیلتے رہیں جیسا کہ آج دنیا کی مہذب و متمدن کہلانے والی قومیں انسانیت کو شرما دینے والے افعال و اعمال کا ارتکاب بلا کسی روک ٹوک کے کر رہی ہیں، انسان اپنی زندگی کے کسی موڑ اور مرحلہ میں کسی ایسی الجھن و مشکل میں مبتلا نہیں ہوتا جس میں اسلام نے اس کی دستگیری و رہنمائی نہ کی ہو، عقائد و اعمال اخلاق و معاملات کے سبھی گوشوں پر حسب ضرورتِ انسانی روشنی نہ ڈالی ہو، آج دنیا میں کسی ایسے مذہب و ملت کا سراغ نہیں ملتا جو اپنی جامعیت میں اسلام کے ہم پلہ تو کیا اس کا عشر عشیر بھی ثابت ہو سکے۔

مگر افسوس کہ اس جامع ترین اور اعلیٰ مذہب کو اپنانے اور اپنی زندگی میں اسکے نفاذ سے مسلمان جی چراتے اور شرماتے ہیں، جس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے

کہ مغربی تہذیب وتمدن اور یورپین اخلاق وعادات کی نحوست نے ان کے دل ودماغ کے دریچوں کو بند اور ان کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا ہے، خواہشات ونفسانیت کی آزادی نے اسلام کے اتباع کی راہیں مسدود کر دی ہیں اس لئے آئے دن اسلام کی نت نئی تعبیریں اور تشریحیں کی جاتی ہیں اور اسلامی افکار وخیالات اور مذہبی دستور واساس کو اپنی نارسا عقل کا غلام اور رفتارِ زمانہ کے تابع قرار دینے کی بیجا تگ ودو کی جارہی ہے۔

حیات انسانی کے اسفار میں ایک مرحلہ نکاح کا بھی آتا ہے جس کے بارے میں قرآن وحدیث کے اندر کھلے کھلے احکام وہدایات اور اس کی ترغیب پر صریح ارشادات موجود ہیں، کہیں اس پاکیزہ رشتہ کو نصف دین سے تعبیر کیا گیا ہے (مشکوٰۃ ص ۲۶۸ ج ۲) اور کہیں مستطیع وصاحبِ وسعت کیلئے اس سے اعراض پر سنت سے اعراض کرنے کی سخت وعید سنائی گئی (بخاری ص ۵ ج ۲)، اور کہیں لسانِ نبوت سے یہ ارشاد فرمایا گیا: چار چیزیں انبیاء کرام کی پسندیدہ سنتوں میں سے ہیں، حیا کرنا۔ خوشبو لگانا، نکاح کرنا اور مسواک کرنا (الجامع الصغیر ص ۳۷ ج ۱)

غرضیکہ تکمیل انسانیت میں نکاح اور ازدواجی زندگی کو بڑی اہمیت وفضیلت حاصل ہے اور جب نکاح کرنا اور شرعی دائرہ میں رہ کر میاں بیوی کا گہرا ربط وتعلق رضائے مولیٰ، اتباع شریعت اور تکمیل انسانیت کا ایک بہترین ذریعہ ہے تو اس پاکیزہ رشتہ اور تعلق کو توڑنا بھی اسی انداز کا ناپسندیدہ اور مبغوض امر ہوگا جس قدر کہ وہ محبوب ہے چنانچہ صحابی رسول حضرت عبداللہ بن عمرؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل فرماتے ہیں کہ آپ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں حلال اور مباح کی ہیں ان میں طلاق سے زیادہ مبغوض اور ناپسندیدہ اور کوئی چیز نہیں ہے۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں عن ابن عمر عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: ابغض الحلال الی اللہ عزوجل الطلاق (مشکوٰۃ ص ۲۸۳، ابوداؤد شریف ص ۲۹۶ ج ۱ مطبوعہ دیوبند) ایک دوسری حدیث میں

یہ الفاظ ہیں عن محارب قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما احل اللہ شیئاً ابغض من الطلاق (ابوداؤد شریف) دونوں حدیثوں کا مفہوم ایک ہے کہ طلاق سے زیادہ حلال چیزوں میں کوئی چیز عنداللہ مبغوض نہیں ہے الجامع الصغیر ص۲/۴، المستدرک ص۱۹۶/۲ میں بھی یہ حدیث موجود ہے۔

ان ارشاداتِ نبوی سے معلوم ہوا کہ طلاق باوجود حلال وجائز ہونے کے اللہ تعالیٰ کے نزدیک نہایت مبغوض ترین چیز ہے، اور بلاوجہ طلاق دینے پر حق تعالیٰ ناراض ہوتے ہیں، مسند احمد، ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ میں حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جس عورت نے بلا کسی مجبوری اور ضرورت شرعی کے اپنے خاوند سے طلاق کا مطالبہ کیا تو اس پر اللہ تعالیٰ جنت کی خوشبو بھی حرام کر دیتا ہے، مشکوۃ ص۲۸۳ الجامع الصغیر ۱۲۷/۱ اس صریح اور صحیح روایت سے معلوم ہوا کہ بغیر اشد مجبوری کے طلاق کا مطالبہ کرنا درست نہیں ہے اور ایسی عورت کے بارے میں تغلیظاً وتشدیداً فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ اس پر جنت کی خوشبو بھی حرام کر دیتا ہے چہ جائیکہ وہ جنت میں داخل ہوسکے۔

مگر بعض حالات ومجبوریاں ایسی بھی پیش آتی ہیں کہ جن میں انسان ازدواجی جیسی پر لطف زندگی اور نکاح جیسے مضبوط ومستحکم اور باعثِ سکون رشتہ کو توڑ دینے پر مجبور ہو جاتا ہے، میاں بیوی کے تعلقات وروابط باعث تسکین ہونے کے بجائے سراپا تکلیف وزحمت بن جاتے ہیں اور اس کی زندگی پریشانیوں اور پیچیدگیوں کے تباہ کن سمندر میں ہچکولے کھانے لگتی ہے، ایسے ناگزیر حالات میں مذہبِ اسلام نے طلاق کی اجازت ورخصت بھی دی ہے، البتہ شریعت نے اس کی قیود وحدود بھی متعین فرما دی ہے، طلوعِ اسلام سے قبل دورِ جاہلیت میں سو سو بلکہ ہزار تک طلاقیں دیکر رجوع کرنے کا دستور تھا مگر مذہب اسلام نے اس ناروا طریقہ کے خلاف علم جہاد بلند کیا اور اس کی ایک حد متعین دی اور بیوی کے مغلظہ ہونے کو تین طلاقوں پر منحصر کر دیا، ارشادِ خداوندی ہے۔

الطلاق مرتان ، فامساك بمعروف او تسريح باحسان الیٰ قوله تعالیٰ فان طلقها فلا تحل له من بعد حتیٰ تنکح زوجاً غیرہ (سورۂ بقرہ رکوع ۱۲)	طلاق رجعی ہے دوبار تک، اس کے بعد رکھ لینا موافق دستور کے یا چھوڑ دینا بھلی طرح سے۔ پھر آگے ارشاد ہے۔ پھر اگر اس عورت کو طلاق دی یعنی تیسری بار تو اب حلال نہیں اس کو وہ عورت اس کے بعد جب تک نکاح نہ کرے کسی خاوند سے اسکے سوا (ترجمہ شیخ الہندؒ)

اس کا حاصل یہ ہے کہ دو طلاق دینے تک انسان کو یہ اختیار ہے کہ اپنی بیوی کو دستور کے مطابق رجعت کر کے رکھ لے پھر اگر اس نے تیسری طلاق بھی دیدی، تو اب اُسے رجعت کرنیکا شرعاً حق حاصل نہیں اور وہ عورت اس کیلئے حلال نہیں ہوگی تاوقتیکہ وہ عدت گذارنے کے بعد کسی اور خاوند سے نکاح نہ کرلے (پھر وہ خاوند فوت ہوجائے یا اپنی مرضی سے اُسے طلاق دیدے اور عدت گذر جائے، اس حد تک ائمہ مجتہدین اور اکابر امت متفق ہیں، البتہ طلاق اور اسکے بعد رجعت کی بعض صورتوں میں کچھ اختلافات بھی ہیں مگر اپنے اس مختصر مضمون میں صرف دو مسئلوں پر گفتگو کی جائے گی جیسا کہ تفصیلات سے معلومات ہوجائے گا۔

(۱) اس میں امتُ کا اختلاف ہے کہ ایک مجلس اور ایک کلمہ سے تین طلاقیں دینا شرعاً جائز اور مطابق سنت و قرآن ہے یا خلاف سنت اور بدعت و ضلالت ہے ؟ بعض ائمہ دین جن میں امام شافعی، امام بخاری، امام بیہقی اور علامہ ابن حزم اندلسی وغیرہم ہیں اس بات کے قائل ہیں کہ جس طرح ایک ساتھ دو طلاقیں دینا جائز اور سنت کے مطابق ہے اسی طرح ایک مجلس اور ایک کلمہ سے تین طلاقیں دینا بھی جائز اور سنت کے موافق ہے، ان کے علاوہ حضرت امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام اوزاعی امام لیث بن سعد

وغیرہم فرماتے ہیں کہ بیک وقت تین طلاقیں دینا غیر مستحسن اور مکروہ وبدعت ہے علامہ نووی شرح مسلم میں لکھتے ہیں کہ بیک وقت تین طلاقوں کو جمع کرنا ہمارے ائمہ شوافع کے نزدیک حرام ومکروہ نہیں البتہ بہتر اور افضل یہ ہے کہ تین طلاقیں الگ الگ متفرق طور پر دی جائیں اور امام احمد بن حنبل اور امام ابو ثور بھی اسی کے قائل ہیں اور امام مالک امام اوزاعی، امام ابوحنیفہ اور امام لیث کہتے ہیں کہ اس طرح بیک وقت تین طلاقیں دینا مکروہ اور بدعت ہے (شرح مسلم ص۴۷۶ ج۱) مگر بدعت ومکروہ ہونے کے باوجود اگر کوئی شخص بیک وقت ایک مجلس میں ایک کلمہ سے تین طلاقیں دیدے تو ان حضرات کے نزدیک بھی تینوں طلاقیں واقع ہو کر عورت مغلظہ ہوجائے گی اور بغیر حلالہ کے شوہر اول کیلئے حلال نہیں ہوگی، البتہ اس سلسلے میں ایک تیسرا نقطۂ نظر بعض حضرات کا یہ ہے کہ سرے سے یہ طلاقیں واقع نہ ہوں گی، کیونکہ اس طرح طلاقیں دینا شرعاً ناپسندیدہ اور بدعت ہے اور جو چیز خلافِ سنت ہو اسکا وقوع ونفاذ کیسے؟ رافضیوں کا بھی یہی نظریہ ہے۔

جو حضرات بیک وقت ایک کلمہ سے تین طلاقوں کو جائز اور موافقِ سنت سمجھتے ہیں وہ اپنے استدلال میں نص قرآنی بھی پیش کرتے ہیں چنانچہ علامہ ابو محمد بن حزم الظاہری الاندلسی المتوفی ۴۵۶ھ محلی میں لکھتے ہیں

ثم وجدنا من حجة من قال ان الطلاق الثلاث مجموعة سنة لا بدعة قول الله تعالیٰ فان طلقها فلا تحل له من بعد حتی تنکح زوجاً غیرہ۔ فهذا یقع	پھر ہم نے ان لوگوں کی جو بیک وقت تین طلاقوں کو بدعت نہیں کہتے بلکہ سنت سمجھتے ہیں یہ دلیل پائی کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے "سو اگر اس نے اپنی بیوی کو (تیسری) طلاق بھی دیدی تو وہ اس کے لئے حلال نہیں تاوقتیکہ وہ کسی اور خاوند سے نکاح نہ کرلے

عـلی الثلاث مجموعة ومفـرقـة ولا يجـوز ان يخصـص بهـذه الآية بعض ذلك دون بعض بغيـر نص۔
(محلی ص ۲۰۷ ج ۱۰)

آیت کریمہ کا یہ مضمون ان تین طلاقوں پر بھی صادق آتا ہے جو اکٹھی ہوں اور ان پر بھی جو متفرق طور پر دی گئی ہوں اور بغیر کسی نص کے اس آیت کو تین اکٹھی طلاقوں کو چھوڑ کر صرف متفرق طلاقوں کے ساتھ خاص کر دینا صحیح نہیں ہے۔

علامہ ابن حزم کی اس عبارت کا حاصل یہ ہے کہ جس طرح متفرق طور پر تین طلاقیں اس آیت کریمہ کے مفہوم میں داخل ہیں اسی طرح تین اکٹھی طلاقیں بھی اس کے مفہوم میں بلاشبہ داخل ہیں اور جس طرح متفرق طور پر دی گئی تین طلاقوں کے وقوع ونفاذ میں کسی کا اختلاف نہیں اور نہ ان کے جائز ومطابق سنت ہونے میں کوئی کلام ہے بعینہ اسی طرح دفعۃً دی گئی تین طلاقوں کا حکم بھی اس آیت کے مفہوم میں داخل ہے اور اس کے موافق سنت اور جائز ہونے میں کوئی کلام نہیں۔

ان حضرات کا دوسرا استدلال حضرت عویمر بن ابیض العجلانی کی حدیث سے ہے کہ جب انھوں نے اپنی بیوی خولہ بنت قیس سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لعان کیا تھا تو اس کے بعد فرمایا تھا:

قال عويمر كذبت عليها يارسول الله ان امسكتها فطلقها ثلاثا قبل ان يامره النبی صلی الله عليه وسلم۔
(بخاری ص ۷۹۱ ج ۲، مسلم ص ۴۸۹ ج ۱)

حضرت عویمر نے فرمایا: یا رسول اللہ اگر اس کے بعد بھی اس عورت کو اپنے پاس روکوں اور بیوی بنا کر رکھوں تو گویا میں نے اس پر جھوٹی تہمت باندھی تھی پس انھوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم صادر فرمانے سے پہلے ہی اس کو تین طلاقیں دے دیں۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ دفعۃً تین طلاقیں دینے سے واقع ہو سکتی ہیں کیونکہ حضرت عویمر نے بیک وقت دے دیں اور اس پر آنحضرت ؐ نے کوئی انکار نہیں فرمایا اگر ایک مجلس میں تین طلاقیں دینا ناجائز و حرام ہوتا تو آپ اس پر ہرگز خاموشی اختیار نہ فرماتے بلکہ سختی سے اس سے منع فرماتے۔

اور جو لوگ اسے غیر مستحسن و بدعت قرار دیتے ہیں ان کا استدلال حضرت محمود بن لبید کی روایت ہے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل فرماتے ہیں۔

اخبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن رجل طلق امرأتہ ثلاث تطلیقات جمیعا فقام غضبانا ثم قال ایلعب بکتاب اللہ وانا بین اظہرکم حتی قام رجل وقال یا رسول اللہ الا اقتلہ۔

(نسائی ج۲ ص۸۲)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبر ملی کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو اکھٹی تین طلاقیں دے دی ہیں تو آپ غصے میں اُٹھ کھڑے ہوئے پھر ارشاد فرمایا کہ کیا میری موجودگی میں اللہ تعالیٰ کی کتاب سے کھیلا جاتا ہے، یہ ارشاد سنکر مجمع میں سے ایک شخص کھڑا ہوا اور اس نے کہا کہ حضرت کیا میں اس شخص کا کام تمام نہ کردوں۔

اس حدیث پاک سے ثابت ہوا کہ بیک وقت تین طلاقیں دینا پسندیدہ و مستحسن امر نہیں ہے ورنہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نہ تو اس واقعہ پر اس قدر ناراض ہوتے اور نہ یہ ارشاد فرماتے کہ میری موجودگی میں اللہ کی کتاب سے کھیلا جارہا ہے، البتہ آپ نے اس ناراضگی و خفگی کے باوجود تینوں طلاقوں کو نافذ بھی فرمادیا تھا چنانچہ ابوداؤد شریف میں حضرت سہل بن سعد کی روایت میں یہ الفاظ ہیں

فطلقها ثلاث تطلیقات عند رسول اللہ صلی اللہ علیہ

کہ حضرت عویمر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنی بیوی کو تین طلاقیں

وسلم نا نفذہ صلی اللہ علیہ وسلم دیدیں، اور آپؐ نے ان کو نافذ کر دیا۔
(ابوداؤد ص ۳۰۶ ج ۱)

اور جو لوگ عدمِ وقوع کے قائل ہیں ان کا استدلال عنقریب آئیگا۔

(۲) ایک مجلس کی تین طلاقیں

اس مسئلہ میں بھی امت مسلمہ کا اختلاف ہے کہ ایک مجلس اور ایک کلمہ سے جو تین طلاقیں دفعۃً دی جاتی ہیں ان کا حکم شرعی کیا ہے؟ آیا وہ سب واقع ہو جاتی ہیں یا نہیں؟ ایک واقع ہوتی ہے یا تین؟، اس اختلاف کو صاحب نیل الاوطار علامہ شوکانی المتوفی سنہ نے اس طرح بیان کیا ہے کہ اس میں چار مذاہب ومسالک ہیں (۱) پہلا مذہب یہ ہے کہ تینوں طلاقیں واقع ہوجائینگی حضرات ائمہ اربعہ جمہور تابعین اور اکثر صحابہ کرام اور بعض اہل بیت جن میں حضرت علی رضی اللہ عنہ، ناصر اور امام یحیٰی وغیرہم کا بھی مسلک یہی ہے، بعض امامیہ کا بھی یہی قول ذکر کیا جاتا ہے (۲) دوسرا مذہب یہ ہے کہ یہ طلاقیں سرے سے واقع ہی نہیں ہونگی نہ تین اور نہ ایک بلکہ سب رد کر دی جائیں گی کیونکہ اکٹھی تین طلاقیں دینا شرعاً بدعت مذموم وحرام ہے، اور ہر بدعت مردود ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس نے دین میں کوئی ایسا کام ایجاد کیا جس پر ہمارا امر اور حکم موجود نہ ہو تو وہ کام اور عمل مردود ہے، امامیہ کا یہی مذہب ہے، ان کے نزدیک ایک مجلس کی تین طلاقیں واقع ہی نہیں ہوتی ہیں (۳) تیسرا مذہب یہ ہے کہ ان تین طلاقوں میں سے ایک طلاق رجعی واقع ہوگی، شوہر کو رجعت کر لینے کا حق ان حضرات کے نزدیک باقی رہے گا، اس قول کو حضرت ابن عباس کی طرف منسوب کیا گیا ہے مگر یہ انتساب صحیح نہیں، البتہ متاخرین میں علامہ ابن تیمیہ اور ان کے شاگرد رشید ابن قیم اسی نظریے کے حامی اور علمبردار ہیں، موجودہ غیر مقلدین کا ابن تیمیہ کی پیروی میں اسی پر عمل ہے (۴) چوتھا مذہب یہ ہے کہ اگر اس عورت کو بیک وقت تین طلاقیں دی گئی ہوں جس سے خاوند ہمبستری کر چکا ہے تو وہ تین ہی متصور اور واقع ہونگی

اور اگر اس سے شوہر نے ہمبستری نہیں کی تو اسکے حق میں تین طلاقیں ایک ہو گی، حضرت ابن عباس کے تلامذہ میں سے ایک گروہ کا یہی قول ہے، اور اسحق بن راہویہ کا بھی یہی مسلک ہے (نیل الاوطار ص۱۵۶ ج۶)

علامہ ابن قیم نے زاد المعاد ص۵۴ ج۴ اور اعلام الموقعین ج۳ ص۲۴ سے ص۳۴ میں انھیں چاروں مذاہب کو نقل کیا ہے۔

جمہور کا استدلال آیتِ قرآنی سے

مذاہب کے بیان سے یہ بات بخوبی واضح ہو گئی کہ جمہور علماء امت ایک مجلس کی تین طلاقوں کو تین ہی قرار دیتے ہیں صرف بعض لوگوں کا نظریہ یہ ہے کہ ان تین طلاقوں سے ایک طلاق رجعی پڑے گی مگر جمہور کے دلائل و براہین کی روشنی میں یہ قول ہبا منثورا معلوم ہوتا ہے جیسا کہ آئندہ سطور سے معلوم ہو جائے گا

جمہور کا پہلا استدلال قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیت سے ہے

فان طلقها فلا تحل له من بعد حتیٰ تنکح زوجاً غیرہ. قال الشافعی فالقرآن واللہ اعلم یدل علی ان من طلق زوجته له دخل بها اولم یدخل بها ثلاثاً لم تحل له حتی تنکح زوجا غیرہ
کتاب الام ص۱۶۵ ج۱

پس اگر اس نے اس کو اور طلاق دیدی تو اب وہ عورت اس کیلئے حلال نہیں تاوقتیکہ وہ کسی مرد سے نکاح نہ کرے، حضرت امام شافعی فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ قرآن کریم کا ظاہر اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ جس شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیدیں عام اس سے کہ اس نے اس سے ہمبستری کی ہو یا نہ کی ہو تو وہ عورت اس شخص کیلئے حلال نہیں تاوقتیکہ وہ کسی اور مرد سے نکاح نہ کرلے۔

اور اس سے پہلے علامہ ابن حزم کی عبارت گذر چکی کہ آیت کریمہ کا یہ مضمون

ان تین طلاقوں پر صادق آتا ہے جو اکٹھی ہوں اور ان پر بھی جو متفرق دی گئی ہوں پس اس آیت سے معلوم ہوا کہ جس طرح تین طلاقیں متفرق طور پر دینے سے تینوں طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں، اسی طرح تین طلاقیں دفعۃً دینے سے بھی واقع ہو جاتی ہیں چنانچہ مشہور عالم دین مولانا عبدالحی لکھنوی مجموعہ فتاویٰ میں تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کا اسی امر پر اہتمام کرنا اور تینوں طلاقوں کے وقوع کا حکم دینا اگرچہ ایک مجلس میں ہوں صحیح مسلم وغیرہ میں مروی ہے اور یہی قول موافق ظاہر قرآن کے ہے (مجموعہ فتاوی ص ۴۹۵/۱۶۷)

اسی طرح غیر مقلدین کے امام و پیشوا مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کا یہ حکم (کہ تین طلاقیں تین ہی ہوتی ہیں) قرآن و حدیث سے ماخوذ ہے (اخبار اہل حدیث ۱۹۲۹ء)

الغرض ایک مجلس کی تین طلاقوں کو تین قرار دینا اس آیت کریمہ سے ثابت ہے اور جمہور کا اس سے استدلال واحتجاج بالکل صحیح اور درست ہے، اس کے علاوہ قرآن کریم کی دیگر بعض آیات سے بھی جمہور کے مذہب کی تصویب و تائید ہوتی ہے مثلاً (۱) وان طلقتموھن من قبل ان تمسوھن الخ (۲) ولا جناح علیکم ان طلقتم النساء ما لم تمسوھن (۳) وللمطلقات متاع بالمعروف"

ان آیات کریمہ میں ایک دو اور تین طلاق کے واقع کرنے کی تفریق نہیں کی گئی، لہٰذا اگر بیک وقت تین طلاقیں بھی دیدی گئیں تو وہ سب واقع ہو جائیں گی اور یہی ائمہ اربعہ اور جمہور امت کا مذہب ہے۔

(باقی آئندہ)

مولانا محمد یوسف لدھیانوی

قادیانی فرقہ جو اپنے گمراہ کن عقائد کی بنا پر باجماع امت خارج از اسلام ہے، سادہ لوح اور ناواقف مسلمانوں کو گمراہ کرنے کیلئے نت نئے حربے اختیار کرتا رہتا ہے چنانچہ اس فرقہ کے موجودہ پیشوا مرزا طاہر نے اپنے باپ دادا کے عبرت خیز انجام کے دیکھنے اور جاننے کے باوجود علمائے اسلام کو مباہلہ کا زبانی چیلنج دیا ہے تاکہ قادیانیت کے دجل و فریب سے ناواقف مسلمان اس کی اس دھونس میں آکر اسے حق پر تسلیم کرلیں، علمائے اسلام کی جانب سے اس چیلنج کو قبول کرتے ہوئے مولانا محمد یوسف لدھیانوی نے ایک طویل مراسلہ لکھا ہے، مولانا لدھیانوی کے شکریہ کے ساتھ اسے ماہنامہ دارالعلوم میں شائع کیا جارہا ہے، علمائے دارالعلوم اور اس کے جملہ متعلقین کی جانب سے اسی تحریر کو اس چیلنج کا جواب سمجھ لیا جائے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی !

جناب مرزا طاہر احمد صاحب ! سلامٌ علیٰ من اتبع الہدیٰ

گذشتہ دنوں آپ کی طرف سے مباہلہ کا چیلنج شائع ہوا، میں اسے شاید لائق التفات نہ سمجھتا مگر طویل سفر سے واپسی پر ڈاک میں اس کی ایک کاپی موجود پائی جس میں بطور خاص مجھے مخاطب کیا گیا تھا جس کا جواب بطور خاص مجھ پر لازم ہوا، اسلئے جواباً چند نکات عرض کرتا ہوں

۱ ـــــ سب سے پہلے اس پر آپ کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس ناکارہ کا نام دور حاضر کے مسیلمہ کذاب مرزا غلام احمد قادیانی کے مخالفوں کی فہرست میں درج فرمایا، یہ دراصل بہت بڑا اعزاز ہے جسے قرآن کریم نے ان الفاظ میں ذکر کیا ہے۔

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَنْ یَّرْتَدَّ اے ایمان والو جو شخص تم میں سے اپنے

مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَأْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗۤ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ

(المائدہ ۵۴)

دین سے پھر جاوے تو اللہ تعالیٰ بہت جلد ایسی قوم کو پیدا کردے گا جن سے اللہ تعالیٰ کو محبت ہوگی، اور ان کو اللہ تعالیٰ سے محبت ہوگی مہربان ہونگے وہ مسلمانوں پر تیز ہوں گے کافروں پر، جہاد کرتے ہوں گے اللہ کی راہ میں اور وہ لوگ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا اندیشہ نہ کریں گے یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے جس کو چاہیں عطا فرمائیں اور اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والے ہیں بڑے علم والے ہیں۔

اس آیت کریمہ میں مرتدین سے مقابلہ کرنے والے حضرات کے چھ اوصاف عالیہ بیان فرمائے ہیں اول یہ کہ وہ حق تعالیٰ شانہ کے محبوب بندے ہیں، دوم یہ کہ وہ حق تعالیٰ شانہ کے سچے محب اور عاشق ہیں، سوم یہ کہ وہ اہل ایمان کے حق میں نہایت پست اور متواضع ہیں چہارم یہ کہ وہ اہل کفر کے مقابلہ میں نہایت سخت ہیں، پنجم یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کرتے ہیں اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیتے ہیں ششم یہ کہ وہ دین کے معاملہ میں کسی ملامت گر کی پرواہ نہیں کرتے آخر میں فرمایا کہ یہ حق تعالیٰ کا فضل خاص ہے جس کو چاہتے ہیں یہ فضل عطا فرما دیتے ہیں۔

اس آیت کریمہ کے اولین مصداق حضرت ابوبکر صدیق رضؓ اور ان کے رفقاء رضی اللہ عنہم تھے جنھوں نے مسیلمہ کذاب اور دیگر مرتدین کا مقابلہ کیا اور اس دور میں اس آیۃ کریمہ کا مصداق وہ حضرات ہیں جو مسیلمہ پنجاب مرزا غلام احمد قادیانی مرتد اور اس کی ذریت کا مقابلہ کر رہے ہیں، پس آپ کا اس ناکارہ کو مرزا غلام احمد قادیانی کے مخالفین میں شمار

کرنا گویا اس امر کی شہادت ہے کہ یہ ناکارہ اس دور میں آیتِ کریمہ کا مصداق ہے، ظاہر ہے کہ یہ اس ناکارہ کے بارے میں حق تعالیٰ شانہ کے فضلِ عظیم کی شہادت و بشارت ہے جس پر آپ کا جتنا شکر ادا کروں کم ہے۔

یہ ناکارہ آنحضرت خاتم النبیین و سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کا ادنیٰ ترین اور نالائق ترین اُمتی ہے اور اپنی روسیاہی اور نالائقی میں پوری امتِ محمدیہ (علی صاحبہا الف الف صلوٰۃ وسلام) میں شاید سب سے بڑھ کر ہے، ہمارے حضرت امام العصر مولانا محمد انور شاہ کشمیری نور اللہ مرقدہ کے بقول

کس نیست دریں اُمتِ تو آنکہ چوں احقر
بارُوئے سیاہ آمدہ وموئے زریری

ایسے نالائق و ناکارہ اُمتی کے لئے اس سے بڑھ کر کیا اعزاز ہو سکتا ہے کہ اسے یُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ کا مصداق بنا دیا جائے، آپ کی تحریر سے اس ناکارہ کو توقع ہو گئی ہے کہ ان شاء اللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اس ناکارہ و نالائق "بارُوئے سیاہ آمدہ وموئے زریری" اُمتی کی شفاعت فرمائیں گے ؎

جب کبھی شوریدگانِ عشق کا ہوتا ہے ذکر
اے زہے قسمت کہ ان کو یاد آجاتا ہوں میں

بہرحال آپ نے مرزا قادیانی کے مخالفوں میں اس فقیر کا نام بھی شامل کر کے مجھے بڑا اعزاز بخشا ہے، ان شاء اللہ آپ کی یہ تحریر مجھے فردائے قیامت میں سندِ شفاعت کا کام دے گی، اس لئے آپ کے مُنہ میں گھی شکر۔

۲ ـــــ مرزا غلام احمد قادیانی نے اپنے رسالہ انجام آتھم میں اپنے اس عزم کا اظہار کیا تھا کہ آئندہ وہ علماء کو مخاطب نہیں کرے گا۔ مرزا کے الفاظ یہ ہیں۔

الیوم قضینا ما کان علینا	ہمارے ذمہ جو تبلیغ فرض تھی آج ہم نے اسکا

من التبلیغات .... وان معنا ان لا نخاطب العلماء بعد هذه التوضیحات .... وهذه منا خاتمة المخاطبات (ص ۲۸۲)

حق ادا کیا، اور اب ہمارا قصد یہ ہے کہ ان توضیحات کے بعد ہم علماء کو مخاطب نہیں کرینگے اور یہ ہماری طرف سے مخاطبات کا خاتمہ ہے

جب مرزا قادیانی ۱۸۹۷ء میں وعدہ کر چکا تھا کہ آئندہ ہم علماء کو خطاب نہیں کریں گے تو کیا نوّے سال کے بعد یہ وعدہ — جو آپ کے عقیدے میں "وما ینطق عن الھویٰ ان ھوالا وحی یوحیٰ" کا مصداق تھا — منسوخ ہوگیا یا آپ کے نزدیک مرزا کے وعدے وعید اور قول و فعل ایسے نہیں جن کی طرف التفات کرنا مرزا کی ذریّت کے لئے ضروری ہو؟

۳ — آپ نے علمائے امت کو مباہلہ کا چیلنج دیا ہے، مباہلہ، دو فریقوں کے درمیان حق و باطل اور صدق و کذب کے جانچنے کا آخری معیار ہے، کیا آپ کے نزدیک ایک صدی کا عرصہ گذر جانے کے باوجود مرزا غلام احمد قادیانی کا صدق و کذب اب تک مشتبہ ہے کہ آپ اس کے لئے مباہلہ کرنے چلے ہیں؟ آپ کو یا آپ کی جماعت کو اب تک اس معاملہ میں اشتباہ ہو تو ہو لیکن الحمد للہ اُمّتِ اسلامیہ کو اور امت کے اس نالائق ترین فرد کو مرزا قادیانی کے جھوٹا ہونے میں ادنیٰ سے ادنیٰ شبہ نہیں، امت اسلامیہ کا قطعی و اجماعی عقیدہ و ایمان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا دعویٰ کرنے والا بلا شک و شبہ جھوٹا، مرتد اور زندیق ہے اور وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد: "ثلاثون کذابون کلھم یزعم انہ رسول اللہ" کی صف میں شامل ہے — حق تعالیٰ شانہ نے اپنی قدرتِ کاملہ اور حکمتِ بالغہ سے مرزا غلام احمد قادیانی مسیلمۂ پنجاب کے جھوٹا ہونے پر ایسے بے شمار قطعی دلائل و شواہد جمع کردیئے ہیں جن سے مرزا کا کذب آفتاب نصف النہار کی طرح

عیاں ہوچکا ہے، ان دلائل کی روشنی میں مرزا کا کذاب ہونا کسی ایسے شخص پر مخفی نہیں رہ سکتا جس کے دل میں نورِ ایمان کی معمولی روشنی باقی ہو اور جس کی دل کی آنکھیں یکسر بند ہوگئی ہوں، ہاں! جو شخص ارشادِ خداوندی

وَمَنْ كَانَ فِي هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا ۝

اور جو شخص دنیا میں اندھا رہیگا سو وہ آخرت میں بھی اندھا رہے گا اور زیادہ راہ گم کردہ ہوگا۔

کا مصداق ہو اس کے لئے سیاہ وسفید اور صدق وکذب کے درمیان امتیاز ممکن نہیں۔ مرزا کے جھوٹ کے لئے یہی کافی ہے کہ اس نے اپنی نام نہاد وحی کے ذریعہ اعلان کیا تھا کہ محترمہ محمدی بیگم کا آسمان پر اس سے نکاح ہوچکا ہے اور ۱۸۸۸ء سے لیکر ۱۹۰۷ء تک اس نکاح کی منادی کرتا رہا، اور اس نکاح کو پکا ثابت کرنے کے لئے اس نے ضمیمہ انجام آتھم میں یہاں تک لکھ دیا

"یاد رکھو کہ اگر اس پیش گوئی کی دوسری جز پوری نہ ہوئی (یعنی محمدی بیگم بیوہ ہوکر مرزا کے نکاح میں نہ آئی) تو میں ہر ایک بد سے بدتر ٹھہروں گا، اے احمقو! یہ انسان کا افترا نہیں، یہ کسی خبیث مفتری کا کاروبار نہیں، یقیناً سمجھو کہ یہ خدا کا سچا وعدہ ہے وہی خدا جس کی باتیں نہیں ٹلتیں وہی ربِّ ذوالجلال جس کے ارادوں کو کوئی روک نہیں سکتا۔"

ہمارا بھی ایمان ہے کہ خدا کی باتیں نہیں ٹلتیں۔ اس کے سب وعدے سچے ہوتے ہیں، ان میں کبھی تخلف نہیں ہوسکتا اور اس کے ارادوں کو کوئی نہیں روک سکتا لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ پیش گوئی کی دوسری جز پوری نہیں ہوئی، اور اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے محمدی بیگم کا سایہ دیکھنا بھی مرزا کو نصیب نہ ہوا، جس سے قطعی طور پر ثابت ہوا کہ یہ خبیث مفتری مرزا غلام احمد قادیانی کا افترا تھا، اور وہ اپنے اقرار کے بموجب ہر

بدسے بدتر ہے. کیا اس خدائی فیصلے اور مرزا کی اپنی تحریر کے بعد بھی مرزا کے جھوٹا مفتری اور ہر بد سے بدتر ہونے میں کوئی شک رہ جاتا ہے؟ یہ میں نے صرف ایک مثال ذکر کی ہے ورنہ اللہ تعالیٰ نے مرزا کو جھوٹا اور روسیاہ کرنے کے لئے سیکڑوں نہیں ہزاروں دلائل جمع کر دیئے۔

۴ ـــــ دیگر دلائل کے علاوہ مرزا غلام احمد قادیانی نے لوگوں سے مباہلے بھی کئے جن کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے مرزا کا مسیح کذاب ہونا کھلے طور پر واضح فرما دیا، مثلاً:

الف: مرزا قادیانی نے ایک عیسائی پادری ڈپٹی آتھم سے پندرہ دن تک مناظرہ کیا، جب مرزا اپنے مضبوط حریف سے عہدہ برآ نہ ہو سکا تو جنابِ الٰہی سے فیصلے کا طالب ہوا، بقول اس کے خدا نے یہ فیصلہ کیا کہ دونوں فریقوں میں سے جو جھوٹ پر ہے وہ آج کی تاریخ (۵ جون ۱۸۹۳ء) سے پندرہ مہینے کے اندر ہاویہ میں گرایا جائیگا۔

اس مباہلہ کی پیش گوئی کا اعلان کرتے ہوئے مرزا نے لکھا:

"میں اس وقت اقرار کرتا ہوں کہ اگر یہ پیشگوئی جھوٹی نکلی، یعنی وہ فریق جو خداتعالیٰ کے نزدیک جھوٹ پر ہے پندرہ ماہ کے عرصہ میں آج کی تاریخ سے بسزائے موت ہاویہ میں نہ پڑے تو میں ہر ایک سزا اٹھانے کے لئے تیار ہوں، مجھ کو ذلیل کیا جاوے، روسیاہ کیا جاوے، میرے گلے میں رسہ ڈال دیا جاوے مجھ کو پھانسی دیا جاوے، ہر ایک بات کے لئے تیار ہوں۔"

میعاد گذرتی گئی اور قادیانی امّت کو یقین تھا کہ ان کے مسیح کذّاب کی پیش گوئی کے مطابق آتھم پندرہ مہینے کے اندر ضرور مر جائیگا، کیونکہ مرزا نے یہ بھی لکھا تھا:

"اور میں اللہ جل شانہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ وہ ضرور ایسا ہی کرے گا ضرور کریگا، ضرور کریگا. زمین و آسمان ٹل جاویں گے پر اس کی باتیں نہ ٹلیں گی۔"

لیکن جب میعاد میں صرف ایک رات باقی رہ گئی تو قادیان میں پوری رات شورِ قیامت برپا رہا، اور سب مرد و زن، چھوٹے بڑے اللہ تعالیٰ کے سامنے ناک رگڑتے ہوئے یہ بین کر رہے تھے کہ یا اللہ آتھم مرجائے، یا اللہ آتھم مرجائے اور سب کو یقین تھا کہ آج سورج طلوع نہیں ہوگا کہ آتھم مرجائیگا، مرزا غلام احمد قادیانی نے آتھم کو مارنے کے لئے ٹونے ٹوٹکے بھی کئے اور چنے پڑھوا کر اندھے کنویں میں ڈلوائے لیکن ان تمام تدبیروں، دعاؤں شور و غوغا کے باوجود اللہ تعالیٰ نے آتھم کو مرنے نہیں دیا، اللہ تعالیٰ نے اپنے فعل سے ثابت کر دیا کہ :

- مرزا قادیانی کی یہ پیشگوئی خدا کی طرف سے نہیں تھی بلکہ مرزا کا اپنا افتراء تھا
- مرزا قادیانی اور ڈپٹی آتھم دونوں جھوٹے تو تھے ہی مگر مرزا، آتھم سے بڑا جھوٹا تھا،
- اللہ تعالیٰ کی نظر میں مرزا قادیانی اس سزا کا مستحق تھا جو اس نے خود اپنے قلم سے تجویز کی تھی : یعنی : اسکو ذلیل کیا جائے۔

رُو سیاہ کیا جائے

اسکے گلے میں رسہ ڈالا جائے

اس کو پھانسی پر لٹکایا جائے

اور جو سزا ممکن ہوسکتی ہے اس کو دی جائے

کیا اس خدائی فیصلے کے بعد بھی مرزا کو جھوٹا ثابت کرنے کے لئے کسی مباہلے کی ضرورت رہ جاتی ہے۔

ب :- ۱۰ / ذیقعدہ ۱۳۱۰ھ کو امرتسر کی عیدگاہ کے میدان میں مرزا قادیانی نے حضرت مولانا عبدالحق غزنوی مرحوم و مغفور سے رُو در رُو مباہلہ کیا، اس کا فیصلہ بھی اللہ تعالیٰ نے دے دیا کہ مرزا قادیانی، حضرت مولانا موصوف کے سامنے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرگیا، اور مولانا موصوف مرزا کے مرنے کے بعد بھی سلامت باکرامت رہے۔

کیا اس کے بعد بھی مرزا کو جھوٹا ثابت کرنے کیلئے کسی آسمانی شہادت کی ضرورت ہے؟

ج : ۱۵/اپریل ۱۹۰۷ء کو مرزا قادیانی نے حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ فاتح قادیان کے خلاف مباہلہ کا اشتہار شائع کیا جس کا عنوان تھا: "مولوی ثناء اللہ صاحب امرتسری کے ساتھ آخری فیصلہ"

اس میں مرزا نے اللہ تعالیٰ سے نہایت تضرع و ابتہال کے ساتھ گڑگڑا کر مکرر سہ کرر یہ دعا و التجا کی تھی کہ ہم دونوں میں سے جو جھوٹا ہے وہ سچے کی زندگی میں ہلاک ہو جائے "مگر نہ انسانی ہاتھوں سے، بلکہ طاعون و ہیضہ وغیرہ امراض مہلکہ سے" اور اس اشتہار میں مولانا مرحوم کو مخاطب کر کے مرزا نے لکھا

"اگر میں ایسا ہی کذاب اور مفتری ہوں جیسا کہ آپ اپنے ہر ایک پرچے میں مجھے یاد کرتے ہیں تو میں آپ کی زندگی میں ہی ہلاک ہو جاؤں گا، کیونکہ میں جانتا ہوں کہ مفسد اور کذاب کی عمر بہت نہیں ہوتی، اور آخر وہ ذلت اور حسرت کے ساتھ اپنے اشد دشمنوں کی زندگی میں ہی ناکام ہلاک ہو جاتا ہے اور اس کا ہلاک ہونا ہی بہتر ہوتا ہے تاکہ وہ خدا کے بندوں کو تباہ نہ کرے۔

اور اگر میں کذاب اور مفتری نہیں ہوں، اور خدا کے مکالمہ اور مخاطبہ سے مشرف ہوں اور مسیح موعود ہوں تو میں خدا کے فضل سے امید رکھتا ہوں کہ سنت اللہ کے مطابق آپ مکذبین کی سزا سے نہیں بچیں گے۔

پس اگر وہ سزا جو انسان کے ہاتھوں سے نہیں، بلکہ محض خدا کے ہاتھوں سے ہے جیسے طاعون ہیضہ وغیرہ مہلک بیماریاں آپ پر میری زندگی میں ہی وارد نہ ہوئیں تو میں خدا کی طرف سے نہیں۔

یہ کسی الہام یا وحی کی بنا پر پیش گوئی نہیں، محض دعا کے طور پر میں نے خدا سے فیصلہ چاہا ہے۔"

اور اس اشتہار کے آخر میں مرزا قادیانی نے لکھا

" بالآخر مولوی صاحب سے التماس ہے کہ وہ میرے اس تمام مضمون کو اپنے پرچہ میں چھاپ دیں اور جو چاہیں اس کے نیچے لکھ دیں، اب فیصلہ خدا کے ہاتھ میں ہے"

مرزا قادیانی نے نہایت آہ وزاری کے ساتھ گڑگڑا کر اللہ تعالیٰ سے جو فیصلہ طلب کیا تھا اس کا نتیجہ سب کے سامنے آگیا کہ مرزا ۲۵ رمئی ۱۹۰۸ء کو رات دس بجے تک بھلا چنگا تھا شام کا کھانا کھایا اور رات دس بجے کے بعد اچانک خدائی عذاب یعنی وبائی ہیضہ میں مبتلا ہوا، اور دونوں راستوں سے غلیظ مواد خارج ہونا شروع ہوا چند ہی گھنٹوں میں زبان بند ہوگئی اور بارہ گھنٹوں کے اندر ۲۶ رمئی ۱۹۰۸ء کو ہلاک ہوگیا جبکہ حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری مرحوم ومغفور مرزا کی ہلاکت کے بعد اکتالیس سال تک ماشاء اللہ زندہ وسلامت رہے اور قیام پاکستان کے بعد ۱۹۴۹ء میں سرگودھا میں واصل بحق ہوئے رحمۃ اللہ رحمۃً واسعۃ۔

اس خدائی فیصلے اور مرزا کی منہ مانگی موت نے ثابت کر دیا کہ وہ مفتری اور کذاب تھا مسیح موعود نہیں تھا اور یہ کہ وہ خدا کی طرف سے نہیں تھا بلکہ شیطان کی طرف سے تھا

مرزا طاہر صاحب! کیا اس خدائی فیصلہ کے بعد بھی کسی مباہلہ کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟

۵ —— آج آپ علمائے امت کو مباہلہ کے لئے بلاتے ہیں، کیا آپ کو یاد نہیں رہا کہ نصف صدی تک آپ کے اباّ مرزا محمود کو مباہلہ کے لئے مسلسل چیلنج دیئے جاتے رہے اور مرزا محمود نے ان میں سے کسی ایک کا سامنا کرنے کی جرأت نہیں کی، اس کی بھی چند مثالیں سن لیجئے۔

الف :- مولانا عبدالکریم مباہلہ نے مرزا پر بدکاری کا الزام لگایا، اسے بار بار مباہلہ کا چیلنج دیا، اور اس کیلئے مباہلہ نامی اخبار جاری کیا، مرزا محمود نے مباہلہ کا چیلنج قبول کرنے کے بجائے مولانا عبدالکریم کو ظلم وستم کا نشانہ بنایا، ان کا مکان جلا دیا گیا، ان پر قاتلانہ

حملہ کرایا گیا، اور بالآخر ان کو قادیان چھوڑنے پر مجبور کر دیا

اگر مرزا محمود میں حق و صداقت کی کوئی رمق تھی تو اس نے مولانا عبدالکریم مباہلہ کا چیلنج کیوں قبول نہیں کیا ــــ مولانا عبدالکریم مرحوم کی بہن سکینہ، جو مرزا محمود کے گناہ کا تختۂ مشق بنی، شاید آج بھی زندہ ہے۔

ب :- عبدالرحمٰن مصری مرزا محمود کا ایسا وفادار اور مقرب مرید تھا کہ مرزا محمود کی غیر حاضری میں وہ قادیان میں "قائم مقام خلیفہ" تک بنایا گیا، غالباً ۱۹۳۶ء میں مرزا محمود نے اسکے لڑکے کو اپنی ہوس کا نشانہ بنایا، عبدالرحمٰن مصری نے مرزا محمود سے اس معاملہ کی تحقیقات کے لئے جماعت کے چند سرکردہ افراد پر مشتمل کمیشن مقرر کرنے کا مطالبہ کیا جس کے سامنے وہ اپنے الزامات ثابت کر سکے، مرزا محمود نے اس مطالبہ کو تسلیم کرنے کے بجائے عبدالرحمٰن مصری اور اسکے ساتھی فخرالدین ملتانی کو ظلم وجور کا نشانہ بنایا، ملتانی کو قتل کر دیا گیا اور مصری پر نقض امن کے تحت مقدمات دائر کر دیئے گئے عبدالرحمٰن مصری نے عدالت عالیہ لاہور میں بیان دیتے ہوئے کہا۔

"موجودہ خلیفہ سخت بدچلن ہے یہ تقدس کے پردہ میں عورتوں کا شکار کھیلتا ہے اس کام کے لئے اس نے بعض مردوں اور بعض عورتوں کو بطور ایجنٹ رکھا ہوا ہے ان کے ذریعہ یہ معصوم لڑکیوں اور لڑکوں کو قابو کرتا ہے اس نے ایک سوسائٹی بنائی ہوئی ہے اس میں مرد اور عورتیں شامل ہیں اور اس سوسائٹی میں زنا ہوتا ہے"

عبدالرحمٰن مصری نے مرزا محمود کے نام ایک خط میں یہ بھی لکھا تھا:

"میں آپ کے پیچھے نماز نہیں پڑھ سکتا کیونکہ مجھے مختلف ذرائع سے یہ علم ہو چکا ہے کہ آپ جنبی ہونے کی حالت میں ہی بعض دفعہ نماز پڑھانے آجاتے ہیں"

ان تمام غلیظ الزامات کے باوجود مرزا محمود کو عبدالرحمٰن مصری کا سامنا کرنے کی جرأت نہ ہوئی اور اسے مصری کی دعوت کو قبول کرنا موت سے بدتر نظر آیا ــــ کیا اس سے کھلے

طور پر یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ اس کا انگ انگ اور بند بند نجس تھا، اور کیا اس کے بعد بھی کسی عقلمند کو اس کے جھوٹا اور نجس ہونے میں کوئی شبہ رہ سکتا ہے۔

ج :- پھر آپ ہی کی جماعت کے ایک منحرف گروہ نے "حقیقت پسند پارٹی" تشکیل دی جس نے مرزا محمود پر سنگین اخلاقی الزامات عائد کئے، انھوں نے "تاریخ محمودیت" نامی کتاب لکھی، جس میں مرزا محمود کی بدکاریوں پر ۲۸ قادیانی مردوں اور عورتوں کے مؤکد بعذاب حلفیہ شہادتیں قلمبند کی گئیں، اور ان حلفیہ شہادتوں میں یہاں تک لکھا گیا کہ مرزا اپنی بیٹیوں کی بھی عصمت دری کرتا ہے اور یہ کہ اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی بیوی سے بدکاری کراتا ہے 'تاریخ محمودیت' میں مرزا محمود کو مباہلہ کا چیلنج دیا گیا اور ان مؤکد بعذاب حلفیہ شہادتوں کے مقابلہ میں اس سے مؤکد بعذاب حلف اٹھانے کا مطالبہ کیا گیا۔

پھر یہی مضمون راحت ملک کی کتاب "ربوہ کا مذہبی آمر" میں شفیق مرزا کی کتاب "شہر سدوم" میں اور مرزا محمد حسین بی کام کی کتاب "منکرین ختم نبوت کا انجام" میں دہرایا گیا، اور مرزا محمود سے حلف مؤکد بعذاب کے ساتھ ان واقعات کی تردید کا مطالبہ کیا گیا۔ لیکن مرزا محمود نے ان میں سے کسی چیلنج کا جواب دیا اور اس پر سکوتِ مرگ طاری رہا۔ اپنے اپنے بھولے بھالے خوش عقیدہ مریدوں کو ان کتابوں کے نہ پڑھنے کا 'سرکاری فرمان' جاری کر دیا، کیا اہلِ عقل اس سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کریں گے کہ مرزا محمود کے اخلاقی خدوخال وہی تھے جو ان کتابوں میں حلفیہ شہادتوں کے ذریعہ بار بار دہرائے گئے ہیں، مرزا طاہر صاحب ! کیا اسی 'خاندانی تقدس' کے بل بوتے پر آپ علمائے امت کو مباہلہ کی دعوت دینے چلے ہیں۔

بادۂ عصیاں سے دامن تر بہ تر ہے شیخ کا
اس پہ دعویٰ ہے کہ اصلاحِ دو عالم ہم سے ہے

مرزا طاہر صاحب! اگر آپ کا خیال ہے کہ آپ کے باپ پر" حقیقت پسند پارٹی" کے الزامات غلط ہیں، تو آپ نے ان کے مطالبہ کے مطابق حلف مؤکد بعذاب اٹھا کر ان الزامات کی تردید کرنے اور مباہلہ کرنے کی جرأت آج تک کیوں نہیں کی؟

۵: آپ کی جماعت میں کسی اور کو معلوم ہو یا نہ ہو لیکن آپ کو تو یقیناً معلوم ہوگا کہ آپ کے ابا کی موت کن عبرت ناک حالات میں ہوئی، اور وہ اپنی زندگی کے آخری گیارہ سالوں میں ایک طویل عرصہ تک کس طرح مرقع عبرت بنا رہا خصوصاً اس کے آخری دور ایام میں اس کی کیفیت کیا تھی؟ اور اس کی موت کیسی عبرتناک ہوئی۔

اور پھر یاد ہوگا کہ آپ کے بڑے بھائی مرزا ناصر کی ناگہانی موت کس طرح واقع ہوئی، آپ کے اسلام آباد کے "قصر خلافت" کے سامنے ہونے والے جلسہ میں شیر ختم نبوت رفیق محترم جناب مولانا اللہ وسایا زید مجدہٗ نے آپ کی ہمشیرہ صاحبہ کا جو خط پڑھ کر سنایا تھا، اس کا کیا مضمون تھا، جس کو سن کر مرزا ناصر صدمہ کی تاب نہ لاسکا اور یکایک اس کی حرکت قلب بند ہوگئی، مرزا طاہر صاحب! کیا اپنے بھائی اپنے باپ اور اپنے دادا کی عبرت ناک موتوں کو بچشم خود دیکھنے اور سننے کے بعد بھی آپ کے لئے کسی مزید سامانِ عبرت کی ضرورت ہے؟ کہ آپ علمائے امت سے مباہلہ کرنے چلے ہیں؟ کیا آپ یہ دعا کرنے کی جرأت کریں گے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو آپ کے باپ اور دادا کی سی موت نصیب کرے؟

۶ —— رفیق محترم جناب مولانا منظور احمد صاحب چنیوٹی مدظلہ العالی آپ کے ابا مرزا محمود کو اس کی زندگی میں ہر سال مباہلہ کی دعوت دیتے رہے، اس کی عبرت ناک موت کے بعد آپ کے بھائی مرزا ناصر کو ہر سال مباہلہ کا چیلنج دیتے رہے، اور اس کی ناگہانی موت کے بعد خود آپ کو بھی التزام کے ساتھ ہر سال مباہلہ کی کھلی دعوت دیتے رہے، انھوں نے متعدد بار و بمبلے ہال لندن میں بھی آپ کو دعوت دی، لیکن آپ

کے باپ کو، آپ کے بھائی کو اور خود آپ کو آج تک اس چیلنج کا سامنا کرنے کی جرأت نہیں ہوئی، کیا اس کا صاف صاف مطلب یہ نہیں کہ آپ کو اپنے اور اپنے باپ دادا کے جھوٹا ہونے کا حق الیقین ہے، مرزا طاہر صاحب! علمائے امت کو مباہلہ کا چیلنج دینے سے پہلے کیا آپ کا فرض نہیں تھا کہ آپ یہ تمام قرضے ادا کر دیتے، جو آپ کے اور آپ کے باپ دادا کے ذمہ واجب الادا ہیں۔

۷ ——— آپ نے اس فقیر کو مباہلہ کی دعوت دی ہے، یہ فقیر اس کے لئے بسرو چشم حاضر ہے، لیکن مباہلہ کا وہ طریقہ نہیں جو آپ نے اختیار کیا ہے اور جس کی آپ نے علمائے امت کو دعوت دی ہے کہ وہ بھی آپ کی طرح گھر بیٹھے آپ پر لعنتیں بھیجتے رہیں اور اخباروں اور رسالوں میں لعنت کی پتنگ بازی کرتے پھریں، گھر بیٹھ کر چرخہ چلانا عورتوں کا مشغلہ ہے اور کاغذی پتنگ بازی بچوں کا کھیل ہے۔

مباہلہ کا طریقہ وہ ہے جو قرآن کریم نے آیت مباہلہ میں بیان فرمایا ہے کہ دونوں فریق اپنی عورتوں اور بچوں اور متعلقین کو لے کر میدان میں نکلیں چنانچہ اس آیت کی تعمیل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نصاریٰ نجران کے مقابلے میں نکلے اور ان کے نکلنے کی دعوت دی۔ اور خود آپ کا دادا مرزا غلام احمد قادیانی حضرت مولانا عبدالحق غزنوی مرحوم ومغفور کے مقابلہ میں عیدگاہ امرتسر کے میدان میں نکلا۔

اگر آپ اس فقیر کو مباہلہ کی دعوت دینے میں سنجیدہ ہیں تو بسم اللہ! آئیے مرد میدان بن کر میدانِ مباہلہ میں قدم رکھئے، تاریخ اور جگہ کا اعلان کر دیجئے کہ فلاں تاریخ کو فلاں وقت فلاں جگہ مباہلہ ہوگا، پھر اپنے بیوی بچوں اور متعلقین کے ساتھ وقت مقررہ پر میدان مباہلہ میں آئیے، یہ فقیر بھی ان شاء اللہ اپنے بیوی بچوں اور متعلقین کو ساتھ لے کر وقت مقررہ پر پہنچ جائے گا۔

اور بندہ کے خیال میں مباہلہ کے لئے درج ذیل تاریخ، وقت اور جگہ سب

سے زیادہ موزوں ہوگی۔

تاریخ ۲۳ مارچ ۱۹۸۹ء

دن جمعرات

وقت دو بجے بعد از نماز ظہر

جگہ مینار پاکستان لاہور

میں نے اس کو بہترین تاریخ اور جگہ اس لئے کہا ہے کہ آپ کو یاد ہوگا کہ آپ کے دادا مسیلمہ پنجاب مرزا غلام احمد قادیانی نے ۲۳ مارچ ۱۸۸۹ء کو لدھیانہ میں اپنی دجالی بیعت کا سلسلہ شروع کیا تھا، گویا ۲۳ مارچ ۱۹۸۹ء کی تاریخ آپ کے مسیح دجال کی صد سالہ تقریب ہے اور اس نے لدھیانہ میں سلسلۂ بیعت کا آغاز کیا تھا میدان مباہلہ میں آپ کا مقابلہ بھی لدھیانوی سے ہوگا — اس طرح باب لُدّ پر مسیح دجال کو قتل کیا جائے گا۔ ظہر کے بعد کا وقت میں نے اس لئے تجویز کیا کہ حدیث نبویؐ کے مطابق اس وقت فتح و نصرت کی ہوائیں چلتی ہیں۔ اور جگہ کے لئے مینار پاکستان کا تعین اس لئے کیا ہے کہ پاکستان میں اس سے بہتر اور کشادہ جگہ اجتماع کیلئے شاید کوئی اور نہ ہوگی۔ علاوہ ازیں ۲۳ مارچ کی تاریخ یوم پاکستان بھی ہے، یوم پاکستان کو مینار پاکستان پر اجتماع نہایت مناسب ہے، تاہم مجھے اس تاریخ، وقت اور جگہ پر اصرار نہیں، بلکہ تاریخ، وقت، اور جگہ کی تعیین کو آپ کی صواب دید پر چھوڑتا ہوں، آپ جو تاریخ، وقت اور پاکستان میں مقام مباہلہ مناسب سمجھیں تجویز کرکے مجھے مطلع کریں۔

یہ فقیر امت محمدیہ کا ادنیٰ ترین خادم ہے اور آپ چشم بد دور "امام جماعت احمدیہ" ہیں، اس فقیر کو اپنے ضعف و قصور کا اعتراف ہے اور آپ کو اپنی امامت و زعامت اور تقدس پر ناز ہے، لیکن الحمدللہ ثم الحمدللہ، یہ فقیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے

غلاموں کا ادنیٰ غلام ہے اور آپ جھوٹے مسیح کے جانشین ہیں، یہ فقیر سید دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن رحمۃ للعالمینی سے وابستہ ہے اور آپ دورِ حاضر کے مسیلمہ کذاب کے دم چھلّہ ہیں، یہ فقیر اپنی نالائقی کا اعترافِ تقصیر کے کر میدان مباہلہ میں قدم رکھے گا، آپ اپنی امامت وزعامت اور تقدس پر ناز کرتے ہوئے آئیے، میں حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت کا عَلَم اٹھائے ہوئے آؤں گا، آپ مرزا غلام قادیانی کی جھوٹی نبوت ومسیحیت کا سیاہ جھنڈا لے کر آئیے۔

آئیے! اس فقیر کے مقابلہ میں میدان مباہلہ میں قدم رکھئے اور پھر میرے مولائے کریم کی غیرت وجلال اور قہری تجلّی کا کھلی آنکھوں تماشا دیکھئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نصاریٰ نجران کے بارے میں فرمایا تھا کہ اگر وہ مباہلہ کیلئے نکل آتے تو ان کے درختوں پر ایک پرندہ بھی نہ بچتا۔

آئیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ادنیٰ امتی کے مقابلہ میں میدانِ مباہلہ میں نکل کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ختمِ نبوت کا اعجاز ایک بار پھر دیکھ لیجئے

اس ناکارہ کا خیال ہے کہ آپ آگ کے اس سمندر میں کودنا کسی حال میں قبول نہیں کریں گے، اپنے دادا کی طرح ذلّت کی موت مرنا پسند کریں گے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس نالائق امتی کے مقابلہ میں میدان مباہلہ میں اُترنے کی جرأت نہیں کرینگے

۸ —— یہ ذکر کردینا ضروری ہے کہ اس ناکارہ کو یا دیگر علمائے امّت کو آپ سے یا آپ کے باپ دادا سے کوئی ذاتی عناد نہیں، نہ کسی جائیداد کا جھگڑا ہے، نہ کسی ریاست کا تنازع ہے، واللہ العظیم ہم آپ کے خیر خواہ ہیں اور نہایت دردمندی و دل سوزی سے چاہتے ہیں کہ آپ دوزخ کی آگ سے بچ جائیں، مرزا قادیانی کے دجل وفریب اور مکّاری وعیّاری کی دھجیاں اس لئے بکھیرتے ہیں تاکہ امت محمدیہ کے ایمان کو بچایا جاسکے اور آپ کی جماعت کے افراد کو دوزخ کی جلتی آگ سے نکالا جاسکے، خدا شاہد ہے کہ ہمارا یہ عمل

محض رضائے الٰہی کے لئے اور آپ کی اور امت محمدیہ کی خیر خواہی کے لئے ہے، ہماری یہ خیر خواہی آپ لوگوں کو مرنے کے بعد معلوم ہوگی، میں آج پھر آپ سے اور آپ کی جماعت کے ایک ایک فرد سے نہایت اخلاص و خیر خواہی اور دل سوزی و دردمندی کے ساتھ کہتا ہوں کہ آپ لوگ راستے سے بھٹک گئے ہیں، مرزا غلام احمد قادیانی مسیح موعود نہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس مسیح کے قرب قیامت میں آنے کی خبر دی ہے وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں، حضرت مسیح علیہ السلام نے فرمایا تھا۔

"خبردار! کوئی تم کو گمراہ نہ کردے کیونکہ بہتیرے میرے نام پر آئیں گے اور کہیں گے میں مسیح ہوں اور بہت سے لوگوں کو گمراہ کریں گے۔" (متی ۲۴-۴-۵)

مرزا غلام احمد قادیانی بھی انہی لوگوں میں سے تھا جنھوں نے مسیح ہونے کا دعویٰ کرکے بہت سے لوگوں کو گمراہ کیا، مرزا غلام احمد نے یا آپ لوگوں نے جو تاویلات ایجاد کر رکھی ہیں وہ محض نفس و شیطان کا دھوکہ ہے یہ تاویلیں نہ قبر میں منکر نکیر کے آگے چلیں گی اور نہ فردائے قیامت میں داورِ محشر کے سامنے کام دیں گی

مرزا طاہر صاحب! آپ کے لئے اپنی امامت و امارت اور خاندانی گدی کو چھوڑ کر حق کا اختیار کرنا بے شک مشکل ہے، لیکن اگر آپ محض رضائے الٰہی کے لئے حق کا راستہ اختیار کرلیں تو حق تعالیٰ شانہ آپ کو دنیا و آخرت میں اسکا ایسا بہترین بدلہ عطا فرمائیں گے کہ اس کے مقابلہ میں آپ کی موجودہ ریاست و امارت ہیچ در ہیچ ہے اور اگر آپ نے ریاست کو حق پر ترجیح دی تو مرنے کے بعد ایسی ذلت اور ایسے عذاب کا سامنا کرنا ہوگا جس کے سامنے موجودہ عزت و وجاہت لغو ولایعنی ہے، میں آپ کی جماعت کے تمام افراد سے بھی گذارش کرتا ہوں کہ مرنے سے پہلے توبہ کرلیں، اور میں آپ کو، آپ کی جماعت کو، اور ان تمام افراد کو جن کی نظر سے میری یہ تحریر گذرے، گواہ بناتا ہوں کہ میں نے حق و صداقت کا پیغام آپ تک پہنچا دیا، کسی

شخص کے دل میں حق طلبی کا جذبہ ہو اور وہ اپنا اطمینان چاہتا ہو تو اس کو سمجھانے کے لئے تیار ہوں۔

۹ ــــــــ آپ نے مجھ سے فرمائش کی ہے کہ میں اپنا جواب اخباروں اور رسالوں میں شائع کردوں، جہاں تک میرے امکان میں ہے میں نے اشاعت کی کوشش کی ہے، آپ اگر چاہیں تو اپنے اخبارات و رسائل میں بھی میرا جواب شائع کرا سکتے ہیں۔

۱۰ ــــــــ میں نے آپ کو میدان مباہلہ میں اترنے کی جو دعوت دی ہے، چار مہینے تک اسکے جواب کی مہلت دیتا ہوں اور جواب کے لئے آخری تاریخ یکم جنوری ۱۹۸۹ء مقرر کرتا ہوں۔

۱۱ ــــــــ میرا خیال ہے کہ آپ نے دیگر اکابر علماء کے نام بھی مباہلہ کا چیلنج بھیجا ہوگا، اس لئے عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ علمائے امت کے اس خادم کا جواب سب کی طرف سے تصور فرمائیں، ہر ایک کو فرداً فرداً زحمت اٹھانے کی ضرورت نہیں۔

سبحانك اللهم وبحمدك اشهد ان لا اله الا انت

استغفرك واتوب اليك، وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين

از = اختر امام عادل سمستی پوری
معین مدرس دارالعلوم دیوبند

(قسط ۳)

"سنت صحابہ"

(۳) لگے ہاتھوں سنتِ صحابہ کا تیسرا اصول بھی دیکھتے چلئے ، اس موضوع پر بھی حضرت قاسم العلوم رحمہ کا قلم نہایت غیر جانبدار اور حکمت ریز چلا ہے ، مگر اتنی رمزیت اور اختصار کے ساتھ کہ اس کے لئے بلا مبالغہ "کوزہ میں دریا" کا محاورہ استعمال کیا جا سکتا ہے ــــ ہم اس موضوع کو کسی قدر تفصیل و تشریح مزید کے ساتھ لکھتے ہیں ۔ اسلئے کہ موجودہ امت میں ایک طبقہ ایسا بھی پیدا ہو گیا ہے جو سنتِ صحابہ کے اصول کو ماننے کیلئے تیار نہیں ہے طرح طرح کی تاویلیں اور حیلے اس اصول سے گریز کے لئے اختیار کرتا ہے ، خدا ان پر رحم کرے

ذیل کی سطور اگر غیر جانبدار ذہن و دماغ کے ساتھ مطالعہ کی جائیں اور نظریاتی تعصب سے بالکل الگ ہو کر تحقیق و تلاش کے اجالے میں ان کو پڑھا جائے تو انشاءاللہ یہ فیصلہ کن ثابت ہوں گی ۔

سنتِ صحابہ کی پیروی کے لئے دوسری مشہورِ زمانہ تعبیر "صحابہ کا معیارِ حق ہونا" چل رہی ہے ۔ علماء دیوبند کا نقطۂ نظر شروع سے اس بارے میں بالکل واضح اور صاف رہا ہے ۔ تفصیلات میں جانے سے پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ اہلِ حق کے یہاں "معیارِ حق" کا صحیح مفہوم کیا ہے ؟ بہت سے لوگ "معیارِ حق" کا صحیح مفہوم نہ سمجھنے ، اور اس کے بارے میں کوئی واضح تصور نہ رکھنے کی بنا پر عناد و انکار کے شکار ہو جاتے ہیں ۔ اگر

معیار حق کا صحیح مفہوم اکابر و اسلاف کی عبارتوں کی روشنی میں متعین ہوجائے تو آگے کی منزل کے لئے فیصلہ آسان ہوجائے گا۔

معیار حق کا مفہوم

معیار حق کا مشہور تصور یہ ہے کہ وہ شخص جس کا قول و فعل دوسروں کے لئے حجت ہو، یعنی جو کچھ اس کے قول و فعل سے ثابت ہورہا ہو وہ حق ہو اور جو کچھ اسکے خلاف ہو وہ باطل۔

لیکن یہ تصور اتنا مبہم اور مجمل ہے کہ بہت سے لوگ اسی اجمال اور ابہام کی بنا پر مبتلائے فریب ہوگئے اس تصور کا ظاہر اتنا محدود ہے کہ اللہ اور رسول ؐ پر تو یہ تعریف پوری صادق آتی ہے، کہ اللہ اور رسول کا ہر حکم حق ہے اور اسکے خلاف باطل ہے، لیکن وہ جماعت جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی ہے، وہ اس سے خارج ہوجاتی ہے، اس لئے کہ صحابہ کی ایک بڑی تعداد ہے، ان کے درمیان اختلافات ہوئے نظریاتی امور اور اجتہادی مسائل میں ان کی رائیں مختلف ہوگئیں، اگر ہر ایک صحابی کا قول و فعل حق ہے، اور جو اسکے خلاف ہے وہ باطل ہے تو پھر ایک ہی مسئلہ بیک وقت حق و باطل کی حدود میں داخل ہوجائیگا جو بداہۃً غلط ہے۔ اگر باطل کہئے تو کیسے؟ وہ ایک صحابی کے اثر کے مطابق ہے اور حق کہئے تو کیسے؟ وہ ایک صحابی کے قول و فعل کے مخالف ہے۔

یہی وہ نفسیاتی کشمکش ہے جس سے ایک طبقہ متاثر ہوا، اور بالآخر اس نے صحابہ کی پوری مقدس جماعت کو محض بزرگوں اور اولیاء کی صف میں داخل سمجھ کر معیار حق کے منصب سے ان کو فروتر قرار دیا —— لیکن اگر اسی تصور کی ذرا اور واضح انداز میں تشریح کردی جائے تو سارا فریب جاتا رہے گا۔

صحابہ کرامؓ کے معیار حق ہونے کا مطلب

معیار حق کی واضح تشریح اس طور پر کرنی زیادہ مناسب ہے کہ کسی کے قول

دفعل میں حقیقت کے انحصار کا مطلب یہ ہے کہ حق ان میں دائر ہے، اس سے خارج نہیں صحابۂ کرام کے معیار حق ہونے کا مطلب یہ ہے کہ حق ان کے اقوال وافعال میں دائر ہے ان سے خارج نہیں ہے، اگر صحابۂ کرام کسی مسئلہ پر جمع ہوجاتے ہیں، تب تو کوئی اشکال ہی نہیں رہتا، لیکن ان کے درمیان اختلاف کی صورت میں حق انھی کے مختلف اقوال میں دائر سمجھا جائیگا کہ انھی اقوال میں سے کوئی ایک حق ہے، ان اقوال سے خروج نہیں کیا جاسکتا، صحابۂ کرام کے بارے میں معیار حق کا یہی وہ تصور ہے جس پر حنفیہ، مالکیہ حنابلہ اور امام شافعیؒ (اپنے قولِ قدیم کے مطابق) کا اتفاق ہے، امام شافعیؒ کے قولِ جدید کا طرزِ تعبیر کچھ اس سے مختلف ہے، لیکن اس کی تاویل بھی کی جاسکتی ہے۔ اولاً ہم صحابہ کے بارے میں اس تصور کے ثبوت کے لیے، امام شافعیؒ کی معرکۃ الآرا اور اصولی تصنیف "الرسالہ" سے ایک عبارت نقل کرتے ہیں، جس سے اس تصوّر کا پورا پورا ثبوت ملتا ہے۔

حضرت امام شافعیؒ دادا کے بارے میں صحابۂ کرام کا اختلاف نقل کرتے ہیں اور اس پر کچھ بحث وتمحیص کے بعد فرماتے ہیں۔

أرأيت اقاويلَ اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم اذا تفرقوا فيها (فقلت) نصير منها الى ما وافق الكتاب او السنة او الاجماع او كان اصح في القياس .... قلت له ما وجدنا في هذا كتاباً ولا سنةً ثابتةً ولقد وجدنا اهل العلم يأخذون	جب صحابہ کے اقوال متفرق ہوجائیں تو آپ کی کیا رائے ہے تو میں نے کہا کہ انہی اقوال میں سے ہم کسی قول کو اختیار کریں گے جو کتاب وسنت اور اجماع یا صحیح ترین قیاس کے زیادہ قریب معلوم ہوگا، میں نے اس سے کہا کہ ہم نے اس بارے میں کتاب اللہ کی کوئی آیت یا کوئی سنتِ ثابتہ نہیں پائی، البتہ ہم نے اہل علم کو دیکھا کہ وہ ان میں سے کسی کے قول کو کبھی لیتے ہیں

بقول واحد هم مرة و يترکونه	اور کبھی اس کو ترک کر دیتے ہیں اس میں
اخری و یتفرقون فی بعض ما	سے کچھ لینے میں وہ جدا جدا طریق کار پر ہیں
اخذ وابه منه (قال) فالی	اس نے کہا کہ پھر آپ کا میلان کس جانب
ای شئ صرت من هذا (قلت)	ہے؟ تو میں نے کہا کہ انہی میں سے کسی کے
الی اتباع قول واحد هم اذا لم	قول کی پیروی کی جانب میرا رجحان ہے
اجد کتابا ولا سنة ولا اجماعا الخ	جب کہ مجھے کتاب وسنت اور اجماع وغیرہ

(الرسالہ باب الاختلاف فی الجد ص۸۱ و ص۸۲ مطبوعہ مصر) سے کچھ روشنی نہ ملے۔

دوسری جزئیات سے قطع نظر کرکے اس پوری عبارت سے اتنا مفہوم صاف طور پر نکلتا ہے کہ امام شافعی رح صحابہؓ کے مختلف اقوال سے خروج کو جائز نہیں سمجھتے تھے، وہ اپنے بزرگوں کا معمول بھی یہی نقل کرتے ہیں۔

اسکے بعد ہم حنابلہ کے مسلک کی ترجمانی کے لئے علامہ ابن قیم جوزیؒ کی کتاب "اعلام الموقعین" کی ایک عبارت نقل کرتے ہیں، امام احمدؒ کا اصول بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں۔

الاصل الثالث من اصوله	امام احمدؒ کا تیسرا اصول یہ ہے کہ جب صحابہ
اذا اختلف الصحابة	آپس میں کسی مسئلے میں مختلف ہو جاتے
تخير من اقوالهم ما كان	ہیں تو انھی کے اقوال میں سے جو قول ان
اقربها الى الكتاب والسنة	کی صوابدید کے مطابق کتاب وسنت کے
ولم يخرج من اقوالهم	قریب تر معلوم ہوتا ہے اس کو وہ اختیار
	کر لیتے ہیں اور ان کے اقوال سے خروج
(اعلام الموقعین ص۱۱/۱۲)	نہیں کرتے۔

امام احمد رح کا یہ اصول اتنا مصرح ہے کہ اس سے صحابۂ کرام کی پوزیشن کے بارے

میں وہی تصور بآسانی قائم کیا جا سکتا ہے جو اس زمانے میں علماء دیوبند کا ہے
رہے مالکیہ اور حنفیہ، تو ان کا مسلک بہت مشہور ہے، اس کے لئے کسی حوالے
کی ضرورت نہیں، حضرت امام مالکؒ جا بجا موطا میں آثار صحابہ سے استدلال کرتے ہیں
مزید ثبوت کے لئے امام شاطبیؒ کی کتاب "الموافقات" کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔
اسی طرح حنفیہ بھی اپنے مذاہب کی کتابوں میں بطور حجت آثار صحابہ پیش کرتے ہیں۔
معیار حق کے مفہوم میں حق کے دائر ہونے کا تصور جب ثابت ہوگیا تو یہ دیکھنا
ضروری ہے کہ اس کی بنیاد کیا ہے، اس بنیاد کی وضاحت قاسم العلومؒ نے یہ فرمائی کہ صحابۂ
کرام رضؓ جن کو سارا تقدس صحبت نبوی سے حاصل ہوا تھا، اور اسی دربار سے ان کو معیارِ
حق کا پروانہ ملا تھا، وہ تمام کے تمام ہر وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس
موجود نہیں رہتے تھے، اختلافِ زمانہ بہر حال صحابہؓ کی رفاقت وصحبت میں رہا ہے
اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی قول وفعل کسی صحابی نے دیکھا اور دوبارہ
پھر ان کو زیارت کا موقعہ نہ مل سکا، یا ملا مگر اس میں اس قسم کا معاملہ پیش نہ آیا تو وہ
اپنے اس مسلک پر باقی رہے، خواہ بعد میں حضور علیہ السلام کے دوسرے متاخر فعل
سے وہ منسوخ ہو چکا ہو، اس طرح دونوں مکتب فکر سنتِ رسول ہی سے ثابت
ہے، فرق اپنے علم کے اعتبار سے ہوگیا ہے، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی
خصوصی مجلسوں میں حاضرین صحابہ کو دینی امور کی ترغیب دی، یا خود اس پر عمل بھی کیا
مگر کسی اندیشہ یا مصلحت کے پیش نظر آپ نے اس پر مداومت نہیں فرمائی، اس
طرح عوام سے یہ حکم مخفی اور پوشیدہ رہا، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال
کے بعد جب وہ اندیشہ منقطع ہوگیا اور وہ وقتی مصلحت ختم ہوگئی، تو پھر صحابہ نے
اس حکم کو عام فرمایا، اس طرح وہ صحابہ کی طرف منسوب ہوگیا، مثلاً تراویح جو خود
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ادا فرمائی، اور آپ نے اس کو بے حد پسند فرمایا

جس کا علم خصوصی صحابہ کو تھا، لیکن فرضیت کے اندیشے سے آپ نے اپنی زندگی میں تین بار پڑھنے کے بعد اس کو ترک فرما دیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد جب یہ اندیشہ ختم ہوگیا تو حضرت فاروق اعظمؓ نے اس کو رسول خدا کی خواہش کے مطابق پھر سے جاری فرمایا جس کی وجہ سے حضرت فاروقؓ کی طرف منسوب ہوگئی۔

اس بے غبار وضاحت سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ سنت صحابہ عمومی طور پر کسی نہ کسی مرحلے میں سنت نبوی سے مل جاتی ہے، اور ظاہر بات ہے کہ سنت نبوی بالاتفاق معیارِ حق ہے، تو پھر سنت صحابہ کے معیار حق ہونے میں اختلاف کی کیا گنجائش ہے؟

جو لوگ صحابہ کے معیار حق ہونے میں متذبذب ہیں وہ بھی سنتِ نبوی کو بلاشبہ معیار حق مانتے ہیں، اگر سنتِ نبوی بلا شبہ معیارِ حق ہے تو جس امر کے متعلق یقین کے ساتھ ثابت ہوجائے کہ یہ سنت نبوی ہے اسے تسلیم کرلینا ضروری ہوگا کیوں کہ اس کے قبول کرنے میں پس وپیش کرنا درحقیقت سنتِ نبوی کے معیارِ حق ہونے کے بارے میں عدمِ اطمینان کا اظہار ہے، اس کے بعد غور کیجئے کہ سنتِ نبوی اور احادیث نبوی سے صحابۂ کرام کا معیار حق ہونا ثابت ہوتا ہے یا نہیں؟ اگر ثابت ہوجائے تو صحابۂ کرام کو معیارِ حق تسلیم کرلینا ضروری ہوگا، ورنہ درحقیقت سنتِ نبوی کے معیارِ حق ماننے سے انحراف ہوگا۔

احادیث کے مطالعہ کے بعد یہ حقیقت کھل کر سامنے آئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جابجا صحابہ کی تقلید وپیروی کا حکم دیا ہے، اور یہ بغیر اس کے ممکن نہیں کہ صحابہ کے آثارِ قدم میں ہدایت وحقیقت مضمر ہو، ورنہ جس شخص کے بارے میں یہ گمان ہو کہ یہ ہدایت وحق سے انحراف بھی کرسکتا ہے اور اس کا قدم جادۂ استقامت سے لغزش بھی کرسکتا ہے، اس کے بارے میں اتنے یقینی طور پر تقلید

واتباع کا حکم نہیں دیا جا سکتا، میں صرف دو تین ایسی روایات پیش کرتا ہوں جن سے بطور عبارۃ النص صحابۂ کرام کا معیارِ حق ہونا اور ان کا مطاع و مقتدا ہونا ثابت ہوتا ہے

① مشکوٰۃ شریف ص۳۰ پر روایت موجود ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار اپنی امت کے انتشار و افتراق کے بارے میں خبر دی کہ بنی اسرائیل بہتر ۷۲ فرقوں میں تقسیم ہو گئے تھے لیکن میری امت ان سے آگے تہتر ۷۳ فرقوں میں بٹ جائے گی، اور سوائے ایک فرقہ کے سب کے سب جہنمی ہوں گے، حاضرین مجلس نے سوال کیا کہ یا رسول اللہ وہ کون سا فرقہ ہوگا، حضورؐ نے جواباً فرمایا کہ "ما انا علیہ واصحابی" کہ جس طریق پر میں ہوں اور میرے صحابہ ہوں، اس پر چلنے والا فرقہ کامیاب ہوگا،

اس روایت میں بغیر کسی جزدی اور منطقی بحث کے ہر آدمی بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ حضور علیہ السلام اس چھوٹے سے جملے سے کیا فرمانا چاہتے ہیں بالکل صاف بات ہے کہ کسی بھی جماعت کی حقانیت کے لئے معیار رسولِ خدا اور آپ کے صحابہ قرار دیئے گئے کیا ایک خالی الذہن انسان کے لئے اس حدیث سے صحابہ کا معیار حق ہونا ثابت نہیں ہوتا؟ بال کی کھال نکالنا مسئلہ کو حل کرنا نہیں ہے بلکہ اس کو مزید الجھانا ہے۔ اسلئے میں اِدھر اُدھر کی نحوی اور منطقی بحث سے احتراز کرتا ہوں

② مشکوٰۃ کے اسی صفحہ پر ایک دوسری روایت خلفائے راشدین کی پیروی کے بارے میں یہ آئی ہے کہ علیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین المهدیین عضوا علیها بالنواجذ (الحدیث) تم پر میری سنت اور خلفائے راشدین کی سنت لازم ہے اس کو اپنے دانتوں سے مضبوط پکڑ لو۔ یہاں صاف طور پر خلفائے راشدین کی سنت کو اسی طرح امت پر لازم قرار دیا گیا، جس طرح رسول اللہ صؐ نے اپنی سنت کو لازم قرار دیا اس میں اشارہ ہے کہ خلفائے راشدین کی سنت، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے معارض نہیں ہو سکتی، ورنہ ایک ذیل میں دونوں کا ذکر اتنے محکم انداز میں نہ کیا جاتا۔

(۳) مشکوۃ شریف ص۵۵۴ پر روایت ہے کہ اصحابی کالنجوم فبایھم اقتدیتم اھتدیتم (الحدیث) کہ میرے صحابہ کی مثال ستاروں کی ہے، تم ان میں سے جن کی پیروی کروگے کامیاب ہوجاؤ گے۔ اس میں ایک طرف صحابہ کی پیروی کو معیارِ حقانیت قرار دیا گیا، دوسری طرف بایھم سے یہ بھی اشارہ کردیا گیا کہ ان کے درمیان اختلافات یقیناً ہوں گے مگر ان اختلافات کی وجہ سے تم ان کی طرف سے بدگمان نہ ہونا بلکہ سب کو برسرِ حق سمجھنا، ان میں سے جن کی بھی پیروی کروگے تم کامیاب ہوجاؤ گے رہا اختلاف تو وہ ستاروں کی طرح ہیں، ستاروں کی راہیں الگ الگ ہوتی ہی ہیں، لیکن الگ الگ ہونے کے باوجود روشنی ہر ایک کے پاس موجود ہے، روشن ہونے میں سب متحد ہیں ـــــ اسی طرح صحابہ بھی باوجود اختلافِ طریق ـــــ کے حقانیت وہدایت کا نور اپنے پاس لئے ہوئے ہیں، اس لئے ان میں سے ہر ایک ہدایت پر ہے اور جو بھی ان کی پیروی کریگا وہ بھی ہدایت یاب ہوجائیگا، گویا صحابہ معیارِ ہدایت ہیں۔

اس قسم کی بہتیری روایات کتبِ حدیث میں موجود ہیں، جن سب کا ذکر کرنا طوالت کا باعث ہے۔ انصاف پسند آدمی کے لئے ایک روایت بھی کافی ہے۔

غلط فہمیاں صحابہ کے معیارِ حق کے منکرین نے سب سے بڑی غلطی یہ کی کہ معیارِ حق کے لئے عصمت کو ضروری سمجھا، اب ظاہر ہے کہ اس کے سوا چارہ ہی کیا رہ جاتا ہے کہ اللہ اور رسول کے سوا کسی کو معیارِ حق نہ جانیں، حالانکہ معیارِ حق کی اس تشریح وتفصیل کے مطابق جو ذکر کی گئی عصمت کی شرط غیر ضروری ہے، اس لئے کہ صحابہ کے بارے میں جب یہ تسلیم کرلیا گیا کہ حقیت انھیں کے اقوال میں دائر ہے تو اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ نفس الامر میں عنداللہ حق ان اقوال میں سے کوئی ایک ہی ہے، لیکن نفس الامر تک رسائی بغیر وحی کے ممکن نہیں، اسلئے روایات

میں ظاہراً عام حکم لگایا گیا کہ سب حق پر ہیں تم کو اپنی صوابدید کے مطابق کتاب وسنت سے جو زیادہ قریب معلوم ہو اس کو اختیار کرلو ـــــ ظاہر ہے کہ کسی غیر معصوم ہی کے بارے میں یہ تصور قائم کیا جاسکتا ہے کہ اس سے خطا کا امکان ہے، کسی معصوم کے بارے میں اس قسم کا خیال ناممکن ہے ۔

(۲) دوسری غلطی ان سے یہ ہوئی کہ انھوں نے صحابہ کرامؓ کے اختلافات کو بنیاد بناکر صحابہ کے معیارِ حق ہونے کا انکار کیا، لیکن مذکورہ تشریح کے مطابق صحابہ کا باہمی اختلاف ناگزیر تھا، اور خود حضور علیہ السلام کو اس اختلاف کا پہلے علم ہوچکا تھا، جس سے صحابہ کی طرف سے لوگوں کو بدگمانی کا امکان تھا، اس لئے حضور علیہ السلام نے متعدد احادیث میں اس بدگمانی کا ازالہ فرمایا، اور تمام صحابہ کرام کو بلا استثنار معیارِ حق قرار دیا ـــــ اس کے علاوہ یہ مقامِ عبرت ہے کہ صحابہ کرامؓ کے معیار حق کا انکار کرنے والے سنّت نبوی کے معیار حق ہونے کے قائل ہیں، حالانکہ احادیثِ رسول میں بے شمار اختلافات موجود ہیں، مگر ان اختلافات کے باوجود سنت کی معیاریت زائل نہیں ہوتی، بلکہ ان اختلافات کو زائل کرنے کی کوشش کی گئی، اور اختلاف دور نہ ہوسکا تو وجوہِ ترجیح کے پیش نظر ان میں سے کسی کو ترجیح دے دی گئی ۔

اس نقطۂ نظر سے وہ صحابہ کرام کے بارے میں کیوں غور نہیں کرتے؟ یہاں اختلافات کی آڑ لے کر صحابہ پر تنقید کی کیچڑ کیوں اچھالتے ہیں؟ یہاں بھی کچھ وجوہِ ترجیح مقرر کرلئے جائیں، اور ان کے پیش نظر ان اختلافات کے وقت کسی صحابی کے قول کو اختیار کرلیا جائے تو کیا مضائقہ ہے؟ اگر محض اختلاف کی بنیاد پر سنت نبوی کی معیاریت ختم نہیں ہوتی، تو پھر صحابہ کرامؓ کے آثار کے بارے میں یہ میگوئیاں کیوں ہیں؟

(۳) تیسری غلط فہمی ان کو یہ ہوئی کہ انھوں نے دیکھا کہ ایک صحابی دوسرے

صحابی کو اپنے خلاف کرنے کی اجازت دے رہے ہیں اور اس پر کچھ بھی نکیر نہیں فرمارہے ہیں، تو اگر صحابی معیارِ حق تھے، اور وہ اپنے کو معیارِ حق سمجھتے تھے، تو اس کے خلاف باطل تھا، پھر اس کی اجازت دوسرے صحابی کو کیوں دی۔

لیکن تعجب ہے ایسے معترضین کے دماغوں پر — یہ کیوں غور نہیں کرتے؟ کہ صحابی معیارِ حق ہے، غیر صحابی کے لئے نہ کہ خود صحابی کے لئے، اسلئے کہ وہ دوسرا صحابی خود بھی تو معیارِ حق ہے، پھر اس کے لئے کوئی اسی کا ہم پلّہ معیارِ حق کیوں ہو، اس وقت ایک صحابی دوسرے صحابی کو اپنے خلاف کی اجازت نہ دے تو کیا کرے؟ اس کا اپنے خلاف کی اجازت دینا اور اس پر نکیر نہ کرنا، اس کی دلیل ہے کہ اس اختلاف کے وقت بھی ان میں سے ہر ایک دوسرے کو برحق سمجھ رہا ہے، البتہ وجوہِ ترجیح کی بنا پر ہر ایک نے اپنی الگ الگ رائے قائم کی ہے۔

جب صحابہؓ کو ستاروں سے تشبیہ دی گئی تو اس کا مطلب ہی یہ ہے کہ ہر ستارہ کا محور الگ الگ ہے، کیا یہ درست ہو سکتا ہے کہ ایک ستارہ دوسرے ستارے سے کہنے لگے کہ تم اپنے محور کو چھوڑ کر میرے محور پر آکر گردش کرنے لگو۔

غرض یہ ایسی بدیہی غلطی ہے جو ذرا سا تأمل سے دور ہو سکتی ہے، ان تفصیلات سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ سنتِ صحابہ کا اصول اپنی جگہ مسلمہ اصول ہے اور ہر وہ حکم جو سنتِ صحابہ سے ثابت ہو وہ قابلِ تقلید ہے۔

(جاری ہے)

۵ ربیع الاول ۱۴۰۹ھ مطابق ۱۸ اکتوبر ۱۹۸۸ء بروز شنبہ کو ملک کے مشہور صاحب قلم، محقق، تذکرہ نگار اور عالم باعمل مولانا مفتی نسیم احمد فریدی چند ماہ کی علالت کے بعد وفات پا گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

واقعہ یہ ہے کہ مولانا فریدی مرحوم کا انتقال علم وتحقیق اور تذکرہ نگاری کی دنیا میں ایک ایسا خلا ہے جس کا مستقبل قریب میں پُر ہونا مشکل نظر آتا ہے مولانا مرحوم نہایت سادہ مزاج، متواضع، خوش خلق، نرم خو، شب زندہ دار، صوفی المشرب بزرگ تھے، علماء ومشائخ کے تذکرے ملفوظات ومکاتیب سے انھیں خاص شغف تھا اس موضوع پر آپ کی متعدد تصانیف ہیں جو علمی حلقوں میں وقعت و اعتبار کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں، جن میں تجلیات ربانی، مکتوبات خواجہ معصوم تذکرہ خواجہ باقی باللہ اور تذکرہ حضرت شاہ اسمٰعیل شہید بطور خاص قابل ذکر ہیں

مولانا فریدی مرحوم ۱۳۲۹ھ مطابق ۱۹۱۱ء کو اپنے آبائی وطن امروہہ میں پیدا ہوئے اور وہیں مڈل کلاس تک کی تعلیم اسکول میں حاصل کی بعد ازاں مدرسہ جامع مسجد امروہہ میں داخل ہو کر اسلامی علوم وفنون کی کتابیں پڑھیں اور تکمیل کیلئے مرکز علوم دارالعلوم دیوبند آئے اور اسی گہوارۂ علم وفن میں رہ کر دورۂ حدیث اور افتاء

کی تحصیل و تکمیل کی، آپ کے اساتذہ میں حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی شیخ الادب والفقہ مولانا اعزاز علی اور حضرت مولانا سید اصغر حسین دیوبندی جیسے اساطین علم و نابغۂ عصر شامل ہیں

تعلیم سے فراغت کے بعد مدرسہ اشفاقیہ بریلی سے درس وافادہ کا آغاز کیا بعد ازاں اپنی مادر علمی جامعہ امروہہ چلے آئے جہاں تدریس کے ساتھ افتار کی اہم ترین خدمت بھی انجام دیتے رہے، جامعہ امروہہ سے یہ تعلق حیات کے آخری لمحہ تک قائم رہا، حتیٰ کہ آج سے اٹھارہ انیس سال پہلے جب آپ آنکھوں کی بینائی سے محروم ہوگئے جب بھی کسی نہ کسی حد تک تدریس کا سلسلہ جاری رہا۔

مولانا فریدی مرحوم کو قدرت نے گوناگوں صلاحیتوں اور خوبیوں سے نوازا تھا وہ بیک وقت کامیاب مدرس، بالغ نظر مفتی، نکتہ سنج شاعر، بہترین مترجم، محقق مصنف اور صاحب نسبت عالم دین تھے ابتدار میں اپنے استاذ حدیث حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی قدس سرہ سے بیعت وارادت کا تعلق قائم کیا، حضرت موصوف کی وفات کے بعد شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب مہاجر مدنی نور اللہ مرقدہ سے وابستہ ہوگئے اور انھیں کی زیر تربیت سلوک کے منازل طے کر کے اجازت وخلافت سے مشرف ہوئے، ان تمام محاسن وفضائل سے متصف ہونے کے باوجود تواضع و انکساری، اخفائے حال اور سادگی کا یہ عالم تھا کہ ان کے مرتبہ ومقام سے ناواقف انھیں دیکھ کر یہی سمجھتا تھا کہ معمولی پڑھے لکھے کوئی میانجی ہیں، حقیقت یہ ہے کہ علمار اور صوفیار ومصنفین کے طبقے میں مولانا فریدی مرحوم اپنی مثال آپ تھے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے اور ان کے فیوض وبرکات سے امت کو استفادہ کی توفیق سے نوازے ۔

⁂ ⁂ ⁂

(۲)

۹ ربیع الاول ۱۴۰۹ھ مطابق ۲۱ اکتوبر ۱۹۸۸ء یوم جمعہ کو پاکستان کے مشہور عالم دین اور جامعہ اشرفیہ لاہور کے شیخ الحدیث مولانا محمد مالک کاندھلوی رہگرائے عالم جاودانی ہوگئے، مرحوم دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل اور حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی علیہ الرحمہ کے خلف الصدق و صحیح جانشین تھے درس و تدریس اور وعظ و بیان کے ساتھ تصنیف و تالیف کا بھی ستھرا ذوق رکھتے تھے جس پر ان کی خالص علمی تصنیف۔ منازل العرفان فی علوم القرآن" شاہد عدل ہے معلوم ہوا ہے کہ مرحوم نے اپنے والد ماجد کی مشہور تفسیر معارف القرآن کے بقیہ حصہ کی تکمیل بھی کی ہے علم حدیث و تفسیر میں مرحوم کو کامل دستگاہ حاصل تھی، وعظ و تقریر میں اہم علمی مسائل کو اس طرح سلجھا کر بیان کرتے تھے کہ سامعین بغیر کسی دقت کے پورے مسئلے کو اچھی طرح سمجھ لیتے تھے ریڈیو پاکستان سے ان کی تفسیر بھی نشر ہوا کرتی تھی جسے عام و خاص بڑی دلچسپی سے سنتے تھے،

دارالعلوم دیوبند سے مرحوم کو خصوصی تعلق تھا اور اس کی دعوت پر یہاں حاضری کو اپنی سعادت سمجھتے تھے ابھی چند سال پہلے جب دارالعلوم میں ختم نبوت کانفرنس کا انعقاد ہوا تھا تو مرحوم — نہ صرف یہ کہ اس کے تمام اجلاسوں میں ذوق و شوق کے ساتھ شریک رہے بلکہ ایک نشست کی صدارت بھی کی تھی، اپنی صدارتی مفصل تقریر میں دارالعلوم دیوبند سے اپنے تعلق کو جس والہانہ انداز میں بیان کیا تھا اس سے دارالعلوم سے ان کی قلبی وابستگی کا پتہ چلتا ہے، مولانا کی وفات سے دارالعلوم دیوبند پاکستان میں اپنے ایک قابل اعتماد ترجمان سے محروم ہوگیا ہے، دعا ہے اللہ تعالیٰ مرحوم کو درجات عالیہ سے سرفراز فرمائے اور ان کے پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق بخشے۔

بقیہ حرف آغاز

مسلمانوں کی دل آزاری سے سکون پاتے ہیں وہ حکومت کے اس منصفانہ فیصلے پر چیں بجبیں ہیں اور اسے رجعت پرستی اور بنیاد پسندی کا نام دیکر حکومت کو گالیاں دے رہے ہیں، ہم ان لوگوں سے پوچھتے ہیں کہ اگر کوئی شخص ان کے ماں باپ کی شان میں گستاخانہ کلمات استعمال کرے یا انھیں پروانۂ ہیروئن کے روپ میں دنیا کے سامنے پیش کرے تو ان کا رویہ اس شخص کے خلاف کیا ہوگا؟ کیا اس شخص کے خلاف ازالۂ حیثیت عرفی کا دعوی نہیں کریں گے؟ پھر اگر خلاصۂ کائنات فخر انسانیت، نبیٔ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی پاک طینت عفت مآب ازواج مطہرات کے بارے میں یہی رویہ اختیار کیا جائے اور مسلمان اس پر احتجاج کریں تو یہ اظہار رائے کی آزادی کے خلاف کیونکر ہوگیا، کیا آزادی رائے کا مطلب یہی ہے کہ کسی کے مذہبی پیشوا پر کیچڑ اچھالا جائے، اسے اپنے تنقید کے تیروں سے مجروح کیا جائے اور اس کی شان میں گستاخانہ جملے استعمال کئے جائیں، اگر آزادی رائے کا مطلب یہی ہے تو اس آزادی کو ہمارا دور سے سلام ہے۔

دار العلوم دیوبند کا ترجمان

دار العلوم دیوبند

ماہ ربیع الثانی ۱۴۰۹ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۸۸ء

نگران

حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب مہتمم دار العلوم

دیوبند

جلد نمبر ۷۳ — سالانہ ۴۰/=

شمارہ نمبر ۱۲ — فی شمارہ ۴/=

مدیر

مولانا حبیب الرحمن صاحب قاسمی

سالانہ بدل اشتراک غیر ممالک سے

سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا - وغیرہ سے 175/-

پاکستان سے 80/=

بنگلہ دیش سے (ہندوستانی) 60/=

سُرخ نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ کا زرِ تعاون ختم ہوگیا ہے۔

فہرست

ہندوستانی و پاکستانی خریدار سے ضروری گذارش

① ہندوستانی خریداروں سے ضروری گذارش ہے کہ ختم خریداری کی اطلاع پاکر اول فرصت میں اپنا چندہ نمبر خریداری کے حوالہ کے ساتھ منی آرڈر سے روانہ کریں

② پاکستانی خریدار اپنا چندہ مبلغ -/۸۰ روپے مولانا عبدالستار صاحب مہتمم جامعہ عربیہ محمودیہ داؤد والا براہ شجاع آباد ملتان، پاکستان کو بھیجدیں۔

③ خریدار حضرات پتہ پر درج شدہ نمبر محفوظ فرمالیں، خط و کتابت کے وقت خریداری نمبر ضرور لکھیں۔

والسلام

منیجر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ آغاز

مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی

مدارس عربیہ کے ذریعہ ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کی بقاء و ترقی کا جو معجزنما ومحیرالعقول کام پچھلی صدی میں انجام پایا وہ تعلیم و تربیت کی تاریخ کا حیرت انگیز باب ہے، عالم اسباب میں اس کی صورت یہ ہوئی کہ ان مدارس نے امت مسلمہ ہندیہ کو مسلسل ایسے افراد اور رجال کار دیئے جو اپنی اپنی جگہ ایک ایک امت سے کم نہ تھے ان نابغہ روزگار علماء نے زندگی کے ہر میدان میں بھرپور کارگذاری کا مظاہرہ کیا۔ اخلاص کیساتھ مسلمانوں کی دینی ملی اور سیاسی ضرورتوں کو پورا کیا اور وہ پچھلی صدی کے زبردست طوفان کے درمیان سے ہندوستانی مسلمانوں کا سفینہ پوری احتیاط اور دانشمندی سے نہ صرف محفوظ نکال کرلے گئے بلکہ ظلمت کدۂ ہند میں اسلام کے قدم کو اس قدر راسخ کردیا کہ اس کی مثال ممالک اسلامیہ میں بھی مشکل سے ملے گی۔

مسلمانوں کے مردم ساز اداروں کی اس تاریخی خدمت کو جتنا بھی خراج تحسین پیش کیا جائے کم ہے لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ عرصۂ دراز سے یہ کارخانے سرد پڑگئے ہیں اور وہ کام تقریباً بند ہے اور امت مدارس کی کثرت کے باوجود ان دینی وملی فوائد سے محروم ہے جو اس کو ماضی میں مدارس کی قلت کے باوصف حاصل ہورہے تھے ملت کے دردمند حضرات اس اندوہناک صورت حال سے انتہائی کرب محسوس کررہے ہیں اور اپنے اپنے زاویۂ فکر و نقطۂ نظر سے ان خامیوں پر غور اور ان کی تلافی کی راہیں تلاش

کر رہے ہیں جن کے سبب یہ سانحہ پیش آرہا ہے۔ ایک نقطۂ نظر کا خلاصہ یہ ہے نصاب تعلیم ان ضرورتوں کو پورا نہیں کر رہا ہے جنھیں عصر حاضر اپنے جلو میں لیکر آیا ہے اور اس سے وہ ذہن سازی نہیں ہو پاتی جو عصر حاضر کے چیلنج کا جواب بن سکے اس لئے اس نقطۂ نظر والوں کی تمام تر ذہنی توانائیاں نصاب میں ترمیم و تبدیلی صرف ہو رہی ہیں اور سائنس جدید کا پیوند لگا کر اس ضرورت کو پورا کرنے کی بات کر رہے ہیں۔

کوئی کہتا ہے کہ اساتذہ میں جوہر علم منتقل کرنے کی وہ صلاحیت باقی نہیں ہے جو ماضی میں موجود تھی ان میں کردار کی وہ مقناطیس نہیں ہے جو افراد کو اپنی طرف جذب کرلے، ان کے دلوں میں حسن منت اور اخلاص کی وہ شمع روشن نہیں ہے جس سے دوسرے چراغ روشن ہو سکیں۔

کسی کا نتیجۂ فکر یہ ہے کہ اس صورت حال کا سرچشمہ خود طلبہ کی کمزوریاں ہیں ان میں طلبِ صادق نہیں ہے جو منزل کی رہنمائی کیلئے ضروری ہے، وہ ذوق تشنگی مفقود ہے جو آب حیات کی طرف گامزن کردے۔ وہ حسن نیت اور اخلاص نہیں ہے جو علم کی خاطر شمع کی طرح پگھلنے کی کیفیت پیدا کرتا ہے۔

ایک نقطۂ نظر کے مطابق ان صورتِ حال کی ذمہ داری مدارس اسلامیہ کے ماحول پر عائد ہوتی ہے کہ اب ان مدارس میں وہ ماحول باقی نہیں رہا ہے جو خوشگوار موسم کی طرح غنچوں میں زندگی اور شادابی کی روح پھونکتا رہتا تھا اور بہاریں خود سمٹ کر ان کا جزوِ زندگی بن جایا کرتی تھیں

یہ تمام اسباب وعوامل یقیناً کسی نہ کسی درجہ میں بھی موجود ہیں اور ان سے انکار کی گنجائش نہیں ہے، لیکن اسی کے ساتھ یہ واقعہ ہے کہ یہ مرض کی صحیح تشخیص نہیں ہے، اصل بات یہ ہے کہ کردار اور شخصیت سازی کی وہ سعی باقی نہیں رہی جو اسلاف کا طرۂ امتیاز رہی ہے موجودہ انحطاط کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ افراد سازی کی مہم سے غفلت برتی جارہی ہے

عرصہ دراز سے فضلاء کرام کو ان کی صلاحیت اور حیثیت کے مطابق مشغلے نہیں دیئے جارہے ہیں بلکہ ہر نوعمر فاضل کو خلاء بسیط میں اس طرح آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے جس کو کنٹرول کرنے والی کوئی طاقت موجود نہیں ہوتی، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ خلاء میں گردش کرتا ... ہوا کسی ایسی سمت نکل جاتا ہے جہاں اس کی تمام توانائیاں ضائع ہوجاتی ہیں

ایک زمانہ تھا کہ اکابر ہر سال کے فضلاء پر گہری نظر رکھتے تھے اور ان کو حسب صلاحیت تدریسی تصنیفی اور ملی خدمات پر مامور فرمادیتے تھے اور اس طرح صالح عناصر کی تربیت کا کام انجام پاتا رہتا تھا ماضی قریب میں حضرت شیخ الہند اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ کے طریق تربیت کو اس کی نظیر میں پیش کیا جاسکتا ہے، کہ دونوں بزرگوں نے کس کس طرح افراد کی تربیت کی اور قرابت کی بنیاد پر نہیں بلکہ صرف صلاحیت کی بنیاد پر وہ ملی و تدریسی خدمات کے لئے افراد کا انتخاب فرماتے رہے۔

اب صورت حال یہ ہے کہ مدارس عربیہ کی سرزمین پر جو نہالِ تازہ اگتا ہے یا تو جامعہ طبیہ میں اس کا قلم لگا دیا جاتا ہے یا معاشی استحکام کی طمع اس کو ہندوستان کے انگریزی مدارس اور عرب کے جامعات میں کھینچ لے جاتی ہے اور ہمارے یہاں پیدا ہونے والا ایک ایک جوہر قابل اپنی صلاحیتوں کو دوسرے میدانوں میں منتقل کردیتا ہے،

بہتر ہوگا کہ مدارس عربیہ کے ذمہ دار اکابر ماضی کے اس بیس سال کا تفصیلی چارٹ تیار کرائیں اور یہ دیکھیں کہ مدارس سے نکلنے والے جم غفیر میں جوہر قابل کتنے فضلاء تھے پھر یہ کہ ان میں کتنے فضلاء جامعہ طبیہ کی نذر ہوگئے، کتنوں نے اپنا سفینہ جدید تعلیم کے طوفان میں ڈالدیا، انمیں کتنے عرب جامعات کی طرف پرواز کرگئے۔ اور کتنے ہیں جو ہندوستان کے مسلمانوں کی ملی و علمی خدمت کا کام انجام دے رہے ہیں پھر یہ کہ جو خدمت بخت و اتفاق سے ان کے سپرد ہوگئی ہے کیا وہ ان کی صلاحیتوں کا صحیح استعمال ہے، نیز یہ کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی خدمت میں مصروف یہ فضلاء

واقعۃً یہ کام خدمت سمجھ کر انجام دے رہے ہیں یا انھیں ایسی مجبوریاں پیش آگئیں کہ وہ زندگی کا نہج تبدیل نہ کر سکے

ہمیں یقین ہے کہ اس طویل مدت میں معدودے چند فضلاء ہی امت کے ہاتھ آئے ہوں گے اور وہ بھی ایسی جگہوں پر اپنی صلاحیتوں کا استعمال کر رہے ہوں گے جو ان کیلئے موزوں نہیں بس یہی ایک سب سے بڑی وجہ ہے کہ امت ان مدارس کے صحیح فائدے سے محروم ہے۔

اس اندوہناک صورتِ حال کو تبدیل کرنے کیلئے ضروری ہے کہ مردم سازی کی مہم بڑے اہتمام سے شروع کر دی جائے مدارسِ عربیہ سے فارغ ہونے والے باصلاحیت نوجوانوں کا انتخاب پھر ان کی صلاحیت کے مطابق کاموں کی تفویض اور نگرانی ہی دراصل اس صورتِ حال کو ختم کر سکتی ہے، ورنہ اگر نصابِ تعلیم، اساتذہ اور طلبہ کی کمزوریاں اور مدارس کا ماحول ہی پیش نظر رہا اور اصلاح کا سارا زور اسی جانب صرف کیا جاتا رہا تو اس سے صورت حال میں کسی بہتری کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

کتنا اچھا ہو کہ مدارس کے ذمہ دار فوراً اس طرف توجہ دیں تاکہ امت کے اجڑے ہوئے گلستاں میں پھر وہی بہاریں خیمہ زن ہو جائیں جن کی کمی محسوس کی جارہی ہے

ایک مجلس میں تین طلاق کا شرعی حکم

مولانا نسیم احمد مظفرپوری فاضل دارالعلوم دیوبند

جمہور کا دوسرا استدلال آیات قرآنیہ کے علاوہ بہت سی احادیث ہیں جن سے مسلک جمہور ثابت ہوتا ہے۔ ان احادیث میں سے ایک حدیث وہ ہے جسے حضرت امام احمدؒ نے سہل بن سعد سے اپنی مسند میں بھی روایت کیا ہے اور علامہ شوکانی نے نیل الاوطار میں ذکر کیا ہے اس حدیث کے الفاظ یہ ہیں

عن سہل بن سعد قال لما لاعن اخوبنی عجلان امرأتہ قال یارسول اللہ ظلمتہا ان امسکتہا ھی الطلاق ھی الطلاق ھی الطلاق۔ (نیل الاوطار ص۱۵۶ ج۶)

حضرت سہل بن سعدؓ سے روایت ہے کہ جب بنی عجلان کے ایک شخص نے اپنی بیوی سے لعان کیا تو کہا یا رسول اللہ اگر اس کے بعد بھی اس عورت کو اپنے پاس روکوں تو گویا زنا کی تہمت لگاکر میں نے اس پر ظلم کیا، اسے طلاق ہے، طلاق ہے، طلاق ہے۔

اور حضرت عویمر کا بھی واقعہ صحیح بخاری شریف میں بھی منقول ہے مگر اسکے الفاظ یہ ہیں

قال عویمر کذبت علیہا یارسول اللہ ان امسکتہا فطلقہا ثلاثا قبل ان یأمرہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم (بخاری ص۷۹۱ ج۲، وکذا فی مسلم ص۴۸۵ ج۱)

حضرت عویمر نے فرمایا، یارسول اللہ اگر اس کے بعد بھی اس عورت کو اپنے پاس روکوں تو گویا میں نے اس پر جھوٹی تہمت باندھی تھی پس انھوں نے رسول اکرم کے حکم صادر فرمانے سے پہلے اس کو تین طلاقیں دیدیں۔

ان دونوں صحیح اور صریح روایتوں سے معلوم ہوا کہ ایک مجلس اور ایک کلمہ سے دی ہوئی تین طلاقیں واقع ہوتی ہیں، کیونکہ حضرت عویمر نے ایک ہی مجلس میں اپنی بیوی کو تینوں طلاقیں دیدی تھیں اور آپ نے اس پر سکوت فرمایا، اگر ایک مجلس کی تین طلاقیں واقع نہ ہوتیں تو آپ سے ضرور ظاہر فرما دیتے۔

تیسرا استدلال جمہور کا تیسرا استدلال صحابیٔ رسول حضرت محمود بن لبیدؓ کی روایت سے ہے جو اس سے قبل گذر چکی ہے کہ ایک شخص نے رسول اکرمؐ کے سامنے اپنی بیوی کو اکٹھی تین طلاقیں دیدیں، تو آپ نے انھیں ایک ہی قرار دیا، یہ الگ بات ہے کہ اس طرح دفعۃً تین طلاقیں دینا غیر مستحسن ہے اس لئے آپ نے اس پر اپنی ناراضگی کا بھی اظہار فرمایا مگر اس ناراضگی کے باوجود انھیں تین ہی قرار دیا، پس اگر دفعۃً تین طلاقیں دینا حرام قطعی اور شرعاً غیر معتبر ہوتا تو آپ ان کو ہرگز جاری نہ فرماتے بلکہ اسے رد فرما دیتے مگر رد کا کوئی لفظ ذخیرۂ حدیث میں موجود نہیں، لہذا یہ حدیث بھی مسلک جمہور پر نص قاطع اور برہان ساطع ہے۔

چوتھا استدلال جمہور کے مذہب کی چوتھی دلیل حضرت عائشہ صدیقہؓ کی روایت ہے وہ ارشاد فرماتی ہیں۔

ان رجلا طلق امرأته ثلاثا فتزوجت فطلق فسئل النبی صلی اللہ علیہ وسلم اتحل للاول قال لا حتی یذوق عسیلتها کما ذاقها الاول۔	ایک شخص نے اپنی عورت کو تین طلاقیں دے دیں پھر اس عورت نے کسی اور مرد سے نکاح کیا اور اس نے (ہمبستری سے پہلے) اسے طلاق دیدی، آنحضرتؐ سے اس کے متعلق دریافت کیا گیا کہ کیا وہ عورت اپنے پہلے خاوند کیلئے حلال ہوگئی تو آپؐ نے فرمایا نہیں جب تک کہ دوسرا خاوند اس سے ہمبستری نہ کرے اور لطف اندوز نہ ہوجائے جیسا کہ پہلے ہوا تھا
(بخاری ص۷۹۱ ج۲، واللفظ لہ، مسلم ص۴۶۳ ج۱، کذا فی السنن الکبریٰ ص۳۳۴ ج۷)	

اس حدیث میں طلق امرأتہ ثلاثا کا جملہ بظاہر اسی پر دلالت کرتا ہے کہ تین طلاقیں اکٹھی اور دفعۃً دی گئی تھیں چنانچہ حافظ حدیث محقق ابن حجر عسقلانی شافعی فرماتے ہیں کہ حدیث کا مذکورہ جملہ اسی کا مقتضی ہے کہ تین طلاقیں اکٹھی اور دفعۃً دی گئی تھیں (فتح الباری ص ۲۹۵ ج ۹) حدیث کا یہی مفہوم حافظ بدرالدین عینی حنفی نے بھی بیان فرمایا ہے (ملاحظہ ہو عمدۃ القاری ص ۵۳۷ ج ۹) ۔ صاحب ارشادالساری حدیث مذکور کی تشریح و توضیح کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

وهذا عام يتناول ايقاع الثلاث دفعة واحدة وقد دلت الآية على ذلك من غير نكير خلافا لمن لم يجز ذلك (ارشادالساری شرح بخاری ص ۱۸۰ ج ۸)	اور یہ عام ہے، دفعۃً تین طلاقوں کے واقع کرنے کو بھی شامل ہے اور آیت قرآنی بھی اس پر دلالت کرتی ہے اور اس میں کسی کا انکار منقول نہیں بجز ان حضرات کے جو اسے جائز ہی نہیں سمجھتے۔

یہ روایت بھی مذہب جمہور پر دلیل صریح ہے۔

پانچواں استدلال جمہور کی پانچویں دلیل حضرت معاذ بن جبل کی روایت ہے جسے دارقطنی نے اپنی سند کے ساتھ حضرت محمد بن مخلد سے روایت کیا ہے۔ روایت کے الفاظ یہ ہیں۔

عن محمد بن مخلد قال سمعت معاذ بن جبل يقول سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول يا معاذ من طلق البدعة واحدة او اثنتين او ثلثا الزمناه (دارقطنی ص ۴۳۱ ج ۲)	حضرت معاذ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ اے معاذ جس نے طلاق بدعی دی چاہے وہ ایک ہو یا دو یا تین ہم اسے لازم کردیں گے۔

حضرت معاذ بن جبل کی مذکورہ روایت سے صراحۃً ثابت ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص

یک وقت اور دفعۃً تین طلاقیں دے تو وہ بھی واقع اور لازم ہوجائیں گی البتہ اس طرح اکٹھی طلاقیں دینے کا گناہ اسے ہوگا مگر اس سے ان کے وقوع میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوگا، باقی یہ کہنا کہ جب اکٹھی تین طلاقیں دینا معصیت اور بدعت ہے تو وہ کیونکر واقع ہوں گی صحیح نہیں ہے کیونکہ کسی چیز کا ناجائز اور ممنوع ہونا اپنی جگہ پر ہے اور اس پر حکم شرعی کا مرتب ہونا اپنی جگہ پر ہے کون نہیں جانتا کہ قتل و غارتگری، ارتداد زنا اور غصب وغیرہ شریعت کی نظر میں بڑے سنگین جرائم ہیں مگر اسکے باوجود ان پر احکام شرعی کا ترتب ہوتا ہے، لہٰذا کسی چیز کے ممنوع اور حرام ہونے سے ہرگز یہ لازم نہیں آتا کہ شرعًا اسکا وقوع بھی نہیں ہوگا۔

جمہور کی چھٹی دلیل

جمہور کے مسلک کی چھٹی دلیل حضرت عبادہ بن الصامتؓ کی حدیث ہے جسے صاحب مصنف عبدالرزاق نے اپنی سند سے ذکر کیا ہے اس روایت کے الفاظ یہ ہیں

عن عبادة بن الصامت ان اباه طلق امرأته الف تطليقة فانطلق عبادة فسأله صلى الله عليه وسلم فقال بانت بثلاث في معصية الله وبقي تسعمائة وسبع وتسعون عدوانا و ظلما ان شاء عذبه الله وان شاء غفر له۔

(مصنف عبدالرزاق ص۲۹۳ فتح القدیر ص۳۳۰ ج۳)

حضرت عبادہ سے روایت ہے کہ ان کے والد نے اپنی اہلیہ کو ایک ہزار طلاقیں دیدیں حضرت عبادہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس واقعہ کو ذکر کیا تو آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ اسکی عورت تین طلاقوں سے بائنہ مغلظہ ہوگئی اور باقی نوسو ستانوے طلاقیں عدوان وظلم قرار پائیں گی اگر اللہ چاہے گا تو اسے اس حرکت پر عذاب دیگا یا اسے معاف کردے گا۔

اگر دفعۃً دی گئی تین طلاقیں تین نہ ہوتیں تو آپ یہ ارشاد فرماتے کہ اسکی عورت

پر صرف ایک طلاق رجعی پڑی، اسے رجعت کر لینے کا اب بھی اختیار ہے، حضرت عبادہ کی یہ روایت بھی مسلک جمہور کی واضح دلیل ہے۔

ساتویں دلیل حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کی وہ حدیث ہے جو مجمع الزوائد اور سنن الکبریٰ میں مذکور ہے کہ ایک شخص ان کے والد بزرگوار حضرت عمر بن الخطاب کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے کہا کہ میں نے بحالت حیض اپنی بیوی کو طلاق بتہ (تعلق قطع کرنے والی اور اس جگہ مراد تین طلاقیں ہیں) دیدی ہے انھوں نے فرمایا کہ تو نے اپنے پروردگار کی نافرمانی کی اور تیری بیوی تجھ سے بالکل الگ ہوگئی اور اب وہ تیرے لئے حلال نہیں، اس سائل نے عرض کیا کہ آپ کے بیٹے عبداللہ کے ساتھ بھی تو اسی طرح کا معاملہ پیش آیا تھا مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تو ان کو رجوع کا حق دیا تھا، اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا۔

فقال لہ عمرؓ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امرہ ان یراجع امرأتہ لطلاق بقی لہ وانہ لم یبق لک ما ترجع بہ امرأتک

(مجمع الزوائد ص ۲۳۵ ج ۴، سنن الکبریٰ ص ۳۳۴ ج ۷)

کہ بلاشبہ رسول اکرمؐ نے میرے بیٹے عبداللہ کو یہ حکم دیا تھا کہ وہ اپنی بیوی سے رجعت کرے مگر اس لئے کہ ایک طلاق باقی تھی (کیونکہ انھوں نے بحالت حیض اپنی بیوی کو صرف دو طلاقیں دی تھی) اور تیرے لئے تو اپنی بیوی سے رجوع کرنے کا حق نہیں کیونکہ تیری طلاق باقی نہیں۔

اس روایت سے معلوم ہوا کہ چونکہ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ نے اپنی بیوی کو تینوں طلاقیں نہیں دی تھیں اس لئے ان کو رجوع کا حق دیا گیا مگر اس شخص نے تو اپنے حق رجوع کا ترکش بالکل خالی کر دیا تھا جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دی تھیں اسلئے حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اب تم اپنی بیوی سے رجوع

نہیں کرسکتے۔

آٹھویں دلیل | بخاری شریف میں حضرت نافع سے مروی ہے کہ جب کوئی شخص حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے سوال کرتا کسی ایسے شخص کے بارے میں جس نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیدی ہوں تو آپ فرماتے۔

قال لاحدھم اما انت ان طلقت امرأتك مرة او مرتين. فان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امرنی بھذا اعا بالمراجعة وان كنت طلقتها ثلاثا فقد حرمت عليك حتى تنكح زوجا غيرك وعصيت اللہ فيما امرك من طلاق امرأتك۔

(مسلم ج ۱ ص ۴۷۶ واللفظ لہ، بخاری ج ۲ ص ۸۰۳، دارقطنی ج ۲ ص ۴۳۶)

کہ اگر تم نے اپنی بیوی کو ایک یا دو طلاقیں دی ہیں تو بے شک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے (اس صورت میں) مجھے رجوع کا حق دیا تھا، اور اگر تم نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دی ہیں تو یقینا وہ تم پر حرام ہوگئی ہے اور جب تک وہ تیرے علاوہ کسی اور مرد سے نکاح نہ کرلے اس وقت تک تیرے لئے حلال نہیں ہوگی، اور اس طرح طلاق دے کر تم نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی بھی کی ہے۔

اس روایت سے بھی معلوم ہوا کہ تین طلاقوں کے بعد شوہر کیلئے کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی اور عورت اس پر حرام ہوجاتی ہے اور اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ ایک دو طلاقوں کے بعد رجوع کرنے کا حکم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے لیکن تین طلاقوں کے بعد خواہ وہ متفرق طور پر دی گئی ہوں یا اکٹھی و دفعۃً دی گئی ہوں رجوع کرنے کا حکم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں، ورنہ حضرت ابن عمرؓ اس کا حوالہ ضرور دیتے اور اس کے خلاف فتویٰ دینے کی جرأت وجسارت ہرگز نہ کرتے اس روایت سے یہ بھی واضح ہوا کہ اس شخص نے دفعۃً تین طلاقیں دے دی تھیں

اگر ایسا نہ ہوا ہوتا تو وہ یہ نہ فرماتے کہ تو نے اس طرح طلاق دے کر اپنے رب کی نافرمانی کی ہے کیونکہ ایک ایک طہر میں ایک ایک طلاق دینے میں تعمیل حکم شریعت ہوتی ہے نہ کہ معصیت و نافرمانی اور اس سے قبل یہ بات بالتفصیل گذر چکی ہے کہ دفعۃً تین طلاقیں دینا حضرت امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام اوزاعی، امام لیث بن سعد اور دیگر حضرات کے نزدیک مکروہ اور ناپسندیدہ ہے اس طرح طلاق دینے والا خدا کی نافرمانی اور حکم شریعت کو توڑتا ہے اسی بنار پر جب ایک صحابیؓ نے دفعۃً تین طلاقیں دیدیں اور آپ کو اس کا علم ہوا تو آپ نے سخت ناراضگی کا اظہار فرمایا۔

نویں دلیل غیر مقلدین حضرات بڑے زور و شور سے حضرت ابن عباسؓ کی روایت پیش کرتے ہیں کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیقؓ، اور حضرت عمرؓ کے اوائل خلافت میں تین طلاقیں ایک طلاق رجعی سمجھی جاتی تھی، مگر حضرت عمرؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں انھیں تین قرار دیدیا۔ اسکا تفصیلی جواب آئندہ سطور میں دیا جائے گا۔ یہاں پر صرف یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ خود حضرت ابن عباسؓ بھی اسی کے قائل تھے کہ دفعۃً تین طلاقیں دینے سے تین ہی پڑتی ہیں، چنانچہ طحاوی شریف اور سنن الکبریٰ میں روایت ہے کہ ایک شخص حضرت ابن عباسؓ کی خدمت میں آیا اور اس نے کہا کہ میرے چچا نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیدی ہیں اب رجوع کرنے کی کیا صورت ہوسکتی ہے؟ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ تیرے چچا نے اس طرح طلاق دیکر خداوند قدوس کی معصیت کا طوق اپنی گردن میں ڈالا۔ اور اب رجعت کی کوئی صورت نہیں بن سکتی، آنے والے نے کہا، کیا حلالہ کے ذریعہ بھی جواز کی صورت پیدا نہیں ہوسکتی؟ اس پر حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ جو شخص اللہ سے دھوکا کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو اس کا بدلہ دے گا (طحاوی ۲۹/۲۶ اور سنن الکبریٰ میں ان سے ایک روایت اس طرح آئی ہے کہ ایک شخص نے

حضرت ابن عباسؓ کی خدمت میں آکر یہ سوال کیا کہ میں نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیدی ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ نے سائل کے اس سوال پر سکوت اختیار فرمایا، ان کے اصحاب وتلامذہ نے یہ خیال کیا کہ شاید وہ اس عورت کو اسے واپس دلانا چاہتے ہیں مگر حضرت ابن عباس نے فوراً ہی فرمایا کہ تم خود حماقت وجہالت کا ارتکاب کرتے ہو اور پھر کہتے ہو اے ابن عباس اے ابن عباس بات یہ ہے کہ جو شخص خدا سے نہیں ڈرتا تو اس کیلئے کوئی راہ نہیں نکل سکتی جب تم نے تین طلاقیں دے کر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی ہے تو اب تمھارے لئے کوئی گنجائش ہی نہیں، تمھاری بیوی اب تم سے بالکل الگ ہوچکی ہے تمھارے لئے حلال نہیں۔ سنن الکبریٰ ص۳۳۱۔

اور ایک روایت میں اس طرح منقول ہے کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو سو طلاق دیدی پھر جب حضرت ابن عباسؓ سے اس کی بابت فتویٰ دریافت کیا گیا تو آپ نے یہ فتویٰ دیا کہ تین طلاقیں تو اس کی عورت پر واقع ہوچکی ہیں باقی ننا نوے کے ساتھ اس نے اللہ تعالیٰ کی کتاب کے ساتھ مذاق وتمسخر کیا ہے۔ (موطا امام مالک ص۱۹۹ — دارقطنی ج۲ ص۴۳۔ —— حضرت ابن عباسؓ کی مذکورہ بالا تینوں روایات اس بات پر صراحتہً دلالت کرتی ہیں کہ بیک وقت تین طلاقیں دینے سے تینوں واقع ہوجاتی ہیں البتہ اس طرح طلاق دینے والا حکم شریعت کی مخالفت کی بنا پر معصیتِ خداوندی کا مرتکب ہوتا ہے، صحابیٔ رسول حضرت ابن عباس جمہور علماء امت کی طرح اسی کے قائل ہیں

دسویں دلیل

جمہور کی دسویں دلیل حضرت مسلمہ بن جعفر الاحمسی کی روایت ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک دن حضرت امام جعفر بن محمد جو اہل بیت میں سے تھے سے سوال کیا کہ کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ جس شخص نے حماقت وجہالت میں مبتلا ہوکر اپنی عورت کو بیک وقت و دفعۃً تین طلاقیں دے دیں تو ان سب کو سنت کی طرف لوٹادیا جائیگا اور اس صورت میں صرف ایک

طلاق رجعی واقع ہوگی، اور لوگ اسے آپ حضرات کے حوالہ سے بیان کرتے ہیں اس پر انھوں نے غضب ناک لہجہ میں فرمایا۔

قال: معاذ اللّٰہ ماھذا قولنا من طلق ثلثا فھو کما قال۔ (سنن الکبریٰ ج۷ ص۳۴۰)

انھوں نے فرمایا، معاذ اللہ: لوگ اسے ہماری طرف منسوب کرتے ہیں حالانکہ ہمارا یہ قول نہیں ہے جس شخص نے تین طلاقیں دیدیں تو وہ تین ہی شمار ہوں گی۔

اس روایت سے واضح ہوا کہ اہل بیت کی طرف تین طلاقوں کا ایک ہونے کی نسبت کرنا سراسر غلط اور بے بنیاد ہے اس مسئلہ میں حضرات اہل بیت بھی دیگر ائمہ اور جمہور امت کے ہمنوا ہیں وہ حضرات بھی تین طلاقوں کو تین ہی سمجھتے اور اسی کے مطابق فتویٰ دیتے تھے۔

ہم نے آیات قرآنیہ اور دس احادیث وآثار صحابہ سے یہ بات ثابت کردی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور مبارک سے لے کر آج تک ہر زمانے اور ہر صدی میں تین طلاقیں تین ہی سمجھی گئی ہیں اور اس پر پوری امت کا اجماع و اتفاق ہے صرف معدودے چند حضرات کا نام ملتا ہے جو اس کے خلاف مذہب رکھتے تھے مگر ظاہر ہے کہ کچھ لوگوں کی مخالفت سے اجماع پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہے۔

صاحب عقل وخرد اور اہل بصیرت ونظر والوں کے لئے یہ دلائل کافی وشافی ہیں انھی دلائل وبینات سے ان کے شکوک وشبہات کے پردے چاک ہوجائیں گے اور مسئلہ کا ہر ہر پہلو ان پر روز روشن کی طرح عیاں ہوجائیگا۔

ہاں نہ ماننے والوں کیلئے دفتر کا دفتر بھی عبث قرار پائیگا ایسے لوگوں کیلئے کبھی کوئی دلیل اس دنیا میں باعث طمانیت نہیں ہوتی اور نہ شاید آئندہ موجب طمانیت ہوگی فالی المشتکی وھو یھدی الی الصراط العزیز الحمید۔ (باقی آئندہ)

مولانا قاضی اطہر مبارکپوری

مطالعات و تعلیقات

سوال ذلت ہے قبیلۂ بنی اسد کے ایک صحابی کا بیان ہے کہ میں اور میرے بال بچے جنت البقیع میں آکر مقیم ہوئے، میری بیوی نے کہا کہ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاؤ، اور ہمارے لئے کچھ کھانا مانگ لاؤ۔ میں خدمت نبوی میں پہنچا اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک شخص سوال کر رہا تھا اور آپؐ فرمارہے تھے کہ تم کو دینے کے لئے اس وقت میرے پاس کچھ نہیں ہے، وہ یہ جواب سن کر غصہ میں کہتا ہوا چلا گیا کہ آپ جس کو چاہتے ہیں دیتے ہیں، آپ نے فرمایا کہ یہ شخص اس لئے غصہ دکھا رہا ہے کہ میرے پاس اس کو دینے کے لئے کچھ نہیں ہے جس کے پاس ایک اوقیہ سونا یا اسکے مساوی رقم ہو اس کیلئے سوال کرنا ذلت ہے۔

صحابی کہتے ہیں کہ آپ کی یہ بات سن کر میں نے سوچا کہ ہمارے پاس دودھ دینے والی ایک اونٹنی ایک اوقیہ سے زیادہ رقم کی ہے، یہ سوچ کر بغیر سوال کئے واپس چلا آیا، اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کہیں سے جو اور کشمش کی زیادہ مقدار آگئی تو آپ نے اس میں سے ہم کو بھی عنایت فرمایا اور بغیر سوال کئے اللہ تعالیٰ نے ہماری ضرورت پوری کردی　　(المنتقیٰ، ابن جارود ص ۱۳۳)

جو شخص سوال سے بچتا ہے اللہ تعالیٰ دوسری طرف سے اس کی ضرورت پوری کردیتا ہے اور جو لوگ صبر و شکر کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں ان میں استغنار، بے نیازی اور سیر چشمی

پیدا ہو جاتی ہے اور جو لوگ صبر و شکر کی دولت سے محروم ہوتے ہیں زندگی بھر ان کا منھ کھلا رہتا ہے حتی کہ مرنے کے بعد اس کو مٹی بھر دیتی ہے۔

ایک بزرگ کا بحری سفر

طبرستان کے علماء و مشائخ میں ایک بزرگ ابو رشید محمد بن علی شافعی متوفی ۵۲۸ھ رحمۃ اللہ علیہ تھے حج کے بعد مکہ مکرمہ میں رہ کر حدیث کی تعلیم حاصل کی، اور اس کی تعلیم دی، بڑے نیک عابد و زاہد بزرگ تھے، ایک مرتبہ بحری سفر میں تاجروں کی ایک جماعت کے ساتھ نکلے اور ایک جزیرہ کے پاس گذرے تو دوست و احباب کو رخصت کر کے اسی جزیرہ میں اتر گئے اور کہا کہ آپ لوگ جائیے میں یہیں قیام کرنا چاہتا ہوں، دوستوں نے باصرار کہا کہ اس ویرانہ میں آپ قیام نہ کریں مگر نہیں مانے اور وہیں رہ گئے، مجبوراً لوگ ان کو چھوڑ کر آگے بڑھے، تو ہوا کا شدید طوفان اٹھا اور سمندری موجوں نے جہاز کو دھکیل کر اسی سمندری جزیرہ پر لا کھڑا کیا۔ لوگوں نے پھر اس بزرگ سے کہا کہ آپ ہمارے ساتھ چلیں، مگر اب کے بھی وہ انکار ہی کرتے رہے، اسی طرح کئی بار جہاز چلا مگر طوفان کی وجہ سے اس جزیرہ پر لگا اور لوگ ان سے ہر بار یہی کہتے رہے مگر وہ اپنے ارادہ پر قائم رہے، آخری بار تمام تاجروں نے کہا کہ آپ ہمارے جان و مال کی ہلاکت کے درپے معلوم ہوتے ہیں جب جب ہم آگے بڑھتے ہیں طوفان ہم کو آپ کے پاس پہونچا دیتا ہے، آپ ہمارے ساتھ چلئے، فلاں بندرگاہ پر اتر جائیےگا اس اجتماعی احتجاج و اصرار پر وہ بزرگ جہاز پر سوار ہوگئے اور جہاز سلامتی کے ساتھ منزل مقصود تک پہونچ گیا، تاجروں کے ساتھ وہ بھی وہاں ٹھہرے رہے اور واپسی کے وقت پھر اسی جزیرہ میں اتر گئے اور دو سال تک وہیں قیام کیا جزیرہ میں پانی کا ایک چشمہ ان کی زندگی کا ظاہری سہارا تھا، پھر وہاں سے نکل کر آمل میں مستقل قیام کیا اور وہیں فوت ہوئے (المنتظم، ابن جوزی ج۱۰ ص۴۰)

بزرگوں کے مکاشفات و الہامات برحق ہیں مگر ان کی حیثیت بشارت و تنبیہ کی ہے، یہ خود ان کے لئے حجت نہیں ہیں دوسروں کے لئے کیسے ہو سکتے ہیں شیخ ابو رشید کے روحانی ذوق اور قلبی کیفیت کو احساس ہو گیا تھا کہ سمندر کے آثار اچھے نہیں ہیں اور طوفان کا خطرہ ہے انھوں نے اس روحانی احساس کی وجہ سے دوسروں کو سفر سے روکنا مناسب نہیں سمجھا اور ساتھیوں کو اپنے ذوق و وجدان کی کیفیت سے بے خبر رکھا مگر یار لوگ سمجھ گئے کہ معاملہ کیا ہے؟ آخر میں ان کو کہنا پڑا کہ آپ ہمارے جان کی تباہی کا باعث نہ بنیں اور ہمارے ساتھ چلیں۔

ویسے شیخ ابو رشید اس خطرہ کی وجہ سے نہیں رکے تھے بلکہ وہ عبادت و ریاضت کی نیت سے وہاں ٹھہرے تھے، چنانچہ بعد میں دو سال تک وہاں رہے، آج آلات اور مشینوں کے ذریعہ سمندری طوفانوں اور ہواؤں کو معلوم کیا جاتا ہے، قدیم زمانہ میں جہازوں پر ایسے ماہر رہا کرتے تھے جو طوفانوں اور ہواؤں کے بارے میں پہلے سے باخبر کرتے تھے وہ بحریات کے ماہر اور سمندروں کے مزاج دان تھے، قدیم جہاز رانی میں ان سے بڑا کام لیا جاتا تھا اور اسی کام کے لئے ان کو رکھا جاتا تھا۔

بے فیض کتابیں: امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ اپنی دو کتاب تاریخ طبری اور تفسیر طبری کی وجہ سے بہت مشہور محدث و فقیہ اور مفسر و مورخ ہیں انھوں نے عباسی وزیر ابن حسن کی خواہش پر کتاب الخفیف تصنیف کی جس کو وزیر نے پسند کر کے امام طبری کی خدمت میں ایک ہزار دینار پیش کئے مگر انھوں نے یہ رقم واپس کر دی حالانکہ وہ اس زمانے میں شدید معاشی پریشانی میں مبتلا تھے (طبقات الشافعیہ ص۱۳۷ ج۲)

بہت سے علماء و مصنفین کو ارباب دولت نے نوازا ہے اور ان کی قدر دانی کی ہے اور یہ بہت اچھی بات ہے اگر جانبین میں خلوص ہو، علماء میں اسراف و طمع نہ ہو اور ارباب

دولت کا جذبہ دینی و علمی خدمت ہو۔ اسکے باوجود بہت سے علماء اپنے علم کو اس پیش کش سے بلند سمجھتے تھے اور اس طرح کی پیش کش سے صاف انکار کر دیتے تھے، خاص طور پر خالص دینی کتابوں کے بارے میں بڑی شدت سے احتیاط کرتے تھے ایسے علماء کی تصانیف دنیا میں زیادہ مقبول و متداول ہوئیں اور ان کا فیض خوب خوب عام ہوا بخلاف اسکے جن علماء نے اپنی کتابوں کی اجرت پائی وہ محدود ہو کر رہ گئیں اور ان کو قبول حاصل نہیں ہو سکا۔

مگر اب علماء کے ایک طبقہ میں یہ مرض پھیل گیا ہے کہ وہ پیسے کمانے کے لئے کتابیں لکھتے ہیں، لکھواتے ہیں اور چھاپ کر فروخت کرتے ہیں بیشک مصنفین کو بھی پیسوں کی ضرورت ہے ان کی ضرورت پوری ہونی چاہئے اور وہ اپنی کتابوں پر منافع لے سکتے ہیں مگر دینی کتابوں کو خالص تجارتی اور کاروباری نقطۂ نظر سے لکھنا اور بیچنا اچھا نہیں ہے، ایسی کتابوں سے فیض نہیں پہونچتا ہے۔

تب اور اب

لعل بدخشاں بہت قیمتی اور مشہور پتھر ہے مقدسی بشاری نے لکھا ہے کہ بدخشاں یاقوت کے مانند جوہر کی ایک کان ہے یہیں سے لعل بدخشانی نکلتا ہے کسی اور جگہ ایسی کان نہیں ہے، نیز یہاں لاجورد طبتور اور بازہر کی کانیں ہیں، اسی طرح حجر الفتیلہ (بتّی کا پتھر) کی کان ہے یہ بردی گھاس کے مانند ہوتا ہے جو آگ میں نہیں جلتا ہے تیل میں رکھ دیا جاتا ہے اور بتی کی طرح خود بخود جلنے لگتا ہے مگر جلنے سے کم نہیں ہوتا، تیل سے نکال کر دہکتی ہوئی آگ پر رکھدیا جاتا ہے تو ایک گھنٹے کے بعد اپنی اصلی حالت پر آجاتا ہے۔ اس سے دسترخوان بھی بنائے جاتے ہیں، جب دسترخوان میلا اور گندا ہو جاتا ہے تو اس کو تنور میں ڈال دیتے ہیں تھوڑی دیر کے بعد نہایت صاف ستھرا ہو جاتا ہے، مقدسی بشاری نے حجر الفتیلہ کے ساتھ ایک اور پتھر کا ذکر یوں کیا ہے۔

وبها حجر يجعل في البيت المظلمة فيضئ ادنى شئ (احسن التقاسيم في معرفة الاقاليم ص۳۰۳)

یہاں ایک پتھر ہوتا ہے جو اندھیرے مکان میں رکھ دیا جاتا ہے تو چھوٹی سے چھوٹی چیز چمکنے لگتی ہے۔

ہمارے زمانے میں انکشافات وایجادات اور تحقیقات واختراعات جس کثرت سے ہو رہے ہیں پہلے زمانہ میں اس کی مثال نہیں ملتی ہے اور آئندہ مزید ترقی ہوگی اور نئے نئے انکشافات واختراعات ہوں گے اور لوگ کہیں گے کہ پہلے زمانہ میں ان کی مثال نہیں ملتی ہے۔

اب سے ہزاروں سال کے لوگ اپنے اپنے دور کی ترقی یافتہ زندگی بسر کر رہے تھے اور سمجھتے تھے کہ ہم سے پہلے یہ ترقی نہیں تھی

قدیم زمانہ میں روشنی کے لئے کس قدر آسان، سہل اور سستا سامان تھا حجر الفتیلہ تیل میں ڈال دو، اور سوئی میں دھاگہ پرو لو، اور اس سے زیادہ آسان یہ اس پتھر کا ایک ٹکڑا رات کو کمرے میں رکھ دو اور پوری روشنی ہو جائے البتہ مواصلات کی دشواریوں کی وجہ سے ایسی چیزیں مقامی بن کر رہ جاتی ہیں، اس لئے ان کی افادیت عام نہ ہوئی اور نہ شہرت ملی اور ہمارے زمانے میں کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ مسافت کی چیزیں آسانی سے حاصل ہو جاتی ہیں اور ہم ان سے استفادہ کرتے ہیں اللہ بھلا کرے ہمارے مورخوں سیاحوں اور جغرافیہ نویسوں کا کہ انھوں نے سیر وسفر کر کے ان اشیاء کے بارے میں معلومات حاصل کیں اور ان کو اپنی کتابوں میں درج کیا جس کی بدولت ہم کو ان کا علم ہو رہا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ زمانہ قدیم میں بھی انسان اپنے احوال وظروف میں رہ کر ترقی یافتہ تھے اور اپنے پچھلے دور والوں کے مقابلہ میں اپنے کو ترقی یافتہ سمجھتے تھے۔

جرم وسزا قریش کے قبیلہ مخزوم کی ایک عورت چوری میں پکڑی گئی اور

معاملہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہونچا، عورت کے خاندان والے بیحد پریشان تھے کہ اگر شرعی حکم کے مطابق اس کا ہاتھ کاٹا گیا تو ہماری بڑی سبکی اور جگ ہنسائی ہوگی، مگر کسی کی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ اس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بات کرے، آخران لوگوں نے حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کے ذریعہ سفارش کرائی تو آپ نے فرمایا کہ تم لوگوں سے پہلے — اسلئے تباہ ہوئے کہ جب ان میں کوئی بڑا آدمی چوری کرتا تھا تو اس کو سزا نہیں دیتے تھے خدا کی قسم اگر فاطمہ بنت محمدؐ بھی چوری کرے گی تو میں اس کا ہاتھ کاٹ دوں گا (بخاری ومسلم)

جب تک جرم کی خبر عام نہ ہو اور قضاء و عدالت تک نہ پہونچے اس کا چھپا رہنا ہی اچھا ہے اور اس کی حیثیت ذاتی جرم کی ہوتی ہے مگر جب اس کی خبر عام ہو جائے تو اس کو چھپانے کی کوشش اور شہادت نہ دینا بجائے خود بہت بڑا جرم ہے کہ اس میں جرم اور مجرم کو شہ دینا ہے اور معاشرہ پر اس کا بُرا اثر پڑے گا۔

مخزومیہ عورت کا جرم ظاہر ہو چکا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک بات جا پہونچی تھی، اس کے بارے میں اب کسی قسم کی سفارش کی گنجائش نہیں رہ گئی تھی اور سزا دینی ضروری ہوگئی تھی، ثبوت جرم کے بعد کسی قسم کی رعایت اسلام میں نہیں ہے، شک کی حد تک مجرم کو فائدہ کرنے کا موقع رہتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رؤف ورحیم تھے اپنی ذات کیلئے کسی سے انتقام لینا تو دور کی بات ہے کسی کے ساتھ سخت کلامی نہیں کرتے تھے لیکن قصاص و حدود کے بارے میں کسی کی رعایت نہیں فرماتے تھے اور نہ ہی کسی قسم کی رو رعایت کرتے تھے۔

جس جگہ جرائم کھلم کھلا ہوں اور لوگ خاموشی سے تماشا دیکھتے رہیں وہاں معاملہ انفرادی اور ذاتی نہیں رہ جاتا بلکہ اس کی سزا اجتماعی طور پر سب کو ملتی ہے

اورسب جرم وگناہ میں شریک کی حیثیت سے سزایاب ہوتے ہیں

امیر حمص اور عوام

عہد فاروقی میں ملک شام کے شہر حمص کے امیر حضرت سعید بن عامر رضی اللہ عنہ تھے، ایک مرتبہ حمص کے عوام نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس ان کی شکایت کرکے معزولی کی درخواست کی، حضرت عمرؓ نے ان سے دریافت کیا کہ تم لوگوں کو اپنے امیر سے کیا شکایت ہے بیان کرو، انھوں نے بتایا کہ وہ دن چڑھنے کے بعد باہر نکلتے ہیں، رات کو ہم سے نہیں ملتے ہیں اور مہینہ میں ایک دن کسی سے ملتے ہی نہیں، حضرت عمرؓ نے تحقیق حال کے لئے حضرت سعید بن عامرؓ کو حمص سے مدینہ بلایا اور وفد کے سامنے ان کو بلاکر کہا کہ اب تم لوگ اپنی شکایات بیان کرو۔ وفد نے کہا کہ پہلی بات یہ ہے کہ ہمارے امیر ہمارے پاس صبح کو دیر سے آتے ہیں، حضرت عمرؓ نے سعید بن عامرؓ سے کہا کہ آپ اس کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ انھوں نے کہا امیرالمومنین! بات یہ ہے کہ میری بیوی کی کوئی خادمہ نہیں ہے اس لئے میں آٹا گوندھتا ہوں۔ روٹی پکاتا ہوں اس کے بعد وضو کرکے دارالامارہ میں عوام کے سامنے آتا ہوں۔

حضرت عمرؓ نے وفد سے کہا کہ اور کیا شکایت ہے؟ وفد نے کہا رات کو ہم سے نہیں ملتے ہیں، حضرت سعید بن عامرؓ نے کہا کہ اس کے بارے میں صفائی دینا نہیں چاہتا تھا، میں نے پوری رات اپنے رب کیلئے رکھی ہے اور دن عوام کے لئے رکھا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ارکان وفد سے کہا کہ اور کیا بات ہے؟ انھوں نے کہا کہ مہینہ میں ایک دن دارالامارہ میں آتے ہی نہیں، حضرت سعید بن عامرؓ نے کہا کہ میرے پاس کوئی خادم نہیں ہے اس لئے مہینہ میں ایک دن اپنے کپڑے خود دھوتا اور سکھاتا ہوں، اسی میں شام ہو جاتی ہے، حضرت عمرؓ نے ہر شکایت

کا معقول جواب سنکر کہا کہ اللہ کا شکر ہے کہ آپ کے بارے میں عمر کی فراست غلط ثابت نہیں ہوئی پھر حمص والوں سے کہا کہ تم لوگ اپنے امیر کے بارے میں خیر خواہانہ حوصلہ اور اچھے خیالات رکھو۔

اس کے بعد حضرت عمرؓ نے حضرت سعید بن عامرؓ کے پاس ایک ہزار درہم بھجوائے اور کہلایا کہ اس رقم سے اپنی ضرورت پوری کریں، مگر ان کی بیوی نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو اس سے بے نیاز رکھا ہے اس رقم کو آپ واپس کردیں، حضرت سعید بن عامرؓ نے کہا کہ کیوں نہ ہم اس رقم کو اپنے سے زیادہ حاجت مند کو دیدیں؟ اور یہ کہکر کہ یہ فلاں یتیم کا ہے، یہ فلاں مسکین کا ہے، اور یہ فلاں حاجت مند کا ہے آخر میں ایک حقیر رقم بچ گئی تو اس کو بیوی کو یہ کہکر دیا کہ تم اس کو اپنی ضرورت میں خرچ کرو (مروج الذہب ج ۲ ص ۲۱۳ و ۲۱۴)

یہ عوامی حکومت اور اس کے عوامی حکمراں کی داستان ہے جس میں نہ قدیم بادشاہت ہے نہ جدید جمہوریت ہے بلکہ اس کا نام خلافت ہے

غزوۂ اُحد کے پہلے شہید

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ غزوۂ احد سے پہلے کی رات میں میرے والد نے مجھے بلایا اور کہا کہ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں اس غزوہ میں سب سے پہلے میں شہید ہوں گا، میں تم کو رسول اللہؐ کے بعد سب سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں، میرے ذمہ کچھ قرضہ ہے تم اس کو ادا کرنا۔ اور اپنی بہنوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنا، چنانچہ ایسا ہی ہوا اور غزوۂ احد میں سب سے پہلے میرے والد شہید ہوئے، میں نے ان کو ایک دوسرے شہید کے ساتھ ایک قبر میں دفن کیا، بعد میں میرے دل نے سوچا کہ والد کو دوسرے کے ساتھ دفن کرنا مناسب نہیں ہے، اور ان کو قبر سے نکالا تو وہ اسی طرح صحیح وسالم تھے جیسے اس قبر میں رکھے گئے تھے البتہ

ان کے کان میں کچھ تغیر آگیا تھا، میں نے ان کو علیحدہ قبر میں دفن کیا، یہ واقعہ غزوۂ احد کے چھ ماہ بعد کا ہے (بخاری کتاب المغازی)

(۱) یقین وایمان کی روشنی بہت دور تک پھیلتی ہے اور غیر مرئی احوال وکوائف پر بھی پڑتی ہے، حضرت جابرؓ کے والد کی ایمانی فراست نے معلوم کرلیا تھا کہ شہادت کی سعادت سب سے پہلے میرے حصہ میں آئے گی، اپنی اولاد بڑی پیاری ہوتی ہے اور اسی سے والدین کو بڑا اُنس ہوتا ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹے حضرت یوسف علیہ السلام کی خوشبو کنعان بیٹھے دور سے محسوس کرلی تھی۔

(۳) قرضہ کی ادائیگی ورثہ کے ذمہ ضروری ہے ورنہ اس کا بار میت کے ذمہ رہے گا مورث کو چاہیئے کہ موت سے پہلے اپنا قرض ادا کردے یا پھر اس کی خاص طور سے وصیت کرجائے (۴) لڑکیاں والدین اور بھائیوں پر بڑا حق رکھتی ہیں، ان کی خبر گیری اور دلداری ضروری ہے ان کے بارے میں غفلت نہیں کرنی چاہیئے۔ (۵) بوقت ضرورت ایک قبر میں دو یا اس سے زیادہ دفن کیئے جاسکتے ہیں، غزوۂ احد میں اسی پر عمل کیا گیا تھا، عام حالات میں قبر کھود کر میت کو نکالنا اچھا نہیں ہے کوئی اہم بات ہو تو اور بات ہے (۶) شہداء زندہ رہ کر اپنے رب کے یہاں سے روزی پاتے ہیں، ان کا جسم محفوظ رہتا ہے، اس کی بہت سی شہادتیں ہیں۔

محبت اور عداوت

ابو محمد یحییٰ بن مبارک یزیدی حدیث، تاریخ، انساب، ادب، لغت، اور تجوید کے زبردست عالم تھے، مشہور امام لغت خلیل بن احمد کے تلمیذ تھے اور ان سے بحور وقوافی کی تعلیم حاصل کی تھی ایک دن یزیدی اپنے استاذ خلیل بن احمد کی مجلس درس میں گئے، اس وقت طلبہ کا ہجوم تھا، خلیل بن احمد تکیہ سے ٹیک لگائے ہوئے درس دے رہے تھے، یزیدی کو آتے دیکھ کر اپنی جگہ سے کھسک گئے اور ان کو اپنے پاس بٹھایا، یزیدی نے کہا کہ میرا

خیال ہے کہ میں نے آپ کے لئے تنگی پیدا کردی ہے خلیل بن احمد نے اس پر کہا کہ

ما ذاق شئ علی اثنین متحابین — دو باہمی محبت کرنے والوں کے لئے کوئی
والدنیا لا تسع متباغضین — چیز تنگی پیدا نہیں کرتی، اور دو عداوت
(تاریخ بغداد ۱۴۸/۱۴۶) — والوں کے لئے دنیا بھی وسعت پیدا نہیں کرتی ہے۔

خلیل بن احمد کا یہ جملہ باہمی محبت وعداوت پر نہایت جامع اور بلیغ تبصرہ ہے اور اس سے محبت کی ہمہ گیری اور عداوت کی تنگ دامانی معلوم ہوتی ہے۔

قرارت کے مشہور امام کسائی اور یزیدی دونوں بغداد کی ایک مسجد میں ہی بیٹھ کر درس دیتے تھے، کسائی ہارون رشید کے صاحبزادے امین کو اور یزیدی مامون کو پڑھاتے تھے۔

یحییٰ بن معاذ حارثیؒ بغداد گئے مگر ان کو وہاں اچھا ماحول اور اچھے لوگ نہیں مل سکے جس سے متاثر ہوکر انھوں نے یہ اشعار کہے۔

لقد جاورتُ بغدادا ؛ فما احببتُ بغدادا
میں بغداد میں ٹھہرا مگر بغداد کو پسند نہیں کیا
ولا احببت کرخایا ؛ ولا احببت کلواذا
مجھے نہ اس کا محلہ کرخ پسند آیا اور نہ کلوازی پسند آیا
ولا وافقنی فیہا اخ ذلک ولا ھذا
اور وہاں میرے اس بھائی نے ساتھ دیا اور نہ اس بھائی نے ساتھ دیا (تاریخ بغداد ۱۴۶/۲۰۷)

بڑے شہروں میں جاکر اپنا مقام پیدا کرنا بڑا مشکل ہے یہ ہر شخص کے بس کا کام نہیں ہے، بغداد مشرقی عالم اسلام کا سب سے بڑا شہر تھا جس میں ہر علم وفن کے نامور رہتے تھے، نووارد صاحبِ علم وکمال کو بڑی مشکل سے مقام ملتا تھا وہاں ایک سے ایک اعلیٰ اہل علم وفن کے ساتھ ایک سے اعلیٰ ایک فن باز بھی تھے جو دوستی اور خیر خواہی کے پردے میں اپنا کام نکالتے تھے۔

قسط ۲ مولانا اقبال احمد صاحب مانچسٹر

حضرت مولانا خلیل احمد محدّث اور بارگاہِ رسالت

خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت اقدس سہارنپوری فرماتے ہیں کہ

"ہمارا اور ہمارے مشائخ کا عقیدہ ہے کہ ہمارے سردار اور آقا اور پیارے شفیع حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین والمرسلین ہیں، آپ کے بعد کوئی نبی پیدا نہ ہوگا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں صاف فرمایا ہے ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین اور یہی ثابت ہے بکثرت حدیثوں سے جو معناً حد تواتر تک پہونچ گئیں۔ اور نیز اجماع امت سے جو اس کا منکر ہے وہ ہمارے نزدیک کافر ہے (المہند ص ۳۹)

علماء دیوبند کے عقیدۂ ختم نبوت کی وضاحت کی حاجت نہیں دنیا اس بات سے بخوبی واقف ہے کہ علماء دیوبند نے عقیدۂ ختم نبوت کے تحفظ میں کیا کیا خدمات سرانجام دی ہیں اور آج تک بفضلہ تعالیٰ دے رہے ہیں منکرینِ ختم نبوت نے جب ہندوستان میں مسلمانوں کے دین وایمان پر ڈاکہ زنی کی کوشش کی تو یہی علماء تھے جنھوں نے اس کا تعاقب کیا جب یہ بیرون ہند پہنچا تو پاکستان ہو یا افغانستان، افریقہ ہو یا امریکہ، ہالینڈ ہو یا برطانیہ ہر ہر مقام پر علماء دیوبند نے ان کی ناکہ بندی کی اور ہر خطرے کے باوجود ڈٹ کر مقابلہ کیا، یہی علمائے دیوبند تو ہیں جنھوں نے قادیانیوں اور دیگر منکرین ختم نبوۃ کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے میں زبردست کردار ادا کیا، اور ان شاء اللہ کرتے رہیں گے۔

علماء دیوبند کے سرتاج حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ پر مکفر المسلمین مولوی احمد رضا خاں بریلوی نے پہلی مرتبہ الزام لگایا اور زبردستی ان کے ذمے یہ کفریہ عقیدہ منسوب کر دیا جس کی تفصیل احقر نے پچھلے مضامین میں بیان کی ہے جس میں مکفر المسلمین کی شرمناک قطع و برید اور کھلی بد دیانتی کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

زیارت قبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم | حضرت اقدس سہارنپوریؒ تحریر فرماتے ہیں کہ

"میرے اور میرے مشائخ کے نزدیک زیارت قبر سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم اعلیٰ درجہ کی قربت اور نہایت ثواب اور سبب حصول درجات ہے بلکہ واجب کے قریب ہے گو شد رحال اور بذل جان و مال سے نصیب ہو اور سفر کے وقت آپ کی زیارت کی نیت کرے اور ساتھ میں مسجد نبوی و دیگر مقامات و زیارتگاہ ہائے متبرکہ کی بھی نیت کرے بلکہ بہتر یہ ہے کہ خالص قبر شریف کی زیارت کی نیت کرے، پھر جب وہاں حاضر ہوگا تو مسجد نبوی کی بھی زیارت ہو جائیگی اس صورت میں جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم زیادہ ہے ....

وہ حصۂ زمین جو خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے اعضاء مبارکہ کو مس کئے ہوئے ہے علی الاطلاق افضل ہے یہاں تک کہ کعبہ اور عرش و کرسی سے بھی افضل ہے ——— (المہند ص۲۶)

اندازہ فرمائیے! جو شخص سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ مطہرہ کی زیارت کو نہایت ثواب اور سببِ حصولِ درجات قرار دے رہا ہو اور جان و مال خرچ کرکے بھی وہاں پہنچنے کی تلقین کر رہا ہو، اور خود بھی کئی بار حاضری کے شرف سے مشرف ہو چکا ہو اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم مطہر سے لگے ہوئے مٹی کے حصہ کو سب سے افضل (کعبہ اور عرش و کرسی سے افضل) بتلا رہا ہو بھلا وہ شخص گستاخ ہو سکتا ہے؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو خود ہی سوچئے جو لوگ اس قسم کے الزامات سے عوام کو

فرقہ کی دلدل میں دھکیلتے ہیں، ان کا انجام کیا ہوگا۔؟

قلب النبی صلی اللہ علیہ وسلم | حضرت اقدس سہارنپوریؒ فرماتے ہیں کہ:

"پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے احسان امت پر دو طرح کے ہیں، ایک "یعلمہم الکتاب" کہ وہ راستہ بتاتے اور طریق نجات سکھاتے تھے، دوم "یزکیہم" کہ پاس بٹھا کر اپنے قلب مبارک سے ان کے قلوب میں ایک نور ڈالتے اور عمل کا ایک شوق جس کو دلچسپی کہنا چاہئے، پیدا کرتے تھے کہ عمل کیلئے محرک بن کر حاضر و غائب بحالت عسر و یسر ہر صورت میں بندۂ خدا اور مستقیم الاحوال بنائے رکھے، پس آپ عالم تھے اور علم کو مورث اور عمل کو مورثِ حال بنانے کے خواہشمند تھے۔ (تذکرۃ الخلیل ص۲۰۱)

دیکھا آپ نے حضرت اقدسؒ کے نزدیک رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قلب مبارک اس قدر لطیف و نفیس اور منور تھا کہ آپ کے پاس بیٹھنے والوں کے قلوب کو بھی آپ نورانیت سے معمور فرما دیتے تھے۔

صلوٰۃ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم | حضرت اقدس سہارنپوریؒ فرماتے ہیں کہ:

"ہمارے نزدیک حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود شریف کی کثرت مستحب اور نہایت موجب اجر و ثواب وطاعت ہے، خواہ دلائل الخیرات پڑھ کر ہو یا درود شریف کے دیگر رسائل مؤلفہ کی تلاوت سے ہو، لیکن افضل ہمارے نزدیک وہ درود ہے جس کے الفاظ بھی حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں گو غیر منقول کا پڑھنا بھی فضیلت سے خالی نہیں اور (پڑھنے والا) اس بشارت کا مستحق ہو جائیگا کہ جس نے ایک بار مجھ پر درود پڑھا حق تعالیٰ اس پر دس مرتبہ بھیجے گا الخ (المہند ص۳۲)

غور فرمائیے! حضرت اقدس درود شریف کی کثرت کی کس کس انداز سے ترغیب

فرما رہے ہیں اور بتارہے ہیں کہ افضل درود شریف پڑھیں کیونکہ اس کے الفاظ بھی سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں تاکہ اس کا اجر بھی اکمل طور پر نصیب ہو، حضرت اقدس کے خلیفۂ اجل حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب مہاجر مدنی کی تصنیف لطیف، فضائل درود شریف اس کا بین ثبوت ہے۔

نہایت تعجب کی بات ہے کہ اس قدر صراحت و وضاحت کے باوجود بھی کچھ لوگ علماء دیوبند پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ یہ لوگ درود کے منکر ہیں، حالانکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے اور اکابرین دیوبند کے اس موضوع پر کئی رسائل اور تالیفات ہیں۔ کاش کہ اتنا بڑا بہتان باندھنے سے قبل کچھ تو خوفِ خدا کرتے؟ یہی نہیں حضرت اقدس تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان پاک خواہ نظماً ہو یا نثراً جائز بلکہ مستحب فرماتے ہیں (دیکھئے فتاویٰ خلیلیہ جلد ۱ ص ۳۶۵)

مدینۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت اقدس سہارنپوری کی سوانح حیات کے مرتب حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی فرماتے ہیں کہ:

(حضرت سہارنپوری) حج سے فارغ ہو گئے قافلہ کے مدینہ منورہ چلنے کا وقت آیا اور چار طرف سے یہ افواہ پھیلی کہ راستہ مامون نہیں ہے اور جان و مال پر ہر قسم کا خطرہ ہے تو اعلیٰ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی نے حضرت سے فرمایا کہ مولوی خلیل احمد سے کہو کیا ارادہ ہے؟ سنتا ہوں کہ مدینہ منورہ کے راستے میں امن نہیں ہے اور اسلئے حجاج بکثرت وطن واپس جارہے ہیں حضرت نے فرمایا کہ حضرت میرا قصد تو مدینہ طیبہ کا پختہ ہے کہ موت کیلئے تو جو وقت مقرر مقدر ہو چکا ہے وہ کہیں بھی نہیں ٹل سکتا اور اس راستے میں (یعنی مدینہ منورہ کے راستے میں موت) آجائے تو زہے نصیب کہ مسلمان کو اور کیا چاہیئے، اللہ کا فضل ہے کہ اس نے یہاں (مکہ مکرمہ) تک پہنچا دیا اب

اگر ڈر سے مدینہ طیبہ کا سفر چھوڑ دوں تو مجھ سے زیادہ بدنصیب کون؟
(تذکرۃ الخلیل ص۱۱۹)

غور فرمائیے! حضرت اقدس مدینۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق میں کیوں اس قدر چور چور ہیں اسی لئے نا کہ یہ خاتم الانبیاء والمرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کا وطن معظم ہے اور پھر اس پر بھی غور فرمائیے کہ آپ کے نزدیک مدینہ منورہ کے راستہ میں موت حاصل کرنے والا حضرت اقدسؒ کے نزدیک کس قدر خوش قسمت ہے۔ آپ تو راستے کی گفتگو کر رہے ہیں مگر اللہ کی شان دیکھئے کہ اس عاشق رسولؐ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وطن میں جان جان آفریں کے سپرد کی اور وہ نعمت حاصل کر گئے جس کی ہر ایک کو تمنا ہوتی ہے۔

وما حب الدیار شغفن قلبی
ولکن حب من سکن الدیارا

مدح خلفاء الرسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت اقدس سہارنپوری رح ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

ذکر مناقب چار یار کبار عبادت ہے اور جن مواقع میں روافض کی مجالس ہوتی ہوں اور ذکر چار یار کی مزاحمت ہوتی ہو اور فساد عقائد عوام کا اندیشہ ہوتا ہو وہاں ذکر مناقب چار یار شعار سنیّت ہوگا اور واجب ہوگا لان ما توقف علیہ الواجب واجب اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت اور چار یار کبار کی مدح نظماً یا نثراً پڑھنا فی حد ذاتہ جائز و مستحب ہے۔

(فتاویٰ خلیلیہ جلد ۱ ص۳۶۵)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا تقاضا یہ ہے کہ آپ کے خلفاء راشدین مہدیین کی تعظیم و تکریم کی جائے، اور حضرت رح فرماتے ہیں کہ خلفائے راشدین کے

مناقب وفضائل بیان کرنا نہ صرف عبادت بلکہ ایسے مقامات پر (جہاں روافض انھیں طنز وتشنیع کا نشانہ بنائیں) سنیت کی علامت اور واجب ہوگا، حضرت اقدسؒ نے رد روافض میں دو لاجواب کتابیں تالیف فرمائی ہیں جن کے جواب سے روافض عاجز ہیں مگر افسوس کہ آج اکابر دیوبندؒ پر وہ لوگ الزامات عائد کرتے ہیں جنھیں کبھی خلفاء راشدین کا دفاع کرنے کی توفیق نہ مل سکی اور اگر کبھی یہ موقع آیا بھی تو یہ کہہ کر جان چھڑا گئے کہ جواب تو ممکن ہے مگر ایک ہزار روپیہ چاہیئے۔

سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت مولانا عاشق الٰہی میرٹھیؒ لکھتے ہیں:

ایک مرتبہ حضرت سہارنپوریؒ روضۂ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں حجاز کے قاضی القضاۃ امیر ابن بلیہد کے پاس بیٹھے ہوئے تھے اور سلطان عبدالعزیز ان کے برابر۔ اُس زمانہ میں جو لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نام گرامی کے ساتھ "سیدنا" استعمال کرتا، اہل نجد اس کو مشرک کہتے (حضرت نے بھی اس کو سنا آپ کیسے خاموش رہ سکتے تھے) آپ نے موقع غنیمت پاکر قاضی صاحب سے سوال کیا کہ آپ لفظ "سیدنا" کے متعلق کیا فرماتے ہیں۔ قاضی صاحب نے تھوڑی دیر سکوت فرمایا اور پھر کہا کہ حدیث میں کہیں نہیں آتا، حضرتؒ نے جواباً ارشاد فرمایا کہ ہاں حدیث میں آتا ہے، قاضی صاحب نے ہمہ تن گوش ہوکر حیرت کے ساتھ پوچھا، کہاں آیا ہے؟ آپ نے فرمایا حدیث میں ہے "انا سید ولد آدم ولا فخر" قاضی صاحب نے کہا کہ ہاں اس طرح تو آیا ہے مگر نام مبارک کے ساتھ کہیں نہیں آیا، حضرتؒ نے جواباً فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے نام مبارک کے ساتھ جو تعالیٰ لگاتے ہیں کہیں قرآن شریف میں آیا ہے، قاضی صاحب نے فرمایا نہیں۔ (حضرت نے فرمایا کہ اسکے باوجود اللہ تعالیٰ کہتے ہیں اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم گرامی کے ساتھ "سیدنا" کا

استعمال ہوسکتا ہے، ایک جگہ حدیث میں آگیا کافی ہے (تذکرۃ الخلیل ص ۲۹۹)
حضرت اقدسؒ کے اس ارشاد پر غور فرمایئے اور اندازہ فرمایئے کہ آپ کے دل میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی کتنی محبت و عظمت تھی۔

اھلِ عرب کا احترام حضرت اقدس سہارنپوری اہل عرب کا بہت زیادہ احترام فرماتے تھے بالخصوص اہل مدینہ کا، آپ کے رفقاء اور کسی جمال میں کوئی نزاع ہوتا تو آپ جمال کی طرف داری کرتے اور حسرت کے ساتھ فرمایا کرتے کہ لوگوں کو ان کی قدر نہیں، معلوم بھی ہے کہ یہ کون لوگ ہیں، یہ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار تک پہنچانے والے ہیں، یہ میرے محبوب کے ہم وطن ہیں۔

حضرت اقدسؒ کی عادت تھی کہ ہر جمال کو ایک روپیہ یومیہ مزید عطا فرماتے اور اپنے ساتھ بٹھا کر ان کو کھانا کھلاتے اور ان کا دل خوش کیا کرتے تھے اور اپنے اعزہ و رفقاء کو نصیحت فرماتے کہ ان کے دینے میں ہرگز بخل نہ کرنا، اسی لئے آپ مدینہ منورہ میں ہدایا قبول کرنے سے گریز فرماتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ میں کوئی ایسا ہدیہ قبول نہیں کرتا جس سے میرے محبوب کے ہم وطن کے نقصان یا حق تلفی کا اندیشہ ہو کیونکہ اہلِ مدینہ کی نقصان رسانی جیران رسولؐ کو ایذا پہونچانے کے حکم میں ہے، ہاں جس رقم میں اطمینان ہوتا کہ اہل مدینہ کو جو دینا تھا وہ دے چکے اور اب میں نے نہ لیا تو دل تنگی کے ساتھ گھر واپس جائیں گے اس کو قبول فرمالیا کرتے تھے (تذکرۃ الخلیل ص ـــ)

اللہ رے عاشقِ رسولؐ! کہ باوجود خود ہمسایۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم بن جانے کے ہمسائیگان محبوب کی اس قدر رعایت کہ ہدیہ بھی ان کے دینے سے اسلئے قبول نہ فرماتے کہ اس سے میرے محبوب کے ہموطن کا نقصان ہے، اسے کہتے ہیں عاشق رسول، عشق رسول صرف چند نعت کہدینے یا ماہ ربیع الاول میں جلسے جلوس کرنے کا نام نہیں بلکہ زندگی کے ہر موڑ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق کی رعایت اور آپ کے حکموں کی اطاعت کا نام ہے اور حضرت اقدس سہارنپوریؒ کی پوری زندگی اس کی شاہد ہے۔

خاکِ مدینہ کا احترام حضرت اقدس سہارنپوریؒ کو مدینہ منورہ کے باشندے ہی نہیں مدینہ منورہ کی ہر ہر چیز سے بے پناہ عقیدت اور والہانہ لگاؤ تھا، آپ کو مدینہ منورہ کی مٹی سے بھی اس قدر پیار تھا کہ زائرینِ حرم کو آپ خود مدینہ منورہ کی مٹی لیجانے کی ترغیب دیا کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ اس میں شفاء ہے مگر مٹی کھانا نہیں، کیونکہ ناجائز ہے، ہاں لیپ وغیرہ میں ضرور استعمال کرنا۔

حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحب فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ بندہ بھی حضرتؒ کے ہمراہ تھا اور میرے ساتھ میرے چچا بھی تھے، مدینہ منورہ پہنچ کر وہ بیمار ہوگئے حضرتؒ نے فرمایا گھبراؤ نہیں اللہ تعالیٰ سب آسان فرمائیگا میرا دل یہ کہتا ہے کہ آستانہ شریفہ کی مٹی لے لو اور وہ منھ پر ملو، میں نے کہا۔ ۔ ۔ ۔ حضرت وہاں مٹی کہاں؟ فرمایا قالین کے نیچے زمین پر جو بھی گرد وغبار ہو وہ ہاتھ کو مل لیجئو اور سمیٹ لیجئو، مگر روضہ شریف کے قریب کی لیجئو۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا اور بعد نماز عصر آکر اپنے ہاتھ سے ان کے چہرہ پر مل کر روئی لپیٹ دی اور عشاء تک حضرتؒ کے ساتھ رہا بعد نمازِ عشاء آکر مزاج پوچھا تو چچا صاحب نے مسرت کے ساتھ فرمایا ذرا میرا منھ کھول کر تو دیکھو مجھے تو معلوم ہوتا ہے مرض دور ہوگیا کہ نہ وہ سوزش ہے نہ کرب اس مٹی نے تو اکسیر سے زیادہ کام دیا۔　　　　(تذکرہ)

جو لوگ کہتے ہیں کہ علماء دیوبند روضۂ مطہرہ سے لگنے والی چیز کے استعمال کرنے کو غلو اور شرک کہتے ہیں مندرجہ بالا واقعہ سے اس کی تردید ہو جاتی ہے، حضرت اقدس سہارنپوریؒ تو روضہ شریف کی مٹی کو شفا فرما رہے ہیں اور زائرین حرمین شریفین کو وہاں کی مٹی لانے کی ترغیب دے رہے ہیں، پھر یہ کہنا کہاں تک

روا ہے کہ علماء دیوبند عاشق رسول نہیں؟ کچھ تو سوچئے!

شمع مدینہ کا احترام کسی نے حضرت اقدس سہارنپوری سے دریافت کیا کہ روضۂ مطہرہ میں روشن ہونے والا موم خدامِ روضہ سے تبرکاً لینا کیسا ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا کہ بڑا موجب برکت ہے، مگر مال وقف ہے کہ یہیں کے استعمال کے لئے بھیجا جاتا ہے، اس لئے یوں کرو کہ اپنے طور پر بازار سے موم بتی خرید کر خدام کو دیدو کہ وہ روشن کریں اور پھر اس کو لے لو (تذکرۃ الخلیل ص ۳۷)

دیکھئے حضرت اقدس جہاں ایک طرف شمع روضہ مطہرہ کو موجب برکت بتلا رہے ہیں وہیں پاس شریعت کا کس قدر خیال فرما رہے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ "نیکی برباد گناہ لازم" کے مصداق ہو جائے اس لئے اس کا طریقہ بتلا دیا کہ بازار سے موم بتی خرید کر روشن کرا دو پھر لے لو۔

یہ ہے عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح تصویر اور اتباع رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک منظر۔

مخالفت سنت ہرگز منظور نہیں حضرت اقدس سہارنپوری کو سرور عالم صلی سے اس قدر محبت تھی کہ آپ سنت مطہرہ کے خلاف کوئی قول و عمل سننا گوارہ نہ فرماتے ایک مرتبہ سفر حج کے دوران مطوف نے آپ کو ایک مقام سے جلد روانہ ہونے کو کہا تو آپ نے فرمایا۔

اُونٹ چلے جائیں گے تو ہم پیدل بھی انشاء اللہ پہنچ جائیں گے مگر تم یہ چاہو کہ سنت رسول چھوڑ کر تمہارا کہنا مانیں — سو اس کی ہرگز ہم سے توقع مت رکھو۔ (تذکرۃ الخلیل ص ۵۸)

حضرت اقدس سہارنپوری کو پیدل چلنا تو گوارہ ہے مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی خلاف ورزی ہرگز منظور نہیں۔ دعویٰ تو ہو عشق کا اور محبوب کی بات کی

مخالفت کرنا۔ تقاضائے محبت کے منافی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ آپ اپنے تمام رفقاء و اعزہ متعلقین ومتوسلین کو اتباع شریعت کا احترام اور ان پر عمل کرنے کی نصیحت فرماتے تھے، ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

میرے نزدیک سب سے اول مسلمانوں کیلئے ہر حالت میں شریعت کا اعتقادی وعملی احترام ہے، محض زبانی احترام کافی نہیں، مسلمانوں کی دنیوی ترقی وفلاح کا ذریعہ بھی کامل اتباعِ شریعت ہی ہو سکتا ہے، جب تک اس اتباع کی روح مسلمانوں میں بالاتفاق پورے طور پر موجود نہیں ہوگی اس وقت مسلمان دنیوی مصائب وآلام سے بھی نجات نہیں پا سکتے اگر دنیاوی مصائب دور کرنے کیلئے اتباع شریعت سے غافل ہو کر عقل انسانی پر اعتماد کیا گیا تو یقیناً مسلمانوں کے لئے ناکامیاں اور غیر متوقع مشکلات وتکالیف رونما ہوں گی (اکابر کے خطوط ص۱۳ مطبوعہ سہارنپور)

ایک مرتبہ ارشاد فرمایا کہ:

شان حضورؐ اور اتباع شریعت میں جتنی ترقی ہوگی اسی قدر قرب الٰہی بڑھے گا اور برکت ہوگی (تاریخ مشائخ چشت ص۳۲۲)

مندرجہ بالا ارشادات سے یقیناً آپ نے اندازہ کیا ہوگا کہ حضرت اقدس سہارنپوری کے قلب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کس قدر عظمت واہمیت ہے۔

میرا تعلق سنت کے ساتھ ہے

بزرگوں کا طریقہ رہا ہے کہ ان حضرات گرامی قدر نے جس جس کے ساتھ تعلق قائم کیا اس کی وجہ محض رضائے الٰہی اور خوشنودیٔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم تھی حضرت اقدس سہارنپوریؒ کے ساتھ بھی جس کسی نے تعلق قائم کیا یا اظہار محبت کی آپ پہلے ہی فرمادیا کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا پاس ضروری ہوگا ورنہ

میرا تعلق تم سے کچھ نہیں، آپ نے ایک مرتبہ صاف صاف فرمایا کہ:

میرا تعلق ڈاڑھی کے ساتھ ہے، ڈاڑھی رہے گی تو میرا تعلق رہے گا اور یہ ختم ہے تو وہ بھی ختم ہے (تاریخ مشائخ چشت ص ۲۲۲)

یعنی جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو محبوب نہیں رکھتا اس پر عمل نہیں کرتا تو پھر میں کیسے ان لوگوں سے تعلق رکھ سکتا ہوں، گویا حضرتؒ بزبان حال کہہ رہے تھے کہ اگر کل میرے محبوب نے مجھ سے پوچھا کہ تم نے ان لوگوں کے ساتھ کیوں تعلق رکھا جو میری ہی سنتوں کا خیال نہ کرتے تھے۔ تو میں کیا جواب دوں گا۔

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

حضرت اقدس سہارنپوریؒ کو چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت ہی محبت تھی اور تقدیر میں مہاجرانہ وفات بھی لکھی تھی اسلئے آپ نے ۱۶ر شوال سے ڈیڑھ سال کی رخصت مدرسہ سے لے کر دار محبوب کا عزم کر لیا، اور جانے سے قبل اعزہ واقارب، دوست واحباب کے گھر بغرض ملاقات تشریف لے جاتے اور فرماتے کہ میرا کہا سنا معاف کرنا۔ میں حرمین شریفین جا رہا ہوں، آپ کی تمنا تھی کہ میری وفات مدینہ منورہ زادہا اللہ شرفاً میں ہی ہو چنانچہ آپ نے "بذل المجہود" کی تالیف کے وقت اللہ تعالیٰ سے تین دعائیں مانگی تھیں، آپ خود فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ سے تین دعائیں مانگی تھیں دو قبول ہو چکیں ایک باقی ہے

(۱) مکہ مکرمہ میں پر امن حکومت اسلامی شرعیہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں۔

(۲) بذل المجہود کی تالیف مکمل ہو جائے۔

(۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جوار میں دفن ہونا نصیب ہو جائے۔

بحمداللہ تعالیٰ دو تو مقبول ہو چکیں، اب تیسری دعا کا منتظر ہوں۔

چنانچہ جب آپ آخری مرتبہ مدینہ منورہ کی طرف روانہ ہوئے تو آپؒ نے فرمایا:

جب کبھی آستانہ مطہرہ پر حاضر ہوا ہوں یہی تمنا لے کر ساتھ گیا ہوں کہ وہاں کی پاک زمین مجھے نصیب ہوجائے .... اب بھی اس توقع پر جارہا ہوں کہ شاید اب میرا وقت آگیا ہو اور مدینہ طیبہ کی خاک پاک مجھے نصیب ہوجائے اور جوارِ نبویؐ میں مجھ کو جگہ مل جائے (تذکرۃ الخلیل ص۴۲۰)

اللہ رے تیری قدرت - ! خواص وعوام اپنوں اور غیروں نے بھی یہ دلکش منظر دیکھا کہ اس عاشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تمنا بر آئی اور مدینہ منورہ ہی میں ۱۵ ربیع الاول ۱۳۴۶ھ کو بعد نماز عصر وصال فرمایا، اور حضرات اہل بیتؓ کے متصل ہی دفن ہونے کی سعادت بھی نصیب ہوئی۔

ایں سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

علماء دیوبندؒ میں کتنے ہی عاشقان رسول صلی اللہ علیہ وسلم گذرے ہیں جنھوں نے اسی ارادے سے وہاں رہائش اختیار کی کہ مدینہ منورہ کی خاک پاک انھیں بھی قبول فرمالے، محدث کبیر حضرت مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی مہاجر مدنیؒ نے اسلئے وہاں ہجرت کی تھی اور وہ بھی مراد کو پاگئے اور حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب مہاجر مدنیؒ بھی اسی خاک پاک میں مدفون ہوئے، رحمہم اللہ تعالیٰ اجمعین۔

کیا ان واضح نصائح ووقائع کے بعد بھی کوئی شخص یہ کہنے کی جرأت وجسارت کرسکتا ہے کہ حضرت اقدس سہارنپوریؒ عاشق رسول نہ تھے اور حضرت اقدس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق ومحبت نہ تھی ـــــ؟

اگر یہ پروپیگنڈہ ہے اور یقیناً ہے تو پھر حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے اتنے بڑے خادم اور شیخ کے بارے میں گستاخیوں پر اُترنے والے خود بتائیں کہ اپنی آخرت کیوں برباد کررہے ہیں؟ ؎ اس میں حیران ہوں کہ کس کس کا گلہ تجھ سے کروں۔

مدارس میں سائنس کی تعلیم اثرات و نتائج

(جناب توقیر عالم صاحب، استاذ شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڈھ)

کسی بھی قوم یا تحریک کے عروج و اقبال اور زوال و ادبار کا نوشتۂ تقدیر تیار کرنے میں تعلیمی اداروں کا اہم رول ہوا کرتا ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ موت و حیات کا فیصلہ کرنے میں یہ ادارے محرک خاص کی حیثیت رکھتے ہیں کیونکہ انھیں اداروں میں ایسے ایسے جیالے جنم لیتے ہیں جو اپنے موقف کی وضاحت اور افکار و خیالات کی ترویج و اشاعت میں سرگرمئ عمل کا مظاہرہ کرتے ہیں اور کسی بھی لومۃ لائم کی پرواہ کئے بغیر باطل افکار و نظریات کو رد کر دیتے ہیں، نیز معاندانہ سازشوں کا توڑ کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے۔ لیکن اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جانا چاہئے کہ ایسے لائق فرزندان قوم اور علمبرداران تحریک اسی وقت پیدا ہو سکیں گے جب کہ اداروں کا تشخص برقرار رکھتے ہوئے افرادی قوت کی تیاری پر ادارے کی انتظامیہ، اساتذہ اپنی منظم کوششوں کا محور بنالیں۔

مدارسِ دینیہ مذہب اسلام کے وہ قلعے ہیں جہاں اسلامی فوجوں کی تشکیل و تنظیم ہوتی ہے اور جہاں سے اسلام دشمن طاقتوں کے چیلنجز قبول کئے جاتے ہیں۔ قرآن حدیث، اور فقہ کی تعلیمات سے لیس ہو کر یہاں کی فوجیں میدانِ مبارزت میں نکلتی ہیں ان علوم کے ذریعہ ایک طرف تو حق و صداقت اور عدل و انصاف پر مبنی افکار و خیالات کی اشاعت ہوتی ہے اور دوسری طرف فاسد خیالات اور باطل نظریات کی بیخ کنی

بھی، مدارس میں قال اللہ اور قال الرسول کی صدائیں گونجتی ہیں، اللہ و رسول کے احکام کے مطابق سیرتوں کی تعمیر کا جذبہ بیدار ہوتا ہے، معاشرے میں رائج غلط قسم کے تمام رسوم و رواج کو ختم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، اشداء علی الکفار، رحماء بینہم کے قیمتی درس دیئے جاتے ہیں، اور اللہ کی زمین پر اللہ ہی کی حکومت کا خیال دلوں پر نقش کرایا جاتا ہے، یہ تمام کوششیں مدارس کی چہار دیواری ہی میں ممکن ہیں، طلبہ کے اندر حق سے محبت اور باطل سے نفرت، صداقت و دیانت سے قربت اور کذب و بطلان سے بُعد پیدا کرانے میں مدارس کو ہی انفرادیت کی شان اور تقدم و پیشوائی کا شرف حاصل ہے۔

آج مدارس میں سائنس کی تعلیم سے متعلق کثرت سے تقریری و تحریری مباحث کا انعقاد عمل میں لایا جا رہا ہے، علماء و ماہرین اپنے لکچرز میں سائنس کی افادیت اور مدارس دینیہ میں اسکے نفاذ پر اظہار خیال کر رہے ہیں اور ان تمام لکچرز و خطبات کے ذریعہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ مدارس میں سائنس کی تعلیم کے نفاذ کے بعد ہی اس دور ترقی کے شانہ بشانہ چلا جا سکتا ہے، بصورت دیگر پسماندگی اور زوال و انحطاط سے دوچار ہونا پڑے گا، ان اداروں میں سائنس کے داخل نصاب ہونے کے بعد ہی وسعت نظری پیدا ہو سکتی ہے دوسروں کی آنکھ سے آنکھ ملا کر بات کی جا سکتی ہے، احساس کمتری احساس برتری میں بدل سکتا ہے اور معاشیات کا مسئلہ یک لخت حل ہو سکتا ہے، یہ باتیں کہاں تک درست ہیں اور ان معجزات کا صدور ممکن بھی ہے یا نہیں اس کا فیصلہ اہل خرد تجربات و مشاہدات کی روشنی میں کر سکتے ہیں، کیا ان اداروں میں جہاں شب و روز سائنس کی ہی تسبیح پڑھی جاتی ہے وہاں کوتاہیٔ فکر اور تنگ نظری نہیں پائی جاتی کیا ان اداروں کے فارغین کو معاشی مسئلہ پیش نہیں آتا، رہی احساس برتری

ر احساس کمتری کی بات، تو یہ خود کی پیدا کردہ ہوتی ہے، جب بیجا رواداری، تعصب
ر کسی طرح کی جانب داری کی عینک اتار کر مسئلہ کی نوعیت پر غور کیا جائے اور
س کے پیش وعقب کا دقت نظری سے جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ سائنس
ا تعلیم کے بعد مدارس پر مضر اثرات مرتب ہوتے ہیں، رہی مطلق سائنس کی تعلیم
اس کی افادیت سے انکار وانحراف نہیں بلکہ قرآن نے تو آیات بینات میں جگہ
بلہ تدبر وتفکر پر اتنا زور دیا ہے کہ موجودہ سائنس بھی قرآن حکیم کی مرہون
منت دکھائی دیتی ہے۔ موجودہ سائنس بھی عقل وفکر کا ہی نام ہے اس لحاظ سے
سائنس کی تعلیم اسلام اور قرآن کے متضاد نہیں ہے، لیکن اس حقیقت سے انکار
نہیں کیا جا سکتا کہ اسلام یا قرآن کا منشار وہی سائنس ہے جو انسان کو خدا تک
پہنچادے، بہرحال یہ ایک الگ موضوع ہے جس پر شرح وبسط کے ساتھ بحث
کی جاسکتی ہے، اس مختصر مقالے میں تو ان اثرات ونتائج کو بتایا جانا مقصود ہے
جن سے مدارس دینیہ کی جہت مخ وشں ہوجاتی ہے اور پھر وہ دانستہ یا نادانستہ
اپنی مخصوص قسم کی ذمہ داریوں سے اپنے آپ کو سبکدوش کر لیتے ہیں۔

اول اور سب سے بڑا اثر یہ ہوگا کہ قرآن وحدیث، فقہ جیسے خالص اسلامی
علوم کی حق تلفی اور خیانت ہوگی، یہ تو امت مسلمہ کے لئے لمحۂ فکریہ ہے ہی کہ قرآن
جو پوری انسانیت کا ضابطۂ زندگی، حدیث اسی ضابطے کی تشریح، اور فقہ جو ان کے
سمجھنے کا ذریعہ ہے، محض مدارس کی چہار دیواری کے لئے مخصوص ومحدود کر دیا گیا
ہے، خالص اسلامی علوم وفنون کے ساتھ تو یوں بھی سوتیلا پن کا سلوک کیا ہی گیا ہے لیکن
ستم بالائے ستم یہ کہ بالواسطہ اور بلا واسطہ دونوں ہی طریقوں سے اپنے فن
میں تخصص اور انفرادیت پیدا کرنے سے یہاں کے طلبہ کے ذہنوں کو موڑا جارہا ہے
علم طبعیات، علم کیمیا اور علم حیات بلاشبہ بڑے قیمتی علوم ہیں، لیکن مدارس میں

جن کا ایک مخصوص میدان ہے، ان علوم کا نفاذ طلبہ پر گراں بار بوجھ ہے، بالفرض اگر یہاں کے طلبہ اس بوجھ کے تحمل و برداشت کی قوت رکھیں بھی تو یہ بات حتمی ہے کہ توجہ کا ارتکاز جو قرآن و حدیث اور فقہ پر تھا انتشار و افتراق سے دوچار ہوجائے گا،

ابتدائی درجات میں سائنسی علوم کے نفاذ کے موقف کی بات کہہ کر علماء مدارس کی توجہ مبذول کرائی جاتی ہے اور ان کی معاونت حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن ابتدائی درجات میں بھی باضابطہ اور منظم طریقے سے سائنس کو شریک کرلینا مدارس کے حق میں خطرے سے خالی نہیں ہے، وہ طلبہ جو ابتدائی درجات یا ہائی اسکول میں پڑھتے ہیں انھیں دینی تعلیم کے علاوہ ان علوم میں بھی خاصی محنت کرنی پڑے گی، بلکہ دینی تعلیم کے مقابلے میں بہت زیادہ انھیں سائنس کی طرف یکسو ہونا پڑے گا، اسلئے کہ یہ علوم بہرحال مشکل ہیں، ان کی عقدہ کشائی میں شب و روز جد و جہد کرنی پڑے گی، اس کا جو نتیجہ ہوگا بہرحال مدرسوں کے لئے حوصلہ شکن اور منحوس ہوگا۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ شاید ہی کوئی طالب علم اپنی تمام تر محنتوں اور مشقتوں کے بعد اگر مسلسل اچھے نمبرات حاصل کرتا ہے تو یقیناً ان کی دلچسپی انھیں علوم کی طرف ہوگی۔ کامیابی اور ترقی کی موجودہ دوڑ بھاگ میں اس کے حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات نہیں آئے گی کہ دقت طلب مضامین میں شاندار کامیابی حاصل کرنے کے باوجود وہ قرآن، حدیث اور فقہ کو اپنی توجہات کا مرکز بنائے جو بظاہر اپنے اندر دنیاوی کشش نہیں رکھتے ہیں، اب اس کے دل میں سائنس داں، انجنیئر اور ڈاکٹر بننے کی خواہشات انگڑائیاں لیں گی، اور وہ طرح طرح کے خواب بھی دیکھے گا، لیکن تفسیر، حدیث اور فقہ جیسے مضامین اس کے لئے بے کیف و بدمزہ

ہوں گے، مفسر، محدث اور فقیہ بننا تو دور کی بات ہے، اس طرح مدرسے اپنا مقام بھول کر موجودہ اسکولس اور کالجیز کا رول تو ادا کرسکتے ہیں، لیکن مدرسے کی تربیت گاہ بلکہ صحیح معنوں میں مدرسوں کا رول انجام نہیں دے سکتے، اور پھر یہی سائنسداں، انجینئر اور ڈاکٹر مدرسوں کے نمائندہ و ترجمان ہوں گے پھر مدارس کی نیکنامی ہوگی یا بدنامی اسکا فیصلہ ان کے کردار کے مطابق ہوگا۔

اور اگر کچھ طلبہ ہائی اسکول تک سائنس کی تعلیم حاصل کرنے کے باوجود آئندہ کے لئے بھی اپنا میدان عمل قرآن وحدیث اور فقہ کو بنانے کے لئے آمادہ ہوتے ہیں تو یہ بڑی مستحسن اور امید افزا بات ہے لیکن ان میں سے اکثریت بھی ایسے ہی کی ہوگی جو سائنس کے مضامین میں کمزور رہوں گے، بہرحال ذہین طلبہ ہوں یا کمزور طلبہ اگر قرآن وحدیث کی طرف مائل ہوئے بھی تو چونکہ ان کی بنیاد ان علوم میں کمزور ہوگی مستقبل میں انھیں پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑے گا اور بنیادی کمزوری کے سبب بہت اچھا کرنے کی توقع نہیں کی جاسکتی۔

اگر مدارس میں سائنس کی تعلیم شامل نصاب ہو بھی جاتی ہے تو ضرورت متقاضی ہوتی ہے کہ ان مضامین کے لئے کالجیز اور یونیورسٹی کے اساتذہ میسر کئے جائیں یہ بات پیش نظر رہنی چاہیئے کہ چونکہ مدارس، طلبۂ مدارس اور علمائے مدارس کے سامنے رزق میں وسعت و فراخی اور تنگی کا فلسفہ کالجیز کے فارغین کے مقابلے میں زیادہ واضح ہوتا ہے، توکل علی اللہ اور قناعت میں کہیں مدارس کے لوگ کالجیز اور دوسری جامعات کے فارغین سے بڑھے ہوئے ہوتے ہیں. گویا کہ دوسرے تمام اسلامی افکار فارغین مدارس، اور طلبۂ مدارس کے سامنے دوسری جامعات کے فارغین کے مقابلے میں درخشاں اور واضح ہوتے ہیں اسلئے شاذ ہی ایسا ہوتا ہے کہ یہ لوگ ان حقیر تنخواہوں پر راضی ہوجائیں. جو دوسرے اساتذہ کو دی جاتی ہیں

عموماً ایسے مواقع پر فرق و امتیاز کو روا رکھا جاتا ہے، یہاں اساتذہ دو گروپ میں تقسیم ہو جاتے ہیں، نتیجہ کیا ہوگا ہر ذی ہوش سمجھ سکتا ہے، ایک ہی ادارے میں ایک ہی نوعیت کی ذمہ داری انجام دینے والے لوگوں کے ساتھ مراتب کے حصول میں یہ تفریق کچھ لوگوں کی بے توجہی، باہمی چپقلش اور تعلیمی زوال پر منتج ہوتی ہے، کیونکہ ایک طبقہ فطری طور پر احساس کہتری کا شکار ہوگا اور دوسرا طبقہ احساس برتری کا۔

دینی مدارس میں سائنس کی تعلیم کے نفاذ کے سلسلے میں ایک بات یہ کہی جاتی ہے کہ ان کی معیشت کا مسئلہ حل ہو جائیگا، یہ عجیب و غریب بات ہے کہ آخرت کی کامیابی اور دینی معاملات کے لئے تو قرآن و حدیث اور فقہ پڑھی جائے، اور معاشی مسئلہ حل کرنے کیلئے سائنس کی تعلیم حاصل کیجائے، یہ بات بعینہٖ اس طرح ہے کہ ایک شخص مسلم سیاسیات میں پی، ایچ، ڈی کرے، اور اپنی معیشت کا مسئلہ حل کرنے کے لئے علم معاشیات سے بھی واقف ہو، اس نقطۂ نظر میں صداقت و حقیقت کا رخ زیبا موجود ہے بھی یا نہیں کچھ نہیں کہا جا سکتا ہاں اتنا ضرور ہے کہ معاشی فلاح و بہبود کے نقطۂ نظر سے قبول کی جانے والی تجویز بڑی تشویشناک ہے کیونکہ اس کا عملی نفاذ اس بات کی ناطق شہادت ہے کہ محض قرآن و حدیث کی تعلیم حاصل کرنے والے افراد فاقہ کش اور بدحال ہی رہتے ہیں اور دنیا کی چند روزہ زندگی میں معاشی نقطۂ نظر سے اس کی کوئی افادیت نہیں ہے، حالانکہ تاریخ کی یہ ایک ناقابلِ انکار صداقت ہے کہ لوگ جب قرآن و حدیث کے ہو کر رہے تو ان پر نوازش و کرم کی بارش ہوئی اور کوئی طاقت ان کا بال بیکا نہ کر سکی، یہاں تک کہ قیصر و کسریٰ جیسی مستبد اور ظالم حکومتیں بھی قدم بوس ہو گئیں۔ حجۃ الوداع کے موقعہ پر رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم

نے ہزاروں مسلم نمائندوں کو یہ مژدۂ جانفزا سنایا تھا۔ ترکت فیکم امرین لن
تضلوا ما تمسکتم بھما کتاب اللہ وسنتی
(ترجمہ) (اے لوگو) میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں، جب تک
تم ان دو چیزوں سے چمٹے رہو گے گمراہ (ناکام) نہیں ہو سکتے۔ ایک تو ہے اللہ
کی کتاب اور دوسری چیز ہے میری سنت۔
شاعر مشرق علامہ ڈاکٹر محمد اقبال نے کیا خوب وضاحت کی ہے۔

وہ معزز تھے زمانے میں مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

معاشی فلاح وبہبود کے نظریہ کے تحت اگر اس پالیسی کو عملی جامہ پہنا دیا
ہے تو خالص اسلامی علوم کی وقعت بایں طور کم ہو جاتی ہے کہ ان سے محض آخرت
کی فلاح ہی حاصل ہو سکے گی، جب کہ ان سے دونوں جہاں کی کامیابی ملتی ہے
بشرطیکہ صحیح معنوں میں مسلم ہونے کا ثبوت دیدیا جائے، اللہ تعالیٰ کا اعلان ہے
انتم الاعلون ان کنتم مومنین تم ہی سربلند رہو گے بشرطیکہ مومن ہو جاؤ
ہاں اگر یہ تجویز ضروری واقفیت اور معلومات کے اضافہ کے نقطۂ نظر
سے ہے تو مستحسن اور قابلِ ستائش ہے۔ بلاشبہ سائنس کے ایک طالب علم
کو علم سیاسیات سے واقف ہونا چاہئیے۔ سیاسیات کے ایک طالب علم کو
معاشیات اور اخلاقیات سے واقف ہونا چاہئیے، طب کے طالب علم کو فلسفہ
اور منطق سے بھی آگاہ وباخبر ہونا چاہئیے، اسی طرح مدرسے کے طالب علم کو
بھی سائنس کی بنیادی چیزوں سے واقف ہونا چاہئیے۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا
کہ شعبۂ سائنس میں معاشیات کا شعبہ کھول دیا جاتا ہے، شعبہ معاشیات
میں سیاسیات کا شعبہ بھی نہیں کھولا جاتا اور نہ ہی میڈیسن میں منطق وفلسفہ کا

نہ ایسا ممکن ہے اور نہ ہی آج کے دور تشخیص میں اس کے اندر معقولیت نظر آتی ہے، تو آخر مدارس کے اندر ہی سائنس کو فروغ دینا مناسب معقول بلکہ ناگزیر کیوں قرار دیا جاتا ہے؟

مدارس کے مخصوص دائرہ کار ہونے کی حیثیت سے فضلائے مدارس اور دوسرے اہلِ حل وعقد کا فرض ہے کہ اس تجویز کے خدوخال اور نتائج و اثرات پر غور کریں، اس لئے بھی کہ جس سائنس کے نفاذ کی بات کی جا رہی ہے وہ تو سراسر غور وفکر کا ہی نام ہے۔ تشدد تنگ نظری اور تعصب کی عینک لگا کر میں نہ تو علمائے مدارس اور ذمہ داران کو اس تجویز کی مخالفت کی تلقین کرتا ہوں اور نہ ہی اس کی موافقت کی دعوت دیتا ہوں ہاں یہ عرض کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ اس کے اثرات ونتائج پیش نظر ہونے چاہئیں، اور یہاں پر اپنے موقف کی وضاحت کر دینا ناگزیر سمجھتا ہوں کہ اگر کسی بھی نقطہ نظر سے مدارس میں باضابطہ سائنسی علوم داخل کئے گئے اور مدارس اپنے مخصوص میدان کار سے ہٹ گئے اور اپنی ذمہ داریوں سے دور رہے اور آئندہ مفسر قرآن محدث اور فقیہ کیلئے یہ زمین زمینِ شور ثابت ہوئی تو اس کے جواب دہ اور ذمہ دار اساتذۂ مدارس انتظامیہ اور اہل حل وعقد ہوں گے جن کے ہاتھوں میں مدارس کی تقدیر ہوا کرتی ہے۔

ادبیات

نعت

اقبال سہیل مرحوم

کتابِ فطرت کے سرورق پر جو نام احمد رقم نہ ہوتا
تو نقشِ ہستی ابھر نہ سکتا وجودِ لوح و قلم نہ ہوتا

یہ محفلِ کن فکاں نہ ہوتی جو وہ امام اُمم نہ ہوتا
زمیں نہ ہوتی فلک نہ ہوتا عرب نہ ہوتا عجم نہ ہوتا

ترے غلاموں میں بھی جو تیرا ہی عکس شانِ کرم نہ ہوتا
تو بارگاہِ ازل سے اسکا خطاب خیر الامم نہ ہوتا

نہ روئے حق سے نقاب اٹھتا نہ ظلمتوں کا حجاب اٹھتا
فروغ بخشِ نگاہِ عرفاں اگر چراغ حرم نہ ہوتا

کمالِ انسانیت کا پیکر جمال وحدانیت کا مظہر
سوائے ذاتِ حضورِ انور کوئی خدا کی قسم نہ ہوتا

سوائے صدیق کون پاتا حضورِ انور کی جانشینی
کہ وہ نہ ہوتے تو یوں جہاں میں بلند دیں کا علم نہ ہوتا

اریکہ آرائی نبوت کا فخر فاروق ہی کو ملتا
جو سلسلہ وحیٔ آسمان حضور پر مختتم نہ ہوتا

خلافتِ راشدہ کا منصب اگر نہ ہوتا نصیب عثماں
تو دفتر وحیٔ آسماں مرتب و منتظم نہ ہوتا

زہے علوم مقام حیدر خوشی میں کہتے تھے خود پیمبر
کہ فتح ہوتا نہ حصن خیبر جو آج یہ ابن عم نہ ہوتا

بیان ملکیت ماہنامہ دار العلوم
بابت رجسٹریشن ایکٹ فارم ۴ رول ۸

نام	رسالہ دار العلوم
وقفہ اشاعت	ماہانہ
پرنٹر و پبلشر	مولانا مرغوب الرحمن صاحب
قومیت	ہندوستانی
پتہ	دار العلوم دیوبند
ایڈیٹر	مولانا حبیب الرحمن قاسمی
قومیت	ہندوستانی
پتہ	دار العلوم دیوبند
مالک	دار العلوم دیوبند

میں تصدیق کرتا ہوں کہ مذکورہ بالا تفصیلات میرے علم و اطلاع کے مطابق درست ہیں

(مولانا) مرغوب الرحمن (صاحب)

علماء عظام اور طلبہ کرام کی سہولت کیلئے ہندوستان میں سب سے پہلی بار بنگلہ اسلامک اکیڈمی کیجانب سے ایک عظیم پیشکش

اشاعت الاسلام اسکیم

علماء اور طلبہ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ "بنگلہ اسلامک اکیڈمی" کی جانب سے شائع کردہ کتابیں رعایتی قیمت پر حاصل کرنا چاہتے ہیں تو وہ اکیڈمی کی جانب سے فراہم کردہ فارم یا فارم دستیاب نہ ہونے کی صورت میں پسندیدہ کتابوں کے نام کے ساتھ اپنے پتے جلی حروف میں ذیل کے پتہ پر لکھ بھیجیں اور اکیڈمی کے باضابطہ ممبر بنیں۔

بنگلہ اسلامک اکیڈمی، مدنی مسجد دیوبند، یو۔پی

اکیڈمی کی جانب سے شائع شدہ کتابیں جو ۵۰٪ کمیشن سے حاصل کی جاسکتی ہیں

(۱) مرقاۃ شرح مشکوٰۃ عمدہ جلد سنہری ڈائی =/۸۰۰ ۱۱ جلدوں میں
(۲) معارف السنن شرح ترمذی عمدہ جلد سنہری ڈائی =/۳۵۰ ۶ جلدوں میں
(۳) المنجد (عربی اردو) عمدہ جلد سنہری ڈائی =/۱۲۰
(۴) درس ترمذی شرح ترمذی عمدہ جلد سنہری ڈائی =/۱۰۰ ۲ جلدوں میں
(۵) تنظیم الاشتات شرح مشکوٰۃ عمدہ جلد سنہری ڈائی =/۱۲۰ ۲ جلدوں میں
(۶) تاریخ اسلام (اکبر خاں) عمدہ جلد سنہری ڈائی =/۱۳۰ ۳ جلدوں میں
(۷) سیرۃ المصطفےٰ عمدہ جلد سنہری ڈائی =/۱۱۰ ۲ جلدوں میں
(۸) اصح السیر عمدہ جلد سنہری ڈائی =/۵۵
(۹) خصائل نبوی عمدہ جلد سنہری ڈائی =/۳۰
(۱۰) ہدایۃ المعتذی شرح مینذی =/۳۰

آئندہ شائع ہونیوالی کتابیں جو ممبر بننے پر ۵۰٪ سے زائد کمیشن سے حاصل کی جاسکتی ہیں

(۱) فتح الملہم شرح مسلم (۲) عین الہدایہ شرح ہدایہ
(۳) فتاوی شامی (۴) الاتقان فی علوم القرآن (اردو)
(۵) معارف القرآن (اردو) (۶) مشکوٰۃ شریف
(۷) [illegible] شریف (۸) ہدایہ اولین و آخرین

(نوٹ) بذریعہ ڈاک کتابیں منگوانے والے حضرات اصل قیمت کی دس فیصد رقم پیشگی روانہ فرمائیں